

حالات کے شکنجے میں جکڑے ہوئے ایک نوجوان کی داستان

سب رنگ ڈائجسٹ کا مقبول عام سلسلہ

بازیگر

راوی: بابر زماں خان
تحریر: شکیل عادل زادہ

ساتواں حصہ



بازار

کیسے قومی و جری، مفقود و بااثر ہو جاتے ہیں۔ دولت سے آدی خریدے جاسکتے ہیں۔ ہوا، پانی، روشنی، دولت سے موسم خریدے جاسکتے ہیں۔ ہٹھل نے خانم کی دی ہوئی گھوریوں کی ڈبیا سے گھوری نکالی اور سلامی کی بندر کی ہوئی بیڑی سلگائی۔ ڈبے میں کسی قدر حنکلی تھی۔ کھڑکیوں کے شیشے گرا دینے سے کچھ گرمی ہوگئی۔ میرے سامنے کی برتھ پر دیوار سے ٹیک لگائے، ٹانگیں پھیلائے ہٹھل گھوری چبانے اور بیڑی کے کش لیتا رہا، پھر ہاتھ روم جا کے اس نے منہ صاف کیا اور واپس آ کے برتھ پر دراز ہو گیا۔ ابھی گاڑی نے پوری رفتار نہیں پکڑی تھی کہ کسی چھوٹے سے اسٹیشن پر ٹھہر گئی اور ایک دو منٹ بعد ہی چل پڑی، کوئی دس منٹ بعد مشہور تیرتھ استھان ایودھیا آ گیا۔ گاڑی یہاں بھی بہت کم وقت ٹھہری۔ ایودھیا گزر جانے کے بعد میں نے روشنی کم کر دی اور بیگ سے ٹیس نکال کے ایک ہٹھل کو دیا، دوسرا اپنے پاس رکھا۔ روشنیاں کم ہونے سے ڈبے کا ماحول خوابیدہ سا ہو گیا تھا۔ تو آواز

پیپے کی عجب کرمشہ کاری ہے۔ اسی ریل گاڑی کے دوسرے ڈبوں میں لوگ ٹھس ٹھس کر بیٹھے ہوں گے۔ بعض لوگوں کو تو شاید کھڑے ہونے کی بھی جگہ نہ ملی ہو۔ ڈبا گو مختصر تھا لیکن ہمارے سوا یہاں کوئی اور نہیں تھا۔ اوپر کی دو برہنیں، نیچے کی دو کشادہ برہنیں اور ہم۔ بیچ میں دیوار سے لٹکی ہوئی لکڑی دونوں برتھوں کے لیے میز کا کام دیتی تھی۔ راکھ دانی سر بانوں کے قریب جڑی ہوئی تھی۔ گلاس رکھنے کے لیے اسٹینڈ بھی پوسٹ تھا۔ ڈبا نئے رنگ روشن سے آراستہ تھا۔ ہر چیز نئی معلوم ہوئی تھی۔ فرش بالکل اجلا، چھت پر بیچھے، گدے نرم اور پچھلیے، ٹیٹھو تو آوی دھستا جائے۔ نرمی، گداز، رنگ، روشنی دولت کو بہت مرغوب ہیں۔ مرغوب تو ہر ایک کو ہیں لیکن دولت ہر ایک کے پاس نہیں ہوتی۔ کہتے ہیں دولت سے زندگی نہیں خریدی جاسکتی مگر دولت زندگی کیسی آسان کر دیتی ہے۔ دولت تو ایک طاقت ہے، جس کے پاس جتنی زیادہ، اتنا وہ طاقت ور۔ دولت سے معذور نا تو اس، مٹنی اور ضعیف بھی

سے چلتی گاڑی بھی لوری کا کام کرتی ہے اور تو اتر سے ڈے کی لکڑی پگھوڑے کی کیفیت رکھتی ہے۔ میں نے بھی نھل کی تقلید میں لیٹ جانا چاہا لیکن نیند نہیں آ رہی تھی۔ بار بار حویلی کے دروایام سامنے آ جاتے تھے اور حویلی ہر لمحے دور دور ہی تھی۔ بیانی پر نقش مناظر دیواروں اور فاصلوں سے نہیں بیٹھے۔ اس مرتبہ وہاں کچھ زیادہ ہی وقت گزارنے کا موقع مل گیا تھا۔ نھل کو کبھی تو ان باتوں سے بھی مطلع تھا۔ آٹھ دس دن سے وہاں کچھ بھڑکاؤ رہا ہے یہ احساس میرا ایسا جلا جاتا تھا کہ سب کچھ میری نادانیوں اور کوتاہیوں سے شروع ہوتا ہے۔ آسن سول اسٹیشن پر میں اتنی ضد اور ناراضی کا اظہار نہ کرتا تو حالات بہت مختلف ہوتے۔ نھل تو فیض آباد کا رخ کرنے کو تیار ہی نہ تھا۔ میرا خیال تھا کہ اول تو ہمیں فروزاں اور یاسمن کو ساتھ لے کر فیض آباد جانا چاہیے تھا۔ یہ ممکن نہ ہوا تو پہلی گاڑی سے ہمیں وہاں پہنچ جانا چاہیے۔ ہمارے بغیر فروزاں اور یاسمن کو حویلی میں بہت اجنبیت محسوس ہو سکتی ہے۔ بے پے اتنے بڑے حادثات کے بعد انہیں تو بہت گداز چاہیے مگر یہ میرا امکان تھا۔ فروزاں اور یاسمن کے فیض آباد پہنچ جانے کے دن بھر بعد ہم بھی وہاں پہنچ گئے تھے۔ بے شک ہمیں دیکھ کے ان کے چہرے کھل اٹھے تھے۔ ہماری آمد سے یقیناً انہیں بہت حوصلہ ملا ہوگا لیکن نھل بھی کیا غلط کہہ رہا تھا، ان کے پیچھے پیچھے ہمارے فیض آباد پہنچنے کی واقعی کوئی ضرورت نہ تھی۔ میں بھول گیا تھا کہ حویلی میں زریں اور خانم موجود ہیں۔ وہاں نیساں ہے۔ انہیں حراماں نصیبوں کی اشک شوئی کا ٹن آتا ہے۔ کاش جیسا کہ نھل کا ارادہ تھا، ہم اس وقت فیض آباد نہ جاتے تو نہ رہا اور گورا کا واقعہ پیش آتا اور نہ شاید نھل کو بہت سی پورے 47 آدمی جان سے جاتے۔ نھل صاف انکاری تھا کہ اس خون خرابے سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ہے اور میں نے بھی یہی

تسلیم کر لیا تھا مگر جب تانے بانے کا خیال آتا تھا تو کچھ دکھائی بھائی نہ دیتا تھا۔ نھل کو اسی شام اور اسی رات مجھے ساتھ لے کے شہر کے مختلف مقامات اور خصوصاً رات کو دن نیم کے بالا خانے پر جانے کی ایسی کیا بڑی تھی؟ اسی شام، اسی رات ہی کیوں؟ شہادتیں نقش کرنے کی صورت ہی میں یہ بد بیریں کا جانی ہیں اور پولیس کے جہاں دیدہ، گرگ باراں دیدہ افسران کسی قسم کا کوئی نشان کھوجنے میں کیوں ناکام رہے؟ کوئی عام مجرم ہوتے تو اپنے آثار ضرور چھوڑ کے جاتے۔ نھل کو بہت سی پلنگا کرنے والے کیسے ہنرمند اور پختہ کار لوگ تھے۔ یہی چیستاں نکتہ رس پولیس افسروں کی نیندیں حرام کیے ہوئے ہے۔ ایک دو نہیں اور بھی بہت سی باتیں تھیں۔ جامو کا اچانک کلکتے سے آنا اور ایک رات کے بعد چھلاوا ہو جانا۔ اپنے آدمی گورا استاد کی ہزیمت کے بعد میری تلاش میں یا حویلی کے کیمینوں کو زک پہنچانے کے لیے شورہ پشت نھل کا ریل دیوکی حویلی کی طرف کوچ کرنے کے امکانات نظر انداز نہیں کیے جاسکتے تھے اور تدارک کی یہی صورت تھی کہ نھل کو بہت سی سرے سے نیست دبا ہو کر دی جائے۔ یوں حویلی ہی محفوظ نہیں رہے گی، ایک خلقت کو بھی امان مل جائے گی۔ جب بھی ان پہلوؤں اور عواقب پر دھیان جاتا تھا، میرا سر کپکپے لگتا تھا۔ سارے جسم پر کانٹے سے آگ آتے تھے۔ بارہا میں نے اپنے آپ کو منضبط کرنے، خود کو لگ رکھنے اور سب کچھ فراموش کر دینے کی کوشش کی لیکن دوسرے پر قابو پانا آسان، خود کو قابو میں رکھنا مشکل ہوتا ہے۔

کہیں نھل سے فیض آباد سے روانگی میں غلٹ تو نہیں ہوئی ہے۔ آدمی بہت ہوش مند ہو، نیبے ہوئے محلوں کی زد پر رہتا ہے۔ وہ مجھے کی قابل سمجھتا تو میں کچھ دن اور وہاں ٹھہرے رہنے کا مشورہ دیتا۔ اس نے صاف لفظوں میں پولیس افسروں کو مکتوبہ

کر دیا تھا کہ اس کے غیاب میں حویلی کے مکینوں سے کوئی باز پرس نہ کی جائے۔ ورنہ کوئی وعدہ کیا تھا نہ اختلاف کیا تھا۔ لیکن پولیس کا کیا بھروسہ ہے۔ ایک دن وہاں ہی نہیں، دوسرے افسر بھی با اختیار ہیں۔ کسی وقت بھی کسی کا دماغ گھوم سکتا ہے۔ ورنہ کا جادو بھی ہو سکتا ہے۔ ادھر حویلی کے لوگوں کو ہمارے باہر کے معاملات سے کئی ہی آشنائی ہو، پولیس، تھانے، پکچری کا انہیں کوئی تجربہ نہیں ہے۔ ہمارے چلے جانے کے بعد انہیں بے امانی، بے سرد سامانی سی محسوس ہو رہی ہوگی۔ نھل کی ہدایتوں پر وہ ہر طرح کا رہند ہیں مگر کوئی دھڑکاؤ تو انہیں ہر دم لگا رہنا چاہیے۔ یہ سفر تو ہم کچھ دن بعد بھی کر سکتے تھے۔ چند دن پہلے یا چند دن بعد سے کیا حاصل ہونے والا تھا۔ آدمی وقت کا پابند رہے، وقت بھی تو اس کا کچھ خیال کرے۔ وقت ہمارے اختیار سے نکل جاتا تھا۔ راستوں میں دیواریں کھڑی ہو جاتی ہیں۔ راستے بھی تو رخ بدل لیتے ہیں۔ مجھے تو اب یہ سارا کچھ معمول سا لگتا تھا، کسی فرض یا قرض کی ادائیگی کی طرح۔ بھی بھی تو معلوم ہوتا تھا کہ ہم شخص اپنی سلی، اپنی دل جوئی کے لیے صبح و شام سفر کا وظیفہ انجام دے رہے ہیں، کیونکہ ہمیں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے نہیں رہنا چاہیے، کیوں کہ سفر کے سوا ہماری استطاعت میں کیا ہے۔ پہلے کسی بہت سی میں داخل ہوتے وقت دل دھڑکنے لگتا تھا کہ اب منزل دور نہیں ہے۔ اب اتنی بستیوں کی خاک چھاننے کے بعد کسی نئی جگہ جاتے ہوئے ناکامی کے احساس سے قدم بوجھل ہو جاتے ہیں۔ نھل کا البتہ یہ حال نہیں تھا۔ ہر صبح تروتازہ ہو کے محلوں اور گلیوں میں مولوی صاحب کی صدا میں لگانے کے لیے تیار ہو جاتا۔ سب ایک مٹی سے بنے ہیں تو ہر شخص کی مٹی الگ ہے۔ نھل کا یقین قائم تھا۔ اتنے آرام، خاطر مدارات، عزیزوں کی رفاقت چھوڑ کے وہ سفر کے لیے مضطرب رہتا تھا۔ سفر چاہے شاہی بجز سے میں کیا

جائے یا آٹھ گھوڑوں کی کبھی میں، سفر تو سفر ہوتا ہے۔ سفر، اپنا نکل، عشرت کدہ، اپنا گھر نہیں ہوتا۔ نھل کا یقین کچھ ایسا بے جواز بھی نہیں تھا۔ بے شمار بستیوں کی کوچہ گردی کرتے ہوئے ایک شہر جنینگر میں ہم مولوی صاحب کے ٹھکانے پر پہنچ گئے تھے۔ حیدرآباد میں بھی ہم نے ان کا گھر ڈھونڈ لیا تھا۔ نگر یا سادات میں مولوی صاحب کے خاص دوست حافظ عبدالخالق تک ہماری رسائی ہو گئی تھی۔ وہ بھی مولوی صاحب کا ایک گھر تھا۔ اتنا کچھ حرکت میں رہنے ہی سے ممکن ہوا تھا۔ منزل، مراد سے مشرور نہیں ہے۔ منزل مل جانا اور چیز ہے، مراد پانا اور۔ اور جہاں مراد بر نہ آئے، اسے منزل ہی کیوں کہا جائے۔ کاش دنیا ہی کچھ چھوٹی ہوئی اور اسی نسبت سے لوگ بھی کم ہوتے۔ خدا کو آخر اتنی بڑی دنیا بنانے کی کیا ضرورت تھی یا پھر آدمی کی سمانی بھی بڑھانی ہوئی۔ آدمی کی چار آنکھیں، آٹھ ہاتھ چہرے بنائے ہوتے، آدمی کے پر لگائے ہوتے۔ دنیا کی وسعت کے اعتبار سے یہ آدمی تو بہت حقیر ہے۔ آدمی تو دو گز کا ہوتا ہے۔

یہ پیچر گاڑی تھی۔ چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں پر دم لیتی بڑھتی رہی۔ میں تو جاگتا ہی رہا۔ میرے سر میں بھی کوئی ریل چل رہی تھی۔ نھل میری طرف سے منہ پھیر کے سو گیا تھا۔ اس کے غافل ہو جانے سے مجھے کچھ اطمینان ہوا تھا۔ تنہائی کا سا احساس، اس وقت جانے کیوں مجھے اس تنہائی کی بڑی طلب تھی۔ نھل جاگ رہا تھا تو مجھے بہت گھبراہٹ ہو رہی تھی جیسے وہ مسلسل مجھے دیکھ رہا، میرے بارے میں سوچ رہا مگر یہ تنہائی بھی عجب ایک خود فریبی، کیسا ایک گمان ہے۔ آدمی کتنا ہی اکیلا ہو، اکیلا کہاں ہوتا ہے۔ جانے کتنے لوگ، کتنے منظر سننے پرانے، اچھے برے اسے گھیرے میں لیے ہوتے ہیں۔ آدمی تو سوتے میں بھی کتنا تنہا ہوتا ہے۔ تنہائی تو شاید ایک ہی وقت، ایک ہی صورت

میں ممکن ہوتی ہے اور کسی نے کہا ہے، آدمی اکیلا کہاں ہوتا ہے۔ وہ مستقل اپنے ساتھ جو ہوتا ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے خود پر ہنسی آتی تھی۔ یہ میں کیسا آدمی ہوں۔ سامنے کا سارا آئینہ ہونے کے باوجود میرا دماغ الجھنے، ہنسنے لگتا ہے۔ اپنے ہوش و حواس پر بھی خود مجھے بہت شک ہوتا ہے۔ کسی معذور، بے توازن، کسی مجہول آدمی میں مجھ سے سوا پھر کیا ہو سکتا ہے۔

پھر کوئی اسٹیشن آ رہا تھا۔ انجن زور زور سے بیٹیاں بجانے لگا تھا مگر جیسے بادل گرے ہوں یا زمین زیر زبر ہو گئی ہو۔ آہستہ ہوئی ہوئی گاڑی کو یکا یک جھکا لگا۔ گاڑی رک گئی تھی۔ دوسرے لیے دو تین اور جھٹکے لیے اور ہسٹنٹی، ڈگمگاتی، دھڑ دھڑاتی ہوئی دوبارہ رک گئی۔ رات کے وقت ڈبے ٹرانے کی گونج اور پہیوں اور پٹیوں کی چیمیں دور تک گئی ہوں گی۔ دھچکے اتنے شدید تھے کہ میں کونے میں دیکنا بیٹھا ہوتا تو فرش پر جا بیٹا، پھر بھی سر کھڑکی سے ٹکرایا اور سارا جسم جھن جھنایا۔ چند لمحوں تو مجھے اپنا ہوش نہیں رہا پھر ٹھٹھل کا خیال آیا۔ میں نے دیکھا کہ سامنے کی تھڑ پر وہ بھی سر پکڑے ہوئے ہے۔ چہرہ بگڑا ہوا، آنکھیں پھٹی ہوئی ہیں۔ میں تیزی سے اس کی طرف جھپٹا۔ اسی اثنا میں وہ کسی قدر سنبھل گیا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میری پیشانی پر دائیں آنکھ سے اوپر خون چھلک آیا ہے۔ آنے سامنے ہم ایک دوسرے کو منظر باند دیکھا کئے اور وہ نور اٹھ کھڑا ہوا تو میری جان میں جان آئی۔ اس نے میری پیشانی چھوئی اور تھپس کا کونا چھٹکتے خون پر رکھ دیا۔ ”کوئی ایسی چوٹ نہیں۔“ میں نے اس کی نشانی کے لیے بظاہر بے پروائی سے کہا۔

اس نے سنا نہیں۔ تھپس ہٹا کے دوبارہ میری پیشانی کا جائزہ لیا۔ پیشانی ادھر ادھر سے دبا کے اسے سکون ہوا۔ میری جیب میں زریں کا دیا ہوا رومال تھا۔ اس وقت یہی ایک چارہ تھا کہ اس سے

کام لیا جائے۔ اس نے پیشانی پر کس کے رومال باندھ دیا۔ ”تمہارے بھی تو چوٹ لگی ہے۔“ میں نے الجھی ہوئی آواز میں کہا۔ ”کچھ نہیں۔“ اس کی بے نیازی بھی مصنوعی تھی۔ ”تھوڑا سردیوار پہنا جا سکتا تھا۔“ ”زور سے لگا ہے؟“ ”تکلیف تو ہوگی؟“ ”ٹھیک ہو جاوے گا لوٹ پیٹ کے۔“

”مجھے بتاؤ، سب ٹھیک تو ہے نا۔“ میں نے اضطرابی انداز میں پوچھا اور اس کا سرد دیکھنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اس نے میرا ہاتھ روک دیا۔ ”پر یہ کیا ہوا ہے؟ میں تو مرا ہوا تھا۔“ اس نے اپنی جانب سے میری توجہ ہٹانے کی کوشش کی۔ ”کچھ معلوم نہیں۔ میں جاگ رہا تھا، گاڑی آہستہ ہوتی ہوئی رکنے والی تھی کہ کیا ہوا، ایک دم جھٹکے لینے لگی۔ پہلا جھکا تو بہت زور کا تھا۔ ذرا تیز ہوتی تو لوٹ جانی۔ اسٹیشن بر آ کے ایسا ہوا ہے۔ گاڑی تو پیٹ فارم میں داخل ہو چکی تھی۔“ اپنی آواز کا بیجان خود مجھے کھٹکے لگے اور میں نے کچھ خمیر کے کہا۔ ”میں باہر جا کے دیکھتا ہوں۔“

ہمیں اپنی بدحواسی میں کچھ احساس ہی نہیں ہوا۔ سچ پکار تو اندر تک آرہی تھی۔ میں نے شیشہ چڑھائے باہر جھانکا۔ پیٹ فارم پر تو قیامت سی چکی ہوئی تھی۔ لوگ دائیں بائیں بھاگ رہے تھے۔ دروازہ کھول کے میں نیچے اتر گیا اور مجھے گاڑی کے پاس ایک جگہ کھڑے رہنا مشکل ہو گیا۔ پاگلوں کی طرح بھاگتے ہوئے کچھ لوگ مجھ سے ٹکرائے اور مجھے گاڑی سے کچھ دور ساٹھان کے کھبے کی طرف ہٹ جانا پڑا۔ یہاں سے وہاں تک لوگ ڈبوں کے دروازوں پر اتر رہے تھے۔ میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ جن ڈبوں میں زیادہ مسافر ہوں گے۔ ان کا ہاں حال ہوا ہوگا۔ وہ تو جیسے ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے ہوں گے۔ سامان لڑھکنے سے چوٹیں لگ

آئی ہوں گی اور کچھ دیر میں یہی دیکھنے میں آیا۔ بہت سے لوگ زخمی ہوئے تھے اور لوگ انہیں جلد سے جلد ڈبو سے نکالنے کے لیے ایک دوسرے کی مدد کر رہے تھے اور ان کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ دیکھتے دیکھتے پیٹ فارم لوگوں سے بھر گیا۔ بہت سے زخمیوں کو کھڑکیوں سے باہر نکالا گیا۔ جو کپڑا ہاتھ میں آیا، جیسے تیسے فرش پہ بچھا کے زخمیوں کو لٹا دیا گیا۔ لوگ گراہ رہے، سسک رہے اور سچ رہے تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں، بچے بھی تھے۔ سارا پیٹ فارم طرح طرح کی آوازوں سے گونج رہا تھا۔

یہ اکبر پور جنکشن تھا۔ فیض آباد سے یہاں تک کا فاصلہ 35 سے 40 میل کے قریب ہوگا اور گاڑی نے پورے دو گھنٹے میں طے کیا تھا۔ سست رفتار کی وجہ انہن کی خرابی ہی ہو سکتی ہے۔ لوگ اس حادثے کی اسے اپنے طور پر تا دہلیس کر رہے تھے۔ ریلوے کے محکمے، حکومت اور انجن ڈرائیور کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔ میں نے انجن تک جانے کا ارادہ کیا تھا اور چند قدم چل کے رہ گیا۔ آگے جانے سے کیا حاصل تھا۔ ہر طرف ایک ہی منظر تھا۔ آگے جانا آسان بھی نہیں تھا۔ جانے کہاں سے لوگ نکل آئے تھے۔ ڈبوں کے قریب تو بڑی بھڑتھی۔ میرے سر میں اب ہلکی ہلکی تھپس آ رہی تھی۔ مجھے پھر ٹھٹھل کا خیال آیا۔ میں اسے اکیلا چھوڑ کے چلا آیا تھا۔ اس نے اپنی چوٹ کی نوعیت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا جس وقت گاڑی نے پہلا جھکا لیا، وہ سو یا ہوا تھا۔ یہی ہو سکتا ہے، سوئے ہوئے آدمی کا صرف وزن ہوتا ہے، اختیار نہیں ہوتا۔ جھٹکے نے جسم پیچھے کی طرف دھکیل دیا اور سر ہانے کی دیوار سے سر جا ٹکرایا، لڑھک کے وہ فرش پر بھی گر سکتا تھا۔ لینے رہنے کی وجہ سے محفوظ رہا۔ جب میری نظر اس پر پڑی، وہ سر پکڑے ہوئے تھا۔ کسی شدید چوٹ میں کوئی اتنے کرب میں ہو سکتا ہے۔ ڈبے سے میں قریب

ہی تھا۔ میں نے دروازہ کھولا تو وہ سر کی ماش کر رہا تھا۔ ”درد ہو رہا ہے کیا؟“ میں نے تشویش سے پوچھا۔ ”ایسا کر کے ٹھیک رہتا ہے۔“ وہ دھیمی آواز میں بولا۔

”میں دبا ہوں۔“ وہ منع کرتا رہا، میں نے اس کے ہاتھ ہٹانے کے لیے اس کا سر دبا کر شروع کیا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ کس جگہ زور سے دبانے پر اس کا کیا تاثر ہوتا ہے اور میں کچھ نہ جان سکا۔ وہ سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا اور کچھ دیر بعد اس نے مجھے روک دیا۔ ”اب بیٹھ جا ادھر۔“ باہر تو بڑا ٹھیل مچا ہے۔“ میں نے مختصر آ سے باہر کا احوال بتایا اور کہا۔ ”گاڑی اب بہت لیٹ ہو سکتی ہے۔“ ”کیا بولیں پھر۔“ وہ اچھتی آواز میں بولا۔ ”تمہارے لیے چائے لادوں؟“ ”اے میں کدھری ملے گی۔“

”دیکھتا ہوں، شاید مل جائے۔“ میں نے کھڑکی سے جھانک کے دیکھا۔ پیٹ فارم پر وہی نفسا نفسی تھی۔ بیوم اور بڑھ گیا تھا۔ اسٹیشن کے آس پاس بسنے والے بھی تماشا دیکھنے آئے ہوں گے۔ پولیس بھی نظر آرہی تھی۔ ڈبے سے اتر کے راستہ بناتے ہوئے میں چائے کا اسٹال ڈھونڈتا رہا۔ اسٹال مل گیا لیکن چائے حاصل کرنا دشوار تھا۔ پہلے سے بہت معظرب اور منظر طلب گار وہاں دھرنا دیے ہوئے تھے۔ چھینتا چھینتی کا سامنا تھا۔ چائے بنانے والے کے اوسان بھی خطا معلوم ہوتے تھے۔ ایک ہی تدبیر ذہن میں آئی۔ میں اسٹیشن سے باہر چلا آیا۔ اسٹیشن کی عمارت سے کچھ فاصلے پر ایک پختہ نا پختہ قسم کا ہوٹل موجود تھا۔ بھیڑ تو وہاں بھی کم نہ تھی مگر چائے ملنے کا آسرا ہو گیا۔ ہوٹل والا گلاس دینے کو تیار نہ تھا۔ میں نے ضمانت کے طور پر پانچ روپے پیش کیے تو وہ تو دوسرا آدمی بن گیا۔ چائے بھی پھر

اس نے توجہ سے بنائی، ملائی بھی ڈالی۔ مجھ سے چوک ہوگی۔ میں دس روپے کا نوٹ بڑھاتا تو وہ ڈبے تک چائے پہنچانے کے لیے بھی آمادہ ہو جاتا۔ اندر پلیٹ فارم پر لوگوں سے بچتے بچاتے اپنے ڈبے تک پہنچنے میں مجھے پھونک پھونک کر قدم بڑھانے پڑے۔ لوگ راستہ ہی نہیں دے رہے تھے۔ خود سے زیادہ مجھے گلاس اسٹینڈ کا خیال تھا۔ کھانے پینے کی کسی چیز کے لیے میں نے ایسی ریاضت کبھی نہیں کی تھی۔ یہ تو ایک آزمائش تھی۔ بہر حال، کسی طور میں ڈبے تک آنے میں کامیاب ہوا۔ ہوا میں خشکی تھی اور ایسی نہیں کہ چائے جلدی ٹھنڈی ہو جائے۔ ٹھنڈی کو واقعی چائے کی طلب تھی۔ چند گھونٹوں میں تمام کر لی۔ ”کچھ دانا دنگا بھی کر لیتا۔“ وہ سمساتے ہوئے بولا۔

”جی نہیں چاہ رہا۔“ میری آواز بھی تھکی ہوئی تھی۔
 ”گھر سے چلے پائیم ہو گیا۔ تھوڑا ہلکا پھلکا کر لے۔“
 ”تمہیں کچھ خواہش ہے؟“

”اپنے کو بھی نہیں ہے پر اس کی رکھی چیزیں ڈبیر نہ ہو جائیں۔“ وہ تردید سے بولا۔ اس کا اشارہ زریں کی طرف تھا۔ زریں نے بیگ میں کھانے پینے کی چیزیں رکھ دی تھیں۔ معلوم نہیں، کیا کیا تھا۔ بھوک ہی نہیں تھی تو کیا کھول کے دیکھتا۔ زریں نے ضرور خیال رکھا ہوگا کہ جلد خراب ہو جانے والی چیزیں ساتھ نہ لے جائیں۔

چائے پی کے اور ٹھنڈی کو پیلا کے میں پھر ڈبے سے باہر آ گیا۔ اتنی دیر میں کسی قدر نظم و ضبط ہو گیا تھا۔ شور کی جگہ بھین بھنائی سوگوار نے لے لی تھی۔ سپاہیوں کی بڑی تعداد نے بھرے اور پھر سے ہوئے لوگوں کو قابو میں کرنا شروع کر دیا تھا۔ دو چار ڈاکٹر بھی آگئے تھے اور زخمیوں کی مرہم پٹی کر رہے تھے۔ اسٹریچروں کی کسی معلوم ہوئی تھی۔ لوگ

چار پائیوں پر شدید زخمیوں کو باہر لے جا رہے تھے۔ میں تماشائی بنا کب تک کھڑا رہتا۔ میں بھی ان میں شامل ہو گیا اور چار پائیاں اٹھانے میں مدد دیتا رہا۔ پھر کئی بچوں کو گود میں بھر کے میں نے پلیٹ فارم سے باہر پہنچایا۔ جہاں ڈاکٹر زخمیوں کی جانچ کر رہے تھے، اس صفحے سے، اس صفحے سے، اس صفحے سے، اس کی طرف ایک بوڑھی عورت پر میری نظر پڑی۔ اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دے رہا تھا۔ وہ بیچ بیکار کر کے لوگوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے کے قابل بھی نہ تھی۔ لگتا تھا، اسے کوئی اندرونی چوٹ لگی ہے۔ اس کا ڈھلکا ہوا سر دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا کہ کہیں..... میں نے جھپٹتے جھپٹتے اس کا کندھا ہلایا تو اس نے چونک کے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھوں میں وحشت بھائی ہوئی تھی۔ میں نے اس کا حال پوچھا۔ اس نے ٹوٹی پھوٹی آواز میں کوٹھے پر ہاتھ رکھ کے کچھ بتانے کی کوشش کی۔ میرے پلے پھٹے نہیں پڑا۔ میں نے پوچھا، اس کے ساتھ کون ہے؟ کیا وہ اکیلی سفر کر رہی تھی؟ وہ کہاں سے آ رہی اور اسے کہاں جانا ہے؟ اس کا سامان کہاں ہے؟ اور ڈبے سے یہاں تک کون اسے لایا ہے؟ وہ اتنے سوالوں کے جواب میں دیدے گھما کے رہ گئی۔ اس کے ساتھ کوئی ہوتا تو اسے یوں اکیلا نہیں چھوڑ دیتا یا پھر معلوم نہیں، اس شخص پر بھی کیا گزری ہو۔

صفحہ پر بیٹھا ڈاکٹر بائیں ہورہا تھا۔ قریب کوئی اسٹریچر یا چار پائی بھی نہیں تھی۔ بوڑھی عورت کی حالت نہایت شکستہ تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں۔ اس سے پہلے میں دیکھ چکا تھا کہ کچھ لوگ زخمیوں کو اپنی پیٹھ پر بٹھا کے باہر لے گئے تھے۔ وہ ان کے عزیز ہی ہوں گے۔ بڑھیا کو بھی ڈبے سے یہاں تک کسی نے پہنچایا ہوگا۔ اپنے پیروں چل کے تو وہ نہ آسکی ہوگی۔ کوئی اور چارہ نہ دیکھ کے میں نے بھی اس کے ہڈیوں بھرے جسم کی ٹھری بازوؤں میں بھری۔ وہ بہت دھان پان تھی۔ باہر جانے کے

لیے گیٹ پلیٹ فارم کے وسط میں تھا اور زیادہ دور نہیں تھا۔ تیز قدموں، رکاوٹوں اور بڑھیا کو احتیاط سے جکڑنے کی وجہ سے میری سانس پھول گئی۔ اسٹیشن کی عمارت کے ساتھ بہت سے تانگے اور دوسری سواریاں زخمیوں کو لے جانے کے لیے منتظر کھڑی تھیں۔ مجھے دیکھ کے کئی آدمی میری طرف لپکے۔ بڑھیا کو تانگے میں بٹھایا گیا اور دو آدمیوں نے اس کے دائیں بائیں بیٹھ کر اسے تھام لیا۔ لوگ غلط نہیں کہتے۔ دنیا میں اچھے لوگوں کی کمی نہیں ہے یا پھر یہ کہ کوئی کتنا ہی برا ظالم، کتنا ہی برا ہو، کسی وقت بھی بہت اچھا اور نرم دل ہو سکتا ہے۔ شہر کے لوگ یہ افتادین کے اتنی رات کو، اپنا آرام چھوڑ کے اسٹیشن پر امد آئے تھے اور ہر کوئی اپنی توہین کے مطابق سرگرم تھا۔ کسی شخص کے بغیر کہ کون کیا ہے۔ تانگا روانہ ہوا جاہتا تھا کہ میں نے بڑھیا کے سامنے جا کے اس کے زانوؤں پر ٹھکی دی۔ وہ بڑبڑانے لگی۔ پوربلی مجھے بھی خوب آتی تھی لیکن اس کی آواز بہت دلچسپی اور منتظر تھی، میں کچھ اخذ نہ کر سکا۔ شاید وہ دعائیں پڑھتا جا رہی تھی۔ جب میں نے اس کے زانوؤں پر ٹھکی دی تھی تو اس کی ویران آنکھوں میں لمبے بھر کے لیے چمک پیدا ہوئی تھی۔ آنکھوں کی زبان سب سے بیخ ہوئی ہے۔ اس زبان کا کوئی نام نہیں اور ہر جگہ بولی اور بھی جاتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں ممنونیت کی ٹھنائی لو دیکھ کے میرا دل بھی ڈلنے لگا اور مجھے ایسا لگا جیسے میرا قد بڑھ گیا ہو اور میں بے وزن ہو گیا ہوں اور جیسے مجھ پر منکشف ہوا کہ میرا وجود صرف میری غرض نہیں، دوسروں کو بھی اس سے کچھ سروکار ہے۔ کوئی اپنے لیے ٹھک سے جی نہیں سکتا تو اصرار بھی کیوں کرے، خود کو دوسروں کی نذر کیوں نہ کر دے۔ آدمی اپنے آپ سے کوئی علاقہ ہی نہ رکھے۔ آدمی کو آدمی کی بڑی ضرورت ہے، اشیاء سے زیادہ۔

اسٹیشن کی عمارت کے باہر کھڑا میں تانگا جاتے

دیکھتا رہا۔ بوڑھی عورت کی نظریں مجھ پر منڈلا رہی تھیں لیکن وہ اپنی بیٹی کی ہوئی تو اتنی تادیر پر قرار نہ رکھ سکی۔ میں نے دیکھا، اس کا جسم دائیں طرف بیٹھے ہوئے شخص پر ڈھلک پڑا۔ تانگا دور ہوتا رہا۔ میرے جی میں آیا کہ تانگہ کا تقاب کروں مگر اور کیا کر سکتا تھا۔ اسے وہ لوگ اسپتال کی طرف ہی لے جا رہے تھے۔

پلیٹ فارم پر واپس آ کے ٹھنڈی کی خبر لینے کے لیے میں نے ڈبے کا رخ کیا۔ وہ برتھ پر دراز تھا۔ میں نے حال پوچھا تو اس نے وہی جواب دیا مجھے معلوم تھا۔ کچھ دیر اس کے پاس رہ کے میں اپنے ڈبے سے نزدیک کی بیچ پر بیٹھے ڈاکٹر کے پاس چلا آیا اور اس کی ہدایت پر میں بھی لوگوں کو پٹیاں باندھنے میں مصروف ہو گیا۔ شروع شروع میں ٹھیک ہو رہی تھی لیکن جلد ہی ہاتھ رواں ہو گیا۔

2 بجے کے قریب اسٹیشن خاصا پرسکون ہو گیا تھا۔ شہر کے بہت سے لوگ گھروں کو واپس جا چکے تھے۔ پلیٹ فارم پر یا تو ریلوے کا عملہ تھا۔ شہر کی افسران تھے، پولیس بھی یا مسافر تھے۔

ڈبوں کے بجائے اب مسافر ٹولیوں کی شکل میں جا بجا پلیٹ فارم کے فرش پر ادھم سیدھے پڑے ہوئے تھے۔ اتنے عرصے میں ڈاکٹر، کمپا، نڈر اور ارد گرد کھڑے سپاہی مجھ سے مانوس ہو چکے تھے۔ زخمیوں سے فارغ ہو کے ڈاکٹر کے اوسان بحال ہوئے تو اس کی نگاہ میری پیشانی پر بندھے رو مال پڑ گئی۔ وہ شرمندہ بھی ہوا، پریشان تھی۔ میں منع کر رہا تھا لیکن اس نے رو مال کی گرہ کھول کے میرے زخم کا توجہ سے معائنہ کیا اور مرہم لگا کے پٹی باندھ دی۔ کئی گولیاں بھی ہر جگہ ٹھنڈے بعد پانی کے ساتھ لگنے کو دیں۔ وہ ایک مہربان آدمی تھا۔ اس نے میرا سینہ دیکھا، نبض دیکھی۔ پٹی سے مجھے سکون ہوا۔ پیشانی کی جگہ میں خاصی کمی ہو گئی تھی۔ پھر ڈاکٹر نے مجھے ساتھ ہی بٹھالیا اور سگار پینے لگا۔

کھپ آرہی ہے۔ اکبر پور سے ادھر مشرق میں 30 میل دور شاہ خج، 45 میل دور جون پور اور مغرب میں 35 میل دور فیض آباد، سو میل کی دوری پر بارہ بجلی ہے۔ کچھ دیر جاتی ہے، ہر طرف سے مدد آجائے گی۔ کئی زخمیوں کی حالت بہت نازک ہے، خصوصاً بچوں اور عورتوں کی۔ شہر والوں نے اسپتال میں جگہ کم پڑنے پر آشرم میں انتظام کر لیا ہے پونیس نے احتیاطاً مسافروں کا سامان ڈبو سے نکلوا کے پلیٹ فارم کے ایک کمرے میں محفوظ کروا دیا ہے۔ کئی شدید زخمی مسافروں نے اپنے سامان کے بغیر اسپتال جانے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ یہیں پلیٹ فارم پر پڑے ہوئے ہیں۔ صرف درمیانہ اور تیسرے درجے کے مسافروں کے ڈبے خالی کرائے گئے ہیں۔ اول اور دوم درجے کے مسافروں کو بھی گہری چوٹیں آئی ہیں لیکن ان میں زیادہ تر اپنے ڈبو میں ہیں۔

ڈاکٹر کا نام مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ اس کا نام آئند کور سکسینہ تھا۔ وہ ایک پسندیدہ شخص تھا۔ شاید میں بھی اسے پسند آ گیا تھا۔ وہ مجھ سے باتیں کرتا رہا، کچھ اپنی سنانا، کچھ مجھ سے پوچھتا رہا۔ میں نے اس سے کہا کہ اتنے زخمیوں کی خبر گیری کے بعد وہ تھک گیا ہوگا، اسے گھر جانا چاہیے، ہائی ڈاکٹر بھی چاہیے ہیں۔ کہنے لگا۔ ”اے کاموں سے کوئی تھکن ہوتی ہے۔“ پھر بولا۔ ”تھکن دوطرح کی ہوتی ہے، ایک پیشگی، دوسری کڑوی۔ یہ بڑی پیشگی تھکن ہے۔“ پلیٹ فارم کی گھڑی ساڑھے تین بج رہی تھی تب وہ اٹھا۔ چلتے وقت مجھ سے بہت زور سے مصافحہ کیا اور اسی جوش سے بولا۔ ”تم سے اب شاید کبھی بھینٹ نہ ہو پر تم مجھ کو یاد ہو گے۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے بھی آپ یاد رہیں گے۔ کبھی اس طرح آنا ہوا تو ایک بار ضرور آؤں گا۔ اتنی دیر میں، میں نے آپ سے بہت جانا ہے۔ آپ جیسے آدمی کم ملتے ہیں۔“ وہ مسکراتا اور سرگار پیتا ہوا گیٹ

اب انہیں حادثے کی نوعیت کے بارے میں غور کرنے کی مہلت ملی تھی۔ بیچ کے عقب میں کھڑا ایک عمر رسیدہ سپاہی کچھ زیادہ ہی واقف احوال تھا۔ اس نے بتایا کہ انجن میں کوئی بڑی خرابی پیدا ہو گئی تھی۔ ڈرائیور پرانا آدمی تھا، کسی طرح گاڑی یہاں تک لے آیا۔ اس نے کمال مہارت اور ہوش مندی سے کام لیا ورنہ گاڑی کسی بڑے حادثے سے دوچار ہو جاتی۔ جوہر نے قیاس کیا تھا، سپاہی کم و بیش اسی ترتیب سے بیان کر رہا تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق، اوپر کی برتھوں پر بیٹھ کر مسافر سوائے ہوائے تھے، نیچے بیٹھے ہوئے بھی نیم خوابیدگی و نیم بیداری کی حالت میں تھے۔ عموماً تیسرے درجے کے ڈبوں میں گنجائش سے زیادہ مسافر ہوتے ہیں۔ اچانک شدید جھٹکے کی وجہ سے اوپر کی برتھوں پر سوائے ہوائے مسافروں کو سنبھلنے کا موقع نہیں ملا۔ پلک جھپکتے میں سب کچھ غٹ رہا ہو گیا۔ رہی اسی گھر دوسرے جھٹکوں نے پوری کر دی۔ اوپر کی برتھوں پر رکھے سامان نے اور زیادہ تباہی مچائی۔ ایسے موقع پر آدمی کو اپنے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ اس کے سامنے شخص وہ ہوتا ہے، اس کی اپنی ذات، اپنا وجود۔ ہر مسافر نے اس ناگہانی سے بچنے کے لیے دروازے اور کھڑکیوں سے کودنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانی چاہی، حالاں کہ گاڑی منٹ دو منٹ کے تلام کے بعد برسکون ہو گئی تھی مگر وقت کی کمیت کیا، وقت تو کیفیت سے عبارت ہے۔ کبھی ایک لمحہ ہی بہت کاری ہوتا ہے۔ ایک لمحے میں منظر بدل جاتا ہے۔

سپاہی نے بتایا کہ قریب قریب کے شہروں سے مدد آرہی ہے۔ لکھنؤ سے نئی گاڑی چل پڑی ہے۔ ریلوے والوں نے فیصلہ کیا ہے موجودہ گاڑی اور انجن کو کل پرزوں کی جانچ پڑتال کے بغیر نہیں چلایا جائے گا۔ فیض آباد اور بارہ بجلی سے ڈاکٹروں، نرسوں اور حادثے کی تفتیش کے لیے بڑے افسران کی ایک

کی طرف جانے لگا تو میں نے چند قدم لپک کے اسے پھر جالیا۔ ”ڈاکٹر صاحب، مجھے دھیان نہیں رہا تھا۔“ میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ”ایک گزارش ہے۔“

”ہاں ہاں بولو!“ وہ پللیں جھپکانے لگا۔ میں نے پچھلیا تے ہوئے کہا کہ اگر زحمت نہ ہو تو وہ میرے ہم سفر کو بھی دیکھ لے۔ گاڑی کے جھکنے سے اس کا سر دیوار سے جا لگا تھا۔

وہ ناراض ہونے لگا کہ میں نے اسے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ پلٹ کے اس نے کہا ڈنڈر کو واپس چلنے کا اشارہ کیا۔ مجھے ہٹھل کو پہلے مطلع کر دینا چاہیے تھا لیکن اس کا وقت نہیں رہا تھا۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ وہ سو نہیں رہا تھا۔ میرے پیچھے دو اجنبیوں کو داخل ہوتا دیکھ کر فوراً اٹھ بیٹھا۔ کپا ڈنڈر کے ہاتھ میں ڈاکٹروں کا مخصوص بیگ تھا۔

”ان کو کیوں کشت دیا ہے۔“ وہ ابھی ہوئی آواز میں بولا۔

”کشت کیسا شرمی مان۔“ ڈاکٹر نے خوش گواری سے کہا اور ہٹھل کو کچھ اور کہنے کا موقع نہیں دیا۔ مختلف جگہوں پر اس کا سر دمایا۔ ہٹھل نے کوئی تاثر ظاہر نہیں کیا تو پوچھنے لگا۔ ”دن ہوتی ہے؟“ ہٹھل نے کچھ توقف کے بعد سندی سے جواب دیا۔ ”تھوڑی بہت تو ہوگی۔“

”تھوڑی بہت یا زیادہ؟“ ڈاکٹر نے پوچھا۔

”اپنے کو چلتی ہے۔“ ہٹھل نے سر جھکا۔

مجھے یہی خدشہ تھا۔ اس کے جواب سے مجھے گھبراہٹ ہونے لگی۔ اسے کچھ زیادہ ہی تکلیف ہوگی جو اس نے ڈاکٹر سے اقرار کر لیا تھا۔ وہ ڈبے سے باہر بھی نہیں نکلا تھا۔ ڈاکٹر نے دوبارہ سر کا معائنہ کیا اور بیگ سے آلٹرنیکل کے سینے کا بھی پھر ما میٹر لگا کے حرارت بھی دیکھی۔ ”کوئی، کوئی ایسی بات تو نہیں۔“ میں نے مضطربانہ پوچھا۔ ”فیض آباد بہت فریب ہے۔ کیا ہم گھر واپس چلے

جائیں؟“

”کیا بولتا ہے رے۔“ ہٹھل تنک کے بولا۔

”تم مت بولو، مجھے ڈاکٹر صاحب سے بات کرنے دو۔“ میں نے سختی سے کہا اور ڈاکٹر سے پوچھا، ہاں ڈاکٹر صاحب! آپ کا کیا مشورہ ہے؟“

”ویسے تو سب ٹھیک لگتا ہے پر تکلیف باقی رہے تو گھر لوٹ جانا چاہیے اور کسی اچھی جگہ دکھانا چاہیے۔“ ڈاکٹر کے لہجے میں، میں نے کوئی فکر اور تشویش کھوجنے کی کوشش کی مگر اس کا لہجہ سرد اور سپاٹ تھا۔ اس نے نسیو دکھا اور تاکید کی کہ بازار سے یہ دوائیں لے کے پابندی سے استعمال کی جائیں۔

اس کی ہدایت پر کپا ڈنڈر نے کئی قسم کی گولیوں کو الگ الگ پڑیاں بنا کے دیں اور ان پر خوراک کی مقدار درج کر دی۔

میں اب ہٹھل کے پاس ہی رہنا چاہتا تھا لیکن ڈاکٹر کو پلیٹ فارم کے باہر تک چھوڑنے کے لیے مجھے جانا چاہیے تھا۔ میں نے راستے میں اس سے کچھ نہیں پوچھا۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ کوئی ایسی دیکھی بات نہ کہہ دے۔ وہ بھی چپ رہا۔ اس کی خاموشی بھی مجھے پریشان کر رہی تھی۔ جیسے تیسے اس کا رسمی شکر یہ ادا کر کے میں نے اسے رخصت کیا اور تقریباً بھاگتا ہوا اپنے ڈبے تک آیا۔ ہٹھل اب دیوار سے ٹیک لگائے تیم دراز تھا۔ پہلے میں نے اپنی سانسیں بحال کیں پھر آواز دہی رکھ کے مفاہمانہ انداز میں اسے سمجھانے کی کوشش کی بہتر یہی ہے ہم فیض آباد لوٹ جائیں، وہاں آرام کا وقت مل جائے گا، وہاں اچھے ڈاکٹر حکیم ہیں، اسپتال بھی بڑا ہے۔ چند دن بعد پھر چل پڑیں گے۔ احتیاط کر لینے میں کوئی ہرج نہیں۔

”جوٹ مجھ کو لگی ہے رے۔“ وہ جھنجا کے بولا۔

”ٹھیک۔“ میں نے عمل سے کہا۔ ”تمہی کو لگی ہے۔ تمہی بہتر جانتے ہو گے لیکن مجھے لگتی تو تم سفر جاری رکھتے؟“

”پہلے تجھ سے پوچھتے۔“

”اور میں تمہاری طرح ہالتا رہتا تو.....“

میں نے اسے قائل کرنے کے بہت جتن کئے، وہ منتار ہا پھر کہنے لگا، آگے جا کے دیکھتے ہیں۔ آگے کچھ اچھا محسوس نہیں کیا تو کسی وقت بھی واپسی کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ فیض آباد سے دور ہوئے تو کھلتے چلے جائیں گے۔ اس کی بات کسی حد تک مقبول تھی لیکن میری تجویز اس سے زیادہ مقبول تھی۔ مجھے معلوم تھا، میری دلپس راہیگاں جائیں گی۔ میں نے پھر کچھ نہیں کہا۔ بیگ سے گلاس نکالا اور پلیٹ فارم کے نکلے سے پانی بھر کے ڈاکٹر سکینہ کی دی ہوئی گولیاں اس کے سامنے بڑھادیں۔ یہی بہت تھا کہ اس نے گولیاں نگھنے میں کوئی پس پیش نہیں کیا۔

صبح چھ بجے لکھنؤ سے خالی گاڑی آگئی۔ صبح کہیں بھی ہو، بہت نرم اور ہلکی ہلکی ہوتی ہے۔ جیسے دنیا کا وزن کم ہو گیا ہے۔ ریلوے لائنوں پر ٹھہرے کوکلوں میں سبزہ پھوٹ رہا تھا۔ صبح کے اپنے رنگ ہوتے ہیں۔ سبزے کا رنگ کچھ اور، پھولوں کے رنگ کچھ اور۔ ریلوے کے عملے کی درخواست پر اول اور دوم درجے کے مسافر اپنے اپنے ڈبوں سے نکل آئے۔ ان میں بھی کئی لوگوں کے بیٹیاں بندھی ہوئی تھیں یا پھائے چپاں تھے۔ بعض لوگوں سے ٹھیک طرح چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ منہ ہاتھ دھو کے ہٹھل بھی تیار ہو گیا۔ قلی نے ہمارا سامان پہلے ہی اٹھا رکھا تھا۔ میں نے بہت غور سے دیکھا۔

تھلنے ہوئے ہٹھل کے بیروں میں کوئی لغزش نہیں تھی۔ البتہ اس کی رفتار سست تھی۔ ہل پار کر کے ہم دونوں پلیٹ فارم پر آگئے تھے کہ میرے قدم اٹکنے لگے۔ کچھ حاصل پر موجود پولیس کے گروہ میں مجھے ایک شناسا افسر نظر آیا۔ اس نے بھی ہمیں دیکھ لیا۔ یہ وہی افسر تھا، دوسری بار کو تو امی میں حاضری کے وقت جس سے ہماری مذہبھڑ ہوئی تھی ”استاد ہٹھل!“ اس نے دور سے پکارا اور تیزی سے بڑھ کے عین

ہمارے مقابل کھڑا ہو گیا۔ اس طرح کہ ہم آگے جانے کے لیے پہلو بدل ہی کے گزر سکتے تھے۔ اس کے ماتحت سیاہی بھی اس کے عقب میں کھڑے ہو گئے تھے۔ ایک کھلے کے لیے میرے دماغ میں کئی طرح کے دوسروں نے یلغار کی۔ میں نے بے چینی سے ہٹھل کی طرف دیکھا۔ ہٹھل نے توجیح کے خلاف اسے سلام کیا نہ کلام کرنے میں پہل کی۔ پولیس افسر کچھ مکدر ہوا اور تہی ہوئی آواز میں بولا۔

”تم بھی اسی گاڑی میں تھے؟“

”دنک دکھا میں مائی باپ!“ ہٹھل کے لہجے کی سختی پر مجھے حیرت ہوئی۔ یہ اتنا مناسب بات تھی۔ پولیس افسر کی پیشانی تنگ ہو گئی، آواز بھی اکڑ گئی۔ ”ہم کو پتا ہے۔ تم چھوٹا کام نہیں کرتے۔“

”بڑا مان بڑھایا تم نے۔“

”کہاں جا رہے ہو؟“

”کیوں پوچھتے ہو صاحب؟“

”نہیں بتانا چاہتے؟“

”ادھر ساروں سے پوچھ رہے ہو؟“

”تم سے پوچھتے ہیں۔“ پولیس افسر نے افسرانہ طور سے پوچھا۔

”اپنے کو یاد نہیں، کوئی ناتے داری لکھتی ہو تم سے۔“

”ناتا جوڑنے میں کیا دیر لگتی ہے۔“

”پہلے تم ہاتھ بڑھاؤ گے یا ہم آگے کریں؟“

”اس کا سے بھی آجائے گا۔“ پولیس افسر کی آواز بل کھائی۔

”کام کی بات کرو مہاراج!“ ہٹھل نے برحسب سے کہا۔

”اپنے لیے کوئی پرچی چالان لائے ہو تو ویسا بولو، نہیں تو اپنا رستہ چھوڑ دو۔“

پولیس افسر سٹہی ہوئی آنکھوں سے اسے گھورتا رہا۔ اس کا چہرہ دکھنے لگا تھا۔ اس کا ارد گرد کھڑے سپاہیوں کے نتھنے پھڑک رہے تھے۔ پولیس افسر

کی تھی۔ اول درجے کے مسافروں کے شایان شان، الگ الگ برتنوں میں۔ منحل نے اسے پاس بیٹھے اور چائے پینے کی پیش کش کی تو وہ بری طرح محکڑ بڑا گیا۔ دو ہی پیالیاں تھیں۔ میں نے اپنے لیے گلاس میں چائے بنائی اور اسے پیالی دینا چاہی۔ اس نے شدت سے انکار کر دیا اور اچک کے میرے سامنے سے گلاس اٹھالیا۔ وہ ہمارے برابر بیٹھنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ ایک مودب اور خدمت گزار آدمی تھا۔ منحل کے اصرار پر یہ بہ مشکل برتھ پر کونے میں سکر کے بیٹھ گیا اور جھپکتے ہوئے اس نے ہماری خیریت پوچھی پھر از خود رات کے واقعات بیان کرنے لگا۔ اس کی اطلاع کے مطابق، ڈاکٹر نے بہت کوشش کی لیکن تین عورتیں، دو بچے اور دو مرد مسافروں کو موت سے نہ بچا سکے۔ کچھ اور زخیوں کی حالت بھی اچھی نہیں ہے۔ بہت سے مسافر احتیاطاً روک لیے گئے ہیں۔ وہ رکنے کو تیار نہیں تھے لیکن افسروں نے انہیں اجازت نہیں دی۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ بعض زخیوں کو کھینچو اور فیض آباد بھیجے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ قلی بھی انجن ڈرائیور کی تعریف کر رہا تھا کہ اس کی مشافی سے گاڑی کسی بڑے حادثے سے بچ گئی۔ کہنے لگا کہ خدا نے خیر کر لی۔ جس کی گھسی تھی، اسے تو جانا ہی تھا۔ موت کے بھی کیسے کیسے بہانے ہوتے ہیں۔ میں نے اس کی اجرت اور اندازا چائے کی قیمت سے زیادہ روپے دیے تو وہ حساب بتانے اور باقی روپے واپس کرنے لگا۔ میں نے واپس ہی نہیں لیے۔ وہ سلام کر کے اور دعا میں دے کے چلا گیا اور جلد ہی لوٹ آیا۔ اس کے ہاتھ میں پانی بھری گوری صراحی تھی۔ پانی کے لیے مجھے بار بار مختلف اسٹیشنوں پر اتارنا پڑتا۔ میں نے اس کا شکر بہ ادا کیا اور شکر بہ رہی نہیں تھا۔ تپشی دیویر گاڑی امبر پورا اسٹیشن پر کھڑی رہی۔ قلی کی موجودگی کے باوجود مجھ پر پنجابی سی کیفیت طاری رہی۔ روشنی اب پختہ ہو گئی تھی۔ صبح کی تاریکی

نے ہمارے سامنے سے بٹنے میں تامل کیا۔ شاید اس کی خواہش تھی کہ منحل ہاتھ بڑھا کے اسے ایک طرف کرنے کی جسارت کرے تو بات آگے بڑھے اور اسے من مانی کرنے کا جواز مل جائے۔ آنے والے لمحے میں کچھ بھی ممکن تھا۔ میرا جسم اٹھنے لگا تھا۔ ہمارے آگے پیچھے گاڑی کی طرف بڑھنے والے مسافر بھی ٹھیر کے ہمیں دیکھنے لگے۔ منحل نے ضبط کیا۔ آخر پولیس افسر خود ہی ایک جانب ہو گیا۔ آگے ریلوے کا ٹکڑا پہلے اور دوسرے درجے کے مسافروں کی معاونت میں مصروف تھا۔ ہمیں پہلے جیسا ہی ڈبلا۔ جب تک میں نے ڈبے میں قدم نہیں رکھا، مجھے یہی محسوس ہوتا رہا کہ کوئی ہمارا تعاقب کر رہا ہے اور کوئی کسی وقت اچانک سامنے آ کے ہمیں روک لے گا۔ رات بھر کی بیداری کے باوجود کسی شخص کا احساس نہیں تھا لیکن اب جانے کیا ہو رہا تھا، کیا ہو گیا تھا، دل ڈوب سا رہا تھا۔ لگتا تھا، بہت دور سے چل کے آ رہا ہوں۔ ڈبے میں آ کے مجھے کچھ خیال نہیں رہا۔ میں نے برتھ کے گدے پر خود کو ڈھیر کر دیا۔ جی چاہتا تھا کہ آنکھیں بند کر لوں اور نہ کچھ دیکھ پاؤں، نہ سن پاؤں لیکن اپنے آپ سے بے گانگی کے چند لمحے بھی مجھے نہ مل سکے۔ قلی کی آواز پر مجھے سنبھلنا پڑا۔ میں بھول گیا، میں نے ابھی کچھ غلطے کیا تھا۔ منحل کی حالت مجھے ٹھیک نہیں لگتی تھی ورنہ پولیس افسر سے یہ تو نکال نہ ہوتی۔ میں نے غلطے کیا تھا کہ اسے بس آرام کرنے دوں گا اور سارے کام خود کروں گا۔ مجھے اپنی دل جمعی اور خوش گواری کا تاثر دیتے رہنا چاہیے۔ سامان رکھنے کے بعد قلی کسی اور خدمت گئے لیے پوچھنے لگا۔ جانے وہ ہمیں کیا سمجھا ہو۔ پولیس افسر سے حجت کے دوران وہ سامان اٹھائے وہیں کھڑا رہا تھا۔ منحل نے اس سے چائے کی فرمائش کی تو اس نے جیسے کوئی اعزاز سمجھا۔ پلک جھپکتے میں باہر چلا گیا اور تھوڑی دیر میں چائے لے آیا۔ چائے بھی خاص قسم

اور معصومیت رخصت ہوگئی تھی۔ ٹھیک آٹھ بجے گاڑی نے حرکت کی۔ اکبر پور تیزی سے دور ہوتا رہا اور گاڑی دونوں طرف پھیلے سبزہ زاروں سے گزرنے لگی تو میں نے بیک کھول کے توشہ دان نکالا۔ چار حصوں پر مشتمل توشہ دان میں مرچ قیصر، میتھی پانگ کی، بھجیا، پوریاں، میٹھی نکلیاں اور سوچی کا حلوہ رکھا ہوا تھا۔ پوریاں اور ٹکیوں کے خانے میں چھوٹی چھوٹی سلور کی کٹوریاں اچاڑا اور چٹنیوں سے بھری ہوئی تھیں۔ میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ زریں نے ایسی چیزیں ہی منتخب کی تھی جو سفر میں جلد متاثر نہ ہو سکیں۔ بیک میں تام چٹنی کی دو پلیٹیں، آسانی رنگ کے ریشمی کپڑے میں لپٹی اور سنہری ڈوری سے بندھے چمچے اور ایک مختصر پھول دار دسترخوان بھی رکھا ہوا تھا۔ یہ سلیقہ دیکھ کے زریں کا سراپا آنکھوں میں اتر آیا۔ کسی نے کہا ہے، سلیقے سے مراد احساس تناسب ہے اور سلیقہ حسن ہے۔ سلیقہ آدمی کے اندر کے سلجھاؤ کی غمازی کرتا ہے اور سلیقہ برداشت ہے۔ چیزوں کی تقدیم و تاخیر درجہ اور سلسلے وار ترتیب میں ایک محل چاہیے۔ زریں میں یہ خوبیاں بدرجہ کمال تھیں۔ کچھ قدرت کا عطیہ، کچھ خود اپنی نیت اور کوشش کا حاصل۔ کوئی بہت حسین ہو بہت بے سلیقہ بھی ہو سکتا ہے۔ زریں کو قدرت نے ہر طرح سے نوازا ہے۔ وہ خود بھی مجسم تناسب، مجسم سلیقہ ہے۔ حسن صرف رنگ روپ نہیں، ایک تناسب بھی ضروری ہے۔ زریں کا وجود تو جیسے تراشا گیا تھا۔ میں نے ہاتھ پر دسترخوان بچھا کے کھانا جن دیا۔ مجھے بالکل بھوک نہیں تھی لیکن کھانے کے رنگ اور خوشبو کا بھی ایک تاثر ہوتا ہے۔ ٹھنڈی کھانے کی برتھ پر چلا آیا۔ ایک تو کھانا لذیذ تھا، کچھ ایک دوسرے کے خیال سے ہم نے سیر ہو کے کھایا۔ کھانے کے بعد میں نے ٹھنڈی کو دوا کی دوسری خوراک دی اور پانوں کی ڈبیا اور بٹوا اس کے پہلو میں رکھ دیا۔ گھوڑی کھا کے اور بیڑی سلگا

کے وہ کھڑکی کے پاس بیٹھا باہر کا نظارہ کرتا رہا، پھر برتھ پر دراز ہو گیا۔
اکبر پور سے مغل سرائے کا فاصلہ 100 میل سے کچھ کم ہے۔ دو پہر دو بجے گاڑی مغل سرائے پہنچ گئی اور اتفاق سے آدھ گھنٹے بعد ہی ہمیں کھلتے کی طرف جانے اور بڑی لائن پر چلنے والی تیز رفتار گاڑی مل گئی۔ میرا خیال تھا، ٹھنڈی پہلے دھن باد جا کے ظفر سے بات کرے گا۔ ظفر کو اب اپنی منگیت فروزاں کے پاس چلے جانا چاہیے۔ گوفروزاں، یاسمن اور ان کے مرئی نصیر بابا نے فیض آباد میں اس کی آمد کے لیے کسی بے کمی کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن اب خاصے دن ہو گئے تھے۔ فروزاں کے والد ایرانی نژاد پروفسر کے انتقال کے بعد ظفر ہی ان کے گھر کا واحد نگران تھا۔ وہ یقیناً کوئی ایسا فرض شناس و جیہد و شلیل، لائق فائق نوجوان ہوگا جو پروفسر جیسے دیدہ و در نے اپنی نازک اندام، حور شامل بینی کے لیے منتخب کیا تھا۔ میں نے ظفر کی شرافت، نجابت اور لیاقت کے متعلق بہت سنا تھا اور مجھے اسے دیکھنے کا اشتیاق تھا۔ دو لاکھوں میں ایک فروزاں جیسی لڑکی کا منگیت تھا۔ علم و فضل کے جو یا اس سادہ شعرا نوجوان پر کینیہت سید محمود علی نے ہر قسم آزمایا تھا۔ اس نے پروفسر کی مرحومہ بیوی اور اس کی بیٹیوں تک ظفر کی رسائی کا ہر راستہ بند کر دیا تھا۔ پروفسر کے بے سہارا خاندان کو ظفر سے بدظن کرنے کے لیے اس نے بڑی شہیدہ بازی کی تھی۔ شہر آسن سول کی زمین اس شاطر نے ظفر کے لیے تنگ کر دی تھی۔ ظفر کو بڑی شہد دھن باد میں پناہ لینی پڑی اور اس کی حالت ہانگوں جیسی ہوئی۔ میرے پوچھنے پر ٹھنڈی نے بردوان شہر کا نام لیا۔ آسن سول سے ہم فیض آباد نہ جاتے تو ہمیں بردوان ہی جانا تھا۔ میں نے تعجب کا اظہار کیا۔ ”ظفر میاں کے پاس نہیں جانا؟“
”نہیں رے۔“ اس نے اکتائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔
”نصیر بابا کہتے تھے، اس کی حالت ٹھیک نہیں

تھی۔ اب دن بھی بہت ہو گئے۔ فیض آباد جا کے وہ سنبھل جائے گا اور ان دونوں، فردواں اور یاسمن کی تسلی بھی ہو جائے گی۔“
”ابھی اس کو ادھری رہنے دے۔“
”کیوں؟ اب نہیں تو پھر کب؟“
”ابھی تا تم نہیں آیا۔“ ٹھنڈی نے آنکھیں میچ کے کہا۔

وقت سے اس کی کیا مراد ہے؟ میں نے وضاحت نہیں چاہی اور خود مجھنے کی کوشش کی۔ ایک ہی وجہ قریب قیاس نظر آتی تھی کہ فیض آباد کے دیگر گوں حالات کے پس منظر میں ظفر کا وہاں جانا مناسب نہیں ہے۔ بانی لوگوں کی بات دوسری ہے۔ زریں کی حوصلی اور فیض آباد، ظفر کے لیے اچھی ہیں۔ میں نے پھر کوئی بحث نہیں کی۔ وقت کم تھا۔ کھلتے کی طرف جانے والی گاڑی تیار کھڑی تھی۔ مجھے ٹکٹ لینے کے لیے اسٹیشن سے باہر جانے میں وقت ضائع کرنا نہیں پڑا۔ میری درخواست پر گاڑی کے ٹی ٹی نے بردوان تک کا کرایہ لے کر پرچی کاٹ دی۔

اول درجے میں کوئی جگہ نہیں تھی، مجبوراً ہمیں دوسرے درجے میں بیٹھنا پڑا۔ ڈبے میں پہلے سے نوجوان مرد و عورت اور شیر خوار بچہ موجود تھے۔ لباس سے آسودہ حال معلوم ہوتے تھے۔

چہروں کی تازگی اور چمک ہی آسودہ حالی کی چغلی کھاتی ہے۔ نوجوان نے ڈبے میں ہمارے داخل ہوتے وقت ہمیں ٹوکا تھا کہ یہ سیکنڈ کلاس کا ڈبہ ہے، یہ سن کے مجھے حرارہ آیا تھا۔ میں نے تڑخ کے کہا۔ ”ہمیں معلوم ہے۔“ وہ کچھ شرمندہ ہوا اور کسمسا کے رہ گیا۔ نظر آ رہا تھا کہ اسے یقین نہیں آیا ہے۔ اس کی خوب صورت بیوی ہمیں دیکھ کے منہ پھیر کے بیٹھ گئی۔ یہ تجربہ ہمیں کئی بار ہو چکا تھا۔ اونچے درجے اور اونچے لوگوں میں بیٹھنے کے لیے

دام دوم ہی کافی نہیں ہوتے، کچھ اور بھی لوازم ہوتے ہیں۔ یوں بھی پہلے سے بیٹھا ہوا ہر مسافر ڈبے کو اپنی جا گیر سمجھتا ہے۔ بہر حال ٹھنڈی کو آرام کے لیے پوری برتھ مل گئی۔ بردوان تک طویل فاصلہ تھا۔ چار سو سو چار سو میل کے قریب۔ کم از کم بارہ گھنٹے کا سفر۔ صبح اکبر پور سے نکلتے ہی ہم نے کھانا کھایا تھا۔ اب دو پہر ہو گئی تھی۔ ٹھنڈی نے جانے کے ساتھ زریں کی دی ہوئی دو میٹھی نکلیاں کھائیں اور مزید کچھ کھانے سے انکار کر دیا۔ میں نے بھی اسی پر اکتفا کیا۔

چھوٹے چھوٹے اسٹیشن درگزر کرتی ہوئی گاڑی تیز رفتاری سے سفر کر رہی تھی۔ مغل سرائے سے گاڑی چلے ہوئے ڈھائی گھنٹے ہوئے ہوں گے کہ ٹھنڈی کا ایک اٹھ بیٹھا۔ میں جاگ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر کرب کے آثار نمایاں ہیں۔ ”کیا بات ہے؟“ میں نے اضطراب سے پوچھا۔
”پٹنا اب کتنی دور ہے؟“ اس کی آواز بھی بدلی ہوئی تھی۔

”قریب ہی ہونا چاہیے۔ مغل سرائے سے سو سو میل کی دوری تو ہے؟“ میں نے تذبذب سے کہا۔

ہمارے ہم سفر نے بھی سن لیا تھا۔ اس نے بھی دخل دیا کہ سات بجے تک گاڑی پٹنا پہنچ جانی چاہیے۔

”بٹھے کو کیوں پوچھ رہے ہو؟ کوئی کام ہے؟“ میں نے مشتعل آواز میں پوچھا۔
”کچھ نہیں۔“ وہ آہستگی سے بولا۔
”آئے تو بول دیتا۔“

”طبیعت تو ٹھیک ہے؟“
”سر میں تھوڑی دھن ہے۔“
”دھن ہے، ہاں!“ میری زبان لڑکھا گئی اور مجھے دھچکا سا لگا۔ اپنی جگہ سے اٹھ کے میں اس کی

برتھ کی طرف چھینا اور اس کے پاس جا کے ٹھک گیا۔ میں نے غیر ارادی طور پر اس کی کلائی پکڑی۔ کلائی گرم تھی۔ اس کی پیشانی چھوئی۔ پیشانی کلائی سے زیادہ گرم تھی۔ ”تمہیں تو بخار؟“ میں نے سٹ پٹاتے ہوئے کہا۔ ”کیا، کیا بہت زیادہ تکلیف ہو رہی ہے؟“

”اتنی نہیں جھننا تو.....“ وہ بیزاری سے بولا۔ ”بولانا تھوڑا دکھتا ہے۔“

”قریب کے کسی اسٹیشن پر اتر جاتے ہیں۔ میں پہلے ہی کہہ رہا تھا، واپس چلو مگر تم.....“ میں نے ہنسی ہوئی آواز میں کہا۔ ”اب آراء شہر آ رہا ہے۔ آتا ہی ہوگا۔ بکسر گزر چکا ہے۔ آراء بھی جنکشن سے ٹھک ہے، وہاں اتر جاتے ہیں۔ وہاں سے ہمیں کوئی تھی گاڑی مل جائے گی۔“

اسے کچھ زیادہ ہی تکلیف ہوگی ورنہ چھوٹی موٹی تکلیفوں کا تو وہ ذکر ہی نہیں کرتا تھا۔ میرا دل بری طرح دھڑکنے لگا تھا۔ چلتی گاڑی میں، میں کبھی کیا سکتا تھا۔ ڈاکٹر نے جو گولیاں دی تھیں، اس کی دو خوراکیں میں دے چکا تھا۔ شاید انہی کا اثر تھا کہ وہ اب تک کسی قدر آرام سے رہا۔ میں نے وہی گولیاں نکال کے اسے دیں۔ اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ آدھے گلاس پانی سے نگل لیں۔ سرد پانی کے لیے ڈاکٹر نے مجھے منع کر دیا تھا۔ گولیاں کھا کے وہ پھر لیٹ گیا۔ میں اپنی نشست پر پہلو بدلتا رہا۔ مجھے تو اپنی فکر ہی رہتی تھی۔ میں نے بھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ بیمار بھی ہو سکتا ہے، اسے بھی چوٹ لگ سکتی ہے۔ اس دوران گاڑی دو ایک اسٹیشنوں پر ٹھہری اور کھنڈے ڈیڑھ گھنٹے میں آراء جنکشن آ گیا۔ میں نے سامان سمیٹ لیا تھا۔ سمیٹا بھی کیا تھا، صرف ایک بیگ ہی کھولا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ میں نے بہت کہا لیکن وہ آراء پر اترنے کو آمادہ نہیں ہوا۔ دوا سے شاید اسے کچھ افاتہ ہوا ہو۔ ”اب کیسا محسوس کر رہے ہو؟ کیا

بات ہے، بتاتے کیوں نہیں؟“ میں نے بہ ظاہر ناراضی سے کہا۔

”ٹھیک ہے رہے۔“ وہ بہت دھیمی آواز میں بولا۔

”میں کہتا ہوں، یہیں اتر جاتے ہیں۔ میری بات مان لو۔“

”پٹنے یہ دیکھیں گے۔“

میری انتہا کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ کوئی تکلیف ہی نہیں تھی کہ ہم اور دور جا کے فیض آباد والی گاڑی پکڑیں۔ میں اس حالت میں اس سے جت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ آراء شہر بھی گزر گیا۔ ہمارے ہمسفر نے پٹنے پہنچنے کا وقت سات بجے بتایا تھا۔ گاڑی آٹھ سے کچھ پہلے پٹنا شہر میں داخل ہوئی۔ ٹھکل کو میں نے پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا۔ وہ تیار تھا۔ میں دروازے پر کھڑا ہو گیا کہ قلی کو فوراً بلا لوں۔ گاڑی رکتے ہی قلی اندر آ گیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ معطل سرائے کے لیے اب گاڑی کس وقت ملے گی تو وہ حیرت زدہ ہوا تاہم اس نے بتایا کہ دو گھنٹے بعد ہاؤس ایکس بریس ادھر سے گزرے گی۔ میں نے اسے ہدایت کی کہ وہ ہمیں فرسٹ کلاس کے ویٹنگ روم میں پہنچا دے۔ ٹھکل منتار ہا تھا۔ جب میں قلی سے بات کر رہا تھا، وہ کچھ نہیں بولا۔ گاڑی سے اتر کے اس نے قلی کو اسٹیشن سے باہر چلنے کا حکم دیا۔ میں اس کی صوت دیکھتا رہ گیا۔

”شہر جانا ہے۔“ میں نے جھلا کر کہا۔ ”شہر کیوں؟ پھر بردوان ہی چلو۔“ کوئی جواب دینے کے بجائے وہ آہستہ آہستہ پلیٹ فارم کے گیٹ کی طرف بڑھتا رہا۔ میری کسی بات کی اس کی نظر میں کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔ مجھے بڑی جھنجھلاہٹ ہو رہی تھی لیکن مجھے اس کے ساتھ ہی چلنے رہنا تھا۔ میں نے چپ سا دھ لیا۔

اسٹیشن کے باہر ایک دوسرے سے پیوست جگیوں اور تانگوں کی ایک بڑی تعداد مسافروں کا

منتظر تھی۔ ٹھکل نے بھی ہوائے اشارہ کیا اور اسے گرائڈ ہوٹل چلنے کو کہا۔ بھیجی میں ہمارے درمیان سکوت رہا۔ اچھی رات کی ابتدا تھی۔ شہر کی سڑکیں صاف ستھری اور روشن تھیں اور خوب چمک چمک تھی۔ اسٹیشن سے ہوٹل کا فاصلہ اتنا زیادہ نہیں تھا۔ بھیجی نے ہمیں ہوٹل کے سامنے اتار دیا۔ کاؤنٹر پر ہوٹل کے رجسٹر میں رہی خانہ پری کے بعد مجھے کمرے کی چابی مل گئی اور مجھے حیرت ہوئی۔ کمرے میں جانے کے بجائے ٹھکل کاؤنٹر کے سامنے صوفے پر بیٹھا رہا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ اب میں اپنی زبان ہی بند رکھوں گا۔ ہوٹل کے خدمت گار نے ایک کشادہ، نہایت آرام دہ کمرے میں ہمارا سامان پہنچایا۔ سامان رکھ کے اور کمرہ منتقل کر کے میں فوراً ٹھکل کے پاس چلا آیا۔ میرے پہنچنے ہی وہ اٹھ گیا۔ میں نے سنا نہیں تھا۔ اس نے کس وقت بھیجی کو ٹھیکرے کرنے کے لیے کہا تھا۔ کوچوان کو جب اس نے پٹنا میڈیکل کالج اسپتال کا نام بتایا تو میرا ماتھا ٹھکا اور میں چپ نہ رہ سکا۔ ”اسپتال چار ہے ہو؟“ میں نے سراستہ کی سے کہا۔

”ہاں رہے، دکھا دیں ادھر ہی۔“

”کیا بات ہے؟ سچ بتاؤ، کیا حال ہے؟“

”دیکھتے ہیں رہے ادھر جا کے۔“

”مجھ سے مت چھپاؤ۔“ میں نے ہڈیانی انداز میں کہا۔

”تیرے ساتھ ہی چلتے ہیں۔“

”کیا، کیا بہت زیادہ.....“ میری آواز پھینے لگی۔

اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے خاموش رہنے کی تلقین کی۔ مجھے احساس ہوا کہ میری پرسش یا دخل اندازی اسے گراں نہ گزر رہی ہو۔ اس موقع پر مجھے سوال جواب نہیں کرنے چاہئیں۔ میرا دل ہول رہا تھا۔ ہوٹل سے اسپتال کا فاصلہ کم نہیں تھا۔ بھیجی کی رفتار سست تھی۔ ہنسی دیر ہو رہی تھی۔ میری وحشت

بڑھتی جاتی تھی۔ آخر بھیجی ایک بڑے اسپتال کے سامنے رک گئی۔ بھیجی سے اتر کے ہم نے خاص عمارت کا رخ کیا۔ جانے ٹھکل کس طرح چل رہا ہوگا۔ کچھ وہی جانتا ہوگا کہ اس پر کیا گزر رہی ہے۔ وہ اسپتال کی عمارت میں اپنے پیروں سے داخل ہوا تھا لیکن ظاہر تھا، کسی بڑی تکلیف ہی میں اس نے سفر ترک کر کے اسپتال کا رخ کیا ہے۔ دواؤں اور علاج معالجے سے اسے ویسے بھی کبھی سروکار نہیں رہا تھا۔ اسپتال کے عملے نے ہمیں پختہ عمر کے ایک جوان شکل ڈاکٹر کے کمرے میں پہنچا دیا۔ کوئی توقف کے بغیر میں نے اسے جلدی جلدی سارا واقعہ بتایا اور گزارش کی کہ وہ ہم پر خصوصی توجہ دے۔ وہ ایک کم گو آدمی تھا۔ عینک لگائے، کچھ ڈھیلا ڈھالا سا، کسی انگریزی کتاب کے مطالعے میں مصروف، بے تاثر سا ایک شخص۔ اس نے کچھ کہے بغیر ٹھکل کو ایک گوشے میں رکھے معائنہ بستر پر لیٹ جانے کا اشارہ کیا اور سر کے مختلف حصے دبا کے دیکھے اور کچھ وہی سوال کرنے لگا جو گزشتہ رات ریل کے ڈبے میں اکبر پور کے ڈاکٹر سکینڈ نے کیے تھے۔ وہ مجھے نو آموز ڈاکٹر لگتا تھا۔ میں نہیں کہنا چاہتا تھا لیکن میرے بس میں نہیں تھا۔ میں نے صاف کہہ دیا کہ بہتر ہے، وہ اسپتال کے کسی اور ڈاکٹر کو بلا کے اس سے مشورہ کرے۔ میری تجویز پر وہ برا فرد خستہ نہیں ہوا، سر ہلانے لگا۔ تھننی بجا کے اس نے چراسی کو طلب کیا اور کسی ڈاکٹر سہری ناتھ کو بلانے کے لیے کہا۔

کچھ دیر میں کسی ڈاکٹر کمرے میں جمع ہو چکے تھے۔ ان میں ایک زیادہ عمر کا تھا۔ ان سب نے ٹھکل اور مجھ سے سوالوں کی ٹھکرار کی اور ٹھکل کے پاس سے ہٹ کے مشورے کرنے لگے۔ وہ پیش تر انگریزی میں بات کر رہے تھے۔ بہت کچھ مجھے بھی سنائی دے رہا تھا۔ پہلے تو وہ آپس میں الجھتے رہے۔ ان کی رائے تھی کہ بہ ظاہر کسی بڑی چوٹ کے آثار نظر

نہیں آتے۔ پھر انہوں نے طے کیا کہ صبح تک ٹھہل کو اسپتال میں روک لیا جائے۔ اسپتال کا بڑا ڈاکٹر، ڈاکٹر رائے صبح سویرے اسپتال آجاتا ہے۔ اس کے آنے تک ٹھہل کو سکون کی دوا میں دی جانی رہیں اور رات کسی طور گزار دی جائے۔ ممکن ہے، ایسے رے کی ضرورت پڑے۔ یہ فیصلہ بھی ڈاکٹر رائے ہی کر سکتا ہے۔ ان کا انداز بے حد سرد مہری کا تھا۔ آپس میں صلاح مشورے کے بعد بڑی عمر کا ڈاکٹر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”ہم مریض کو رات بھر کے لیے.....“

مجھے معلوم تھا، وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ میں نے اسے روک دیا اور انگریزی میں پوچھا۔ ”ڈاکٹر رائے اس وقت کیوں نہیں آتے؟“
مجھے انگریزی میں بولتا دیکھ کے ان کے جسم لہرا گئے، آنکھیں پھیل گئیں۔ عمر رسیدہ ڈاکٹر نے چند ثانیوں کے سکوت کے بعد نرمی سے کہا۔ ”وہ اس وقت گھر پر رہتے ہیں اور مریض دیکھنا پسند نہیں کرتے۔“

”یہ کون سا ڈاکٹر ہے؟“ میں نے برہمی سے کہا۔ ”مرض گھڑی دیکھتا ہے جو ڈاکٹر گھڑی کا پابند ہے۔ یہ اسپتال بھی رات کو بند کر دیا کریں۔ رات آرام کے لیے ہوتی ہے۔ آپ سارے بھی یہاں کیوں ہیں۔ گھر جا کے آرام کریں۔“
”آپ اطمینان رکھیے۔ ہم رات بھر ان کی خبر گیری کریں گے۔ کوئی ایسی گھبرانے والی بات نہیں معلوم ہوئی۔“ ڈاکٹر نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

”ہم بردوان جا رہے تھے۔ بننے کے اس اسپتال میں دکھانے کے لیے ہم نے آگے کا سفر ختم کیا۔ ہم کسی امید سے آپ کے پاس آئے ہیں۔ ازراہ کرم آپ ڈاکٹر رائے سے رابطہ کیجیے یا مجھے ان کا پتا بتائیے۔ میں ان کے پاس جا کے منت کرتا ہوں۔ ہم ان کی، جتنی بھی تمہیں ہو، ادا کر دیں

گے۔“

”ڈاکٹر رائے کے کچھ اصول ہیں جناب۔“ ڈاکٹر نے متانت سے کہا۔

”پھر کسی اور ڈاکٹر کو بلائے کا بندوبست کیجیے۔ کیا اس بڑے شہر میں ڈاکٹر رائے کے سوا کوئی اور ڈاکٹر نہیں ہے۔ میں نے آپ سے کہا، روپے پیسے کی فکر مت کیجیے۔ کوئی بھی نہیں اور کتنا بھی خرچ ہو۔“ میری درخواست میں درشتی شامل تھی۔

عمر رسیدہ ڈاکٹر کسی قدر بے چارگی کی ہی کیفیت میں اپنے ساتھیوں کے چہرے دیکھنے لگا۔

”دیکھیے نا!“ میں نے اس سے کہا۔ ”اسپتال میں کوئی بھی مریض کسی وقت، کسی حالت میں آسکتا ہے، کیا بس یہاں ڈاکٹر رائے پر انحصار کیا جاتا ہے۔ آپ، آپ لوگ یہاں پھر کس لیے ہیں؟“
”یہ ہمیں پیچیدہ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ دماغ کا معاملہ ہے۔ ہمیں احتیاط کرنا ہے۔“ ڈاکٹر کی آواز الجھ رہی تھی۔

”پھر تو اور ضروری ہے۔ آپ یہ کیس صبح پر کیوں نال رہے۔ پھر ایک مہربانی کیجیے اس شہر میں، میں انجمنی ہوں، کوئی سواری مجھے فراہم کر دیجیے۔ میں خود ڈاکٹر رائے کے گھر جا کے دہائی دیتا ہوں یا جس ڈاکٹر کو آپ بتائیں جس کے اصول اتنے سخت نہ ہوں۔ جو اپنے پیسے سے انصاف کرتا ہو، جو واقعی ڈاکٹر ہو یا کوئی ایسا ڈاکٹر جو روپے پیسے کو بہت عزیز سمجھتا ہو۔“ میری مدد کیجیے۔ یوں کھڑے کھڑے آپ وقت کیوں ضائع کر رہے ہیں۔“

میرے منہ میں جو آیا، میں کہنا گیا۔ جی میں تو یہ آتا تھا کہ جیب سے چاقو نکال لوں۔ یہ زبان ان کی سمجھ میں نہیں آتی تو دوسری ضرور آئے گی۔

جواب میں عمر رسیدہ ڈاکٹر دیر تک جپ رہا پھر اس نے ایک نوجوان ڈاکٹر سے کہا۔ ”ڈاکٹر رائے کے پاس جا کے ساری صورت حال بتا دو ورنہ پھر انہیں ڈاکٹر سمیت کے پاس بھیجئے کا انتظام کرو۔“

ڈاکٹر سمیت اس اسپتال میں نہیں آئیں گے۔ ان کے گھر ہی جانا ہوگا۔ وہ ایک مہربان آدمی ہے لیکن پہلے ڈاکٹر رائے کو دیکھو، شاید وہ..... وہ..... وہ شائے اچکا کے بولا۔

”وہ نہیں آئیں گے جناب! آپ کو معلوم ہے، انہوں نے سختی سے تاکید کی ہے۔ پہلے بھی.....“ نوجوان ڈاکٹر کی آواز بھی ہوئی تھی۔

”اچھا ہے، ایک بار انہیں دیکھ لو۔“ عمر رسیدہ ڈاکٹر کا لہجہ نیم حکمیہ تھا۔ ”بعد کو کوئی شکایت بھی ہو سکتی ہے۔“

”آپ کہیں تو میں ساتھ چلتا ہوں۔“ میں کہنا چاہتا تھا، شاید میری التجا سے ڈاکٹر رائے متاثر ہو جائے۔

”نہیں۔“ عمر رسیدہ ڈاکٹر نے صاف انکار کر دیا۔ ”آپ یہی ٹھہریں اور انتظار کریں۔ سردست ہم مریض کو کچھ دوا میں دیتے ہیں۔“

اس سے اب کوئی اور بات کرنی مناسب نہیں تھی۔ اس کی ہدایت پر کمرے میں پہلے سے تعینات ڈاکٹر نے ٹھہل کے بازو میں سونی ٹھونپ دی اور چند گولیاں بھی کھلائیں۔ اس کے اور عمر رسیدہ ڈاکٹر کے سوا باقی ڈاکٹر چلے گئے۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی، ہیبت ناک سی خاموشی۔ پھر عمر رسیدہ ڈاکٹر..... نے کرسی پر بیٹھ کے پاپ سلگایا اور مجھ سے پوچھنے لگا۔ ”یہ آپ کے کون ہیں؟“

”کیا بتاؤں۔“ میں نے لچکاتے ہوئے کہا۔ ”یہ میرے سب کچھ ہیں، میرے بھائی، دوست میرے بزرگ، میرے حسن.....“

”آپ کا ان سے کوئی خونی رشتہ نہیں ہے؟“ ”تمام انسانوں کا ایک دوسرے سے خونی رشتہ ہوتا ہے۔“

”ہاں۔“ وہ کچھ بے قرار ہوا اور ٹھنڈی سانس بھر کے بولا۔

”آپ ٹھیک کہتے ہیں بلکہ آپ نے بڑی جچی

بات کہی ہے۔“ پھر پوچھنے لگا۔ ”آپ لوگوں کا کیا مشغلہ ہے؟“
مجھے جواب دینے میں تامل ہوا۔ وہ چمکتی آنکھوں سے منتظر تھا۔ میں نے کہا۔ ”ہماری زمینیں ہیں۔“ زمینوں کا سن کے عموماً دوسرے سوالات نہیں کیے جاتے۔

”آپ زمین دار ہیں؟“
”جی ہاں۔“ میں نے مختصر جواب دیا۔
”فیض آباد میں آپ کی زمینیں ہیں؟“
”اور کبھی کبھی جگہ.....“ میں نے یوں ہی کہہ دیا۔

اس نے توصیفی انداز میں آنکھیں پھیلائیں۔ ”آپ تو خوب تعلیم یافتہ معلوم ہوتے ہیں۔“

”انگریزی گولی سے مراد علم یا حکمت نہیں ہے۔“ ”ہاں ہاں۔“ اس کے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔ ”لیکن سمجھا کچھ ایسا ہی جاتا ہے۔“

”حکمرانوں کے لالچ و لٹکر میں ان کی تہذیب بھی ہوتی ہے۔ گوروں کو تو یہاں حکم رانی کرتے ہوئے زمانہ گزار گیا۔“

”بے شک، بے شک، اور یہ بھی توجیح ہے کہ اب وہ ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔ ان کا وقت ہے، کیوں کہ ان کے پاس علم ہے۔“ اس وقت ان باتوں کا کوئی عمل نہیں تھا۔ حکیم ڈاکٹر کو علاج معالجے کے علاوہ کچھ اور بھی جانا چاہیے۔ اس کی مزید سوالوں سے بچنے کے لیے میں کرسی سے اٹھ گیا اور میں نے ٹھہل کے بستر پہ جا کے اسے دیکھا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ میں نے پوچھا۔ ”ٹھیک ہے کچھ؟“ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ بکھر گئی اور اس نے لمبے بھر کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ ”بس اب ڈاکٹر صاحب آتے ہی ہوں گے۔“ میں نے اس کا شانہ چھب تھاتے ہوئے کہا۔ اس نے جیسے سنا ہی نہیں۔ میں نے ٹھکے ہاتھ سے اس کے بھرے بال درست کیے اور ڈاکٹر کے پاس

آکے بیٹھ گیا۔
ابھریں۔ نوجوان ڈاکٹر نے بھی کرسی چھوڑ دی۔

میں بھی کھڑا ہو گیا۔ عمر رسیدہ ڈاکٹر نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ”اگر واقعی وہی ہیں تو حیرت ہے؟“ یہ کہتا ہوا وہ ایک کے دروازے کی طرف بڑھ گیا مگر اس کے باہر نکلنے سے پہلے ستر سال کے لگ بھگ عمر، اوسط قد کا، بھورے رنگ کی پتلون پر آدمی آستینوں کی پھول دار قمیض پہنے، حلقی ہوئی سرمئی رنگت کا ایک صحت مند شخص کمرے میں داخل ہوا۔ وہ ڈاکٹر رائے ہی ہو سکتا تھا۔ اس کے عقب میں نوجوان ڈاکٹر ہریش کے علاوہ ایک اور شخص بھی تھا۔ ”کیا ہوا؟“ ڈاکٹر رائے نے کھردری آواز میں پوچھا۔

عمر رسیدہ ڈاکٹر نے انگریزی میں مختصر مضمحل کے مرض کی نوعیت سے آگاہ کیا اور مضمحل کے بستری طرف انگلی اٹھائی۔ ڈاکٹر رائے نے خود بھی مڑ کے دیکھ لیا تھا۔ ناگواری اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ اپنے سر ہانے سرسرائی آہٹوں پر مضمحل نے آنکھیں حول دیں۔

”ڈاکٹر گوکھلے! تم کہہ رہے تھے، تم نے اسے... دی ہے۔“ ڈاکٹر رائے نے کسی دوا کا نام لیا تھا۔ میں پوری طرح نہ سن سکا۔ ”کننی دیر ہوئی؟“

پہلی بار مجھے علم ہوا کہ عمر رسیدہ ڈاکٹر کا نام گوکھلے ہے۔ اس نے تنہی سے جواب دیا۔ ”دیر ہوئی جناب! شاید گھنٹا بھر پہلے۔“
”ایک گھنٹا!“ ڈاکٹر رائے کی تیوری تڑپ گئی۔
”مگر یہ تو جاگ رہا ہے۔“

”جی، میں بھی دیکھ رہا ہوں مگر ہم نے اسے پوری خوراک دی تھی۔ یا تو درد شدید ہے یا یہ آدمی اعصاب کا مضبوط ہے۔ یہ اپنے پیروں سے چل کے یہاں آیا تھا جناب!“ ڈاکٹر گوکھلے کی عمر ڈاکٹر رائے کے برابر ہوگی، ممکن ہے، کچھ زیادہ ہی۔ وہ ڈاکٹر رائے کی جناب میں نہایت مودب تھا اور یہی

”میں آپ کی بے چینی سمجھ رہا ہوں۔ کبھی مریضوں سے زیادہ ہمیں تیار داروں کو سنبھالنا پڑتا ہے۔ مشکل یہ ہے، انہیں پرسکون رہنے کی دوا نہیں دے سکتے۔“ عمر رسیدہ ڈاکٹر مجھے تسلی دینے لگا۔ ”اطمینان رکھیے، آپ صبح جلد آگئے ہیں۔“
میں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ ڈاکٹر بھی چپ ہو گیا۔ اسے کیا اندازہ ہو سکتا تھا، مجھ پر یہ وقت کسے گزر رہا ہے۔ میں تو لمحے گن رہا ہوں۔ کمرے کی دیواری کھڑی نے ساڑھے گیارہ کا گھنٹا بنایا تو ڈاکٹر نے اپنے بند گلے کے کوٹ سے جیبی کھڑی نکال کے وقت کی تصدیق کی اور نوجوان ڈاکٹر سے بولا۔ ”ہریش کو گئے دیر ہوئی۔ اسے اب تک واپس آ جانا چاہیے۔“

”ڈاکٹر رائے کا گھر سستی دور ہے؟“ میں نے تنہی سے پوچھا۔
”ایسا دور نہیں، قریب ہی ہے۔“ ڈاکٹر کے لہجے میں بے چینی بھی تھی، پشیمانی بھی۔ ”کچھ دیر اور دیکھتے ہیں۔“

کچھ دیر اور گزر گئی۔ میری نگاہیں کبھی دروازے کی طرف اٹھتی تھیں کبھی مضمحل کی طرف۔ اگر ڈاکٹر رائے آمادہ نہ ہوا؟ مضمحل کی حالت مجھے بالکل ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ اس وقت اس اجنبی شہر میں، میں کہاں کہاں، کس کس دروازے پر دستک دوں گا۔ یہ سوچ سوچ کے میرا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ عمر رسیدہ ڈاکٹر کا حال یقیناً مجھ جیسا نہیں ہوگا لیکن وہ بھی اب خاصا منتظر معلوم ہوتا تھا۔ کرسی سے اٹھ کر وہ کمرے میں ٹھلنے لگا، مضمحل کے پاس بھی گیا اور اسے ایک نظر دیکھ کے پلٹ آیا۔ میں اس سے منت کرنا چاہتا تھا کہ ڈاکٹر رائے کا مزید انتظار کرنے کے بجائے وہ کوئی اور تدبیر کرے۔ میں نے کچھ کہنے کے لیے ہمت استوار کی تھی کہ اسی دم کمرے کے باہر سے تیز قدموں کی چاچیں

حال دوسرے ڈاکٹروں کا تھا۔ وہ تقریباً ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ ان سب کی نظروں میں ڈاکٹر رائے کی اس قدر منزلت سے مجھے کچھ سکون ہوا۔ وہ کوئی بڑا ہی ڈاکٹر ہوگا۔ ہر صاحب کمال کے اپنے تیور ہوتے ہیں۔ وہ بھی کچھ الگ قسم کا آدمی معلوم ہوتا تھا۔

ڈاکٹر رائے، ہنسل کے جسم پر جھک گیا اور مختلف زاویوں سے تادیر اس کا سر دبا تاربا۔ ہنسل کا چہرہ کھینچا اور کھتا رہا۔ اس کی کوئی آہ یا کراہ بلند نہیں ہوئی۔ ”کتنا درد ہے؟“ ڈاکٹر نے ہندوستانی میں پوچھا۔

”اچھی تھوڑا کمی ہے۔“ ہنسل نے مدہم آواز میں رک رک کے کہا۔ ڈاکٹر اس کے سر پر ٹھونکیں مارنے لگا اور اس نے اپنا کان سر کے قریب کر لیا۔ ”جدھر جاتی ہوتا ہے، مجھ کو بولو۔“ ڈاکٹر رائے ہر لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا اور پوچھنے لگا۔ ”ابھی پورا سننے میں آتا ہے، میں کیا بولتا ہوں؟“

ہنسل نے آہستہ سے سر ہلایا۔ ڈاکٹر نے پورے سر پر ٹھونکیں مارنے کا عمل دہرایا۔ پہلے ہلکے ہلکے پھر رفتہ رفتہ زور زور سے۔ ہنسل کے چہرے پر نشینیں گہری ہونی لگیں۔

”بولو، کس جگہ یہ زیادہ دکھتا ہے؟“ ہنسل نے آنکھیں پھینچ لیں اور یہ مشکل جواب دیا۔ ”سارا پھلتا ہے۔“ ڈاکٹر رائے نے اس کے سر سے ہاتھ ہٹالیا اور آلہ لگا کے جسم کے مختلف حصوں کا جائزہ لیا، نبض دیکھی، پونے اٹھا کے دیکھے اور بازو پر پٹی باندھ کے خون کے دوران کا معائنہ کرتا رہا۔ ”اس کے ساتھ کون ہے؟“ اس نے ادھر ادھر نظر میں دوڑاتے ہوئے پوچھا۔

میں ڈاکٹر گوگلے کی آڑ میں کھڑا تھا۔ اس نے ایک طرف ہٹ کے مجھے سامنے کیا اور مود بانہ کہا۔ ”یہ تو جوان اس کے ساتھ ہے۔“

ڈاکٹر رائے نے سر تاپا مجھے گھور کے دیکھا۔ ”اوہ..... تم! تم مریض کا کیا لگتا ہے؟“ وہی سوال اس کے جواب سے مجھے خفقان سا ہونے لگتا تھا۔ میں کسی کو کیا جواب دوں۔ جو رشتے ناموں اور درجوں سے سوا ہوتے ہیں، کوئی ان کی تشریح کیا کرے۔ مجھے متذبذب دیکھ کے ڈاکٹر گوگلے نے میری مشکل آسان کی۔ ”یہ دونوں بھائی ہیں جناب!“

ڈاکٹر رائے کے ہونٹ پھیل گئے۔ ہنسل کے سر پر ٹھکی دینا ہوا وہ کمرے کے وسط میں رکھی میز کی طرف آ گیا۔ میری نظریں اس پر مرکوز تھیں۔ اس کے چہرے پر فکر مندی کے آثار تھے یا یہ میرا وہم تھا۔ میں کچھ اندازہ نہیں لگا سکا۔ مجھے تو بہت گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ ”ہم اس کو ابھی ادھر روکنا ہے۔ کبھے! ایک رات یہ آیزرویشن میں رہیگا۔ سویرے اس کو پھر دیکھے گا۔ مجھ کو ابھی سارا بات بولو۔“ ڈاکٹر رائے نے دونوں انداز میں مجھے مخاطب کیا۔

میں نے اپنا حلق تر کیا اور شکستہ آواز میں گزشتہ رات کی روداد سنائی شروع کی تو ڈاکٹر گوگلے نے دخل دیا کہ بہتر ہے، میں ڈاکٹر رائے کو انکر بڑی میں تفصیل بتاؤں۔ ڈاکٹر رائے بھی میری انگریزی دانی پر متعجب ہوا تھا مگر اس نے گوگلے کی طرح مجھ سے سوال جواب نہیں کیے۔ میں نے اسے ڈبے میں ڈاکٹر سکسینٹ کی آمد، اس کے معائنے، اس کے لکھے ہوئے نسخے اور دوا کے بارے میں بتایا میں نے کہا کہ نسخے کی دوا میں خریدنے کا وقت ہی نہیں مل سکا۔ گولیوں کی تین خوراکیں دے چکا ہوں اور کوئی افادہ نہیں ہوا ہے۔ جیب سے گولیوں کی پڑیا اور نسخہ نکال کے میں نے اسے پیش کر دیا۔ اس نے غور سے نسخہ پڑھا، گولیاں دیکھیں اور دونوں چیزیں مجھے لوٹا دیں۔

”دیکھو، نوجوان!“ اس نے میرے کندھے پر

ہاتھ رکھ کے کہا۔ اس کا لہجہ خاصا نرم تھا۔ کہنے لگا۔ ”ہم ابھی کچھ کہہ نہیں سکتے۔ یہ اندرونی چوٹ ہے۔ ہمیں بہتری کی امید کرنی چاہیے۔ رات کے لیے ہم ایسی دوا میں دے رہے ہیں جو درد بھی کم رکھیں گی اور مریض کو نیند بھی آجائے گی۔ صبح تک انتظار کرو۔ ہو سکتا ہے، کچھ دن تمہیں یہاں ٹھہرنا پڑ جائے۔ کیا تمہارے لیے یہ ممکن ہے؟“

”میری سب سے بڑی ترجیح ان کا علاج ہے۔“ میری آواز بھرا گئی۔ ”ٹھیک ہے۔ یہ لوگ مریض کو ایک آرام دہ کمرے میں منتقل کر دیں گے۔ تم بھی وہیں رہ سکتے ہو۔ رات بھر وقفے وقفے سے ڈاکٹر آتا رہے گا اور مریض پر نگہ رکھے گا۔ کوئی ایسی ویسی بات ہو، درد زیادہ اٹھنے لگے تو تم ڈاکٹر طلب کر سکتے ہو۔ زس بھی دیکھ بھال کرتی رہے گی۔“

”مناسب ہے جناب!“ میری آواز دھڑک رہی تھی۔ ”ڈاکٹر صاحب!“ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا ”کوئی ایسی بات تو نہیں۔ آپ کیا سمجھتے ہیں؟“

”ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“ وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ ”صبح ہم اور معائنہ کریں گے۔ خون کے علاوہ اور کئی ٹیسٹ، ایکس رے بھی لیں گے۔ ضرورت پڑی تو دوسرے ڈاکٹروں کو بھی مشورے کے لیے بلا یا جاسکتا ہے۔“

”خدا کے لیے کچھ سچیے ڈاکٹر صاحب!“ میں نے عاجزی کی۔ ”جو بھی، جس طرح کا علاج ہو، بالکل فکر مت کیجیے۔“

”مجھے بتا دیا گیا ہے کہ تمہارے پاس بہت سونا چاندی ہے۔“ ”یہ میں نے روپے پیسے کا ذکر اس لیے کیا تھا کہ علاج میں کوئی کسر نہ رہ جائے۔“ میں نے معذرت کی۔ ”اس کا مطلب کچھ اور نہیں تھا، اور پیسا پھر کس لیے ہوتا ہے۔“

”میں سمجھتا ہوں۔“ وہ مسکرانے لگا۔ ”پیسا بھی کام آتا ہے مگر ہر موقع پر نہیں۔“

”بس آپ مہربانی کیجیے جناب!“

”ہم اپنی کوشش کریں گے، ہم یہاں اسی لیے ہیں۔“

”مجھے احساس ہے، میں نے آپ کو ناوقت زحمت دی پھر وہی پیسے کا ذکر آجائے گا لیکن ذقت کا کوئی تو مول ہوتا ہے۔ آپ کچھ خیال مت کیجیے۔“

”بعد کو دیکھیں گے۔“ ڈاکٹر رائے آنکھیں چڑھا کے بولا۔ ”تم بھی کمرے میں جا کے آرام کرو، ادھر دوسرا بستر بھی ہے اور حوصلہ رکھو۔ تم سے اب صبح بات ہوگی۔ شب بخیر۔“ اس نے میری طرف سے مڑ کے ڈاکٹر گوگلے کو سرگوشیاں لہجے میں کچھ ہدایات دیں اور سیدھا دروازے کی جانب چل پڑا۔

آدھ گھنٹے کے اندر ایک کھلے ہوئے، صاف ستھرے، ہوادار اور آراستہ و پیراستہ کمرے میں وہ ہمیں لے آئے۔ ڈاکٹر گوگلے کے ساتھ دو نوجوان ڈاکٹر بھی آئے تھے۔ انہوں نے ہنسل کو ایک اور سوئی لگائی اور مختلف قسم کی دوا میں دیں۔ بڑی عمر کی ایک فریب اندام، چاق و چوبند زس ان کی مدد کرتی رہی۔ کمرے میں کھڑکی کے پاس صوفہ لگا ہوا تھا، کرسیاں بھی تھیں اور مریض سے متعلق ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔

”قریب ہی ادھر دریا ہے۔“ اپنے کام سے نمٹ کے ڈاکٹر گوگلے میرے شانے پر ہاتھ رکھے مجھے صوفے پر لے آیا اور پوچھنے لگا۔ ”کیسے، کیسا ہے یہ کمرہ؟“

میں نے لجاجت سے کہا۔ ”آپ کی بڑی مہربانی۔“

”مہربانی میری نہیں، ڈاکٹر رائے کی ہے۔“ وہ مجھے کمرے کے اوصاف تفصیل سے گنوانے لگا کہ ارد گرد کے خاص الخاص لوگوں کے لیے یہ کمرے

خصوص ہیں۔ گورے مریضوں کو بھی یہیں ٹھہرایا جاتا ہے۔ یہ خالی رہتے ہیں تو بھی ان کی صفائی ستھرائی کا خیال رکھا جاتا ہے۔ ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹروں کے لیے لازم ہے کہ ان کمروں میں زیر علاج مریضوں پر خصوصی توجہ دیں۔ یہاں ماہر نرسوں کا تقرر کیا جاتا ہے۔ دریا رخ ہونے کی وجہ سے یہاں بڑی نرم و لطیف ہوا آتی ہے وغیرہ۔ اسے عجیب تھا کہ ڈاکٹر رائے سے تو میری پہلی ملاقات تھی۔ میں نے کیا جادو کر دیا کہ اس نے از خود اس کمرے میں ہمیں قیام کی اجازت دے دی ورنہ وہ تو بہت محتاط ہے۔ ڈاکٹر گوٹھلے کو لفظ تلاش کرنے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ غالباً وہ یہ کہنا اور جتنا چاہتا تھا کہ مریضوں کا حسب نسب، ان کے زور و اثر سے مطمئن ہونے کے بعد ہی انہیں یہاں علاج کے اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔

میں چپ چاپ سنتا رہا۔ کہنے والے کو کچھ تو احساس ہونا چاہیے کہ سننے والا کتنا سن رہا ہے یا کتنا متوجہ ہے۔ بے موقع کلام بھی یادہ گوئی ہے اور یادہ گوئی ایک عارضہ ہے اور یہ عارضہ بہت عام ہے۔ لوگ ہر جہر کا حساب رکھتے ہیں۔ یہ حساب کوئی نہیں لگاتا کہ زندگی کا کتنا وقت بے موقع اور غیر ضروری باتوں میں گزر جاتا ہے۔ مجھے ڈاکٹر گوٹھلے کی باتوں سے چڑھ رہی تھی۔ میں ٹھٹھل کے پاس بیٹھنا چاہتا تھا۔ اسے بستر پہ بے سدھ بڑا دکھ کے میرا دل ڈوبا جا رہا تھا، جسم کی جان جیسے پھٹی جالی ہو۔ مجھے تو کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ میں ڈاکٹر گوٹھلے کا منہ کس طرح بند کر سکتا تھا۔ میری بے توجہی سے وہ ناراض بھی ہو سکتا تھا۔ مجھے اس کی ضرورت تھی۔ وہ اگر ساتھ نہ دیتا تو اس وقت ڈاکٹر رائے کی آمد قطعی ناممکن تھی۔ شاید وہ میری توجہ بنانے کے لیے ادھر ادھر کی باتیں کر رہا تھا مگر اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ سننے والے کی آمادگی کے بغیر شریں سخی بھی فضول گوئی ہے۔ اس نے پھر پائپ سلگا لیا۔ لگتا تھا، اسے

کوئی کام نہیں ہے۔ میں ہوں ہاں کرتا رہا۔ میری آنکھیں تو ٹھٹھل کے بستر پر تکی ہوئی تھیں۔ جانے کتنی دیر گزر گئی۔ اس نے بار بار پائپ سلگا یا اور جب پائپ کا تمباکو رکھ ہو گیا تو اسے کچھ بے چینی ہوئی۔ مزید تمباکو نوشی کے لیے وہ جیبوں میں پاؤنج ٹول رہا تھا اسے خیال آیا کہ وہ تو پچھلے کمرے میں چھوڑ آیا ہے مجھے بہت کھلی دلا سے دے کے کہیں وہ رخصت ہوا اور میں نے دانستہ ٹھٹھل کے بارے میں اس کا قیاس جاننے سے اجتناب کیا کہ اس کے منہ سے بے سوچے کچھ بھی نکل سکتا ہے۔ میں نے اسے کمرے کے باہر تک رخصت کیا۔

اس وقت ایک بیچ رہا تھا۔ اس کے جاتے ہی نرس نے آکے کمرے کی روشنی دہی کر دی۔ ٹھٹھل بالکل غافل تھا۔ اس کی سانسوں کا توازن معمول کے مطابق تھا۔ باقی رات میں تین بار نرس آئی اور دو مرتبہ ڈاکٹر نے چکر لگایا۔ انہیں میرے جاگتے رہنے سے کیا پریشانی تھی جو ہر بار آکے وہ مجھے اس طرح سمجھاتے تھے جیسے میں کوئی باگن ہوں یا بچہ ہوں۔ صبح ہونے سے کچھ پہلے نرس گنتا نرس نے ٹھٹھل کا معائنہ کر کے مجھ سے مشقانہ لہجے میں کچھ دیر کر نکالنے کو کہا اور میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے کرسی سے اٹھا دیا۔ پھر مجھ سے منع نہ کیا جاسکا۔

میں بستر پہ آکے لیٹ گیا اور اس وقت مجھے محسوس ہوا، میرا سارا جسم ٹوٹ رہا ہے۔ اپنا آپا ہی مجھ سے نہیں سمجھ رہا۔ میں نے جان کے آنکھیں بند نہیں کیں کہ کہیں کسی لمحے ٹھٹھل کو میری ضرورت نہ پڑ جائے۔

صبح اٹھ بجے سے منہ ہاتھ دھو کے اور کپڑوں کی ٹٹلیں درست کر کے میں تیار بیٹھا تھا۔ نرس نے مجھے بتایا تھا کہ ڈاکٹر رائے وقت کا بڑا پابند ہے۔ ٹھٹھل آٹھ بجے اسپتال آ جاتا ہے۔ میرے کپڑے خاصے میلے ہو گئے تھے لیکن سامان ہوٹل میں رکھا ہوا تھا اور وہاں جانے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔

قریب اندام نرس رات کی ڈیوٹی سے فارغ ہونے سے پہلے میرے لیے ہلکا ناشتا خود لائی تھی اور سامنے بیٹھی رہی۔ اس نے اپنے ہاتھ سے توس پر مکھن لگا کے مجھے پیش کیا تو مجھے زہر مار کرنا پڑا۔ وہ کم بولتی تھی اور اس کے انداز میں ایسا شفقت آمیز حکم تھا کہ انکار آسان نہیں تھا۔ میں نے چند گھنٹوں میں جائے بھی ختم کر لی۔ نرس کا نام۔۔۔ ایک ٹٹھل تھا۔ یہ نام اس نے خود بتایا اور مجھے شرم سار کیا۔ رات سے وہ متعدد بار کمرے میں آچکی تھی اور میں نے نہ اپنا تعارف کرایا نہ اس کا نام پوچھا تھا۔ اس نے ٹھٹھل کی دیکھ بھال میں مستعد رہنے کے لیے مجھے اپنی حالت درست کرنے کی نصیحت کی۔ وہ ٹھٹھل ہی کہہ رہی تھی، اپنے آپ کو باندھے رکھے بغیر میں مریض، (ٹھٹھل) کے کس کام آسکتا ہوں۔ وہ مجھ سے اس طرح پیش آرہی تھی جیسے ایک زمانے سے واقف ہو یا جیسے ٹھٹھل کے بجائے میں بیمار ہوں۔ گھر کے کپڑے پہن کے وہ مجھے دعائی سلام کرنے آئی اور ٹھٹھل اور میرے لیے چند رکری دعا یہ جملے کہہ کر رخصت ہو گئی۔ پھر دروازے سے وہ پلٹی اور کہنے لگی کہ اس کی جگہ دن بھر کے لیے اب نرس سیورین کی ڈیوٹی ہے۔ اس نے سیورین کو تاکید کر دی ہے کہ وہ اس کمرے کا خاص خیال رکھے۔ کوئی بھی کام ہو، بے جھجک اس سے کہا جاسکتا ہے۔ وہ ایک معاون لڑکی ہے۔

نرس ایکی کو گئے ابھی چند منٹ ہوئے ہوں گے کہ گندمی رنگت، شکھے نقش و نگار، متناسب قد کی دہلی تپتی ایک نو عمر نرس لپکتی چھپتی کمرے میں آئی اس کے چہرے پر سب سے نمایاں اس کی بڑی آنکھیں تھیں۔ اس نے سنجیدہ لہجے میں 'صبح بخیر' کہا اور مشاقی سے ٹھٹھل کے بستر کی ٹٹلیں درست کرنے اور چیزیں ترتیب سے رکھنے لگی۔ صوفے کے ساتھ والی کھڑکی کا پردہ بھی اس نے کھول دیا۔ کمر روشن ہو گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ ڈاکٹر رائے اب آ رہی ہیں۔

چاہتے ہیں۔ میں ہڑبڑا کے کرسی سے اٹھ گیا۔ سیورین نے وہ کرسی بھی دیوار کے ساتھ لگا دی اور جس تیزی سے آئی تھی، اسی تیزی سے واپس چلی گئی۔

میں کمرے میں دے قدموں ٹھٹھل رہا۔ ٹھٹھل نو بجے ڈاکٹر رائے دو اور ڈاکٹروں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ ان کے پیچھے نرس سیورین بھی تھی اور اسپتال کے مخصوص لباس میں ایک اور شخص تھی۔ ڈاکٹر رائے نے مجھے سرسری دیکھا، سر کی جنبش سے سلام کا جواب دیتا ہوا وہ ٹھٹھل کے پاس جا کے ٹھہر گیا اور ان سب نے ٹھٹھل کا بستر گھیر لیا۔ بائیں پر لگی ہوئی رپورٹ دیکھ کے ڈاکٹر رائے نے ٹھٹھل کا شانہ ہلایا۔ اس نے یہ مشکل آنکھیں کھولیں۔ ڈاکٹر نے حال پوچھنا چاہا۔ ٹھٹھل دیدے گھما کے رہ گیا۔ اس پر غوندگی کا شدید غلبہ تھا۔ ڈاکٹر رائے کے اشارے پر ایک ڈاکٹر نے ٹھٹھل کی کلائی سے خون کھینچنے کے لیے سوئی پیوست کر دی اور حاصل کیا ہوا خون تیشی میں ٹھٹھل کر دیا۔ اس نے خون کی پھر ایک اور تیشی بھری۔ میں ان کے ساتھ ہی کھڑا تھا۔ ڈاکٹر رائے کو اپنے درمیان میری موجودی سے جانے کیا خلل پڑ رہا تھا کہ اس نے مجھے دور صوفے پر بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ میں نے مجبوراً ٹھٹھل کی۔ وہ سارے ٹھٹھل کے گرد جمع رہے۔ میں اپنے آپ کو جگڑے ہوئے دور بیٹھا انہیں دیکھتا رہا۔ میں نے ان کی سرگوشیاں سننے کی کوشش کی لیکن کچھ پلے نہیں پڑا۔ مجھے تو چکر آ رہے تھے۔

کچھ دیر میں ڈاکٹر رائے میری طرف آ گیا اور مجھ سے گزشتہ رات ٹھٹھل کی کیفیت کے متعلق پوچھنے لگا۔ میری آواز ڈول رہی تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ ساری رات وہ بے خبر رہا ہے۔ دو ایک بار مجھے اس کی گراہ کا گمان ہوا اور میں نے اٹھ کے اس سے پوچھا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور ادھر ادھر دیکھا کیا۔ اس کی آنکھیں سکڑی اور چمکتی رہیں اور

وہ کچھ کے بغیر نیند میں ڈوب گیا۔

ڈاکٹر رائے سوچنا رہا، پھر اکڑی ہوئی آواز میں بولا۔ "ہم اسے ایسے رے کے لیے لے جائیں گے۔ وہاں کچھ اور ٹیسٹ بھی لیں گے۔"

"آپ کیا سمجھتے ہیں ڈاکٹر صاحب؟" میں نے ناتوازی سے پوچھا۔

"ٹیسٹ کے نتائج کے بعد ہی یقین سے کچھ کہا جاسکتا ہے اور ان کی رپورٹ آنے میں دو دن لگ سکتے ہیں۔"

"ان رپورٹوں میں جلدی نہیں ہو سکتی؟" "بعض کے نتائج فوراً سامنے آجائیں گے لیکن تمام میں دیر ہو سکتی ہے۔" اس کے لہجے میں ذرا سی پگ نہیں تھی۔

"میں اس سے کچھ اور پوچھنا چاہتا تھا لیکن میں نے خود پر جبر کیا۔"

"دو دن میں صورتحال واضح ہو جائے گی۔" مجھے گرم سم دیکھ کے وہ کہنے لگا۔ "تمہیں بہتری کی امید رکھنی چاہیے اور یہ یقین بھی کہ تم ایک بہتر جگہ پر ہو۔"

"ڈاکٹر صاحب!" میں نے ہمت جمع کر کے کہا۔ "یہ مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہیں۔ باقی چیزیں تو ثانوی ہیں، جان سے زیادہ....."

ڈاکٹر نے میری بات قطع کر دی۔ "ہم اپنی کوشش کر رہے ہیں، اپنے امکان بھر۔"

"لیکن میں اپنے امکان سے سوا جاسکتا ہوں اور میرے امکانات محدود ہیں۔"

"لیکن مرٹے اپنی جگہ ہیں اور ان کے لیے برداشت چاہیے، کسی اور چیز سے زیادہ....." ڈاکٹر رائے کے لہجے کی صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔

"ڈاکٹر صاحب! مجھے معلوم نہیں، آپ سے یہ کہنا مناسب ہے یا نہیں مگر ازراہ کرم، اس سے بہتر کوئی صورت، کوئی اور جگہ ہو تو مجھے بتائیے۔ اس شہر میں یا کہیں اور کلکتہ، بمبئی، دہلی..... میں کہیں بھی

جاسکتا ہوں، ہندوستان سے باہر بھی۔"

"اب اس کا وقت نہیں ہے۔ اس سے بہتر جگہیں بنیاداً بے شمار ہیں لیکن مریض کی حالت فی الحال ادھر سے ادھر منتقل کرنے کی نہیں۔" وہ کسی قدر بے اشتنائی سے بولا۔ "بہر حال، تم جو چاہو، فیصلہ کر سکتے ہو۔ ذمے داری، ظاہر ہے، تمہاری ہوگی۔"

"میرا مطلب غلط نہ سمجھئے۔ میرا مقصد مریض سے اپنے تعلق کا اظہار ہے۔ میری جان، میں جانتا ہوں، کسی کام کی نہیں لیکن ثانوی چیزیں اہمیت رکھتی ہیں اور بہت سے لوگ تو انہیں جان سے زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔ میرے لیے میرا مریض ہر چیز سے زیادہ اہم ہے۔ آپ بڑے ڈاکٹر ہیں۔ آپ کے مشوروں کے بغیر میں کوئی فیصلہ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا بلکہ اس وقت تو مجھ میں کسی نتیجے تک پہنچنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ میرا حال سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ میں ہاتھ جوڑتا ہوں آپ کے آگے....."

"دیکھو نوجوان! اب ہم پر چھوڑ دو، جہاں جاؤ گے، یہی کچھ ہوگا۔ انہی مرحلوں سے گزر کے کوئی رائے قائم کی جائے گی۔ ایلو پیتھی طب کا اپنا ایک منظم طریق کار ہے۔"

میں چپ ہو گیا۔ اتنی دیر میں ہٹھکل کا بستہ گھیرے ہوئے ڈاکٹر رائے کے ماتحت اس کے پاس سے ہٹ چکے تھے۔ ڈاکٹر رائے نے میرا بازو چڑکے مجھے حوصلے اور اعتماد کی لقیں کی اور کمرے سے چلا گیا۔

باہر اسے رخصت کر کے نرس سیورین کمرے میں واپس آگئی اور اس نے مجھے ہٹھکل کی جیبوں میں رکھی ہوئی چیزیں تھول میں لینے کی تاکید کی۔ ہٹھکل کو ایسے رے کے لیے لے جانے سے قبل انہیں اسے اسپتال کا رومی لباس پہنانا تھا۔ میرے تو ہاتھ پاؤں ویسے ہی پھول رہے تھے۔ میں یہ کہنے والا تھا کہ نرس یہ کام خود کرے لیکن مجھے

خیال آیا کہ ہٹھکل کی جیب میں جا تو بھی ہوگا۔ اسے کرتے کے نیچے بنیان کی جگہ ہلکی بندھی سینے کی عادت ہے۔ ہوسکتا ہے، کوئی اور ہتھیار بھی اس کے پاس ہو۔ سیورین کو جلدی تھی مگر وہ سامنے کھڑی تھی۔ جیبوں سے برآمد ہونے والی ہر چیز اس کی نظر میں آسکتی تھی۔ اس کی عدم موجودگی ہی میں مجھے

جامد تلاش کا یہ اذیت ناک ٹریڈ انجم دینا چاہیے تھا۔ میں نے ناوقت سہی مگر چائے کی خواہش ظاہر کی تو وہ فوراً کمرے سے چلی گئی۔ ہٹھکل کے بستے پہنچنے کے اس کی جیبوں میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے میں نے اسے آہستہ سے پکارا۔ اس کے پونوں میں کلبلا ہٹ ہوئی اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔

میں نے بے ربطی سے اسے بتایا کہ مجھے اس کی جیبیں خالی کرنی ہیں۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار ہو رہے تھے۔ معلوم نہیں، اس نے کچھ سمجھا کہ نہیں۔ سیورین کسی لمحے واپس آسکتی ہے۔ میں نے جلدی جلدی باہر سے کپڑے نٹول کے پہلے جا تو نکالنا چاہا۔

جاؤ گے، یہی کچھ ہوگا۔ انہی مرحلوں سے گزر کے کوئی رائے قائم کی جائے گی۔ ایلو پیتھی طب کا اپنا ایک منظم طریق کار ہے۔

میں چپ ہو گیا۔ اتنی دیر میں ہٹھکل کا بستہ گھیرے ہوئے ڈاکٹر رائے کے ماتحت اس کے پاس سے ہٹ چکے تھے۔ ڈاکٹر رائے نے میرا بازو چڑکے مجھے حوصلے اور اعتماد کی لقیں کی اور کمرے سے چلا گیا۔

باہر اسے رخصت کر کے نرس سیورین کمرے میں واپس آگئی اور اس نے مجھے ہٹھکل کی جیبوں میں رکھی ہوئی چیزیں تھول میں لینے کی تاکید کی۔ ہٹھکل کو ایسے رے کے لیے لے جانے سے قبل انہیں اسے اسپتال کا رومی لباس پہنانا تھا۔ میرے تو ہاتھ پاؤں ویسے ہی پھول رہے تھے۔ میں یہ کہنے والا تھا کہ نرس یہ کام خود کرے لیکن مجھے

خیال آیا کہ ہٹھکل کی جیب میں جا تو بھی ہوگا۔ اسے کرتے کے نیچے بنیان کی جگہ ہلکی بندھی سینے کی عادت ہے۔ ہوسکتا ہے، کوئی اور ہتھیار بھی اس کے پاس ہو۔ سیورین کو جلدی تھی مگر وہ سامنے کھڑی تھی۔ جیبوں سے برآمد ہونے والی ہر چیز اس کی نظر میں آسکتی تھی۔ اس کی عدم موجودگی ہی میں مجھے جامد تلاش کا یہ اذیت ناک ٹریڈ انجم دینا چاہیے تھا۔ میں نے ناوقت سہی مگر چائے کی خواہش ظاہر کی تو وہ فوراً کمرے سے چلی گئی۔ ہٹھکل کے بستے پہنچنے کے اس کی جیبوں میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے میں نے اسے آہستہ سے پکارا۔ اس کے پونوں میں کلبلا ہٹ ہوئی اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔

میں نے بے ربطی سے اسے بتایا کہ مجھے اس کی جیبیں خالی کرنی ہیں۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار ہو رہے تھے۔ معلوم نہیں، اس نے کچھ سمجھا کہ نہیں۔ سیورین کسی لمحے واپس آسکتی ہے۔ میں نے جلدی جلدی باہر سے کپڑے نٹول کے پہلے جا تو نکالنا چاہا۔

واسکٹ کے دونوں پہن کھول دے تھے۔ اسپتال سے رخصت ہوتے ہوئے شاید، ایچی مجھے واسکٹ کے بارے میں بتانا بھول گئی۔

سیورین سے واسکٹ لے کے میں صومنے پر آ گیا۔ اس کی مختلف جیبوں میں بھی سوٹ کیس کی چابیوں کے علاوہ خاصے میسے تھے۔ سینے کے حصے کی اندرونی جیبیں اندرونی پن سے بند تھیں۔ دائیں طرف کی جیب کا بٹن کھولنے پر میری انگلی میں ریشمی ڈوری آگئی۔ ڈوری کا ایک حصہ پن سے لپٹا ہوا تھا،

اسے کھینچنے پر دوسرے حصے سے نٹول پان کے بٹوں کی شکل کی مختصر سی عتلا بی گلی تھیلیا برآمد ہوئی۔ تھیلیا کے سکرے ہوئے مشہرہ رڈوری سے گرہ لگی ہوئی تھی اور آسانی سے نہیں کھل سکتی تھی۔ اس احتیاط سے ظاہر تھا کہ اندر کوئی قیمتی چیز موجود ہے۔ وہ بہرے ہی ہو سکتے تھے۔ نٹولے سے کچھ یہی اندازہ ہوتا تھا۔ تھیلیا میں روٹی بھری تھی۔ روٹی کی تہوں میں بہرے پیسے ہوں گے جو گاہکوں پر ان کی سطح کی سخت محسوس نہیں ہوتی تھی اور تھیلیا گر جانے پر بہروں کے نونے کا امکان رہا تھا۔ پن سے لپٹی ڈوری گھمانے پر تھیلیا آزاد ہوئی۔ میں نے اسے اپنی

واسکٹ کی جیب میں ڈال لیا۔

نرس سیورین کے پیچھے پیچھے اسپتال کے دو کارکن بھی کمرے میں آگئے تھے۔ سیورین نے مجھ سے پوچھا کہ آیا میں نے جیبوں کی اچھی طرح تلاش لی ہے۔ نسبتاً بلند آواز کی وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ میرے اقرار کے رد آدی گواہ رہیں۔ دونوں کارکنوں نے اسپتال کا لباس پہنانے کے لیے ہٹھکل کے جسم پر لمبی پادرو ڈال دی۔ نرس سیورین باہر چلی گئی۔ مجھ سے یہ سب کچھ دیکھا نہیں جاتا تھا۔

سیورین کے پیچھے میں بھی باہر نکل آیا۔ کارکن، ہٹھکل کا پہیوں والا پلنگ باہر لے آئے تو میں نے بھی ان کی بیری دی کی..... ان کی رفتار معتدل تھی لیکن میری ٹائٹیں ان کا ساتھ نہیں دے پا رہی تھیں۔ وہ زیادہ

سیورین کے پیچھے میں بھی باہر نکل آیا۔ کارکن، ہٹھکل کا پہیوں والا پلنگ باہر لے آئے تو میں نے بھی ان کی بیری دی کی..... ان کی رفتار معتدل تھی لیکن میری ٹائٹیں ان کا ساتھ نہیں دے پا رہی تھیں۔ وہ زیادہ

سیورین کے پیچھے میں بھی باہر نکل آیا۔ کارکن، ہٹھکل کا پہیوں والا پلنگ باہر لے آئے تو میں نے بھی ان کی بیری دی کی..... ان کی رفتار معتدل تھی لیکن میری ٹائٹیں ان کا ساتھ نہیں دے پا رہی تھیں۔ وہ زیادہ

دور نہیں گئے اسپتال کی خاص عمارت میں داخلے کے دروازے کے قریب ہی ان کی منزل تھی۔ انہوں نے مجھے دروازے پر روک دیا۔ میں نے ان سے جبت کی کہ یہ آپریشن کا کمرہ تو نہیں ہے۔ وہ کہنے لگے کہ ایک روم کے کمرے میں بھی مریض کے لیے حاضر باش شخص کا داخلہ ممنوع ہے۔ ناچار مجھے باہر ہی رہنا پڑا۔ نھل کو اندر لے جا کے انہوں نے دروازہ بھی بند کر لیا۔

اسپتال میں مریضوں اور ان کے متعلقین کی تعداد اس وقت اچھی خاصی تھی۔ مجھ سے ٹھیک طرح اپنے بیروں پر کھڑا بھی نہیں ہوا جا رہا تھا۔ وہیں دیوار کے پاس تھی ہوئی کرسیوں میں ایک کرسی خالی ہوئی تو میں نے جلدی سے اس پر قبضہ کر لیا۔ کچھ دیر کے لیے میں آنکھیں بند کر لینا چاہتا تھا لیکن مجھے اپنے آپ پر یقین نہیں تھا۔ دماغ میں جالے پڑے ہوئے تھے مجھے اب کیا کرنا چاہیے؟ میں اور کیا کر سکتا ہوں؟ میری استطلاعات میں اور کیا ہے؟ مجھ سے کوئی کوتاہی تو نہیں ہو رہی؟ جانے ڈاکٹر کیا فیصلہ صادر کرے۔ اب سب کچھ اسی پر ہے۔ ہم دونوں اسی کے ہتھکنے میں ہیں۔ اگر اس نے زیادہ دن رکنے کو کہا تو میں اکیلا تو پاگل ہو جاؤں گا۔ یہی بہتر ہے کہ مجھے کسی کو بلا لینا چاہیے۔ ابا جان کو تاروں یا جامو کو مطلع کروں یا زریں کو بلا لوں۔ جیسے ہی تار ملے گا، وہ پہلی گاڑی سے آ جائے گی۔ نھل کی صبح نگہداشت وہی کر سکتی ہے۔ اس کے آنے سے مجھے بھی آسرا ہو جائے گا۔ اس میں وہ برداشت اور حوصلہ ہے، ڈاکٹر رائے جس کی تعلیم مجھے دے رہا تھا۔ نھل بھی زریں کو پاس دیکھ کے بہت مطمئن ہوگا۔ اچھے بیمار دار بھی علاج میں کارگر ہوتے ہیں۔ میرا تو کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ میں یوں بھی ایک ناکارہ آدمی ہوں۔ ایسے وقت میرے نواسے کو منتشر ہو جاتے ہیں۔ مجھے کچھ دکھائی سمجھائی نہیں دیتا۔ میں اکیلا کوئی بھی غلط قدم اٹھا سکتا

ہوں۔ آدھ گھنٹا گزرایا اس سے زیادہ۔ ایکس رے کے کمرے کا دروازہ کھلنے کے انتظار میں میری آنکھیں پتھرانے لگی تھیں، دروازہ کھلا تو چند قدموں کا فاصلہ میں نے بھاگ کے طے کیا۔ ابھی وہ باہر نہیں نکلے تھے کہ میں نے اکھڑی ہوئی سانسوں سے پوچھا۔ ”کیا ہے، سب ٹھیک تو ہے؟“

اسپتال کا کارندہ منسکرانے لگا اور ہم دروازہ کے پاس بولا۔ ”ابھی کیا بولیں بھیا صاحب! دیر رکو۔ پہلے رپورٹ سنے گا پھر ڈاکٹر دیکھے گا۔ وہی ٹھیک سے بتائے گا۔“ اس نے مجھے سامنے سے ہٹ جانے کو کہا۔

وہ نھل کو واپس کمرے میں لے گئے اور پہلی والی جگہ پر لوہے کا پلنگ ٹھہرا کے وہ جانے لگے تو میں نے جب سے چند نوٹ نکال کے ان کی نذر کرنا چاہیے۔ وہ تو ایسے گھبرائے جیسے میرے ہاتھ میں نوٹ نہ ہوں، پچھو ہوں۔ دونوں نے انکار کر دیا۔ میرے اصرار پر کہنے لگے، ہاں جب مریض صحت مند ہو کے یہاں سے رخصت ہو تو مضمائل کھانا نامت بھولیے گا۔

نھل کے جسم پر چادر ڈھکی ہوئی تھی اور چہرہ کھلا ہوا تھا۔ جانے انہوں نے کون سی دوا لی تھی کہ وہ اب تک بے خود بڑا ہوا تھا۔ میں کرسی صبح کے اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ اتنے میں سیورین آگئی۔ وہ کچھ فراغت میں نظر آتی تھی۔ میرے قریب نیا بیٹھ گئی اور شگلی سے بولی۔ ”سسر ایکی بتا رہی تھی۔ آپ رات بھر ایک پل کے لیے نہیں سو پائے ہیں۔ بہتر ہوگا، اب آپ آرام کر لیں۔ میں یہاں موجود ہوں۔ ڈاکٹر رائے نے میری ڈیوٹی صرف اسی کمرے تک محدود کر دی ہے۔“

”آپ کی کچھ بات ہوئی ڈاکٹر صاحب سے؟“ میں نے اضطرابی آواز میں پوچھا۔ ”کہا کرتے تھے؟“

”انہوں نے مسلسل مریض پر نگاہ رکھنے کی ہدایت کی ہے۔“ ”آپ، آپ کیا سمجھتی ہیں؟“ ”میں صرف ایک نرس ہوں۔“ وہ انکسار سے بولی۔

”ہاں۔“ میں نے مایوسی سے کہا۔ ”مگر آپ کا تجربہ بھی ہوگا۔“ ”میرا کیا تجربہ۔“ وہ شرماسی گئی اور کہنے لگی۔ ”ڈاکٹر رائے مریض کے معالج ہیں۔ وہ ایک تجربہ کار اور پاکمال ڈاکٹر ہیں۔ دور دور سے بیمار آئیں دکھانے آتے ہیں۔“

”مگر انہوں نے.....“ میں نے ابکتی زبان سے کہا۔ ”آپ کو انہوں نے مستظلاً یہاں معین کیا ہے تو کوئی، کوئی بات تو ضرور.....“ میری آواز گھٹے میں رنڈھ گئی۔

”نہیں نہیں، ایسا مت سوچئے۔“ اس نے یہ شدت تردید کی۔ ”ان کمروں میں مستقل طور پر نرسیں مقرر کر دی جاتی ہیں اگر مریض اور اس کے پرسان حال درخواست کریں۔ کیا آپ نے ڈاکٹر رائے سے خصوصی نگہداری کی درخواست کی تھی؟“ ”جی، جی ہاں۔“ مجھے اس کی صراحت سے طمانیت ہوئی۔ ”میں نے کئی بار ان سے یہ التجا کی ہے۔“

سیورین کے چہرے سے بھی بھکدور ہوا۔ ”آپ کہاں سے آئے ہیں۔“ اس نے سادگی سے پوچھا۔

”قیض آباد سے۔“ میں نے مختصر اسے اکبر پور کے اسٹیشن کے حادثے کے بارے میں بتایا۔ ”یہ آپ کے کون ہیں؟“

مجھے اس سوال کی توقع تھی۔ میں نے کسی توقف کے بغیر کہا۔ ”یہ میرے بھائی ہیں۔“ اس کے ہاتھ پر چمک سی پیدا ہوئی۔ ”اور، اور آپ ان سے بہت قریب ہیں۔“ وہ پتلیں جھپکا کے بولی۔

میری آنکھیں جلتے لگیں اور میں نے یہ مشکل اپنے آنسو ضبط کیے۔ ”بھائیوں میں ایسی بیگانگی دیکھ کے خوشی ہوتی ہے۔ میری دعا ہے، خدا آپ کے بھائی کو جلد صحت یاب کرے۔“ اس کے لہجے میں کوئی بناوٹ نہیں تھی۔

نرس ایسی صحیح کہہ رہی تھی۔ سیورین ایک شاہد، حقیقت اور عم گسار لڑکی تھی۔ وہ نرس تو معلوم ہی نہیں ہوتی تھی۔ خوش صورتی یہ خوش سیرنی متراد خوبی ہے۔ اس کی انگریزی گوئی میں نفاست، سلاست اور روانی تھی۔ دیکھی آواز میں کام کرنے کے باوجود آواز ہلکتی تھی، کہنے لگی۔ ”آپ کو تنہائی کی ضرورت ہے تو میں کمرے کے باہر سائبان میں بیٹھ جاتی ہوں۔ آپ یہاں آرام کیجئے۔“

جاسوسی ڈائجسٹ کا مقبول سلسلہ

صدیوں کا ایٹما

مصنف: ایم۔ اے۔ راحت

57 سیریل

اس انسان کی کہانی جو صدیوں سے ہے اور شاید آج بھی کہیں موجود ہے

قیمت لی سیٹ - 330 روپے

مشہور نثر دانوں کے کتابوں کے لیے

کتابیات پبلکیشنز

فون: 021-5804300

23 بس سٹاپ

Kitabiat1979@yahoo.com

کری 74200

2003 ©

”مجھے نیند نہیں آ رہی۔“ میں نے پشمردی سے کہا۔

”ڈاکٹر رائے ٹھیک ڈیڑھ بجے گھر جاتے ہیں۔ ایک بجے کے قریب شاید وہ یہاں آجائیں۔ پھر شام کو پانچ سے سات تک اسپتال میں رہتے ہیں۔ ابھی ساڑھے دس ہو رہے ہیں۔ ایک بجتے میں پورے ڈھائی گھنٹے ہیں۔ اس دوران گھنٹے دو گھنٹے کے لیے آپ آرام کر لیں تو مناسب ہوگا۔“

”پہلے تو مجھے یہ لباس تبدیل کرنا چاہیے۔“ میں نے شش و پنج سے کہا۔ ”مجھے کچھ تار بھی دینے ہیں۔“

”آپ کہاں ٹھہرے ہیں؟“

میں نے اسے بتایا کہ گزشتہ رات اسپتال سے ہم گرائڈ ہوٹل میں کمرہ محفوظ کرانے گئے تھے۔ سامان رکھ کے فوراً یہاں آ گئے۔ پھر ہوٹل واپس جانا ممکن نہ ہو سکا۔ ہوٹل والے بھی کیا کہتے ہوں گے۔ ”گرائڈ ہوٹل ایسا دور نہیں ہے۔“ اس نے ہنسی آواز میں کہا۔ ”ڈاکٹر رائے کے آنے تک آپ واپس آ سکتے ہیں۔ مجھ پر بھروسہ کیجیے۔ میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گی۔“

”مجھے آپ پر پورا بھروسہ ہے لیکن.....“ میں کہنا چاہتا تھا کہ میرا دل نہیں چاہتا۔

”لیکن کیا.....؟“ وہ جھس سے بولی۔

مجھ سے جواب نہ دیا جا سکا۔

”شاید آپ کا دل نہیں مانتا لیکن آپ اتنی دیر میں اپنا کچھ کام بھی کر لیں گے۔ آپ کے ذہن پر کم از کم یہ بار نہیں رہے گا۔ میں یہاں ہوں۔“ اس نے کسی حد تک انتہائے انداز میں مشورہ دیا۔

”میں کتنی دیر میں واپس آ سکتا ہوں؟“

”ڈیڑھ دو گھنٹے میں آپ اطمینان سے واپس آ سکتے ہیں۔ اسپتال کے باہر آپ کو سواری مل جائے گی۔ اسے ساتھ ہی رکھیے۔“

ٹھٹھل کے سر بانے جا کے میں نے ایک نظر

اسے دیکھا۔ اس کی غفلت جاری تھی۔ کچھ دیر اس کٹش کش میں گزر گئی۔ مجھے جانا چاہیے یا نہیں۔ سیورین کے چہرے پر چھایا ہوا ثبات دیکھ کے میں نے عزم کر لیا۔ لاؤنج عبور کر کے میں چند قدم ہی گیا ہوں گا کہ سیورین کی آواز آئی۔ اس نے کاغذ کا ایک بڑا ٹھیکہ میرے حوالے کیا۔ میں نے کھول کے دیکھا، اس میں اتارے ہوئے ٹھٹھل کے کپڑے رکھے تھے۔ اسپتال کے باہر ہی مجھے ٹانگا مل گیا۔ دن پوری طرح جاگ چکا تھا۔ سڑکوں پر زندگی رواں دواں تھی۔ ٹانگے کی رفتار بیٹھری کی وجہ سے متاثر ہو رہی تھی۔ کئی بار جی میں آئی کہ واپس چلوں لیکن ٹانگا ہوٹل کا فاصلہ کم کرتا رہا اور جلد ہی ہوٹل پہنچا دیا۔ رات کا عملہ بدل چکا تھا۔ میں نے کمرے کی چابی طلب کی تو کاؤنٹر پر کھڑے خوش پوش، خوش اطوار نوجوان نے جس نظر سے مجھے دیکھا اور خیریت پوچھی۔ میں نے اسے سرسری بتایا کہ میرے ساتھی کی طبیعت خراب ہو جانے کی وجہ سے سامان ہوٹل میں رکھ کے ہمیں اسپتال جانا پڑا۔ رات وہیں گزری۔ اس نے تاسف کا اظہار کیا اور پوچھا کہ اب ساتھی کا کیا حال ہے؟ میں نے بتایا کہ انہیں اسپتال میں روک لیا گیا ہے۔ جب تک ڈاکٹر اجازت نہ دے، ہم وہیں رہیں گے۔ مجھے جلدی واپس جانا ہے اور میں صرف لباس تبدیل کرنے آیا ہوں۔ وہ فکر مند ہونے لگا کہ یہ ہوٹل خاصا مہنگا ہے۔ اس طرح تو مجھ پر بے جا مصارف کا بوجھ ہوگا۔ میں نے کہا کہ اسپتال میں کوئی شناسا نہیں ہے۔ اب جو بھی ہو۔ وہ ایک شریف شخص نوجوان تھا۔ میرے منع کرنے کے باوجود مجھے ہوٹل کے پختہ کار لیکن چست و مستعد فیجر کے پاس لے گیا اور اسے ساری روداد سنائی۔ فیجر بھی خاصا معقول آدمی تھا۔ پہلے کچھ سوچتا رہا، پھر اس نے پیش کش کی کہ مجھے کوئی عارضہ نہ ہو تو ایک دو روز کے لیے وہ میرا سامان محفوظ کرنے کا بندوبست کر سکتا ہے۔ جب

بھی ضرورت پڑے، میں ہوٹل آ کے اپنا سامان کھول سکتا ہوں۔ اسپتال میں خدا نہ کرے، زیادہ دن ٹھہرنے کی صورت میں کسی اور تہیہ پر غور کریں گے۔ میں اس کے شہر اور اس کے ہوٹل میں مہمان ہوں اور مجھ پر اچانک یہ افتاد آ پڑی ہے۔ سو وہ اپنی بساط بھر مجھ سے یہی سلوک کر سکتا ہے۔ استہمال کیے بغیر کمرے کا گراں کرنا یہ ادا کرنا کہاں تک درست ہے۔ میں نے اس کا شکر یہ ادا کیا۔ میرے جواب سے وہ جزبہ بھی ہوا، متعجب بھی۔ میں نے کہا کہ میرے لیے یہ زیادہ تسلی کی بات ہوگی کہ میں کمرہ اپنے پاس ہی رکھوں۔ ڈاکٹر بھی مرض کی نوعیت جاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ دو ایک دن میں ساری صورت حال واضح ہو جائے گی۔ تیجہ مجھ سے طرح طرح کے سوالات کرنے لگا۔ میں نے معذرت کی کہ مجھے اسپتال پہنچنے کی جلدی ہے۔ میری عدم موجودگی میں نہیں ڈاکٹر نہ آجائے۔ وہ خاموش ہو گیا اور اس نے کرسی سے اٹھ کے مجھے رخصت کیا۔ ٹھٹھل کی صحت پائی کے لیے دعا کی اور کہا کہ ہوٹل کے علاوہ بھی کوئی کام ہو تو میں بے تکلف اس سے کہہ سکتا ہوں۔ میں نے گزارش کی کہ میں اپنے اعزاء کو تازہ بخبر رہا ہوں اور ہوٹل کا پتا دے رہا ہوں۔ میری بات پوری ہونے سے پہلے اس نے پرتپاک انداز میں یقین دلایا کہ جیسے ہی میرا کوئی خط یا تار موصول ہوا، وہ کسی تاخیر کے بغیر اسپتال پہنچا دے گا۔

کمرے میں سامان اسی جگہ رکھا ہوا تھا جہاں رات میں نے چھوڑا تھا۔ بیگ کھولنے پر توشہ دان نظر آیا۔ کھانا اب تو خراب ہو چکا ہوگا۔ خدمت گار کو بلا کے میں نے توشہ دان اس کے سپرد کیا کہ اسے خالی کر کے واپس کمرے میں رکھ دے۔ دس روپے کی بخشش پر اس نے جھک کر سلام کیا اور کوئی اور خدمت بجالانے کے لیے بے قرار ہو گیا۔ وہ چلا گیا تو ایک بیگ خالی کر کے میں نے اس میں ٹھٹھل

کھینچی ریزر، صابن، برش، پھنکری کی ڈلی، منجن، کھنکھی، آئینہ، روبال اور اپنا بھی کچھ یہی سامان اور اپنا اور ٹھٹھل کا ایک ایک جوڑا رکھا۔ ہوٹل میں کپڑوں کی دھلائی اور استری کا اہتمام تھا لیکن استری میں دیر لگتی۔ کپڑوں پر ایسی ٹھنکیں بھی نہیں پڑی ہوئی تھیں۔ اسپتال میں مریض کے ساتھ رہنے والے کے لیے بھی لمبل موجود تھا۔ میں نے اپنا ٹھیکس بھی رکھ لیا اور حفظ ماتقدم کے طور پر بہمنی کے بیگ میں جمع کرنا بھی کی عطیہ رقم کی چیک بک بھی بیگ میں ڈال دی۔ منہ ہاتھ دھو کے کپڑے بدلنے کا ارادہ تھا۔ ٹھٹھل خانے میں آ کے چپ چپاہٹ کا احساس ہوا۔ نہانا کیا، بس جسم بھگوا اور خشک کر لیا اور خاصی تازہ دمی محسوس ہوئی۔ ملے کپڑوں کی چھینیں خالی کرتے ہوئے اپنی واسکٹ کی چابی جیب میں چرپی بٹوا دیکھ کے مجھے حیرت ہوئی۔ بٹوا بہت نرم و پھس تراش خراش کا اور بالکل نیا تھا اور نوٹ بھرے ہوئے تھے۔ سفر میں کئی بار جیب بھاری بھاری لگی تھی لیکن اس یقین سے میں نے ایسی توجہ نہیں دی تھی کہ زریں کے سوا کون ہو سکتا ہے۔ وہ اسی طرح چونکا پنی اور اپنی قدر و منزلت فزوں کرتی ہے، اسی نے کوئی چیز رکھی ہوگی، کسی جگہ ٹھہرنے یا اطمینان سے دیکھوں گا۔ میرے وہم و گمان میں نہیں تھا کہ یہ نوٹوں سے بھرا ہوا ہو سکتا ہے۔ میری واسکٹ میں، ٹھٹھل کی واسکٹ سے نکالی ہوئی نوٹوں کی دو گڈیاں بھی تھیں، انہیں سوٹ کیس میں محفوظ نہیں کیا جا سکتا تھا اور اتنی رقم مستقل ساتھ رکھنی بھی حماقت معلوم ہوتی تھی۔ ہیروں کی تھیلیاں... کا تو کوئی وزن ہی نہیں تھا۔ غلت کے خیال سے نہ میں نے اس کی گرہ کھولی نہ اپنے پاس موجود رقم گننے اور مالیت کا اندازہ لگانے میں وقت ضائع کیا جس طرح ہیروں کی تھیلیاں اور روپے پرانی واسکٹ کی جیبوں میں رکھے ہوئے تھے، اسی ترتیب سے ہی واسکٹ کی جیبوں میں رکھ لیے۔ ٹھٹھل کا چاقو اس

کے میں نے خود سے دور کیا اور دروازے کی جانب دوڑ لگائی۔ دوسرا عمارت سے نکل کے دائیں طرف مڑ گیا تھا۔ میں نے پوری قوت سے اس کا پیچھا کیا۔ کاش میں اس پر لعنت بھیج کے تعاقب چھوڑ دیتا۔ وہ بے تمناشا ہماکتا ہوا پہلی گلی میں مڑ گیا اور اس سے پہلے کہ میں اس کے سر پر پہنچوں، اسے جیب سے چاقو نکالنے اور چشم زدن میں کھولنے کا موقع مل گیا۔ میرا دماغ الٹ گیا تھا میں اندھا ہو گیا تھا۔ مجھے فی الفور وہاں سے واپس ہو جانا چاہیے تھا۔ اس کی پھینکی سے خون کھولنے لگا۔ میں نے بھی پھر اپنی رفتار سست کی اور تھیر گیا۔ وہ چاقو کھماتا رہا۔ آہستہ قدموں سے میں نے اس کے قریب ہونا شروع کیا۔ مجھے نہتا اپنی جانب بڑھتا دیکھ کے اسے ہراساں نہیں تو متوش ہو جانا چاہیے تھا۔ وہ اچکا تھا، ایک نظر میں اس کا تخمینہ ہو گیا تھا کہ چاقو سے اس کی نسبت کس قدر ہے اور وہ کتنی دیر نکلنے والا ہے۔ بندرتن اپنی جانب میری پیش قدمی سے غیر ارادی طور پر وہ پیچھے ہٹا۔ کئی میں اتنی تمنا پیش نہیں تھی۔ یقیناً اپنے پاس چاقو کی موجودی سے برتری کا کوئی احساس اس پر غالب ہوا۔ وہ بھپکیاں دیتا ہوا میری طرف بڑھا۔ مجھے معلوم تھا، وہ چاقو مارنے کے بجائے مجھے خوف زدہ کرنے کی کوشش کرے گا۔ میں نے ایک قدم بڑھ کے فاصلہ اور کم کیا۔ چاقو والا ہاتھ بڑھانے میں اس کا تامل و تردد لازم تھا۔ میں اس کے خاصا قریب ہو چکا تھا اور اسے میرے دماغی توازن پر شبہ ہونا چاہیے تھا۔ ایسی صورت میں احتیاط کی زیادہ ضرورت پڑتی ہے۔ اس نے ہچکچتے ہوئے پھر چاقو بڑھایا۔ میں تیزی سے دائیں پہلو ہوا پھر بائیں۔ تین چار بار اس عمل کی تکرار سے اسے متذہب کرنا مقصود تھا۔ وہ کبھی اس طرف ہاتھ بڑھاتا کبھی اس طرف۔ میں نے اسے مزید آزمائش سے دوچار نہیں کیا، ایک بار مجھے دائیں طرف ہوتا دیکھ کے اس نے اسی جانب ہاتھ بڑھایا

تھا کہ میں ایک دم پیچھے گیا اور اسی لمحے اٹھا تو اس کے چاقو والے ہاتھ کی کلائی میرے نچے میں تھی۔ یہ حربہ میں نے پہلے بھی کسی جگہ اختیار کیا تھا اور نتیجہ اچھا ہی نکلا تھا۔ ساتھ ہی میں نے دوسرے ہاتھ سے اس کے پیٹ پر ضرب لگائی۔ وہ بہت زور سے چیخا اور ہلبلہانے لگا۔ چاقو اس کی انگلیوں کی گرفت میں قائم نہ رہا۔ اسے پھر میں نے پھینکنے کی فرصت نہیں دی۔ اس کی گردن اور پسلیوں پر پے در پے ضربیں لگیں۔ وہ دہرا ہوا گیا اور ادھ مواہو کے پیٹ پکڑے وہیں ڈھیر ہو گیا۔ وہ اب مزاحمت کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ میں نے آسانی سے اس کے کرتے کی جیب سے اپنا ہوا نکال لیا۔ میری جیب میں کھلے روپے بھی تھے وہ بھی میرے ہاتھ میں آگے۔ میرا وزنی چاقو جیب کی تہ میں پڑا ہوا تھا اس لیے انگلیاں چاقو تک نہ پہنچ سکیں اور اسے میری جیب میں چاقو ہونے کا گمان بھی نہ ہوگا۔ اس سے نشے میں چند منٹ ہی لگے ہوں گے۔ تین چار زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ۔ اس دوران ان گلی میں کئی راہ گیر جمع ہو چکے تھے۔ جیب کترے کی چیخوں اور کراہوں سے آنے سامنے کے مکانات کے دروازوں کی آڑ اور کھڑکیوں سے عورتیں اور بچے بھی جھانکنے لگے تھے اور شور مچانے لگا تھا۔ کوئی راہ گیر قریب نہیں آیا۔ انہوں نے درمیان میں پڑا چاقو دیکھ لیا تھا۔ میں نے شکستہ حال نوجوان کا چاقو زمین سے نہیں اٹھایا۔ اس سے نشے میں گوساری توجہ مرکوز رہی تھی لیکن میں اس کے دوسرے ساھی سے بھی غافل نہیں رہا تھا۔ ڈاک خانے میں نار فایم پر کرانے کے لیے مجھ سے التماس کرنے والا پہلا شخص یقیناً اسی کا ساھی تھا۔ جیب کترے عموماً تنہا نہیں ہوتے، یہی ہوا۔ میں جلد سے جلد کئی سے نکل جانا چاہتا تھا۔ ابھی میں مزے مزے ہوئے نوجوان کو ٹھوکر مار کے پلٹا ہی تھا کہ ڈاک خانے کی سڑک

سے دو آدمی دیوانہ وار گلی میں نمودار ہوئے۔ دونوں نہتے تھے۔ کئی میں داخل ہوتے ہی انہوں نے مجھے آنے دیکھا تو ٹھنک کے رک گئے۔ راہ گیر اور تماشاچی، گمن گھنٹا شور اور کچھ فاصلے پر اپنے ساھی کے حال سے سارا ماجرا انہیں کچھ جانا چاہیے تھا۔ سامنے کھلا چاقو بھی پڑا ہوا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ایک ساتھ جیبوں میں ہاتھ ڈال کے چاقو نکال لیے اور زبردگاتے ہوئے بھاگنا شروع کر دیا۔ میں ایک کی توقع کر رہا تھا۔ وہ دو تھے۔ ان کی آمد میں اتنی دیر کی کوئی بھی وجہ ہو سکتی تھی۔ یا تو انہیں اپنے ساھی کے فرار کی سمت کا علم نہیں تھا یا پھر تیسرے ساھی کو اطلاع دینے اور اسے ساتھ لانے میں کچھ وقت صرف ہوا۔ میرے لیے مفر کی ایک یہی صورت تھی کہ سڑک پر جانے کے بجائے میں کئی میں مخالف سمت بھاگنے لگوں مگر آگے کئی کی طول عرض کا بھی مجھے کوئی علم نہیں تھا۔ مجھے اب وحشت ہونے لگی تھی۔ مجھے تو اسپتال پہنچنا ہے، وقت تیزی سے گزر رہا ہے اور وہ مجھے اس طرح جانے نہیں دیں گے۔ ایک ہی صورت تھی کہ میں ان سے بات کرنے کی ایک کوشش کروں۔ وہ مان چائیں تو ٹھیک ہے۔ میں بنوا ان کے حوالے کر دوں گا یا پھر ان سے مذہبیز۔ انہوں نے مجھے زنج ہو جانے کا موقع نہیں دیا۔ وہ چاقو لہراتے، چیخ پکار کرتے ہوئے میری طرف بڑھ چکے تھے۔ ان میں ایک تیس سال کے قریب تھا، دوسرے کی عمر تیس بائیس سال ہوگی۔ یہ وہی نوجوان تھا جس نے ڈاک خانے میں مجھے پہلے روکا تھا۔ میں اپنی جگہ ٹھیر گیا اور میں نے دونوں ہاتھ اٹھا دیے اور بلند آواز سے کہا "ٹھیرو، ٹھیرو، میری بات سنو۔" میری صدا کا ان پر کچھ اثر ہوا۔ وہ ٹھیر کے تو میں نے مفاہمتا نہ لکے میں کہا۔ "میری بات دھیان سے سن لو۔ میں دہراؤں گا نہیں۔ میں تمہارے شہر میں اجنبی ہوں میرا ایک عزیز اسپتال

میں ہے۔ مجھے جلد اس کے پاس پہنچنا ہے۔ تم لوگوں سے میری کوئی دشمنی نہیں ہے۔ تمہارے ساھی نے مجھ سے زیادتی کی تھی اسی لیے مجھے اس کے پیچھے بھاگنا پڑا، اس نے چاقو نکال لیا۔ مجھے اسے بتانا پڑا کہ کبھی ایک جیسے نہیں ہوتے۔ ہتھیار ایسے ہی ساتھ نہیں رکھا جاتا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو میں تمہیں بھی دیکھ لینا لیکن میں نے تم سے کہا ہے، میرے پاس وقت نہیں ہے۔ اپنی مجبوری کی وجہ سے وہ بنوا میں تمہارے حوالے کر دوں گا جو تمہارے ساھی نے میری جیب سے نکالا تھا۔ تم لوگ میرے راستے سے ہٹ جاؤ، کچھ غلط مت سمجھنا۔ تم ایک ساھی کو دیکھ رہے ہو۔ چاقو کا کھیل اچھا نہیں ہوتا۔ کسی کو نقصان پہنچ سکتا ہے اور یہ کوئی اچھی بات نہیں ہوگی۔ تمہیں پیسا چاہیے۔ وہ میں تمہیں دیے دیتا ہوں۔ مجھے فوراً جواب دو۔"

"یوہ ائی کا بڑ بڑ کرتے ہے۔" جواب میں زیادہ عمر کے آدمی نے اپنے ساھی کو دیکھتے ہوئے نفرت سے کہا۔ اس نے چاقو ہوا میں اچھالا اور مہارت سے اسے اچک لیا۔ بنوا نکالنے کے لیے میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تھا کہ وہ تیزی سے میری طرف چھپتا۔ میں بنوا نکال چکا تھا لیکن اس کے تورا مجھے نہیں تھے۔ بشرے ہی سے وہ ایک شورہ پشت آدمی دکھائی دیتا تھا۔ چہرے کی جلد کھردری، چھوٹی چھوٹی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی، تنگ پیشانی، نیل میں چمکتے بال اور سچ میں مانگ نکلی ہوئی، دانتوں پر بالوں کی تہہ، ناک، ہونٹ اور دائیں طرف کے گال پر چاقو کے نشانات، دبا ہوا قد، گٹھا ہوا صدمہ، لکیر والی مونچھ۔ اپنا ہاتھ کھلا رکھنے کے لیے مجھے بنوا دو بارہ جیب میں ڈالنا پڑا۔ دونوں مجھ سے چند منٹ کے فاصلے پر آ کے رک گئے اور ہاتھ پھیلائے، جسم دکاتے پھر کاتے ہوئے وار کرنے کا تاثر دیتے رہے۔ "ہم کا، کاجھے ہو ہوا! ہم، تم کا بھیک منگا دکھائی پڑت ہے؟" زیادہ عمر

والے نے دھتکارنے والے انداز میں کہا۔

میرے منہ پہ آیا، کہوں کے چوری سے اچھی بھیک ہوتی ہے۔ میں خاموش رہا۔ جنت میں وقت اور ضائع ہوتا۔ بڑے کی چاقو پر دست رس معلوم ہوتی تھی، چھوٹا نواز آموز نظر آ رہا تھا۔ میں نے اپنی آواز دہیسی رکھی۔ ”پھر تم کیا چاہتے ہو؟“

”تم ہر امنٹی (آدی) پہ کاہے ہاتھ اٹھائے؟“

اس کو مارن ہو، ہاں! وہ گرن کے بولا۔

”اور اس نے کچھ نہیں کیا؟“ اس کی ڈھٹائی پر میرا سر جھٹکنے لگا۔

”یہی شعور اپنے میدا استاد راج کرت ہیں۔ دوسرا کونوں حکم نانی ہے۔ ہم تم کا ہٹانے دے کہ جونوں سر میدا استاد کا آدی پہ ہاتھ اٹھائے تو سمجھو، وہ اس دھرتی پہ نانی رہے۔“

”دیکھو استاد!“ میں نے جکڑی ہوئی آواز میں کہا۔ ”ایسا ہے تو میں پھر آ جاؤں گا۔ تم سے وعدہ ہے۔ مجھے اس وقت جانے دو۔ میں تمہارے میدا استاد کے پاس بھی آ جاؤں گا۔ مجھ سے اس وقت مت الجھو مجھے کیوں نہیں۔“

”ہم سارا سمجھت ہیں۔ تم کا الو کا پنجاہ کھائی پڑت ہیں ہم؟ تم کا ایسا نہیں چھوڑ دیں۔ ابھی سبک بڑھائے دیت ہیں۔“ میری خاموشی پر وہ زہریلی آواز میں بولا۔ ”تم کا جب کاہے گی ہے؟“

”تم مجھے آدی نہیں لکھتے۔ میں نے غلطی سے کہا۔ اس کے چہرے پر کئی نقش تھے۔ جی میں آتا تھا، زندگی بھر یاد رہ جائے والا کوئی نقش میں بھی شبہت کروں۔ آئینے کی طرف بھی منہ نہ کر پائے۔“

”ابھی تم سول آنا ٹھیک سمجھت ہو۔ ہم اپنا میدا استاد کا نمبر ایک پالتو ہے۔ سمجھا کہ نہیں۔ اس کا پنا اپنی گردن میں ہے۔“ وہ جو منہ میں آیا، بکٹا رہا۔ کوئی بات کہہ کہ وہ ارد گرد کھڑے تماشا بینوں کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھتا جیسے انہیں کچھ جتنا چاہتا ہو۔ لوگوں کی تعداد اتنی زیادہ نہیں تھی لیکن

اب ان پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ مجھے احساس ہو گیا تھا کہ میری ہراسندہ طبعی اثر سے گی۔ ان سے ایسے چھٹکارا نہیں لے گا لیکن مجھے پہل کر کے ضرورت نہیں تھی۔ میری خاموشی نے بڑی عمر والے کا اضطراب اور ہمزیم کیا۔ اس نے اپنے کم عمر ساتھی کو کوئی اشارہ کیا اور کچھ پانی آواز میں بولا۔ ”ابھی تم کا گھا پلڑائے کے استاد کا دربار میں لیے چلت ہیں۔ اس کے آگے ماتھا گڑنا اور دکھنا بھی دینا۔“ دونوں نے ہاتھ پھیلائے دو قدم بڑھ کے فاصلہ اور کم کیا۔

میں نے اپنی جگہ سے جنبش نہیں کی۔ وہ مجھ سے اور قریب ہو گئے۔ بڑی عمر والا چاقو بھی اس ہاتھ سے لیتا تھی اس ہاتھ میں۔ مخالف پر اپنی ہنرمندی کی دھاک بٹھانے کے لیے یہ ایک عام اور موثر شیوہ اظہار ہے۔ اصل میں ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ تک چاقو پھینکنے میں ہاتھوں کے درمیان فاصلہ اور پھرتی پر بہت کچھ منحصر ہے، لکھنا فاصلہ اور کیسی پھرتی۔ پھرتی سے مراد تکرار کی تیزی و تیز رفتاری ہے۔ بعض مشتاق کا ایک ہاتھ چاقو پھینکتا ہے تو دوسرا ہاتھ بے اختیار اسی سمت اٹھتا ہے اور نگاہ کا اس عمل میں کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ ہاتھ شین بن جاتے ہیں مگر صرف یہی ہنرمندی نہیں۔ یہ کوئی داؤ نہیں، ایک طرف کی بازی گری ہے۔ چاقو پر گرفت ایک خوبی ہے، دوسری خوبی چاقو اور نگاہ، چاقو اور داغ، چاقو اور بیل کا ٹال بیل یا توازن ہے۔ موقع محل کے اعتبار سے مہارت آزمانی جانی ہے۔ ضرورت پر مرحلہ در مرحلہ۔ پہلے ہی مرحلے پر اپنے جوہریاں نہیں کر دیے جاتے۔ پھل تو نیت کی کبھی بات کرنا ہے۔ اس کا کہنا ہے، نیت کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے اور کہتا ہے، چاقو بھی اٹھانا چاہیے جب ذہن صاف، آلودہ نہ ہو، کوئی مقصد ہو، بے مقصدی نہ ہو اور تب جب کوئی چارہ نہ ہو۔

میری جانب سے کوئی مزاحمت نہ دیکھ کے بڑی

عمر والے کا گڑنا ہوا چہرہ اور گڑ گیا۔ اپنے آئندہ اقدام کے بارے میں اسے کس کس سے دوچار ہو جانا چاہیے تھا۔ میں اسے بت کی طرح دیکھتا رہا۔ اس کا ساتھی اس سے ڈیڑھ گز کی دوری پر بڑھ چکا تھا، پروتے ہوئے۔ زیادہ عمر کا آدمی ایک قدم اور بڑھ آیا۔ میرا خیال تھا، وہ میری جیبوں میں ہاتھ ڈال سکتا ہے لیکن وہ سیانا آدمی تھا۔ اس نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ اس کے بجائے اس نے کسی قدر بچکھاتے ہوئے اپنا خالی ہاتھ میری طرف بڑھایا۔

ہمارے درمیان اب گڑ بھر کی دوری رہ گئی تھی۔ اس نے میری ٹھوڑی پکڑی، پہلے آہستہ، پھر پنجہ ٹھوڑی پر کس دیا اور ناخن گز دو بے اور چاقو بردار ہاتھ اٹھانے کے چاقو کی دھار میری ناک پر پھیری، پھر کان پر اور گالوں پر۔ میں نے اپنا جسم بند کیے رکھا۔ مجھ پر لمحہ لمحہ پہاڑی طرح گراں تھا۔ اس نے چاقو والا ہاتھ دور کر کے میرے منہ پر زور سے مکا مارا..... دوسرا، پھر تیسرا.....

میں نے سوچا، اس میں کہیں بھیسی ہوئی غیرت وحیت اجاگر کرنے کی ایک کوشش کیوں نہ کروں۔ اس سے کہوں کہ وہ دو ہیں۔ دونوں کے ہاتھ میں چاقو ہیں۔ ایسے میں، میں کیا اپنا دفاع کر سکتا ہوں۔ بہت ممکن ہے، لوگ ارد گرد موجود ہیں، وہ کسی خنار یا غزے میں آجائے اور ہو سکتا ہے، اپنے ساتھی کو پیچھے ہٹانے کے اس کا چاقو بھی میرے حوالے کر دے۔ یہ تدبیر طوالت انگیز ہو سکتی تھی۔ ان دونوں پر اعتماد بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان کا تعلق اڈے سے واجبی معلوم ہوتا تھا۔ چاقو تو ہر کوئی چلانا سیکھ لیتا ہے مگر چاقو بازوں کے اپنے کچھ طور طریقے ہوتے ہیں۔ کم عمر جوان سے تو کچھ بعید نہیں تھا کہ اس جلد باز کے سر میں کس وقت کیا سنا جائے اور میرے اس مطالبے میں دعوے کا پہلو دکھاتا تھا۔ میرے بارے میں ان کا لالچ رہنا ہی بہتر تھا حالانکہ ان کا ایک ساتھی ابھی تک اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو سکا تھا اس کی خستہ

حالی میری شد بد کی شہادت تھی۔

کسی شہدہ کاری ہی سے جلد نجات ممکن تھی۔ بہر حال میں نے فیصلہ کر لیا تھا۔ فیصلہ کرنے کے بعد عواقب و نتائج پر توجہ نہیں دینی چاہیے۔ بڑی عمر والے کے کئے کی چوٹی ضرب بھی میں نے برداشت کر لی۔ میں بے حس و حرکت رہا۔ پھر جیسے ہی اس نے پانچویں کئے کے لیے ہاتھ اٹھایا، اس کی ضرب سے بچنے کے لیے میں مخالف سمت کسی قدر جھکتا ہوا مڑ گیا۔ چار مرتبہ کے تجربے کے بعد اسے یقین ہوگا کہ میں اسی طرح ساست کھڑا ہوں گا۔ جھک کے مڑتے ہوئے میں نے بیچ جھسی صدا بلند کی اور اچھل پڑا۔ یہ غیر متوقع بیچ اسے مزید منتشر کرنے کے لیے تھی۔ وہ ہاتھ اٹھا چکا تھا اور اس کی ساری توجہ پانچویں ضرب لگانے پر مرکوز تھی۔ آنا فنا بیک وقت میرے بھٹکنے، مڑنے، اچھلنے اور بیچ مارنے پر لااثر ہونا ہوا ہاتھ پیچھے ہٹانے نہ ہٹانے میں اسے تذبذب و تردد ہونا چاہیے تھا۔ مجھے ضرب کی پروا نہیں تھی کہ یہ چہرے کے بجائے جسم کے کسی حصے پر لگتی ہے۔ اس کا چاقو والا ہاتھ بھی شعوری، غیر شعوری طور پر متحرک ہوا۔ میں نے بھی کچھ طے کر کے اپنی جگہ سے حرکت کی تھی۔

مڑ جانے سے اس کا چاقو والا ہاتھ پوری طرح میری نظروں اور میرے وجود کی نظروں میں تھا۔ اس کے ہاتھ میں کھلا چاقو تھا اور میری ذرا سی چوک سے کہیں بھی پیوست ہو سکتا تھا۔ ادھر سے اضطراب کے عالم میں اس کا چاقو والا ہاتھ مجھے نشانہ لینے کے لیے قریب ہوا، ادھر میرے دونوں ہاتھ اسے روکنے کے لیے اٹھے ہوئے تھے۔ اس صورت میں اسے خود کو سنبھالنے یا سانس استوار کر کے کچھ بھٹکنے کے لیے چاقو والا ہاتھ، فطرتی طور پر پیچھے بھی کرنا چاہیے تھا۔ اس پر یہ بھجان طاری نہ ہوتا تو بھی میں تو اپنے ہاتھ بڑھا چکا تھا۔ پلک پھینکنے کی مدت میں میرے دونوں بیچوں کی گرفت

میں اس کی کلائی تھی۔ مجھے اب فوراً دوبارہ اسپتال کے اور ڈرائی ڈیپل دے کے اس کے ہاتھ کو جھنکا دینا تھا۔ میں نے کوئی لمحہ ضائع نہیں کیا۔ میرے اچھلنے اور جھکاؤ کے جسم کا سارا وزن، سارا زور ڈالنے سے باز رکھنا چاہتا تھا۔

یہی ہوا۔ اس کی کرب ناگ چنچ دور تک گونگی ہوگی۔ چا تو پھر اس کے ہاتھ میں برقرار نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ پیر بیٹھنے لگا۔ میں اسے مزید بے قابو کرنے کے لیے کسی ناخبر کے بغیر ضربیں لگانا چاہتا تھا کہ میں نے دیکھا، اس کا کم عمر سا بچہ چا تو سیدھا کیے میری طرف بڑھ چکا ہے۔ وہ گھوم کے میری پشت پر وار کرنا چاہتا تھا۔ میرے پاس یہی راستہ تھا کہ جیسے تیسے میں اس کے ہنڈی کار سا بچے سے دست بردار ہو کے اب اس سے بچنے کی راہ ڈھونڈوں۔

اس پر نوٹ پڑنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ میرے پاس سنبھلنے کا وقت نہیں رہا تھا۔ نوجوان اپنی جھونک میں تیزی سے بڑھ چکا تھا۔ گونجے اس کے سا بچے کو چند ایک آزمودہ ضربوں سے بے حال کر کے اس کی طرف ہی پلٹنا یا اس کی دیوار بھی بنانا تھی۔ ظاہر ہے، وہ ہاتھ پیر پارے تماشا تو نہیں دیکھتا رہتا۔ اپنے سا بچے کو محفوظ کرنے کے لیے کوئی طور تو اسے اختیار کرنا تھا اور جواب میں مجھے یہی کرنا تھا کہ اس کے سا بچے کو ڈھال بنائے رکھوں اور اس کی پس پائی تک مسلسل ضربیں لگاتا ہوں۔ نوجوان نے بڑی جلدی کی۔ اسے ابھی ہتھیار ہاتھ میں نہیں لینا چاہیے تھا۔ شعل کے بقول، گھوڑے کی طرح نوجوان مشقوں سے ہتھیار بدلتا رہتا ہے۔ میں نے خود کو اور اپنے قبضے میں آئے اس کے سا بچے کو سامنے سے ہٹانے کی پوری کوشش کی تھی۔ نوجوان چا تو بردار خود کو تھام نہ سکا۔ وہ اندھا دھند پاگلوں کی طرح اپنی جگہ سے اٹھتا تھا۔ اس کا چا تو اپنے سا بچے کی پٹلی میں پیوست ہوا۔ پٹلی کی رعایت بھی اس سبب سے ممکن ہوئی کہ میں اسے نشانے سے ہٹانے میں کس حد تک

کام یاب رہا تھا اور نہ چا تو اس کے پیٹ میں کھب جاتا۔

راہ گیسوں اور دروازوں، کھڑکیوں پر کھڑی عورتیں اور بچوں کی سہ کاریاں نکل گئیں۔ نوجوان اس ناگہانی، نادیدنی سے ہکا بکارہ گیا۔ میں اسے سکتے کی اس لٹائی کیفیت سے درچار چھوڑ کے بھاگ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ اور دیوانہ ہو سکتا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ میں نے اسی حالت میں اس کے بال پکڑ کے اسے کئی ضربیں لگائی۔ وہ خود بھی بے خبر ہو جانا چاہتا ہوگا۔ ایسے صدمے میں، آدمی کو اپنے خواہش خود دینے، خود سے بے نیاز ہو جانے کی ایک طلب ہوتی ہے۔ اس نے کوئی مدافعت نہیں کی جیسے سڑک کے طور پر یہ ضربیں کھا رہا ہو۔ پھر وہ پکڑا کے زم میں پر گر گیا۔

میں نے اسے کپڑے بھاڑے اور ایک نظر لوگوں کی طرف دیکھا۔ کوئی بھی میرے قریب نہیں پھنکا بلکہ انہوں نے نظریں جھکا لیں۔ بھاگتا بھل تھا۔ تیز قدموں سے میں نے سڑک کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ ذمہ شورا تھا۔ میں نے پیچھے مڑ کے نہیں دیکھا۔ راہ گیر زخمی نوجوان کو اس حالت میں کیسے چھوڑ سکتے تھے۔ خون نے اسے سرخ کر دیا ہوگا۔ کسی نے میرا تعاقب نہیں کیا۔ تعاقب کرتا تو آہٹ ضرور ہوتی۔ گلی سے نکل کے میں ڈاک خانے والی چوڑی سڑک پر آ گیا۔ کوچوان ناگہانے لیے ڈاک خانے کی عمارت کے پہلو میں بدحواس کھڑا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی پوچھنے لگا کہ خبریت تو ہے۔ میں ڈاک خانے سے اس آدمی کے پیچھے کیوں بھاگا تھا۔ کہنے لگا کہ تانگے میں میرا بیک رکھا ہوا تھا۔ وہ تانگا چھوڑ کے گلی میں جا بھی نہیں سکتا تھا۔ میں اسے کیا کچھ بتاتا۔ میرا تو سرخ رہا تھا۔ میں نے اس سے جلد سے جلد اسپتال پہنچنے کی درخواست کی۔ جیسے ہی میں تانگے پر سوار ہوا، گلی سے چند آدمی بھاگتے ہوئے سڑک پر آتے دکھائی دیے۔ سڑک پہ

آکے انہوں نے خود کو روکا اور بولائے ہوئے انداز میں ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ کسی کو تا نگا نظر آ گیا۔ اسی شخص نے میری جانب سب کو متوجہ کیا۔ کوچوان نے تا نگا چلا دیا تھا۔ کوئی بھی تا نگے کے پیچھے نہیں بھاگا۔ میں دیکھتا رہا۔ وہ انگلیاں اٹھا کے ایک دوسرے کو میری طرف اشارے کر رہے تھے۔ آگے کچھ فاصلے پر سڑک گھوم گئی اس لیے وہ سارے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

سڑک پر اب بھیڑ زیادہ ہو گئی تھی۔ دھوپ میں بھی خاصی تیزی تھی۔ کچھ ایسا وقت نہیں گزرا تھا۔ زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس منٹ اوپر ہوئے ہوں گے۔ گھڑی یوں وقت کا مستند پیمانہ ہے لیکن کس پر کب کیسا وقت گزرتا ہے، اس کا شمار کون کرے۔ وقت سب پر یکساں نہیں گزرتا سو ہر ایک کے لیے پیمانے بھی جدا ہوتے چاہئیں۔ اسپتال دور تھا اور بھیڑ کی وجہ سے تا نگے کی رفتار متاثر ہو رہی تھی۔ اگر وہ تینوں واقعی اڈے سے متعلق آدمی تھے تو اڈے کے دیگر آدمیوں کو کسی وقت بھی خبر ہو سکتی تھی۔ بری خبر بے طرح پھیلتی ہے۔ لوگوں کو اس کی جستجو بھی بہت ہوتی ہے۔ میں نے اسپتال کا ذکر کیا تھا۔ یہ ان کا شہر ہے۔ میری تلاش میں اڈے کے آدمی شہر کا کوئی اسپتال نہیں چھوڑیں گے۔ میں نے اپنے سر سے تمام اندیشے جھینکے جاے۔ بعد کی بات بعد کی ہے۔ اس وقت تو مجھے کسی طرح اسپتال پہنچنا چاہیے۔ مجھی سے غلطی ہوئی۔ اس برس سپورین کے کہنے پر اتنے کم وقت میں مجھے ہول کارخ ہی نہیں کرنا چاہیے تھا۔ نہ جانے شعل کا کیا حال ہوگا؟ ڈاکٹر رائے کمرے میں نہ آ گیا ہو۔ مجھے وہاں نہ دیکھ کے کیا سوچے گا؟

یہی بہتر نظر آتا تھا کہ تا نگے سے اتر کر سڑک پہ بھاگنا شروع کر دوں۔ اس طرح تا نگے سے جلدی اسپتال پہنچ سکتا ہوں مگر لوگ ایک آدمی کو بھاگتا دیکھ کے پاگل ہی سمجھیں گے۔ سڑک پر بہت سے

سائیکل سوار تھے۔ کاش کوئی سائیکل ہی مل جاتی۔ بھیڑ میں سائیکل گزارنے کی جگہ جلد مل جاتی ہے۔ کیوں نہ تا نگے سے اتر کے کسی سائیکل سوار سے التجا کروں کہ وہ مجھے کیر پر پہنھا کے اسپتال پہنچا دے یا کسی موٹر والے کو روکوں۔ پوں پوں کرتی اکا دکا موٹریں بھی گزر رہی تھیں۔ شاید کوئی مہربان ہو جائے۔ میں اسے منہ مانگے معاوضے کی پیشکش کروں گا۔ معاوضے کا سن کے وہ ناراض تو ہو گا لیکن اس طرح اسے میری منت گزاری کی اہمیت کا کچھ اندازہ ہو جائے گا۔ کوچوان بھی میری پریشانی سمجھ رہا تھا۔ وہ کبھی گھوڑے کو چابک مارتا، کبھی لگام کھینچتا، طرح طرح آوازیں نکالتا اور گالیاں بکتا تھا۔ وہ بے چارہ اپنے جتن کر رہا تھا۔ اس کا بس چنا تو آگے چلنے والی گاڑیوں کے اوپر سے تا نگا گزار کے لے جاتا۔

ڈاک خانے سے چلے پندرہ منٹ کے قریب ہوئے ہوں گے۔ تا نگے نے ابھی بہت کم فاصلہ طے کیا تھا کہ مجھے اے کے انوں پر شبہ ہوا مگر سینیوں کی گونج واضح تھی۔ پولیس کی سینی کی آواز الگ ہوتی ہے۔ میں نے مضطر بنا اپنی نشست سے اٹھنے کے دیکھا اور میری آنکھیں دھندلانے لگیں۔ دور خاصے فاصلے پر سائیکلوں پر سوار کئی پولیس والے مجھے اپنی طرف آتے نظر آئے۔ سادہ لباس میں چند لوگ بھی ان کے ساتھ تھے۔ انہیں بھی تیز رفتاری سے سائیکلیں دوزانے کے لیے راستہ صاف نہیں مل رہا تھا۔ مسلسل بیٹیاں بجانے کا مقصد رکاوٹ بننے والے راہ گیروں اور سوار یوں کو ایک طرف سٹ جانے اور راستہ دینے کی تاکید کرنا ہی ہوگا۔ پولیس کو دیکھ کے لوگ ویسے بھی کنارے ہو جاتے ہیں۔ وہ کسی وقت بھی جھٹک پہنچ سکتے تھے۔ میں نے خوش گمانی کی کہ شاید انہیں میری تلاش نہ ہو، مجھے خاطر جمع رکھنی چاہیے اور اگر انہیں میری ہی تلاش ہے تو مجھے اپنے اوسان بجا رکھنے کی ضرورت ہے۔ میری

جگہ کوئی بھی ہونا تو یہی کچھ کرتا۔ مجھے ساری صورت حال ان کے گوش گزار کر دینی چاہیے کہ میں نے تو صرف اپنا دفاع کیا ہے۔ میں نے ان سرکشوں کو سمجھانے کی بہت کوشش کی تھی۔ انہوں نے میری کوئی بات نہیں سنی اور چاقو نکال لیے۔ میرے ہاتھ میں تو چاقو بھی نہیں تھا۔ اس نے دیکھا ہے کہ بڑی عمر کا نوجوان اپنے ساتھی کی نادانی کی وجہ سے زخمی ہوا ہے۔ میرے پاس کہنے کے لیے بہت کچھ ہے لیکن..... لیکن کوئی سنے بھی تو اوہ پولیس کے آدمی ہیں اور پولیس پہلے پولیس ہوتی ہے، بعد آدمی۔ میں تو یوں بھی شہر میں اچھی ہوں۔ وہ مجھے روک لیں گے۔ میں کسی ہی دہائیاں دوں، وہ وقتیش حال کے بغیر مجھے جانے نہیں دیں گے۔ انہیں خانہ پری کی عادت ہوئی ہے، اس کی روزی کھاتے ہیں۔ پھر وہ تھا نا، سوال و جواب، حوالات..... میرا دل ڈوبنے لگا۔ میرے گواہ بہت سے ہیں لیکن صفائیاں اور گواہیاں پیش کرنے میں ایک وقت چاہیے۔ سارے گواہ اسی شہر کے ہیں اور یہ استاد میدا کے زور دار کا علاقہ ہے۔ اس کے آدمیوں کے خلاف گواہی دینے کی جرأت کوئی کس طرح کر سکے گا۔ کبھی میں بھی وہ سارے سبے ہوئے کھڑے تھے اور انہی نے پولیس کو تا نگے اور اس کی سمت کی نشان دہی کی ہوئی۔

طرح طرح کے سودے میرے سر میں منڈ لار رہے تھے۔ سڑک کے دونوں اطراف گھاس نکلتی تھیں۔ بس یہی کچھ میں آتا تھا کہ تا نگے سے کسی گلی میں داخل ہو جاؤں۔ ممکن ہے، ابھی ان کی نظر تا نگے پر نہ پڑی ہو۔ درمیان میں سوار یوں کی نقل و حرکت سے کئی بار وہ بھی میری نظروں سے گم ہو گئے تھے۔ شش و پنج کا وقت نہیں تھا۔ مجھے جلد ہی کچھ طے کرنا تھا۔ میں نے جیب سے کچھ روپے نکال کے اگلی نشست پر بیٹھے کوچوان کی طرف پھینکے۔ اس سے کچھ کہنے سننے میں دقت اور ضائع ہوتا۔

ابھی پولیس دور تھی اور سڑک کے مختصر گھاؤ سے تا نگا پولیس سے اوجھل ہو جانا چاہیے تھا۔ یہ ایک مناسب موقع تھا۔ بیک سنبھال کے میں تا نگے سے کود پڑا اور پندرہ گز دور واقع گلی میں داخل ہو گیا۔ دس بارہ قدم تک میری رفتار تیز تھی۔ مجھے جلد سے جلد خاص سڑک سے دور ہو جانا چاہیے تھا لیکن اس خیال سے کبھی کے راہ گیر میری اس تیزی سے شہے میں پڑ سکتے ہیں، میں نے رفتار کم کی۔ کئی دور تک سیدھ مہر جانی تھی اور ایک چھوٹے سے چوراہے سے دائیں بائیں گھایاں نکلتی تھیں۔ دائیں طرف کی گلی سے اسپتال کا فاصلہ کم ہونے کا امکان تھا۔ احتیاطاً میں نے مخالف گلی کا رخ کیا۔ ایک اور گلی میں مڑ جانے سے اب میں پولیس کو خاص سڑک سے لکھنے والی سیدھی گلی میں نظر نہیں آ سکتا تھا۔

یہ مسلمانوں کا کوئی قدیم محلہ تھا۔ دونوں اطراف مسلمانوں کی خاص طرز تعمیر کے حامل اونچے نیچے، چھوٹے بڑے مکانات بنے ہوئے تھے، پیش تر پرانے۔ جہاں بھی موڑ آتا، میں اسی گلی میں مڑ جاتا۔ اندر بیچ در بیچ گلیاں تھیں، کہیں تک، کہیں کشادہ۔ لگتا تھا، ایک دو دن پہلے نالیوں صاف کی گئی ہیں۔ نالیوں سے نکالی ہوئی سیاہ پتھر اور کوڑے کے ڈھیر جگہ جگہ بڑے ہوئے تھے اور ہر طرف کوئی پوی بسکی ہوئی تھی، کھانا کھینے اور کوڑے کرکٹ سے اچھی ملی جلی ہو۔ سروس کے تیل کی بو ان میں غالب تھی۔ اقامتی علاقوں کی گلیوں میں عموماً ایک دوسرے سے واقف لوگوں کی آمد و رفت رہتی ہے۔ فقیر اور پھیری والے بھی شناسا ہوتے ہیں۔ گلیوں میں کھینٹے ہوئے نیچے، در پچوں اور دروازوں سے جماعتی عورتیں اور راہ گیر مجھے تنہا نظروں سے دیکھتے تھے۔ پوں منہ اٹھائے کبھی کبھی کھونٹے کا جواز پیدا کرنے کے لیے مجھے کسی جگہ گھیر کے کسی کا پتا دریافت کرنا چاہیے تھا۔ مگر کس کا نام لیتا۔

میرے ہوش و حواس ہی ٹھکانے نہیں تھے۔ ایک جگہ آگے جا کے گلی بند ہو گئی تھی۔ اتفاق سے وہاں سبوتا سنانا تھا۔ مجھے سر جھکانے واپس آنا پڑا۔ کسی نے مجھے نوک نہیں تھا۔ مجھے اپنے آپ سے بہت غنٹ ہوئی۔ اندازاً میں خاص سڑک سے خاصی دور آ گیا تھا لیکن اب بھی محفوظ نہیں تھا، متعدد راہ گروں نے مجھے دیکھا تھا۔ پولیس اس گلی میں آگے جہاں سے داخل ہوا تھا، کسی کو میرا جلیبوتا کے میری سمت کے بارے میں معلومات کر سکتی تھی۔ مگر مجھے اپنی جیسی کوشش کرتے رہنا چاہیے تھا۔ میں ایک گلی سے دوسری گلی میں چکر کھاتا رہا۔

گلیوں میں لٹری کی ٹالوں، چونے کے بھٹوں کے علاوہ پرچوں فروشوں اور دیگر گھریلو ضروریات کی چھوٹی موٹی دکانیں قائم تھیں۔ مجھے دیکھ کے دکا دار اور خریدار کچھ کہتے نہیں تو چونکتے ضرور تھے اور ان کی کیکھی نگاہیں مجھے اپنے جسم پر کانٹوں کی طرح پھینتی مسوس ہوتی تھیں۔ ایک خالی دکان دار نے مجھے آواز دے کے روک لیا۔ میں سنی ان سنی کر کے نکل جانا چاہتا تھا لیکن وہ اور مشکوک ہو جاتا۔ وہ پوچھنے لگا کہ مجھے کسی کی تلاش ہے اور میں کون ہوں۔ مجھے نام بتانے میں جھجک ہوئی پھر میری زبان پر بے اختیار مولوی صاحب کا نام آیا۔ اس نے جمرانی کا اظہار کیا اور کہنے لگا کہ وہ اس محلے کے برہمن سے واقف ہے۔ کسی مولوی محمد شفیق کا نام اس نے آج تک نہیں سنا اور پوچھنے لگا کہ آخر کس نے مجھے اس محلے میں مولوی صاحب کے قیام کے بارے میں رو نمائی کیا ہے۔ میں نے کہا کسی نے بھی نہیں، مجھے تو پتہ شہر کے بارے میں کسی نے بتایا تھا۔ مجھے ٹھیک پتا نہیں معلوم، سو میں مسلمانوں کے محلوں میں جا بجا انہیں تلاش کر رہا ہوں۔ میرے جواب سے اس کی میری نہیں ہوئی۔ وہ کوئی جزئیات بتانے، دوسروں کے معاملات میں ناگ اڑانے والا شخص تھا، سوال پر سوال کرنے لگا۔ میری بے رہی پر اس نے مجھے خطا الحواس سمجھایا کچھ اور۔ مجھے سمجھانے لگا کہ بہتر ہے، وقت ضائع کرنے کے بجائے میں کسی اور محلے کا رخ کروں۔ گلی میں آگے جانے کے بجائے میں اس کی ہدایت پر عمل کا تاثر دیتا ہوا وہاں سے لوٹ آیا۔

میری ناگہانیں جواب دینے لگی تھیں۔ خاصا وقت گزر گیا تھا۔ اتنی دیر میں پولیس دور چلی گئی ہوگی۔ پھر بھی احتیاط ضروری تھی۔ پولیس کے ہاتھ پڑ جانے کے بعد اپنی دست و پائی کا مجھے اچھی طرح احساس تھا۔ مجھے خیال آیا، ہول بھی ڈاک خانے سے قریب تھا۔ جس مقام سے میں گلی میں داخل ہوا تھا، وہاں سے اور قریب ہونا چاہیے۔ ہول کے نیچر اور کاؤنٹر پے تعینات نو جوان نے مجھ سے بڑی ہم دردی کی تھی۔ شاید وہی اس وقت میری کچھ مدد کریں۔ پولیس ہول کی طرف نہیں جائے گی۔ کسی کو نہیں معلوم کہ میں گرائڈ ہول میں نصیرا ہوا ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان دونوں شہدوں، اچکوں نے ہول سے نکلنے ہی میرا پیچھا شروع کر دیا ہو اور ڈاک خانے میں جا لیا ہو لیکن کچھ تو ہول میں جانے کا خطرہ تو مجھے مول لینا چاہیے۔ وہاں سے ضرور کوئی راہ نکلے گی۔ یہ سوچ کے میں نے واپس سڑک پر جانے کا قصد کیا اور واپسی کا راستہ کہیں کھو گیا۔ میں اندازے سے چلتا رہا اور چلتے چلتے ایک کھلی جگہ پر آ گیا۔ سامنے لوہے کے جھنگے کی فصیل کے اندر اونچے اونچے درختوں سے گھرا ہوا ایک بڑا باغیچہ تھا۔ باغیچے کے چاروں طرف بڑے مکانات کا سلسلہ تھا اور ایک جانب مسجد بنی ہوئی تھی۔ موزن ظہر کی اذان دے رہا تھا۔ گویا ایک بج رہا تھا۔ ڈاکٹر رائے کمرے میں آچکا ہوگا۔ خرس سیورین نے بتایا تھا کہ وہ وقت کا بڑا پابند ہے۔ مجھے نہ پانے جانے اس نے کیا سمجھا ہو۔ وہ نکل کے بارے میں مجھے کیا بتانا چاہتا ہو۔ میرے تو اب ہاتھ پیر نوٹے جاتے تھے۔ بس یہی جی کرتا تھا کہ وہیں ڈھیر

ہو جاؤں، اپنا سر بیٹوں یا منہ لوچوں۔ میں اب کسی طرح بھی وقت پر اسپتال نہیں پہنچ سکتا تھا۔ موزن اذان ختم کر چکا تو میں نے قریب جا کے دیکھا۔ اس وقت وہاں کوئی نمازی نہیں تھا۔ دروازے کے پاس، مدرسہ حنفیہ کی بوسیدہ تختی آویزاں تھی۔ کوئی طالب علم بھی اندر نظر نہیں آ رہا تھا۔ مسجد سے ملحق موزن یا امام کا حجرہ بھی ہونا چاہیے تھا۔ کیوں نہ میں اس کے پاس جا کے اپنا حال بیان کروں اور اس کے حجرے میں کچھ درپناہ لوں۔ اس طرح مجھے خود کو بحال کرنے کا کچھ وقت مل جائے گا اور پولیس اگر اس طرف آگئی تو مسجد میں داخل ہونے سے اجتناب کرے گی۔ موزن کو میرے بچ پر یقین آ گیا تو وہ بھی میری اعانت سے درپنچ نہیں کرے گا۔ جوتے اتار کے میں نے مسجد کے صحن میں قدم رکھا تو موزن چٹائیاں بچھا رہا تھا۔ وہ اڑی اڑی، بھری بھری ڈاڑھی کا ایک پستہ قد، اوسط عمر شخص تھا، کرنا اور تھپہ سینے ہوئے۔ پیرے پر درپنچ تھی اور خود سے بیزار معلوم ہوتا تھا۔ اس سے کسی نرمی اور مہربانی کی امید بہت کم تھی۔ میں نے پانی طلب کیا تو وہ بے دلی سے کورے میں پانی لے آیا۔ ایک سانس میں کورا خالی کر کے اور چپو ترے کا مختصر زینہ پھیلا لنگ کے میں جلد سے جلد باہر آ گیا۔

مسجد سے وابستہ باغیچے کی شکل بیٹھوی تھی اور اس کے کھمبوں کے ساتھ کسی قدر چوڑی اینٹوں کی سڑک چلتی رہتی تھی۔ سڑک اور باغیچے کے بیچ میں جاگن جھنگے کی سلاخیں جگہ جگہ سے گھڑی یا نکلے ہوئی تھیں جب کہ داخلے کے لیے باقاعدہ دروازے موجود تھے۔ دوسری طرف جانے کے لیے لہبا چکر کانٹے کے بجائے میں نے مسجد کے نزدیک سلاخوں کے درمیان بنے ہوئے راستے سے باغیچے میں قدم رکھا۔ سبزہ برائے نام تھا۔ بچے شاید یہاں کھیلنے ہوں گے اس لیے زمین پر بچھے سبزے کے بیج بچ

میں مٹی نمایاں ہو گئی تھی اور دھبے پڑے ہوئے لگتے تھے۔ اطراف میں کنارے کنارے لٹری کی ٹوٹی پھوٹی بیچیں نصب تھیں۔ اندر خاصا سنانا تھا۔ اب ایک قدم بھی چلنا دشوار ہو رہا تھا کچھ دیر خود کو استوار کرنے کے لیے میں ایک بیچ پر بیٹھ گیا اور چند لمحوں بعد ہی اٹھ گیا کہ میں کسی طور اس غنٹ کا تحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ باغیچے کی دوسری جانب نکلنے ہوئے میں نے خود کو سڑک کی کہ میں کب تک یوں بے سرو پا پھرتا رہوں گا۔ مجھے کوئی پروا کے بغیر یا تو کسی سے راستہ پوچھ کے اسپتال کا رخ کرنا چاہیے یا پھر پولیس کے سامنے خود کو پیش کر دینا چاہیے اور اس سے بہتر ہے کہ مجھے نکلنے میں جامو کا ایک اور تار دینا چاہیے کہ وہ جلد از جلد یہاں پہنچ جائے۔ پہلے مجھے قریب ترین جگہ، گرائڈ ہول پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ مجھے خود تار دینے کا موقع نہ مل سکا تو ہول والے یہ کام کر سکتے ہیں۔ یکا یک میرے دماغ میں شرارہ سا کوندا۔ کیوں نہ میں کسی راہ گیر سے استاد میدا کے اڈے کا پتا پوچھوں۔ یہی میں اس طرح کئی اڈے میرے قبضے میں آگئے تھے۔ میں براہ راست استاد میدا کے پاس جا کے اڈے کی چوکی کا دعوا کرتا ہوں۔ اڈوں کی روایت یہی ہے کہ چانو اور زور آزمائی سے دعوے کا فیصلہ ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے، فیصلہ میرے حق میں ہوگا۔ اتنا تو مجھے خود پر اعتماد ہے۔ ٹھیک بھی مجھ پر یہ اعتماد کرتا ہے۔ استاد میدا کو اس کے اڈے سے میں نے بے دخل کر دیا تو سب کچھ خود بہ خود ختم ہو جائے گا۔ اڈے سے وابستہ ہر آدمی نئے استاد کے زیر نگیں ہوگا۔ وہ تینوں بھی جو ڈاک خانے اور اس سے ملحق گلی میں میرے آڑے آگئے تھے۔ اس وقت اس سے بہتر کوئی تدبیر نہیں ہو سکتی۔ استاد میدا کا اڈا نہیں کہیں آس پاس ہوگا۔ میری رفتار غیر ارادی طور پر تیز ہو گئی اور پھر بہت سے دھندلے اندیشوں نے مجھ پر یورش کی۔ اگر نتیجہ مختلف ہوا! ساری چیزیں موافق ہوں تو بھی

بد قسمتی اور ان ہونی کا ایک فی صد امکان ہمیشہ موجود رہتا ہے اور محفوظ رکھنا چاہیے۔ یہاں کے اڈوں کے طور طریقے الگ بھی ہو سکتے ہیں۔ استاد میدا کوئی بہت کمینہ اور سفلہ شخص بھی ہو سکتا ہے۔ ادھر ٹھل اپنی ہل میں پڑا ہے۔ مجھے پہلے تو اس کی فکر کرنی ہے۔ اس کے لیے خود کو محفوظ کرنا ہے۔ چاقو کے ساتھ کسی کے مقابل ہونے میں ایک سو فی صد شرط ہے۔ اور تا کا می کی صورت میں کچھ بھی ممکن ہے، ذرا سی چوک ہوگی تو تانی کی گنجائش نہیں ہوتی۔

مجھے کچھ اور سوچنے، کسی اور طرف غور کرنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ بائیس کے اس جانب سامنے پڑنے والی پہلی گلی کے پار کوئی بڑی سڑک تھی۔ وہاں راہ گیروں اور سواروں کی کثرت سے آمد و رفت دکھائی دیتی تھی۔ پہلے تو مجھے گمان ہوا، یہ وہ سڑک تو نہیں جہاں سے میں چلا تھا مگر دور، بہت دور پائی نظر آ رہا تھا۔ یہ لگا نڈی ہی ہو سکتی تھی۔ بائیس کے نکل کے میں سامنے والی گلی کی طرف بڑھ رہا تھا کہ عقب سے جھن بھنا تا شور سنا لیا۔ پیچھے دیکھے بغیر میں ایک جانب ہو گیا پھر ایک درخت کی آڑ سے میں نے دیکھا کہ دوسری جانب، بائیس کے پار، مسجد سے نزدیک گلی کے دہانے پر کئی سائیکل سوار سپاہی سائیکلیں روک کے ادھر ادھر نظریں گھما رہے ہیں۔ ان کے ساتھ اور لوگ بھی تھے۔ وہ گلیوں کے لوگ ہی ہوں گے۔ تماشا ہونا چاہیے، تماشا سبوں کی کی نہیں۔ مجھے یہی خدشہ تھا، گلیوں میں متعدد لوگوں نے مجھے گھومتے دیکھا تھا۔

میرے اور پولیس کے درمیان بائیس کا فاصلہ اور بائیس کے درختوں اور پینٹے پر چڑھی بیلوں کا پھدرا پردہ حائل تھا۔ یہی ایک راستہ رہ گیا تھا کہ اپنے آپ کو چھپانا ہوا سامنے والی گلی تک پہنچ جاؤں۔ اس گلی میں بھی مکانات کا سلسلہ تھا۔ روپوش ہونے کی وہیں کوئی بہتر جگہ مل سکتی تھی۔

بھاگنا کسی طور مناسب نہیں تھا۔ بائیس کے ساتھ گھومتی ہوئی نسبتاً چوڑی سڑک پار کر کے میں تیز قدموں سے گلی میں آ گیا اور مجھے سیڑیوں کی گونج سنائی دی۔ انہوں نے مجھے دیکھا یا نہیں، مڑ کے دیکھنے کا مجھے پارانہیں تھا۔ گلی کے نکل ہی پر کسی چھوٹی جوبلی کی طرز کا ایک دو منزلہ پرانا مکان بنا ہوا تھا۔ گلی میں سیدھے چلتے رہنے سے نظر آ جانے کا امکان تھا۔ کڑوالے مکان کی ڈیوڑھی کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں اسی میں داخل ہو گیا۔ اندر روشنی کم تھی۔ کسی کمرے کے بہ قدر اس ڈیوڑھی میں تین دروازے تھے، ایک سامنے اور دو دائیں اور بائیں۔ دائیں ہاتھ کا دروازہ نزدیک تھا۔ میں نے آہستہ سے دستک دی۔ کوئی جواب نہیں ملا تو میں نے ایک کے بائیں طرف کا دروازہ کھٹ کھٹایا اور احتیاطاً جب سے چاقو نکال لیا۔ کسی مردانہ آواز نے اندر سے پوچھا۔ ”کون ہے؟“

میں نے پہلے اپنی آواز پر قابو پانے کی کوشش کی اور دلی زبان سے کہا۔ ”دروازہ کھولے۔“

”کون..... کون ہو میاں؟“ اندر سے وہی بھاری بھر کم آواز آئی۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو میں نے جلدی سے کہا۔ ”ذرا باہر آئیے۔ آپ کے لیے ایک پیغام ہے۔“

میری بات پوری سننے سے پہلے ہی اس شخص نے دروازہ کھول دیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ چونک پڑا اور مضطرب نظروں سے دیکھا گیا۔ کمرہ اونچائی پر تھا۔ ایک قدم کی میزگی پر پاؤں رکھ کر ہی اوپر جانا ممکن تھا۔ مجھے اسے کوئی وقت نہیں دینا تھا۔ صورت حال سمجھنے اور کوئی نتیجہ اخذ کرنے کا۔ یوں بھی آنے والے لمحے اس کے تصور سے بعید ہوں گے۔ منظر کی اس اچانک تبدیلی سے متوازن آدمی بھی ہے تو اوزن ہو جاتا ہے۔ آنکھ سنی جلد دیکھ لیتی ہے، ذہن اتنی جلد قبول نہیں کرتا۔ میں نے ایک چہرہ میزگی پر رکھا،

دوسرے لمحے اسے پیچھے دھکیلتا ہوا میں کمرے کے اندر تھا۔ میں نے چاقو کھول لیا۔

وہ ترشی ہوئی داڑھی، سرخ و سپید رنگت، طویل قامت، بھاری بھر کم بنے، تیکھے خال و خط، لمبل کے مکلف کرتے اور پا چاہے میں لمبوس پچاس سے پچپن کی عمر کا ایک دو بیہ شخص تھا۔ بشرے سے کوئی نواب لگتا تھا۔ کمرے میں خاصی روشنی تھی۔ میں نے طائرانہ نظر سے کمرے کا جائزہ لیا۔ فرش کے وسط میں قالین بچھا ہوا تھا۔ ارد گرد کرسیاں رکھی اور دیواروں سے بیوستہ شخصے کی الماریوں میں کتابیں بھی ہوئی تھی۔ کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں اور ان پہ پردے لگے ہوئے تھے۔ چوکی پر موجود افراد میں ایک کم عمر لڑکا تھا، بھگتی مسوں کا۔ دونو جوان لڑکیاں تھیں اور ایک سن رسیدہ عورت تھی۔ مجھے دیکھتے ہی ان کی چٹپٹیں نکل گئیں پھر بدحواسی سے عورتوں نے دو بچوں سے پھرے پھیالے اور چوکی کے پاس گھر کے اندرونی حصے میں چھلنے والے دروازے سے بھاگنا چاہا۔ میری دھمکتی آواز نے انہیں ساکت کر دیا۔ ”کوئی نہیں، کوئی بھی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرے گا۔ سب اسی کمرے میں رہیں گے۔“

میں نے کہا۔ ”کوئی بھاگنے کی کوشش نہ کرے۔“

دروازہ کھولنے والا شخص میرے چاقو کی زد پر تھا اور بری طرح بوکھلا گیا تھا۔ ”کون، کون ہوتم؟ کیا..... کیا چاہتے ہو؟“ وہ پھلائی آواز میں بولا۔

میرا چاقو اس کی گردن کے نزدیک تھا اور میں نے اس کا دایاں بازو اپنے بازو میں جکڑ لیا تھا۔ سامنے چوکی پر بیٹھے گھر کے افراد کے آگے دسترخوان بچھا ہوا تھا اور کھانا رکھا تھا۔ میرا وجود ان کے لیے کسی بھیما تک خواب کے پابند ہوگا۔ گو میری حالت بھی ان سے کچھ مختلف نہیں تھی۔ میں اندر ہی اندر پانپ سا رہا تھا۔ انہیں میری کیفیت کا کوئی اندازہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں نے خود کو جمع رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی اور بہ ظاہر دھمکتی آواز میں

پوچھا۔ ”گھر میں اندر اور کون کون ہے؟“

”کوئی نہیں، کوئی بھی نہیں، صرف ایک ملازمہ ہے۔“ مرد نے بہ مشکل کہا۔ ”اور..... اور.....“

”اور کون؟“ میں نے اپنے لہجے میں سفاکی قائم رکھنے کی ڈھٹائی کی۔

”اور میری بیمار والدہ۔“ اس نے بہ غلٹ جواب دیا۔ ”وہ..... وہ چل پھر نہیں سکتیں۔“

”ملازمہ کو اندر بلاؤ۔“ میں نے سرد مہری سے کہا۔

اس نے پھینچی ہوئی آواز میں چوکی پر بیٹھے ہوئے نوخیز لڑکے کو مخاطب کیا۔ ”زینی، زینی! جاؤ، جا کے راجہ سے کہو، وہ فوراً یہاں آجائے۔“ ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے تیز اور شستہ انگیریزی میں زینی کو واپس نہ آنے اور پڑوسیوں کو مطلع کرنے کی ہدایت کی۔

زینی کے دیدے باہر نکلے ہوئے تھے اور بیٹھے کا سا عالم طاری تھا۔ اس کے پیلو سے تپکی ہوئی دہشت زدہ ادھیڑ عورت کے کہنی مارنے پر وہ جڑ بڑا گیا۔ وہ چوکی سے اٹھ پڑا تھا کہ میری آواز پر اس کا سراپا متلاطم ہوا اور وہ ہیں ڈھیر ہو گیا۔

”تم نہیں نہیں جاؤ گے، اپنی جگہ سیدھے بیٹھے رہو گے۔“ میں نے سچ کر کہا۔ ”ملازمہ کو یہیں سے آواز دو۔“ میں بھی اسے انگیریزی میں حکم دے سکتا تھا لیکن میں نے دانستہ اجتناب کیا۔

زینی کے بجائے ادھیڑ عورت نے خفحانی انداز میں ”راجہ راجہ“ کی گردان شروع کر دی۔

”میں نے کہا یا تم سے، میری والدہ بیمار ہیں۔“ مرد نے سراپتگی سے کہا۔ ”ملازمہ انھی کے پاس ہوگی۔ وہاں تک شاید آواز.....“

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ مزید کیا کروں، کون سا حکم دوں۔ میں نے ایک بار پھر کمرے کا جائزہ لیا۔ کھلی کھڑکیوں پر پردے لگے ہوئے تھے۔ چوکی کے برابر گھر میں داخلے کے لیے ایک ہی دروازہ تھا

اور کھلا ہوا تھا۔ دونوں نوجوان لڑکیاں، ادھیر عورت، غالباً اپنی ماں سے چمٹی ہوئی تھیں۔ انہوں نے دو بچوں سے چہرے ڈھانپ لیے تھے اور ان کے بدن کانپ رہے تھے۔ کھلے دروازے سے ملازمہ کسی بھی وقت اندر آسکتی تھی اور کوئی اور بھی..... یہ ظاہر گھر میں کسی اور افراد کی موجودی کا امکان نہیں تھا اور نہ کھانے کے وقت بھی اس کمرے میں جمع ہوتے۔ میں نے خود کوسلی دی۔ کوئی اور آ بھی جائے تو کیا ہے۔ اسے بھی روکا جاسکتا ہے۔ جب تک میری گرفت میں گھر کا کوئی ایک فرد ہے، مجھے خاطر جمع رکھنی چاہیے۔ یہ سارا پرہاگھوا، آسودہ حال گھرانا معلوم ہوتا ہے۔ تعلیم یافتہ اور آسودہ حال نسبتہ ہوش مند ہوتے ہیں۔ طرح طرح کے اندیشے وسوسے ان کے ذہنوں میں نمود پاتے رہتے ہیں۔ چینی دیران پر میری ہیبت رہے گی، یہ کسی نادانی کے مرتکب نہیں ہوں گے۔ اور میرا مقصد کسی کو زک پہنچانا بھی نہیں ہے۔ مجھ سے تو ان کی یہ حالت بھی دیکھی نہیں جاتی۔ میرے لیے اپنی نوعیت کا یہ پہلا واقعہ ہے تو انہیں بھی ایسی ناگہانی سے کہاں واسطہ پڑا ہوگا۔ تاہم مجھے اپنی شقاوت کا تاثر انہیں دینے رہنا چاہیے۔

چند منٹ کا وقفہ قہرستان کی سی خاموشی کا گزر گیا۔ میری نظریں کمرے میں چاروں طرف بھٹکتی رہیں۔ مجھے احساس تھا کہ سکوت کے یہ لمحے ان پر عذاب کے مانند گزر رہے ہوں گے۔ اس طرح گھر میں داخل ہونے والا شاید ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرنا ہو، میری آمد کا مقصد اور میرے اگلے اقدام کے بارے میں جاننے کے لیے یہ بہت متوش ہوں گے۔ سکوت کا یہ عرصہ میرے لیے بھی نقصان دہ ہو سکتا ہے۔ ان میں جرات عود کر سکتی ہے۔ یہ مجھے کوئی پائل دیوانہ نہ سمجھ رہے ہوں۔ یوں مجھے مذہب و مترودد کچھ کے یہ میرے بارے میں اپنی رائے نہ بدل دیں۔ مجھے کوئی نہ کوئی حرکت کرتے

رہنا چاہیے لیکن اور کیا؟ میں اور کیا کر سکتا ہوں؟ مناسب یہی ہے کہ مجھے سب کچھ صاف صاف انہیں بتا دینا چاہیے۔ سب پر ایک عالم بیجان واضطراب طاری ہے۔ زندگی بھر کے لیے اس وقت کی دہشت ان پر نقش ہو سکتی ہے۔ آئندہ کوئی کسی نفسی پیچیدگی کا شکار بھی ہو سکتا ہے۔ ایسا کچھ ہوا تو کیا میں خود کو معاف کر سکوں گا۔ لڑکیوں کا حال تو سب سے خراب ہے۔ ان کے چہروں پر بہت سادگی، شائستگی اور مصومیت ہے۔ یہ کسی سزا، کس جرم کی سزا وہ بھگت رہی ہیں۔ کوئی بھی اوسان کھو سکتی ہے۔ ان کی استطاعت سے سوا مجھے ان کا امتحان نہیں لینا چاہیے۔ کسی اور طرح بھی میں ان سے پیش آسکتا ہوں۔ چاقو تو بہر حال میرے ہاتھ میں ہے اور یہی سب کچھ ہے۔ میری ساری توانائی میرا ہشت بھر تھیار ہے۔ ایک ہتھیار بدست کے آگے سو آدمی بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ وہ مجھ پر یقین کریں یا نہ کریں۔ مجھے جتنا وقت مطلوب ہے، وہ تو مل ہی جائے گا۔

میں نے عواقب پر غور کرنے کے بعد مرد کا جکڑا ہوا بازو آزاد کر دیا۔ وہ پلٹیں بھجھکانے لگا اور اس نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ ”آپ کرسی پر بیٹھ جائیں۔“ میں نے ظاہری رعوت سے کہا۔ ”اور خیال رہے، میرا ہاتھ خالی نہیں ہے اور نشانہ بھی برا نہیں۔ آپ مجھ دار آدمی ہیں۔ بہتر ہے، جیسا میں کہتا ہوں، مرد دست اس پر عمل کیجیے۔“

کرسی پر بیٹھ جانے کی رعایت پر اسے مزید حیرت ہوئی۔ اس نے چمکی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ ان میں غصہ بھی تھا، تجسس اور خوف بھی۔ وہ فوراً ہی کرسی پر بیٹھ گیا اور جھکتے ہوئے کرتے کی آستین سے پیشانی کا پینہ پونچھا۔ میں اس کے قریب ہی رہا۔

”آپ، آپ، آپ کیا چاہتے ہیں میاں؟“ اس نے نکلت نکلت خورہ آواز میں بدقت لب کشائی کی۔

”کچھ نہیں۔“ میرے منہ سے نکل گیا اور میں نے چاقو اچھال کے دوبارہ ہاتھ میں اچک لیا۔ اپنے اس اضطراب اور مشافی کے بے اختیار اظہار پر مجھے خود سے بیزار ہی ہوئی۔ ”میری بات دھیان سے سنیے اور اپنے ہوش و حواس قائم رکھیے۔“ کچھ نامل کے بعد میں نے وہی آواز میں کہا۔ ”میں چوری ذہنی کے ارادے سے آپ کے گھر میں داخل نہیں ہوا ہوں۔ مجھے یہاں سے کچھ نہیں چاہیے صرف تھوڑا سا وقت..... مجھے آنسو ہے کہ میں نے آپ کو ناحق ایسی بدترین آزمائش سے دوچار کیا ہے۔ یہ جبر، یہ دیدہ دلیری ایک ناقابل معافی جرم ہے بلکہ یہ تو کوئی گناہ ہے لیکن میری کچھ مجبوری ہے جو مجھے آپ کے ہاں اس طور سے پناہ لینی پڑی۔ میرے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ آپ لوگ خاموشی سے بیٹھ کر اور مشکل وقت گزار دیں تو..... میں.....“ لفظ ذہن میں منتشر ہو گئے۔ ممنونیت اور احسان کے لفظ بہت توج تھے۔ مجھ سے یہ سب کچھ نہ کہا جاسکا۔

”کیا، کیا بات ہے؟“ مرد کی آواز میں پہلی مرتبہ ٹھہراؤ آیا۔

میرے نرم اور ندامت زدہ لہجے سے چوکی پر بیٹھی خواتین اور زینبی نامی لڑکے کی بھی یقیناً کچھ تسلی ہوئی ہوگی۔ میں نے ان کی طرف دیکھا۔ ”میں اس شہر میں اجنبی ہوں۔“ میں نے اپنی بھری ہوئی آواز استوار کرنے کی کوشش کی۔ ”کل رات ہی میں اپنے بڑے بھائی کے ساتھ بننے آیا ہوں۔ ہماری منزل بردوان تھی۔ ہم فیض آباد سے ریل میں بیٹھے تھے کہ اکبر پور ریشن پر انجن میں خرابی پیدا ہو گئی۔ ساری گاڑی بیک ایک جھٹکے کھانے لگی۔ رات کا وقت تھا اور مسافر ایسے بیدار نہیں تھے۔ کئی مر گئے، بہت سے زخمی ہوئے۔ کسی شدید جھٹکے سے میرے سونے ہوئے بھائی کا سر بھی ڈبے کی دیوار سے ٹکرا گیا تھا

لیکن اس وقت ایسی کوئی فکر کی بات نہیں معلوم ہوتی تھی۔ آگے راستے میں بھائی کے سر کی تکلیف بڑھتی گئی اور سرفاتوی کر کے ہم پناہ لگے۔ گرائڈ ہوٹل میں کمرالے کے اور سامان رکھ کے ہم نے پناہ میڈیکل کالج اسپتال کا رخ کیا۔ وہاں ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر مرض کی نوعیت نہ سمجھ پائے۔ وہ اسپتال کے بڑے ڈاکٹر، ڈاکٹر رائے کو نا وقت زحمت دینے سے بچکا رہے تھے۔ بڑی منتوں کے بعد آمادہ ہوئے۔ ڈاکٹر رائے نے مہربانی کی، اپنے اصول توڑ کے وہ اسپتال آ گیا۔ بھائی کا توجہ سے معائنہ کیا مگر اندرونی چوٹ کی وجہ سے وہ بھی کئی طور پر کچھ بتانے سے قاصر رہا۔ بہر حال اس نے کچھ دوامیں تجویز کیں۔ اس کی ہدایت پر ہمیں ایک الگ کمرے میں منتقل کر دیا گیا۔

”رات بھر بھائی پر غفلت طاری رہی۔ صبح ان کے کئی ایکس رے لیے گئے۔ ڈاکٹر رائے دوپہر ایک بجے دوسری بار معائنے کے لیے کمرے میں آنے والا تھا۔ دوپہر تک میرے پاس خاصا وقت تھا لیکن وہاں سے ہنسنے کود لیں مانتا تھا۔ کمرے میں تعینات مہربان اور مستعد نرس کی مستقل نگہداشت اور اس کی یقین دہانی پر کہ میں ہوٹل جا کے ڈاکٹر رائے کی آمد سے پہلے واپس آسکتا ہوں، میں اسپتال سے نکل آیا۔ تانگے والے نے میری توقع سے کم وقت میں مجھے ہوٹل پہنچا دیا۔ جیسا کہ میرا خیال تھا، ہوٹل کا عملہ ہمارے بارے میں فکر مند تھا۔ گزشتہ رات سامان رکھ کے ہم وہاں سے چلے گئے تھے اور اسپتال میں ٹھہرے جانے کی وجہ سے واپسی ممکن نہ ہو سکی تھی۔ ہوٹل میں لباس تبدیل کرنے اور فیجر کو ساری صورت حال سے آگاہ کرنے کے بعد اتنا وقت تھا کہ میں ڈاک خانے بھی ہو آؤں۔ تانگا مجھے ڈاک خانے لے گیا۔ دو ضروری تاروں کے میں وہاں سے نکلا ہی جا رہا تھا کہ ایک نوجوان دیوار بن کے سامنے کھڑا ہو گیا اور تار فارم پر کسی عزیز کے

نام اپنی ماں کی بیماری کی اطلاع لکھوانے کے لیے عاجزی کرنے لگا۔ میرے پاس وقت کم تھا اور صاف انکار بھی نہیں کیا جا رہا تھا۔ اسی شش و پنج میں تھا کہ ایک اور نوجوان سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس کے ہاتھ میں بھی تار فارم تھا۔ پہلے والے کی طرح وہ بھی میرے پیچھے بڑ گیا۔ وہ تو مجھ سے چٹ ہی گیا تھا۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ دونوں ساٹھی ہیں اور تار فارم پر پیغام نویسی کے لیے اتنی منت گزاری ایک جیل ہے، مقصد ان دونوں کا کچھ اور ہے۔ ان سے گھوڑی کی کش مکش کے دوران بعد کو آنے اور مجھ سے چٹ جانے والا نوجوان میری جب سے بڑا نکال چکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں صفائی نہیں تھی یا گھبراہٹ میں ہاتھ اوچھڑا چکا تھا کہ دوسرے لمحے مجھے اس دست درازی کا احساس ہو گیا۔ میرا ہاتھ اس کی گردن تک پہنچ جاتا کہ ادھر پہلے والے نوجوان کی عاجزی میں شدت آ گئی۔ اس نے میرا بازو جکڑ لیا تھا۔ اس سے بازو چھڑانے میں کچھ دیر لگی۔ اس اثنا میں جب کتر نوجوان ڈاک خانے سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے اس کا تعاقب کیا۔ وہ بھاگتا ہوا ڈاک خانے سے ملحق کئی میں داخل ہو گیا۔ غالباً یہ جان کے کہ میں اس کے تعاقب سے باز آنے والا نہیں ہوں، کئی میں کچھ اندر جا کے وہ ایک جگہ ٹھہرا گیا اور اس نے چاقو نکال لیا۔

”کاش میں وہاں سے لوٹ آتا۔ اس کے ہاتھ میں کھلے چاقو اور مشتعل تیروں نے مجھے بھی اندھا کر دیا۔ اسے سمجھنا چاہیے تھا کہ چاقو کے معاملے میں مجھے بھی کوئی شہ بد ہو سکتی ہے۔ میں نے اسے جلد ہی پس پا کر دیا۔ اپنا ہوالے کے میں نے کئی سے باہر نکلنے کا ارادہ کیا۔ کچھ فاصلہ طے کر لیا تھا کہ نوجوان کے دو اور ساتھی چاقو گھماتے ہوئے ڈاک خانے کی سڑک سے کئی میں آتے دکھائی دیے۔ انہوں نے میرے باہر نکلنے کا راستہ بند

کر دیا۔ میں نے ان سے بہت کہا کہ مجھے اپنے پیار بھائی کے پاس اسپتال پہنچنے کی جلدی ہے۔ انہوں نے ایک نہیں سنی، مجھے دھتکا کر دیا۔ میں نے ہوا واپس کرنے کی بھی پیش کش کی لیکن وہ تو کچھ طے کر کے آئے تھے اور جانے کس گمان میں تھے، بار بار میدان نامی اپنے کسی استاد کا حوالہ دیتے تھے۔ ان میں ایک نسبتاً مشاق چاقو باز معلوم ہوتا تھا۔ دونوں نے مجھے گھیر لیا۔ قریب ہی اپنے بے سدھ بڑے ساتھی کی شکستہ حالت نے انہیں اور غضب پر آمادہ کیا۔ میرے پاس ان سے منسنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ کئی میں کھڑے لوگوں نے کوئی دخل اندازی نہیں کی۔ وہ تماشا دیکھتے رہے۔ میرے پاس بھی چاقو تھا۔ بات بڑھ جانے کے خیال سے میں نے جب ہی میں رہنے دیا۔ تفصیل سے کچھ حاصل نہیں، مختصر یہ کہ میں نے پختہ کار آدمی کو کسی طرح زیر کر لیا۔ وہ اپنے ہاتھ میں چاقو برتر رکھ کر کا نوزاں، نہ خود پر اپنا اختیار۔ اس غیر متوقع صورت سے اس کا نوجوان تو آموز ساتھی بے قابو ہو گیا اور چاقو کھولے کسی پائل کی طرح مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اس پر تو جیسے خون سوار ہو گیا تھا۔ اپنی جھوک میں وہ اتنی تیزی سے بڑھا تھا کہ میرے لیے خود کو اور اپنے قبضے میں آئے اس کے بے حال ساتھی کو بچانا مشکل ہو گیا تھا۔ ظاہر ہے، پہلے مجھے اپنے آپ کو محفوظ کرنا تھا۔ اس نے کچھ نہیں دیکھا کس کا ساتھی بھی زد پر آسکتا ہے، کیوں کہ وہ میری گرفت میں ہے اور خود کو بچانے کے لیے میں اسے سامنے کر سکتا ہوں۔ میں نے بہت کوشش کی کہ اس کی دیوانگی سے میرے ساتھ اس کا ساتھی بھی محفوظ رہ سکے۔ میری کوشش بس اسی حد تک کارگر رہی کہ چاقو پیٹ میں چھبنے کے بجائے پھل میں بیوست ہوا۔ نوجوان اپنی نادانی کے اس انجام سے حواس کھو بیٹھا۔ اسے قابو میں کرنا پھر میرے لیے دشوار نہیں رہا۔ چند ضربوں میں وہ چکرا کے زمین پر گر گیا۔ اس سانحے کے بعد کچھ وہ

خود بھی بے خبر ہو جانا چاہتا ہو گا۔

”دونوں کو ان کے حال پر چھوڑ کے میں نے دوبارہ وہاں ہی کا ارادہ کیا، پھر کوئی میرے راستے میں مزاحم ہوا نہ میں نے پلٹ کے دیکھا۔“

”تاہم ڈاک خانے کے باہر میرا منتظر تھا۔ پندرہ بیس منٹ کا فاصلہ تانگے نے طے کیا ہو گا کہ پولیس کی بیٹیاں سنائی دیں۔ لوگوں نے مجھے تانگے میں بیٹھے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ انہی نے تانگے کی سمت کا بھی اشارہ کیا ہو گا۔ کوئی اور وقت ہوتا اور کوئی جگہ ہوتی تو میں خود کو پولیس کے حوالے کر دیتا لیکن پولیس کے طریق کار کا مجھے تصور بہت علم ہے۔ وہ ایسے، میری روداد کن کے اور میرا بیان لے کے مجھے واپس جانے نہیں دیتے۔ ان کے نرنے میں آجانے کے بعد میں وقت پر کسی طرح اسپتال نہیں پہنچ سکتا تھا۔ یہاں میرا کوئی واقف کار نہیں۔ اگر چنگی کے مکین اور راہ گیر سارے واقف کے شاہد ہیں لیکن صاف نظر آ رہا تھا، ان پر بھی استاد امیدا کے زور و اثر کی ہیبت چھائی ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ انہوں نے مداخلت نہیں کی۔ سڑک کے دونوں اطراف گلیاں نکلتی تھیں۔ بس یہی اس وقت دماغ میں آیا کہ تانگے سے اتار کے کئی گلی میں خود کو روپوش کر دوں۔ پولیس ابھی کچھ دور تھی، سڑک کے ایک سوڑ پر میں تانگے سے کود پڑا اور چند گز دور درامیں جانب کی پہلی گلی میں داخل ہو گیا۔ ان گلیوں کے طول و عرض کا مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا لیکن ایسی بھول بھلیاں گلیاں ہر بڑے اور پرانے شہر میں ہوتی ہیں۔ میرا خیال تھا، ان سچ در سچ گلیوں میں پولیس کی دست رس سے نسبتاً محفوظ رہوں گا اور کہیں، کسی جگہ اسپتال کی طرف جانے والا راستہ مل جائے گا۔ میں ایک گلی سے دوسری، دوسری سے تیسری میں بھٹکتا رہا اور آپ کے گھر کے قریب مسجد اور باٹیچے تک چلا آیا۔ میں نے باٹیچہ تقریباً عبور کر لیا تھا کہ دوسری جانب سے سانکھوں پر سوار پولیس اور

لوگوں کا شور مچانا ہجوم دکھائی دیا۔ میرے اور ان کے درمیان باٹیچے کا فاصلہ اور باٹیچے کے درختوں اور پتوں سے چڑھتی بیلیوں کا چھپرہ پرہہ حائل تھا۔ ان کی نظروں سے بچتا بچاتا باٹیچے سے پورے چوڑی سڑک عبور کر کے میں آپ کے گھر والی گلی میں آ گیا۔ گلی سیدھ میں ہے، آگے جانے میں دکھائی دیے جانے کا اندیشہ تھا۔ ناچار میں نے گلی کے کھڑے اس پہلے مکان، آپ کے مکان پر دستک دے دی۔“

میرا گلابی طرح خشک ہو رہا تھا۔ میں نے ان سے کچھ نہیں چھپایا تھا۔ اب باقی ان پر تھا کہ وہ کیا اخذ کریں۔ شاید یہی کچھ جاننے کی غیر شعوری جستجو میں، میں نے ٹھیکرے چوکی پر بیٹھی خواتین اور لڑکے زینتی کو ایک نگاہ دیکھا۔ وہ سب میری طرف متوجہ تھے۔ مجھ سے نگاہیں ملیں تو وہ اپنی اپنی جگہوں پر ڈنگا سے گئے۔ لڑکیوں نے مضطربانہ سر جھکا لیے اور دو بڑے سروں پر اور کھینچ لیے۔ اب وہ باہم ایسی سکڑی گئی ہوئی نہیں تھیں۔ زینتی کی آنکھیں بھی جبرتی انداز میں کھلی ہوئی تھیں اور اس کا جسم بھی تنا ہوا تھا۔ میرے مخاطب، کرسی پر بیٹھے گھر کے گراں مرد کے چہرے پر چھائی زردی کے بجائے سرخی واپس آگئی تھی۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد میں نے جگڑی ہوئی آواز میں کہا۔ ”یہ گھر نہ ہوتا تو کوئی اور گھر ہوتا اور کچھ اور لوگ ہوتے۔ میرے پاس انتخاب کا وقت نہیں تھا۔ میرے لیے ہر جگہ ایک جیسی تھی۔ مجھے تو ایک پناہ گاہ چاہیے تھی۔ دوسرا کوئی گھر ہوتا تو وہاں بھی مجھے کچھ اسی ناروا، ناز بنا سلوک کا مرتکب ہونا پڑتا۔ میں آپ کو بتاؤں، یہ میرے لیے اتنا ہی جبر ہے جتنا آپ کے لیے۔“

میں نے دوبارہ معافی مانگی۔ ”میری وجہ سے پردہ نشین خواتین کی بے پردگی ہوئی۔ آپ لوگ کھانے میں مصروف تھے اور کھانے کے بعد جانے آپ کے کیا معمولات ہوں، میں نے آگے سب درہم برہم

کر دیا۔ اطمینان رکھیے، کچھ دیر میں، مجھے یہاں سے چلے جانا ہے۔ امکان یہی ہے، پولیس اس علاقے سے ناکام ہو کے کسی اور طرف نکل گئی ہوگی۔ مجھے بہر حال پولیس کے ہاتھ نہیں آتا، اسپتال پہنچنا ہے۔ ڈاکٹر کے بارے میں نرس نے بتایا تھا، وہ وقت کا بڑا پابند ہے۔ وہ آگے کب کا چلا گیا ہوگا۔ کمرے میں میری ناموجودی پر اس نے جانے کیا سمجھا ہو۔ گزشتہ رات میں نے اس سے بڑی محبت کی تھی، سارا اسپتال سر پہ اٹھالیا تھا۔ وہی شخص جو کل رات اور آج صبح اپنے مریض کے لیے اتنا بے قرار تھا، وہی شخص..... میری آواز بھرا گئی۔ ”ڈاکٹر کیا کہتا ہو گا اور معلوم نہیں..... ان کا، بھٹل بھائی کا کیا حال ہو۔ ساری غلطی میری ہے۔ میں نرس کے کہنے میں آگے اسپتال سے نکلتا نہ یہ سب کچھ پیش آتا۔“

”اب تو وقت گزر رہی چکا ہے۔“ بہت دیر بعد کرسی پر بیٹھے مرد نے زبان کھولی۔ ”مناسب سمجھیں تو آپ بھی بیٹھ جائیں میاں۔“

مجھے اپنے کانوں پر شبہ ہوا مگر یہ اسی کی آواز تھی، نرم اور مشتاقانہ۔ مجھے ٹھنڈی ہوا کے کسی جھونکے کا احساس ہوا۔ یعنی میری صراحتیں رانگاں نہیں گئیں۔ مبہم و مبہوم کسی مگر مجھے توقع تھی، ان کا جواب یہی ہونا چاہیے۔ اپنا احوال سنا کے میری گراں باری کسی قدر نرم ہوئی تھی، اب مجھے اپنی گرہیں کچھ اور کھلتی محسوس ہوئیں۔ تاہم اسی لمحے کوئی تند و تیز لہر میرے وجود میں درآئی کہ یہ تو میں جانتا ہوں، میرا بچ، کسی سچ کے طور پر کارگر ہونا چاہیے مگر یہ تو اس پر منحصر ہے کہ اپنے گھر میں میری غاصبانہ آمد اور میرے شروع کے سفاکانہ رویے سے یہ کتنا منقطع اور متفر ہو چکا ہے۔ سچ کے پودے کی حکم ریزی کے لیے بھی نرم و نرم زمین چاہیے، اور شاید چھ ایسا ہے کہ آدمی سچ پر اتنا قادر نہیں جتنا محبت پر ہے۔ سچ بہت نایاب ہے، اس لیے اس

کی دست یابی پر مشکل سے یقین آتا ہے۔ اور ساعت آلودہ ہو تو سچ بھی دھندلا جاتا ہے، نارسا رہتا اور نامعتبر ٹھہرتا ہے۔ اس نے کسی اور تاثر، میری بابت کسی نئی تاثر میں وہ سب کچھ سنا ہے، جو میں نے کہا ہے تو زہر کی طرح اس کے کانوں میں سرایت ہونا چاہیے۔ مجھے صلہ دینے کا ہر جواز اس کے پاس ہے۔

آدمی تو آدمی ہوتا ہے۔ اس کے سینے میں مثنوی تیزی سے آگ بھڑکتی ہے، اتنی تیزی سے بھکتی نہیں۔ مجھے اس کی افتاد طبع اور رسمی پیچیدگیوں کا کچھ علم نہیں تھا۔ آدمی چہرے مہرے، قامت و رنگ میں کتنے ہی مشابہ ہوں، ان کے باطنی خصائل بہت جدا جدا ہوتے ہیں۔ سولے بھر کی بدگمانی نے مجھے منتشر کر رکھا کہ اس کی خوش خلقی میں بدغولی کا کوئی پہلو تو مظہر نہیں۔ میں نے ایک اچھتی نظر سے یہ ہر زاویہ اس کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ اس کی حالت اب پہلے جیسی نہیں تھی، وہ اب خاصا پر اعتماد لگ رہا تھا۔ اس اعتماد کا سبب بھی میں تھا۔ کرسی پر بیٹھ جانے کی اس کی خواہش کی تعمیل میں مجھے ایک ذرا تردد ہوا تھا اور میں نے خود کو سرزنش کی کہ میرا اعتماد کیوں متزلزل ہے۔ یوں بھی مجھے کتنی دیر یہاں ٹھہرنا ہے اور ہتھیار تو اب بھی میری تحویل میں ہے۔ میں اس کے پہلو کی کرسی پر بیٹھ گیا اور مجھے چائو کھلا رکھنا بھی ناگوار گزارا۔ میں نے اسے بند کر کے جیب میں ڈال لیا۔

اس نے جھجھکی سی لی اور گہری سانس بھر کے کرسی کے سرہانے سے سر نکال دیا۔ یقیناً اتنی کشاکش کے بعد دل و دماغ کی یک جانی کے لیے اسے کچھ مہلت درکار ہوگی۔ چند ثانیے اس کی یہی کیفیت رہی پھر چونک کے بولا۔ ”آپ نے شروع ہی میں یہ سارا کچھ بتا دیا ہوتا تو شاید.....“ وہ کہتے کہتے رک گیا۔ ”بہر حال.....“ اس نے پھر آنکھیں میچ لیں۔

”کاش کہ یہی ہوتا مگر یہ کیسے ممکن تھا۔ میں آپ کے لیے بالکل اچھی تھا۔ اتنی جلدی نہ میں اپنا مدعا بیان کر سکتا تھا نہ آپ کو یقین آسکتا تھا۔ پولیس بہت فریب تھی۔ بس یہی ایک صورت مجھے بھائی دی۔“

”فائل پالیس اس طرف نہیں آئی ورنہ سڑک کا شور یہاں ضرور سنا دیتا۔ یا تو وہ لوٹ گئی یا کسی اور طرف جا گئی۔“ اس نے اچھے ہوئے لہجے میں قیاس آرائی کی۔

میں خاموش رہا۔

اسے جیسے کچھ یاد آیا۔ ”مجھے اکبر علی خاں کہتے ہیں۔“ اس نے متانت سے کہا۔ ”میں ایک وکیل ہوں لیکن اب وکالت نہیں کرتا، لاہور کالج میں پڑھاتا ہوں۔“

”میرا نام باہر زماں ہے۔“ میں نے آہستگی سے کہا۔

”آپ مجھے تعلیم یافتہ نوجوان معلوم ہوتے ہیں۔“

”تمہوز بہت لکھنا پڑھنا آتا ہے۔“

اس کے ہونٹوں پر چمکی سی مسکراہٹ پھیل گئی، پیشانی پر شکنیں نمودار ہوئیں اور وہ کھوئے کھوئے انداز میں سر ہلانے لگا۔ اس کے چہرے سے عیاں تھا کہ اسے کوئی بات کہنے میں دشواری پیش آرہی ہے اور شاید اسے لفظ مل گئے یا سرائل گیا، ادھر ادھر نظریں گھماتے اور نیچکھاتے ہوئے بولا۔ ”یہ، یہ خود کو آزاد سمجھیں؟“ اس نے چوکی پر موجود اپنے آپ میں بندھی جکڑی خواتین کی طرف اشارہ کیا۔ ”میرا مطلب ہے۔“ اس نے بہ جلت وضاحت کی۔ ”اجازت ہوتی تو انہیں اندر جانے دیا جائے۔“

میں بیٹھے بیٹھے اچھل پڑا۔ میں نے اس مرحلے کے بارے میں غور ہی نہیں کیا تھا۔ گھر کے افراد کے اندر چلے جانے سے مراد ہے، آنے والے لمحوں میں کوئی بھی ان ہوتی صورت پر ہر ہوسکتی ہے اور ادھر

میرے انکار سے بھی یہ مثبت اور موافق صورت حال قائم نہ رہے گی۔ مجھ میں اب انکار کی جرات نہیں تھی۔ میں نے اسے خود گنوا دیا تھا۔ میرے پاس اس کے سوا شاید کوئی اور جواب ہی نہ تھا۔ ”جی، جی، ہاں۔“ میں نے پہنچی ہوئی آواز میں کہا۔ ”اجازت لے کے آپ مجھے اور شرم سار کر رہے ہیں۔“

”میں نہیں، بخدا نہیں۔“ وہ ہاتھ بلند کر کے بے تابی سے بولا۔ ”میرا مقصد یہ ہے کہ اب ان کی یہاں کیا ضرورت ہے۔ یہ گھر کے اپنے کام کاج دیکھیں۔“

”میرا خیال ہے، مجھے اب چلنا ہی چاہیے۔“ میں نے اٹھنے کا ارادہ کیا۔

”اطمینان رکھیے۔ میں انہیں کوئی اور ہدایت نہیں دے رہا۔“ اس نے میری دھند دور کر دینی کوشش کی۔ ”یہ خود بھی سمجھ بوجھ رکھتی ہیں اور انہوں نے بھی میری طرح سب کچھ دیکھا اور سنا ہے۔ میں سمجھتا ہوں، آپ کو اتنی جلدی نہیں کرنی چاہیے۔ ڈاکٹر کا وقت تو نکل ہی چکا ہے۔ سوچتے ہیں، آپ کس طرح یہ حفاظت اسپتال پہنچ سکتے ہیں۔“

”آپ بہت مہربان آدمی ہیں۔“ میرے اظہار ممنونیت میں تصنع کی آمیزش تھی مگر شاید اسے محسوس نہ ہوئی ہو۔

”یہ بتائیے، آپ کیا نہیں گئے؟ صبح سے آپ نے کہاں کب کچھ کھا پایا ہوگا۔“

”مجھے بالکل بھوک نہیں ہے۔“

”ہاں، ایسی صورت میں بھوک پیاس کا کیا احساس ہو سکتا ہے۔“

”آپ، آپ لوگوں کے کھانے میں میری آمد سے رخنہ پڑ گیا تھا۔ اچھا یہی ہوگا کہ میں اب چلوں، آپ اپنے معمولات جاری رکھیں۔“

”ہمارے معمولات کو جانے دیجیے۔ اب نہیں تو کچھ دیر بعد جاری ہو جائیں گے۔ صبح و شام کا یہ چکر تو چلتا رہے گا۔ اس وقت تو آپ کا مسئلہ اہم

ہے۔“ اس کے لہجے میں غیر معمولی سنجیدگی تھی۔ ”دیکھیے، میں آپ کے کسی کام آسکا تو مجھے خوشی ہوگی، تم سب کو خوشی ہوگی۔“ اس نے خواتین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ارے بھئی! تم لوگ اندر جا کے مہمان کی کچھ تو وضع وغیرہ کا بندوبست کرو اور ہاں، نہ کوئی باہر جائے نہ آس پڑوس سے واسطہ رکھے۔ درمیان میں کوئی گھر آئے تو اسے یہاں، ہماری طرف نہ آنے دیا جائے۔“

ادبیز عورت اور دونوں لڑکیاں سٹ پٹاتی ہوئی چوکی سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ انہوں نے جیسے تیسے دوپٹوں سے اپنے بدن اور چہرے چھپالیے اور ایک دوسرے کے پیچھے اندر جانے کے لیے دروازے کی طرف لپک پڑیں۔ زینتی بھی اٹھ گیا۔ اکبر علی خاں نے اسے روک لیا اور حکمیہ انداز میں کہا۔ ”ذرا باہر جا کے دیکھو، ادھر کہیں آس پاس پولیس تو نہیں ہے۔ اور وہاں، کسی سے کچھ پوچھو گے نہ باہر کسی سے بات کرو گے۔ اور جلدی واپس آنا ہے۔ سمجھے۔“

زینتی تیزی سے باہر چلا گیا۔

کمرے میں ہم دونوں رہ گئے۔ میں خود کو چھپکھپایا دیتا رہا۔ امکان تو نہیں ہے لیکن خوش گمانیوں میں احتیاط عین ہوش ہے۔ دروازہ چند قدم کے فاصلے پر تھا اور چاقو جیب میں محفوظ تھا اور میرے اختیار میں کچھ نہیں رہا تھا۔ سب کچھ جیسے میرے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ میں تو دیکھتا اور سناتا رہتا تھا۔

زینتی کے جاتے ہی اکبر علی خاں نے خوش اطواری سے پوچھا۔ ”کچھ اپنے بارے میں بتائیے۔ ہاں، کیا مشاغل ہیں آپ کے؟“

”کیا بتاؤں۔“ میں نے چمراتی آواز میں کہا۔

”کچھ بتائیے نا۔ ملازمت تو آپ نہیں کرتے اور تجارت۔“ وہ تندی لہجے میں بولا۔ ”یقیناً وہ بھی

نہیں۔“

”آپ کا اندازہ درست ہے۔“

”پھر وقت کیسے گزرتا ہے؟“

”میرے سفر میں؟“

”پھر تو ضرور گھر کے نواب ہوں گے، زمینیں جاگیریں ہوں گی۔“ اس کی مسکراہٹ میں شائستگی تھی۔

”تمہوزی بہت زمینیں ہیں۔“ میں نے اس کے بے موقع سوالوں سے بچنے کے لیے اقرار کیا۔

”میں آباد میں؟“

”جی ہاں، وہ ہیں۔“ میں نے سر جھکا کے کہا۔

”میریض آپ کے گلے بھائی ہیں؟“

”جی، میرے لہجے میں ترشی آگئی۔“ وہ گلے ہیں، نہ سوتیلے۔ کوئی فوٹی رشتہ نہیں ہے میرا ان سے۔ کچھ رشتے بے نام ہوتے ہیں اور کبھی سارے رشتوں سے بلند ہوتے ہیں۔“

اس کی آنکھیں سکڑنی چھلیکتی رہیں اور وہ سر ہلاتا رہا۔ ”کیا اسم شریف ہے ان کا یا یاد آتا ہے، کوئی نام لیا تو تھا آپ نے۔“

”نصل۔“

”نصل؟“ اس نے تعجب سے دہرایا۔ ”صرف یہی نام۔“

”سب انہیں اسی نام سے جانتے ہیں۔ اب تو شاید خود انہیں بھی اپنا اصل نام یاد نہ ہوں۔“

”اچھا۔ اچھا۔“ اس نے مفاہمانہ لہجے میں کہا۔ وہ ایک نہایت ذہین اور حساس آدمی تھا، کہنے لگا۔ ”ہو سکتا ہے، آپ میرے ان بے در پے سوالوں سے مکدر ہو رہے ہوں۔ اصل میں میرا مقصد یہی نہیں کہ مجھے آپ کے بارے میں کچھ جاننے کی جستجو ہے، ایک قسم کی فطری جستجو۔ میری یہ بھی خواہش تھی اور ہے کہ کچھ اس طرح آپ کی توجہ بے لگن لگتا ہے، آپ کے دماغ پر بہت بوجھ ہے یا آپ، آپ اپنے مخاطب کو اعتبار کے قابل نہیں

”بھینٹے نہیں۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، آپ میرے محسن ہیں۔“ میں نے لاجب سے کہا۔ ”کچھ ناگوار خاطر ہوا ہو تو مجھے معاف کر دیجیے۔“ میں آپ سے پھر کہوں گا، ذرا تحمل کیجیے، دیکھیں، جلد بازی میں ضد خانو استہ اور رکاوٹیں نہ کھڑی ہو جائیں۔ آپ نے استاد میدا کا نام لیا تھا نا؟ میں اسے جانتا ہوں۔“

”آپ جانتے ہیں اسے؟“ میں نے بے گلی سے پوچھا۔ ”وکالت کے دوران کئی بار اسے کچھری میں دیکھا ہے۔ شہر میں تقریباً سبھی اسے جانتے ہیں۔ وہ ایک شورہ پست، پرلے درجے کا شیطان آدمی ہے، ایک نمبر کا فنڈ، بہت کٹ کھنا اور خوں خوار۔ بڑے بڑے سرکاری افسر اس پر ہاتھ ڈالتے ہوئے کتراتے ہیں۔ اس کے گرتے، ایک سے ایک منہ مار، ہتھ پھٹ شہر بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں، بس اس کے سر پہ تاج نہیں ہے۔ من مانی، دھاندلی، ہٹ دھرمی۔ شہر میں بیش تر جرائم کے پیچھے وہ ہوتا ہے یا اس کے حاشیہ بردار ہوتے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کوئی اس کے آڑے نہیں آتا یا اسے نہیں چھیڑتا تو وہ بھی اس شخص پر ہاتھ نہیں ڈالتا، گویا یا تو اس سے کوئی سروکار نہ رکھے یا اس کے سامنے میں آجائے، پھر عافیت ہے۔ شہر میں عزت آبرو سے زندگی گزارنے کی بجلی ایک بہتر تدبیر ہے۔ اور لوگ عموماً اسی پر عمل پیرا ہیں اور لطف یہ کہ بعض ستم ظریف اس سرکش کی تائید بھی خوب کرتے ہیں۔ کہتے ہیں، شہر میں ہونے والے جرائم کہیں زیادہ ہوں اگر استاد میدا موجود نہ ہوا۔ مراد یہ ہے کہ شہر کا ایک طبقہ اسے اپنا محافظ بھی سمجھتا ہے۔ طرح طرح کے قصے کہانیاں اس کے بارے میں مشہور ہیں۔ اور سنا ہے، اپنے دربار سے وابستہ لوگوں کا وہ بہت خیال رکھتا ہے۔ رکھنا بھی چاہیے کہ یہی تو اس

کے دست و بازو ہیں، انہی کی وجہ سے اس کی سرکار قائم ہے۔ ڈاک خانے کی گلی میں زخمی ہو جانے والا نوجوان میدا کا آدمی تھا تو.....“ اکبر علی خاں کے ماتھے پر لکیریں ابھر آئیں اور وہ کوئی شدید بات کہنے سے رک گیا۔ ”تو کیا؟“ میں نے تلخی سے پوچھا۔ ”تو کچھ بھی ممکن ہے۔“ وہ ہنسی ہوئی آواز میں بولا۔ ”یہ بتائیے، جس آدمی کے چاقو پیوست ہوا تھا، اس کی حالت کیسی تھی؟“

”یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ زخم گہرا ہے اور جلدی ہی مزہم پٹی نہ ہوئی اور خون زیادہ نکل گیا تو کچھ بھی ممکن ہے۔“ ”یعنی وہ اپنی جان سے بھی جاسکتا ہے؟“ اکبر علی خاں نے بے ربطی سے پوچھا۔ ”یہ بھی ممکن ہے۔“ میں نے کسی جھجک کے بغیر کہا ”اس کا چاقو بردار سا بھی کوئی اچھا چاقو باز نہیں تھا۔ اسی نوشکی کی وجہ سے اس کا وارکاری بھی ہو سکتا ہے۔ اچھے چاقو باز ہاتھ بچنے کے رکھتے ہیں، چاقو کو لگام دے کے، اور وہ تو..... میں نے آپ کو بتایا، وہ تو مجھے چاقو مارنا چاہتا تھا۔“

”لیکن کون گواہی دے گا؟“ ”میں جانتا ہوں، کوئی بھی نہیں دے گا لیکن استاد میدا کو تو اصل بات سے آگاہ ہی ہونی چاہیے۔ گلی کے لوگ اسے سچ کیوں نہیں بتائیں گے؟“ ”آب کا یہ نکتہ اہمیت رکھتا ہے۔“ اکبر علی خاں نے چپکتی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور کہنے لگا۔ ”استاد میدا کو اپنے طور پر بھی واقفے کی نوعیت جاننے کی کوشش کرنی چاہیے اور واقعی گلی کے لوگ اس سے سچ کیوں چھپائیں گے۔“

”گلی سے لکھے ہوئے مجھے دیر نہیں ہوئی تھی کہ پولیس نے میرا تعاقب شروع کر دیا تھا۔ اتنی جلدی استاد میدا کو خبر نہیں ہوئی جانتے۔ یقیناً گلی کے لوگوں نے پولیس کی توجہ میری جانب مبذول کرائی

ہوگی مگر اب وقت خاصا گزر گیا ہے۔ اتنی دیر میں استاد میدا کو سب کچھ معلوم ہو جانا چاہیے۔“ ”اور معلوم ہو جانے کے بعد اس کا رد عمل کیا ہوا ہوگا، کیا ہونا چاہیے؟“ اکبر علی خاں نے جیسے خود سے پوچھا۔

”وہ اڈے کا کوئی مستند استاد ہے تو اسے آدمیوں کی نادانی اور اچکے پن پر بہت برکت ہوگا اور جیسا کہ آپ بتاتے ہیں، وہ کوئی خود سر، بر خود غلط اور طبعاً کمینہ آدمی ہے تو اس سے کچھ بھی بعید نہیں۔“ میں نے دونوں انداز میں کہا۔

”اسے شہر میں اپنی دھاک، اپنے بھرم کی فکر ہو سکتی ہے۔ وہ خاموش ہو جاتا ہے تو اس شرافت میں اس کی سکی کا پہلو نکلتا ہے۔ شہر میں کوئی اجنبی اس کے تین آدمیوں پر حاوی آجائے، یہ حقیقت اس کا چہین سکون غارت کر سکتی ہے۔ ایسے لوگ اتنے اصول پسند نہیں ہوتے۔ اسے آپ کی تلاش ہونی چاہیے۔ پولیس بھی اسی کا ساتھ دے گی۔ ظاہر ہے، پولیس کے کتنے لوگ، اور پر سے نیچے تک اس کے پروردہ ہوں گے۔“ اکبر علی خاں نے دیکھوں کی طرح نکتہ طرازی کی اور ماپوسی سے بولا۔ ”استاد میدا جیسے آدمی سے کسی بہتری کی توقع نہیں۔“

”آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟“ میری آواز کی تیش اسے اپنے کانوں میں محسوس ہوئی ہوگی۔ ”میں امکانات کی بات کر رہا ہوں۔“ پہلی بار اس کے لہجے میں برہمی ہی شامل تھی۔

”تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟“ میں نے سنگتی آواز میں پوچھا۔ ”میرے پاس کون سا راستہ ہے۔ میں استاد میدا کے رحم و کرم پر رہوں اور ہاتھ پیر باندھے انتظار کرتا رہوں؟“

”مجبوری ہے۔ سامنے کوئی ایسا ویسا آدمی نہیں، پیشہ ور مجرم ہے۔ یہی دیکھنا ہے کہ سر دست کون سا راستہ آپ کے لیے مناسب ہے اور اس کے لیے آپ کو صبر و ضبط کرنا پڑے گا۔ ذرا سی کوتاہی

سکھیں رخ اختیار کر سکتی ہے۔“ اکبر علی خاں کے ننھے پھول گئے تھے اور ہونٹ پھڑک رہے تھے۔ ”آب کہہ رہے تھے کہ گلی میں بعد کو آنے والے آدمیوں کو آپ نے بتایا تھا۔ آپ ان سے الجھنا نہیں چاہتے کیوں کہ آپ کا ایک عزیز اسپتال میں ہے اور آپ کو جلدی ہے۔ آپ نے انہیں بناؤ اور ایس کر کے کسی پیش کش بھی کی تھی۔ انہوں نے سنی ان سنی کر دی۔ کیا آپ نے اسپتال کا نام بھی لیا تھا؟“

”نہیں، بالکل نہیں۔“ ”یہ اچھا ہوا لیکن وہ شہر کے ہر اسپتال میں آپ کو تلاش کریں گے اور ان کے لیے یہ کام مشکل نہیں ہے۔ میدا کے پاس بد معاشوں کی ایک فوج ہے۔“ ”انہی اندیشوں کی وجہ سے مجھے یہاں، آپ کے گھر میں پناہ لینا پڑی اور آپ سب کو.....“

اس نے مجھے بات پوری کرنے نہیں دی۔ ”ہماری بات جانے دیجیے، جو وقت گزر گیا، گزر گیا۔ اس پر گفتگو کا موقع بعد کو بھی آ سکتا ہے۔ بعد میں ذکر کریں گے اس کا۔“ اس نے ایک آہ سی بھری اور مدھم آواز میں بولا۔ ”اور خدشے تو اب بھی موجود ہیں جناب!“

”مجھے بہر حال اسپتال پہنچنا ہے اور جلد سے جلد۔“ میرے منہ لہجے میں سرکشگی نمایاں تھی۔ ”میں ٹھہل بجائی کو اس حالت میں ایسے نہیں چھوڑ سکتا۔“

”مگر برادر م کس طرح؟“ ”کسی بھی صورت۔“

”وہی تو میں آپ سے پوچھ رہا ہوں۔“ ”میں نکل کے دیکھتا ہوں۔“

”اور راستے میں ان لوگوں سے مد بھیجی ہوگی۔ آپ سوچیں، یہ قطعی ممکن ہے۔ راستے میں آپ کو کسی نے پہچان لیا یا آپ پولیس کے ہاتھ لگ گئے؟“ ”میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ ٹھیک ہی

کہہ رہا تھا۔ راستے میں کہیں بھی کوئی پتھر بن سکتا ہے۔ وہ پولیس ہو یا میدا کے آدمی۔ دونوں صورتوں میں اسپتال پہنچنا ممکن نہ ہو سکے گا۔ باہر آہٹ ہوتی تو بے یک لحد ام دونوں کی نظریں دروازے کی طرف اٹھیں۔ وہ زہنی تھا۔ وہ پھرتی سے اندر آیا تھا۔ ”کیا خبر لائے؟“ اکبر علی خاں نے ہڑک کے پوچھا۔

”اس طرف کوئی نہیں۔“ زہنی کی آواز بھی اس کی عمر کی طرح بچی تھی۔

”تم نے کسی سے بات کی؟“

”آپ نے منع جو کیا تھا۔“ زہنی نے دہی زبان سے جواب دیا۔

”ہاں ہاں۔“ اکبر علی خاں کچھ خفیف ہوا۔ ”تم نے ٹھیک کیا، اور سنو! تم گھر ہی میں رہو گے۔ میوشن کے لئے ماسٹر ضیاء الدین آئیں تو آج کے لئے منع کر دو گے۔“ زہنی سر جھکائے واپسی کے لیے مڑ گیا تھا کہ اکبر علی خاں الجھ کے بولا۔ ”یہ لوگ اندر کیا کر رہی ہیں؟ ان سے کچھ کہا تھا میں نے..... جاؤ، اندر جا کے دیکھو۔“

زہنی کے کمرے سے نکلتے ہی اس نے چھت کی طرف دیکھا۔ ”شکر ہے، پولیس اس علاقے میں موجود نہیں ہے۔“

میں سر ہلا کے رہ گیا۔

”دیکھیے۔“ اس نے ہنسی آواز میں کہا۔

”ایک تو یہ صورت ہے کہ آپ خود کو.....“ اس نے جلدی سے توضیح کی۔ ”یہ ایک مفروضہ ہے۔ فرض کیجئے، آپ خود کو پولیس کے حوالے کر دیتے ہیں تو کیا ہوگا؟ کل صبح یا اس سے اگلے دن وہ آپ کو عدالت میں پیش کر دیں گے اور کوئی آپ کی ضمانت لے لے گا۔ فرض کیجئے، یہ ضمانت میں لے لیتا ہوں۔ پھر آپ کسی حد تک محفوظ ہو جائیں گی اور نہ آپ کو اس وقت تک ٹھانے پکچہری کی گردش میں رہنا پڑے گا۔ جب تک معاملہ کسی کروٹ نہ بیٹھ جائے۔ اگر ذمہ ٹھنڈا خدا نخواستہ زندگی ہار بیٹھتا ہے

تو ضمانت بھی مشکل ہو جائے گی۔ اور یوں عدالت میں آپ کی بے گناہی ثابت کرنے، ثبوت و شواہد جمع کرنے اور چشم دید گواہوں کو حق گوئی پر آمادہ کرنے میں ایک مدت صرف ہو سکتی ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کیوں نہ آپ اپنے بیمار بھائی کی دیکھ بھال کے لیے اپنی کسی عزیز کو یہاں بلا لیں۔ بار کے ذریعے یہ اطلاع میں انہیں دے سکتا ہوں۔ فیض آباد سے دوسرے دن کوئی بھی یہاں پہنچ جائے گا اور آپ کو تسلی ہو جائے گی۔ جب تک کوئی فیض آباد سے آ نہیں جاتا، میں اسپتال جا کے آپ کے عزیز کی نگہداشت کر سکتا ہوں۔ اسپتال والوں سے بھی آپ کی غیر حاضری کا کوئی معقول عذر کیا جا سکتا ہے۔ اس دوران آپ کی تم کو تردد کے بغیر یہاں، اس گھر، میرے غریب خانے میں میرے مہربان کی حیثیت سے چھیر سکتے ہیں۔ مجھ پر کوئی بوجھ نہ ہوگا بلکہ مجھے خوشی ہوگی۔ ہمارا خاندان مختصر ہے اور گھر ماشا اللہ بڑا ہے۔ اوپر کی منزل تقریباً خالی رہتی ہے۔ یہاں آپ کے قیام کے دوران میں کسی طرح چپ چپاتے آپ کی بے عافیت فیض آباد واپسی کی تدبیر کی جا سکتی ہے۔ آپ شہر میں نہیں رہیں گے تو یہ سب کچھ خود بہ خود ب جائے گا۔ یعنی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کسی بھی حالت میں آپ کافی الحال اسپتال جانا ممکن نہیں ہے۔ چون کہ انھی معاملہ گرم ہے۔ ہو سکتا ہے، جلد ہی ٹھنڈ پڑ جائے۔ خدا کرے، ایسا ہی ہو۔“ وہ پر امید انداز میں بولا۔ امید سے زیادہ اس کے لہجے پر حسرت کا غلبہ تھا۔

مجھے حیرت ہوئی۔ اور پہلوؤں پر اس جزر کی نگاہ کیوں نہیں گئی۔ میں سنتا رہا اور میں نے اس سے نہیں کہا کہ ڈاک خانے سے پہ آسانی معلوم کیا جا سکتا ہے، میں نے کون کون سے مقامات پر تار دیے تھے۔ جس تار کے پر میں ڈاک خانے آیا تھا، اسے ڈھونڈ لینا ان کے لیے کیا دشوار ہوگا۔ تار کے والے سے انہیں معلوم ہو سکتا ہے کہ میں کون سے

اسپتال سے سوار ہوا تھا اور درمیان میں کہاں ٹھہرا تھا۔ اس تفتیش میں ہوگی میں ہماری اقامت اور پتے کی معلومات ہو سکتی ہیں۔ تار کے فارم پر میں نے پشاور شہر میں اپنے پتے کے طور پر گرائڈ ہوگی کا نام لکھا ہے۔ ہوگی کے رجسٹر میں اپنی مستقل سکونت کے خانے میں فیض آباد کا پتہ لکھوایا ہے۔ سرا پکڑتے پکڑتے وہ ٹھنڈ تک پہنچ سکتے ہیں۔ میں کچھ دیر بعد اپنے آپ کو چھپاتا ہوا اسپتال پہنچنے میں کام یاب بھی ہو جاؤں تو کبھی شام کو یارات کو یا کل کسی وقت وہ اسپتال میں میرے سر پر آدھک سکتے ہیں۔ اس طرح ٹھنڈ کے میں کیا کام آ سکتا ہوں۔ اکبر علی خاں کا یہ مشورہ ہی صاحب معلوم ہوتا ہے کہ کھلتے تار دے کے جامو کو بلا لیا جائے۔ تار میں یہ تاکید بھی ملاحظیت رکھتا ہے اور ضرورت پڑنے پر وہ کہیں سے کسی کو بھی طلب کر سکتا ہے۔ کھلتے میں زور اور مرد بھی موجود ہیں۔ جامو کے ساتھ وہ بھی یہاں آجائیں تو اور اچھا ہو۔ مگر تار پہنچنے اور کسی کے آنے میں کچھ وقت تو لگے گا۔ تار کب پہنچے۔ ادھر ٹھنڈ کے لیے سوچ سوچ کے تو میرے اوسان خطا ہو رہے ہیں۔ کچھ خبر نہیں، ڈاکٹر رائے نے کیا تجویز کیا ہے، وہ کس نتیجے پر پہنچا ہے، ایکس ریز میں کیا آتا ہے۔ یہ اکبر علی خاں، ایک شریف انسان جیسی، ٹھنڈ کی خبر گیری کرنے کی نوازش پر آمادہ ہے تو غنیمت سمجھنا چاہیے۔ اسپتال میں ٹھنڈ کو تہا چھوڑ دینے سے بہتر ہے، کوئی انجینی ہی سہی، اس کی پرسش حال کے لیے کوئی تو سرہانے موجود رہے۔ اکبر علی خاں ڈاکٹروں سے عمدگی سے بات کر سکتا ہے۔ میں اپنے پاس محفوظ ساری رقم اس کے حوالے کر دوں گا کہ اسپتال کے اخراجات میں اس کا ہاتھ کھلا رہے لیکن یہ متبادل تجویز کس حد تک قابل عمل ہے، اکبر علی خاں نے اس طرف غور نہیں کیا۔ اگر میدا کے آدمی کھوج لگاتے لگاتے ٹھنڈ تک پہنچ گئے

اور انہیں اسپتال کے کسی ذریعے سے معلوم ہو گیا کہ ٹھنڈ کو اسپتال لانے اور اس سے برادرانہ فریبت کا دعویٰ کرنے والا کوئی اور، یعنی میں تھا، اور میں ڈاک خانے سے ملحق کئی میں ہونے والے واقعے کے بعد اسپتال واپس نہیں آیا ہوں تو لازماً ان کی توجہ ٹھنڈ کے تیماردار اکبر علی خاں پر مرکوز ہو جائے گی۔ اس کا گھر ان کا ہدف بن جائے گا جہاں منہ چھپائے واقعتاً میں موجود ہوں گا۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے کہ ایک نہایت خلیق، اعلیٰ ظرف شخص، اپنے محسن کو کسی مصیبت سے دوچار کر دیا جائے۔ اکبر علی خاں کو تو اسی شہر میں رہنا ہے۔ اسے استاد میدا کے آدمیوں کی نظر میں نہیں آنا چاہیے۔

میرا سر پھٹا جا رہا تھا جتنا میں سوچتا، جدھر دیکھتا، اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دیتا۔ اسپتال کے بستروں پر بے سدھ پڑے ٹھنڈ کی تصویر میرے سینے، میری آنکھوں، میرے وجود میں سمائی ہوئی تھی۔ بار بار ہڑک سی اٹھی تھی کہ بس اکبر علی خاں سے رسمی اجازت لے کے اس گھر سے نکل پڑوں۔ آگے جو ہوگا، دیکھا جائے گا، اور اسی لمحے یہ اندیشہ جسم جکڑ لیتا تھا کہ راستے بہت طویل نہ ہو جائے۔ راستوں کی طوالت، فاصلوں سے نہیں، راستوں کی نوعیت سے طے ہوتی رہے۔ راستے میں کوئی دیوار کھڑی ہوگی تو اس کی بلندی کی انتہا کچھ بھی ہو سکتی ہے۔ پھر اسی صلاح پر بات تمام ہو جاتی ہے کہ مجھے اکبر علی خاں سے گزارش کرنی چاہیے، وہ فی الفور ڈاک خانے جا کے کھلتے میں جامو کو تار دینے کی زحمت کرے۔ جب تک جامو وغیرہ یہاں آنہ جائیں، مجھے اکبر علی خاں کے دولت کدے میں زندانی بن کے وقت کاٹنا سے اور دیواروں سے سر پھوڑتے رہنا ہے۔ ادھر ٹھنڈ کا کچھ بھی حال ہو، مگر میری حالت بھی اس سے کیا جدا ہے۔ وہ اپنے آپ سے بے خبر ہے، میں بہ قائم ہوش و حواس یہاں بے دست و پا پڑا ہوں گا۔

”کیا سوچ رہے ہیں جناب!“ مجھے چپ دیکھ کے اکبر علی خاں نے لکھے لکھے میں ٹوکا۔
 ”کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔“ میں نے کئی پھٹی آواز میں کہا۔

ہو گیا۔ اس نے مجھے آداب کیا تو میرا جسم بل کھا گیا۔ ”یہ بیگم ہیں، نذہت خانم۔“ اکبر علی نے اشتیاق آمیز لہجے میں کہا۔ ”یہ یہاں کالج میں انگریزی ادب پڑھاتی ہیں اور علی گڑھ کی سند یافتہ ہیں۔“

میں نے کرسی سے اٹھ کے تعظیم دی۔ اس سے نگاہیں ملانے کی جرات نہیں ہو رہی تھی لیکن مجھے کچھ تو کہنا چاہیے تھا اور میں یہ مشکل کہہ سکا۔ ”میں بہت نام ہوں، مجھے معاف کر دیجیے۔“

”نہیں نہیں، ایسا نہ کہیے۔“ نذہت خانم نے ٹھنکی آواز میں شائستگی سے کہا۔ ”جو بیت گیا، اس کا کیا مال اور اس کی کیا خوشی۔ وہ تو ماضی ہوا۔ اسے دہرانے سے کیا حاصل، اور خصوصاً جب کہ وہ ناخوش گوار بھی ہو۔“ اس کے لہجے میں بلا کا اعتماد تھا۔

”ہاں ہاں، وہ تو کسی خواب کے مانند تھا۔“ اکبر علی خاں نے لکھی سے بولا۔ ”لیکن اس کی تعبیر بالکل مختلف ہے۔“

نذہت خانم کے چہرے پر آگ سی بھڑکی اور غالباً موضوع بدلنے کے لیے نشست کی طرف ہاتھ اٹھاتے ہوئے وہ زیر لہجی سے بولی۔ ”آپ کچھ کہتیے نا۔“

”یہ آپ نے کیا تکلف کر لیا۔“ میں نے پوجھل آواز میں کہا۔

”کچھ نہیں ہے، سب بلا پھلکا ہے۔“

”یقین کیجیے۔“ میں نے عاجزی سے کہا ”بھوک ہی نہیں ہے۔“ میں نے اس سے بچ کہا تھا۔ میرا تو جی ہی لوٹ رہا تھا۔

”کوئی اصرار نہیں۔“ اکبر علی خاں نے میری مشکل حل کی۔ ”مگر یہ شراب خاص۔ بیگم یہ ایک خاص شربت پاتی ہیں۔ آسانی کے لیے اسے کسی کہہ لیجیے، پوربی کسی یا بہاری کسی لیکن یہ کسی ہرگز نہیں ہے۔ یہ تو بہت سے اجزا کا مجموعہ ہے۔ شاید آپ کو

”میں سمجھ سکتا ہوں، میری مایے تو مجھے پتہ دیتیے۔ میں ڈاک خانے جا کے تاریخ بتا دیتا ہوں۔ جتنا تاہل و تذذب کیجیے گا۔ اتنی دیر ہونی جائے گی۔ آج کل ان تاروں کا بھی کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ احتیاطاً میں ارجنٹ تاروں کا اور وقفے وقفے سے دو مرتبہ باہر نکلنے پر کچھ ادھر ادھر کی سن گھن لینے کا بھی موقع ملے گا۔ دیکھتا ہوں، شہر میں اس واقعے کی کتنی گونج ہے اور زخمی ہو جانے والا آدمی کس حال میں ہے۔ بہت کچھ اس کی حالت پر بھی منحصر ہے۔ ہو سکتا ہے، ہم کچھ زیادہ ہی قیاس کر رہے ہوں اور باہر سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو۔ کاش کہ.....“

دروازے سے برتنوں کے گھڑکنے کی آواز پر وہ رک گیا۔ سادہ ساڑھی میں ملبوس، بوئے قد، سانولی رنگت کی ایک نوجوان لڑکی ہاتھوں میں نشست اٹھائے، پلو سے آدھا گھونگھٹ کاڑھے ہوئے دڑاتا اندر آئی۔ گھبراہٹ میں پلو سر سے سرک گیا، وہ اور گھبرا گئی۔ دونوں ہاتھوں میں نشست تھا اور وہ پلو درست نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ملازمہ راجہ ہی ہو سکتی تھی۔ ابھی وہ اندر داخل ہوئی تھی کہ ایک اور عورت نے کمرے میں قدم رکھا۔ میں اسے فوراً نہ پہچان سکا مگر وہ تو وہی ادھیڑ عورت تھی جو کچھ دیر پہلے دو لڑکیوں اور لڑکے زینی کے ساتھ چوکی پر بے حال بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے لباس تبدیل کر لیا تھا اور لگتا تھا جیسے اپنا سراپا ہی تبدیل کر لیا ہے۔ بادامی رنگت، متوازن قامت اور متوازن بدن، اطوار میں حکمت، رفتار میں وقار، ناک میں لوہنگ، کانوں میں چھوٹے بندے، گلے میں چھیاکلی، کھانیاں سنہری چوڑیوں سے آراستہ تھیں۔ میں کرسی پر سیدھا

پسند آئے۔ اس نے گلاس اٹھا کے میری جانب بڑھا دیا۔

انکار اب بد تمیزی کے زمرے میں آتا۔ میں نے گلاس لے لیا۔ ممکن ہے، جیسا کہ اکبر علی خاں دعویٰ کر رہا تھا، مشروب واقعی خوش ذائقہ ہو۔ ذائقے بھی غلب سے مشروط ہیں اور غلب جسم و جان کی ایک سوئی، بے حالی سے۔ میرا جسم جیسے کسی شکنجے میں کسا ہوا تھا، جیسے اندر سے کوئی نوچتا ہو۔ مجھ میں ذائقہ شناسی کی حس ہی نہیں رہی تھی۔ پہلا گھونٹ ہی حلق کا فنا ہوا گزرا۔ مزید چند گھونٹ زہر مار کر کے میں نے گلاس میز پر رکھ دیا۔ ”کیسا ہے؟“ اکبر علی خاں نے حسرتی انداز میں پوچھا۔ ”کچھ مرغوب ہوا؟“

”بہت عمدہ ہے۔“ شاید مجھے یہی کہنا چاہیے تھا اور وہ دونوں یہی سننا چاہتے تھے۔ دادوستاد میں کے غلب گار کو دادوستاد ہی منطقی کرتی ہے۔

”زہت اس کی ماہر ہیں۔ ذرا وقت تو لگتا ہے لیکن یہ اسے تمام اہتمام سے بنانی ہیں۔ یہ ان کا اپنا وضع کیا ہوا معطر مجموعی یا مشروب بے شمار آتش ہے۔“ وہ ہنس کے بولا اور اسے خیال آیا۔ اس نے مچلتے ہوئے اپنی نیگم سے پوچھا۔ ”یہ اپنی جوہی اور یکتا کہاں رہ گئیں۔ ٹھیک تو ہیں وہ؟“

”آرام کر رہی ہیں۔ انہیں ابھی اندر ہی رہنے دیجیے۔“ زہت خانم نے دھمکے لہجے میں کہا۔

”کیوں، کیوں، کیا بات ہے؟“

”کچھ نہیں، کوئی خاص نہیں۔“ زہت خانم ایک نظر مجھے دیکھ کے جمعیتے ہوئے بولی۔ ”بچیاں ہیں، ایڈجسٹ منٹ کے لیے کچھ وقت تو چاہیے۔“

”اوہ!“ اکبر علی خاں کی پللیں پھڑپھڑانے لگیں۔ ”اسی لیے تو میں انہیں یہاں بلانا چاہتا تھا۔“

”دیکھیے، کچھ دیر میں سکی۔“ زہت خانم نے یاسیت سے کہا۔

یہ سن کے مجھے جھکا سا لگا اور میرا سر جھک گیا۔ زہت خانم کے لہجے میں شکایت نہیں تھی۔ واقعی دونوں لڑکیوں کی عمریں اتنی پختہ نہیں تھیں۔ میں اسی بات سے ڈر رہا تھا۔ اب میرا یہاں سے ہٹے جانا ہی مناسب تھا۔ اس گھر میں میرا وجود انہیں مضطرب کیے رکھے گا۔ کہتے ہیں، پہلا تاثر ہی آخری تاثر ہوتا ہے۔ بعض داغ مٹائے نہیں مٹتے۔ بعض لمحے نقش ہو جاتے ہیں، پتھروں پر کندہ لکیروں کی طرح۔

”یہ ہمارا گھر ہم دو مہیاں بیوی، دو بیٹیوں اور ایک بچے پر مشتمل ہے۔“ اکبر علی خاں نے اپنی آواز میں کہا۔ ”شاید یہ آپ کو عام گھروں سے الگ نظر آئے، اور ہے بھی یہی سچ۔ ہم اپنی طرح سوچتے اور اپنے انداز کی زندگی گزارتے ہیں اور کسی دوسرے پر زور نہیں دیتے کہ ہماری روش ہی بہتر ہے۔ میں نے قانون کی تعلیم کے سلسلے میں تین سال انگلستان میں گزارے ہیں۔ زہت بھی دو سال وہاں رہ کے آئی ہیں۔ انگلستان کے علاوہ ہم نے یورپ کے دوسرے ملک بھی دیکھے ہیں اور مغرب سے۔ جیسا یہاں سمجھا جاتا ہے، وہاں ویسا بالکل نہیں ہے۔ یہاں کے لوگوں کو وہاں کے قمار خانے، سے خانے اور عسرت کدے ہی نظر آتے ہیں۔ وہاں علمی ادارے، کتب خانے اور تحقیقی مراکز بھی کثرت سے ہیں۔ وہاں کے علم و فضل، نظم و ضبط سے یہ لوگ قطعی بے خبر ہیں۔ شائستگی اور اخلاق، کاروبار میں دیانت، معاملات میں صاف اور کھرے، وقت کے پابند، وہ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ ہم تو کہیں کم ہو گئے یا راستہ بھٹک گئے ہیں۔ انہوں نے خود کو دریافت کر لیا ہے اور ان کا یہ عمل جاری ہے۔ ہم ہامی میں زندہ رہتے ہیں، انہیں مستحق کی فکر رہتی ہے۔ وہ گھٹے ہوئے نہیں رہتے، زندگی ڈھونڈتے ہیں۔ روایت پر اصرار، سہل پسندی ہے۔ یہاں ہمارے آس پاس کی بودوباش بڑی روایتی ہے۔ سو یہ لوگ ہم سے تریب

ہونے میں کتراتے ہیں حالانکہ ہمیں معلوم ہے، انہیں بھی ہمارے طور طریقے پسند ہیں۔ معلوم نہیں، آپ کے کیا خیالات ہیں۔ آپ ہماری یہ روایت کھنی کس طرح دیکھیں مگر ایک گمان ہے۔ آپ بھی یہ قول آپ کے، جگہ جگہ گھومتے رہتے ہیں۔ سفر کرنے والے روایتوں کے معاملے میں اتنے شدید نہیں ہوتے۔ تعلق تو ہمارا بھی روایتی خاندانوں سے ہے لیکن ہم نئی لہروں، نئی چیزوں کو مشکوک نظروں سے نہیں دیکھتے۔ جو اچھا ہے، اس کے لیے دل کشادہ، جو غیر ضروری ہے، اسے ترک کر دینے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔“

اکبر علی خاں اپنی رو میں مغرب کی اوصاف بیانی میں رطب اللسان رہا۔ اسے کچھ خیال نہیں تھا کہ میں کتنا سن رہا ہوں اور مجھ پر کیا بیت رہی ہے۔ کسی نے بھی کہا تھا کہ وکیل ہونے کی پہلی شرط شوق کلام ہے۔ زہت خانم بھی بے آرام سی لگتی تھی۔ ہر چند اسے اپنے شوہر کی خوش گفتاری کا عادی ہونا چاہیے تھا۔ اسی نے قطع کلامی کی اور اندر جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔

”ارے ہاں۔“ اکبر علی خاں کی جیسے کسی نے چٹکی بھری ہو، وہ چونک پڑا اور اس نے مجھ سے معذرت کی۔ ”کچھ احساس ہی نہیں رہا کہ بے موقع گفتگو، محض فضول گوئی ہے لیکن..... لیکن شاید ایک جواز بھی تھا۔ آپ یہاں قیام کریں تو آپ کو اس گھر اور گھر کے مکینوں سے تھوڑی بہت شناسائی ہو جائے، مابین کوئی اجنبیت نہ رہے۔“ اس نے خنجر زہت خانم سے کہا۔ ”باہر میاں آج یہاں، ہمارے گھر مہمان رہیں گے۔ اوپر کی منزل پر انتظام کر دیجیے۔ ان حالات میں ان کا باہر نکلنا کسی صورت موزوں نہیں ہے۔ مجھے کچھ دیر کے لیے باہر جانا ہے، جلد واپس ہو جائے گی۔ زینہ سے کہیے کہ وہ مہمان کا خیال رکھے۔“

زہت خانم نے تجسس آنکھوں سے یہ ہدایتیں

سنیں اور نچی تلی آواز میں بولی۔ ”مناسب ہے، کوشش یہی ہوگی کہ مہمان کو کوئی شکایت نہ ہو۔“ پھر اس نے میری طرف نگاہ کی۔ ”کسی چیز کی ضرورت ہو تو تلف نہ کیجیے گا۔“ یہ کہتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور تیز قدموں سے دروازے کی طرف لوٹ گئی۔

”آپ یہاں بیٹھے، زینہ کو آپ کے پاس بھیجتا ہوں۔ میں بھی ذرا حلیہ ٹھیک کرنے کے لیے اندر جاتا ہوں۔“ نیگم کے اوجھل ہو جانے کی دیر ہوئی کہ اکبر علی خاں ایک گوشے میں رکھی ہوئی میز پر گیا اور کاغذ قلم اٹھا کے میرے پاس لے آیا۔ ”مار کے لیے آپ پیغام کا متن اور پتہ لکھ دیجیے۔ میں تیار ہو کے ابھی آتا ہوں۔“ اس جستجو مستعدی سے وہ اپنی طول کلامی کی تلافی کرنا چاہتا ہوگا۔

”یہ، یہ میدا استاد کا ٹھکانا کہاں ہے؟“ میں نے آہستگی سے پوچھا۔ وہ دروازے کی طرف چلتے چلتے رک گیا۔ ”کیوں، کیوں صاحب؟“

”جی، جی ہاں، میں کیا، سارا شہر جانتا ہے مگر آپ کیوں پوچھ رہے ہیں میاں؟“

”یہاں سے کئی دور ہے؟“

”زیادہ، زیادہ دور نہیں۔“ وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میں پچیس منٹ پیڈل کا راستہ ہوگا۔“

”میں وہاں جانا چاہتا ہوں۔“ میں نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔

”کیا، کیا، کہاں جائیں گے آپ؟ کیا آیا ہے آپ کے دماغ میں؟“ اس کی آواز تعلق میں چھنس گئی۔ ”میدا استاد کے ٹھکانے پر؟“

”جی ہاں۔“

”میدا استاد کے سامنے! آپ ہوش میں تو ہیں میاں؟ میں نے آپ کو بتایا ہے، وہ کیسا جنگلی آدمی ہے۔ وہاں، بھڑوں کے چھپتے میں ہاتھ ڈالنا چاہتے ہیں آپ؟“

”میں آپ سے بالکل متفق نہیں، وہ بہت برے لوگ ہیں، بدترین لوگ۔ ان سے کسی بھلائی کی توقع فضول ہے۔“

”دیکھتے ہیں، ورنہ تو ویسے بھی۔“

”ویسے بھی کیا؟“ اس کا چہرہ بگڑنے لگا۔ ”یہ گھر آپ کے لیے بالکل محفوظ ہے۔ تار ملتے ہی آپ کے بھائی کی دیکھ بھال کے لیے کوئی نہ کوئی ضرور آ جائے گا۔ ایک رات اور دن بھر کی بات ہے۔ حوصلہ رکھیے میاں! پینا میڈیکل کالج کا اسپتال علاج معالجے میں دور دور شہرت رکھتا ہے۔ وہ اپنی جانب سے کوئی کسر نہ چھوڑیں گے۔ انشا اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”مگر وہ وقت..... یہ ایک رات اور کل کا دن.....“ میری آواز ڈوبنے لگی اور میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”مجھے اس کے پاس جانا ہی ہوگا۔“

”معاف کیجیے، آپ بچوں کی سی باتیں کر رہے ہیں۔ وہاں جاکے ان بے داد گروں کے سامنے آپ دائرہ بادر کریں گے کیا؟ ان لوگوں کے آگے جو رحم و کرم نام کی کسی شے سے واقف نہیں۔“

”مگر وہ بھی آدمی ہیں۔“

”مگر کیسے آدمی، کیسے آدمی۔“ وہ بجز کسی آواز میں بولا۔ ”ان کے آدمی نے آپ کا ہوا چرایا۔ چاقو نکال کے وہی آپ پر حملہ آور ہوئے۔ انہی کے ایک آدمی کی غلطی یا نادانی کی وجہ سے ان کا دوسرا آدمی زخمی ہوا، اور ستم یہ کہ پولیس آپ ہی کی تلاش میں ہے۔ دو وہاں لوگ ہیں۔“

”یہی کچھ اسے باور کرانا ہوگا۔“

”کسے؟ استاد میدا کو؟“ اکبر علی خاں کے لہجے میں درشتی آگئی۔ ”اور آپ کے خیال میں وہ مان جائے گا؟ اچھا ٹھیک ہے۔ اگر وہ نہیں مانا؟ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔“

”مجھے راستہ بتائیے۔“ میں کرسی سے اٹھ گیا۔

”کیا، کیا آپ واقعی؟ نہیں نہیں میاں۔“

”مجھے جانے دیجیے۔ آپ کا بہت احسان ہے، آپ اور آپ کے گھر والوں نے جس اعلیٰ نظرئی کا سلوک کیا ہے، میں اسے کبھی فراموش نہ کر سکوں گا۔ موقع ملتا تو ایک بار ضرور آپ کے پاس، آپ سب سے دست بستہ معافی مانگنے آؤں گا۔“

”وہ تو ٹھیک ہے مگر میں آپ کو باہر جانے نہیں دوں گا۔“ اس نے عزم سے کہا۔

”ازراہ کرم مجھے اب مت روکیے۔“

”کیسے جانے دوں، میں آپ کو آگ کے حوالے کر دوں؟“

میں نے اپنا بیگ اٹھایا اور باہر جانے والے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ منع کرتا اور تیش کرتا رہا۔ انکار کی شرمندگی سے بچنے کے لیے مجھے جلد از جلد باہر نکل جانا چاہیے تھا۔ میں نے لپک کے دروازہ کھولا اور باہر آ گیا۔ وہ بھی میرے پیچھے تقریباً چھینٹتا ہوا آیا اور ڈیوڑھی میں میرا بازو پکڑ لیا۔ ”یہ آپ کے سر میں کیا سودا لایا ہے؟ ایک تو وہاں تک آپ کا پینٹا ہی مشکل ہے۔ راستے میں پولیس کی نظروں میں آگئے یا اس بد بخت کے آدمیوں کی۔“

”وہ مجھے نہیں روکیں گے۔“ میں نے وثوق سے کہا۔ ”میں انہیں بتاؤں گا کہ میں میدا استاد کے پاس جا رہا ہوں تو وہ مجھے نہیں روکیں گے بلکہ میدا تک پہنچانے میں میری مدد کریں گے۔ ان کی نظروں میں، میں میدا کا مجرم ہوں۔ وہ تو اس عجوبے پر خوشی کا اظہار کریں گے کہ میں خود کو میدا کی عدالت میں پیش کر رہا ہوں۔ میدا کی خوش نودی حاصل کرنے کے لیے مجھے اس کے روپ بردار دینے کی انہیں بے چینی ہوگی۔“

”گویا آپ نے طے کر لیا ہے۔“ اس کے شانے لٹک گئے، آواز بھی۔

”میرا اسپتال جانا ضروری ہے۔ میں اپنے

بھائی کو ایسے نہیں چھوڑ سکتا۔“

”یعنی آپ کا مطلب ہے، اس طرح آپ کو اسپتال میں داخلے کی اجازت مل جائے گی؟ میں نے آپ سے کہا ہے میاں کہ میں آپ کے بھائی کی پریشانی کے لیے اسپتال چلا جاتا ہوں۔“

”کاش یہ ممکن ہوگا۔“

”یہ ممکن کیوں نہیں ہے؟“

”خیرت ہے، آپ کی نگاہ امکانی نتائج پر کیوں نہیں گئی؟ نھل بھائی کے پاس آپ کے چلے جانے سے مراد ہے، اپنے گھر کی نشان دہی کرنا۔ وہ آسانی سے پھر آپ کے گھر پہنچ سکتے ہیں، جہاں میں روپوش ہوں گا۔“

”یہ کیسے؟ مجھے سمجھائیے۔“ وہ جزبہ ہونے لگا اور میری کسی تشریح سے پہلے ہاتھ بلند کر کے بھائی انداز میں بولا۔ ”آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ یہ ممکن ہے، قطعاً ممکن ہے۔ واقعی یہ پہلو میری نظر سے دور رہا مگر..... مگر اس کے باوجود میں آپ کو مشورہ نہیں دوں گا کہ آپ استاد میدا کے ٹھکانے کا رخ کریں۔“

”میں نے ارادہ کر لیا ہے۔“ اپنے لہجے کی مغفرت نے خود مجھے آزر دہ کر دیا۔

وہ میری شکل دیکھا کیا اور ہاپوسی سے بولا۔ ”ٹھیک ہے میاں۔ آپ پر میرا کوئی عزم تو نہیں چلتا۔“

”ایسا مت کہیے۔ میں نے آپ جیسے درد مند اور صاحب دل کم دیکھے ہیں۔“

”پھر بھی آپ میری بات نہیں مان رہے۔“

”مجھ سے اب کچھ مت کہیے۔ میری گزارش ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ اگڑی ہوئی آواز میں بولا۔ ”پھر تھیرے۔ میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔“

”آپ! آپ میرے ساتھ چلیں گے؟“ میرا

سارا وجود سٹ پٹا گیا۔ ”نہیں نہیں۔“ میں نے شدت سے انکار کر دیا۔

”کیوں نہیں، میں آپ کو اکیلا کیسے چھوڑ دوں؟“

”وہاں آپ کا جانا مناسب نہیں ہے۔“

”جو میرے لیے مناسب نہیں ہے، آپ کے لیے بھی نہیں ہو سکتا لیکن آپ نے ٹھان لی ہے تو مجھے بھی ساتھ رکھیے۔ آپ تھوڑی دیر کے لیے اندر چلیے۔ میں جوتے پہن کر آتا ہوں۔“

”میری خاطر آپ کیوں جو عزم میں پڑتے ہیں۔ آپ کا تعلق اسی شہر سے ہے۔ آپ کو ان لوگوں کے سامنے نہیں آنا چاہیے۔“

”مجھے نہیں آنا چاہیے۔ میں جانتا ہوں لیکن جب آپ ہمت کر سکتے ہیں تو میں بھی کچھ حوصلہ کرنے کی استطاعت رکھتا ہوں۔ چلیے، اندر چلیے، میں تیار ہو کے آتا ہوں۔“

مزید جھٹ، ٹھکر، وضع دمروت کے منافی تھی۔ دمروت بڑی زنجیر ہے۔ بادل خواست مجھے دوبارہ اندر آنا پڑا۔ وہ عجب تماش کے آدمی تھے۔ ان کا اصرار میری کجھ سے بالا تر تھا۔ آدھیوں کی بھی ہزار قسمیں ہوتی ہیں۔ مجھے کرسی پر بٹھا کے وہ فوراً ہی اندر چلے گئے۔ میرے پاس وقت تھا کہ میں پچکے سے نکل کھڑا ہوں۔ دروازہ کھلا ہوا تھا لیکن اس طرح بھاگ جانا مجھے اچھا نہیں لگا اور وہ میری توقع سے کم وقت میں واپس آ گئے۔ ایسے طرح دار، صاحب وضع، ایسے ہائے شخص کی قدر منزلت مجھ پر کیا، کسی پر بھی واجب ہو جاتی۔

انہوں نے سیلینی رنگ کی شیر دانی پہن لی تھی۔ مستزاد سلیم شاہی جوتی۔ سر یہ دوپٹی ٹوٹی تھی۔ اس وضع قطع میں وہ بالکل مختلف نظر آ رہے تھے۔ جیسے کسی تقریب میں شرکت کے لیے جا رہے ہوں۔ ممکن ہے، باہر جاتے وقت ان کا یہی حلیہ ہوتا ہو۔ میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اس اہتمام کے معنی بھی

کسی قدر سمجھ میں آرہے تھے۔ بہرحال وہ ایک جامہ زیب شخص تھے اور اس لباس میں تو ان کی شخصیت اور پروقار ہوگئی تھی۔ ”پہلے صاحب! ان کی آواز میں مضبوطی تھی، ایسی استواری جو ہر قسم کے ایثار پر آمادگی کے بعد ہی ممکن ہو سکتی ہے۔

ہم ڈیوڑھی سے گزرتے ہوئے گلی میں آگئے۔ ڈیوڑھی سے باہر آگے وہ ٹھہر گئے۔ انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ کیوں نہ میں اپنا بیگ گھر میں چھوڑ دوں، اور مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ کچھ سوچتے ہوئے انہوں نے بری کرپہ ہاتھ رکھا اور آگے چل پڑے۔ گلی نسبت چوڑی تھی۔ راہ گھیروں کی تعداد بھی کم تھی۔ جس سمت سے میں یہاں آیا تھا، اکبر علی خاں اس کی مخالف سمت جا رہے تھے۔ ان کی رفتار تیز تھی نہ دھیمی۔ گلی میں طے والے اکا دکا راہ گھیروں نے انہیں سلام کیا۔ وہ خندہ پیشانی سے جواب دیتے ہوئے بڑھتے رہے۔ ان کے پہلو پہ پہلو چلتے ہوئے مجھے اپنی حیثیت کسی معمول کی سی محسوس ہونے لگی تھی۔ یوں بھی شناسا راستوں میں راہ گھیر کا تیور ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ لمبی گلی پارک کے ہم ایک کشادہ سڑک پر آگئے۔ سڑک کے کنارے قطار سے چند تانگے خالی کھڑے تھے۔ کچھ کہے سے بغیر وہ پہلے تانگے پر بیٹھ گئے۔

استاد میدا کا پتا بنانے پر خستہ حال، عمر رسیدہ کوچوان کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے لیکن وہ بڑبڑا کے رہ گیا اور چابک بلند کر کے اونگھتا ہوا کھوڑا بیدار کیا۔ کچھ فاصلے پر سڑک کے دونوں اطراف مکانوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس طرف بھی بھیر بھی زیادہ تھی۔ اکبر علی خاں نے دیر تک مجھ سے کلام نہیں کیا۔ میں بھی چپ رہا۔ خاصا راستہ خیریت سے گزر گیا لیکن کچھ اور آگے جا کے بائیں جانب جیسے ہی تانگا ایک دوسری سڑک میں داخل ہوا، اس کی رفتار پہلے جیسی نہ رہی۔ تانگے والا چن چڑانے لگا۔ اکبر علی خاں کے استفسار پر اس نے بتایا کہ دوپہر

سے پولیس کسی مجرم کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ اس سے زیادہ اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ اکبر علی خاں نے بھی کرپہ نہیں کی۔ ہم دونوں کچھلے نشست پر بیٹھے تھے اس لیے صرف گزرتا ہوا راستہ ہی نظر آتا تھا۔ تانگے نے کچھ اور فاصلے طے کیا تھا کہ اسے رک جانا پڑا۔ میں نے اچک کے دیکھا اور ایک لمحے میں سارا منظر عیاں ہو گیا۔ آگے مختلف سواریوں کے پار پولیس تھی۔ وہ ہر سواری اور پیدل راہ گھیر کا جائزہ لے کے آگے جانے کی اجازت دے رہی تھی۔ اکبر علی خاں کی معنی خیز نظریں مجھ پر مڑلانے لگیں اور میرے سکوت و سکون سے وہ مطمئن ہو گئے۔ ہم تانگے سے اتر کے پیدل واپس ہو سکتے تھے لیکن انہوں نے ایسا کوئی ارادہ ظاہر کیا نہ میں نے۔ آنے والے وقت سے نبرد آزمانی کے لیے میری طرح انہوں نے بھی خود کو جکڑ کے رکھا ہوگا۔

تانگا تقریباً کھسکتا ہوا پولیس کے قریب پہنچ گیا۔ دھوپ میں سہ پہر کی زردی شامل ہو چکی تھی۔ پولیس کے جی اہل کار وہاں موجود تھے۔ انہوں نے معاندانہ انداز میں ہم دونوں کو نگاہوں میں تو لا اور کوئی سوال جواب کیے بغیر ہمیں آگے جانے کی اجازت دے دی۔ میں نے اپنا بیگ نشست کے نیچے حصے میں ڈال دیا تھا۔ تانگے کا یہ حصہ مختصر پردے سے ڈھکا ہوا تھا۔ بیگ بھی میری ایک نشانی تھا۔ اکبر علی خاں کے گھر میں پناہ حاصل کرنے سے پہلے اردگرد کی گلیوں میں کھومتے ہوئے بہت سے راہ گھیروں نے مجھے بیگ کے ساتھ دیکھا تھا۔ پولیس اہل کار تھک گئے تھے یا ان کی توجہ اکبر علی خاں کی سحر انگیز شخصیت ہی پر مرکوز رہی یا انہیں میری شکل اور ہونے والے واقعات میں کوئی نسبت دکھائی نہیں دی۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے، تانگا اس مرحلے سے بہ خیر و خوبی گزر گیا۔

کچھ دور بعد تانگا ایک گنجان علاقے میں داخل ہو گیا۔ قریب ہی چوراہا تھا۔ وہاں چاروں طرف دو

تین منزلہ عمارتیں بنی ہوئی تھیں۔ فرشی منزلیں تمام کی تمام چھوٹی بڑی دکانوں، چائے خانوں، اشپائے خورد و نوش، بساٹیوں اور پان بیڑی کی دکانوں پر مشتمل تھیں۔ وہیں کسی نے مجھے پہچان لیا۔ وہ ڈاک خانے کی گلی کا کوئی بیٹی شاید ہی ہو سکتا تھا۔

اسی نے دوسرے، دوسرے نے تیسرے کو اشارہ کیا۔ دیکھتے دیکھتے ان کی وحشت فزوں ہوئی گئی اور شور مچنے لگا۔ ان کے اشاروں کنایوں اور غل غپاڑے سے اکبر علی خاں کو بھی اندازہ ہو جانا چاہیے تھا کہ میں پہچان لیا گیا ہوں اور بات کنسی آگے چاچی ہے۔ حیرت انگیز طور پر ان کا سراپا کھنچا اور تنا ہوا رہا۔ تانگے والا خاصا سرا سہمہ ہو چکا تھا، بار بار پیچھے مڑ کے دیکھتا، کبھی انہیں، کبھی نہیں۔ چوراہے سے چند قدم کی دوری پر تانگے کے پیچھے پیدل اور سائیکل سواریوں کی تعداد میں اور اضافہ ہو گیا۔ وہ ہمیں نگاہوں میں رکھے تانگے کے ساتھ ساتھ بڑھتے اور شور مچاتے رہے۔ ان میں سے کوئی بھی قریب یا سامنے آنے اور ہم سے باز پرس کرنے کی جرأت نہیں کر پارہا تھا۔ ہمارے سکون نے شاید انہیں باندھے رکھا تھا۔ میں نے اپنے ہوش و حواس متوازن رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ایک اور موڑ پر آکے تانگا رک گیا۔ پختہ گندی رنگت اور نیم پختہ عمر کے ایک پستہ قد، گراں ذلیل شخص نے اچانک سامنے آکے دائیں جانب سے تانگے کا ہم پکڑ لیا۔ وہ ہم سے تقریباً جھول گیا تھا۔ موڑ کاٹنے کی وجہ سے تانگے کی رفتار بے حدست تھی۔ تانگے نے کئی جھٹکے کھائے، گھوڑا ہپنٹانے، کوچوان چنچنے لگا۔ ”کدھر جتی ہو؟“ تانگے کو روکنے والے شخص نے دہارتے ہوئے پوچھا۔

کوچوان اور میرے بجائے اکبر علی خاں نے جلدی سے جواب دیا۔ ”استاد میدا کے پاس۔ ہمیں ان سے ملنا ہے۔“ ان کی آواز سننا ہی تھی۔

بڑھتے ہوئے جہوم میں سے کسی نے ہانک لگائی۔ ”ہم بھی سمجھ لیت ہیں۔“ گینڈے جیسے جسم والے بیرو نامی شخص نے نخوت سے کہا۔ ”اچھا ہو یو، جو خود ہی ادھر آگیا۔“

یہ سنتے ہی تانگے سے چھلانگ لگا کے میں سڑک پر آ گیا۔ ”ہاں یہ میں ہی ہوں۔“ میں نے بلند آواز سے کہا تو بیچ پر سناٹا چھا گیا اور لمبے بھر میں بھن بھناہٹ میں بدل دیا گیا۔ اس دم اکبر علی خاں نے تانگے سے اتر کے زور سے میرا بازو تھام لیا۔ ”یہ میں ہی ہوں، اچھی طرح دیکھ لو۔“ میں نے اپنی آواز قابو میں کی اور سرد لہجے میں کہا۔ ”میں تمہارے استاد، پناہ شہر کے راجا استاد میدا کو دیکھنے آیا ہوں۔“

”استاد میدا کو دو۔۔۔۔۔؟“ میرا خالص پوربی لہجے میں کوا کھنچ کے اور بھڑکے بولا۔

”ہاں اسی کو۔ اسے میری تلاش ہے نا۔ تو میں خود اس کے پاس آ گیا ہوں۔ اسی سے ٹھوڑی بات کرنی ہے۔ مجھے اس کے پاس لے چلو یا اسے ادھر لے آؤ۔ فیصلہ نہیں بھی ہو سکتا ہے۔“

اکبر علی خاں نے مجھے ”بھنچوڑا۔“ ”میاں،“ ”ماں۔“ وہ ہذیبانی انداز میں بولے۔ ”یہ آپ کیا پاگل بنا کر رہے ہیں۔ ذرا اپنے آپ کو سنبھال کے، دیکھتے نہیں، ہم کہاں ہیں۔“

میں نے آنکھیں کھینچ کے انہیں خاموش رہنے کی تاکید کی۔ بیرو نامی شخص کی آنکھیں اہل پڑی تھیں، چہرے پر آگ سی بھڑکنے لگی تھی۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ وہ مجھ پر بھجھٹ پڑتا لیکن وہ ٹھیرا ہوا اور پھونکارنی آواز میں بولا۔ ”فیصلہ کرنا ہے؟ پہلے تو ہم تھرے آگے کھڑے ہیں۔“

”تم سے کیا بات کریں۔ تم سے اپنا کوئی پیر نہیں ہے اور تم ایسا چاہتے ہو تو کھلی رکھو۔ تمہاری حسرت بھی نکال دیں گے۔ ادھر ڈاک خانے کی گلی

میں استاد کے تین آدمی دیکھے ہیں، تم کو بھی دیکھ لیں گے۔ پہلے اپنے استاد سے پوچھ کے آؤ۔ بعد کو اسے کوئی شکایت نہ ہو۔" میں نے کہا۔

میں نے اچھی طرح بیرو کی قسم کا تخمینہ کر لیا تھا۔ وہ اڈے ہی سے متعلق آدمی تھا لیکن کچھ لوگوں کی اڈے سے وابستگی اپنے تئیں تو توڑ، استاد کی خدمت، مخبری کے کام وغیرہ سے بھی گہری ہونی ہے۔ بیرو اچھی لوگوں میں سے کوئی ایک تھا۔ جا تو بازی میں، ہو سکتا ہے، کبھی کوئی درک رکھتا ہو لیکن اس کا پھاری جیٹاب جا تو بازی کے لیے لازم مستعدی کا محمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اتنی دیر میں تین اور آدمی سامنے گلی کے اندرونی حصے سے لپکتے بلکہ بھاگتے ہوئے نظر آئے۔ وہ صاف اڈے کے آدمی تھے۔ انہوں نے قریب آ کے ہمارا ٹانگا، تانگے کے پیچھے از دحام اور اپنے ساتھی بیرو کا غضب آلودہ چہرہ دیکھا تو جبران و پریشان ہوئے۔ بیرو بری طرح بھنایا ہوا تھا۔ اس کے منہ سے گالیاں اندر پڑیں اور گالیوں کے دوران اس نے ان تینوں کو میرے بارے میں بتایا۔ تینوں کو پہلے یقین ہی نہیں آیا۔ پھر ان کی آنکھیں انکارا ہونے لگیں لیکن انہوں نے بیرو کے شانے تھب تھبا کے اسے پرسکون رہنے کا درس دیا۔ بیرو پیر پختے لگا۔ ان میں سے ایک، زیادہ عمر کے آدمی نے بیرو کا واو بلا نظر انداز کر کے حقارت سے مجھے مخاطب کیا "تو تم ہو او؟"

میں نے سر ہلانے پر اکتفا کی۔

"کاتم اپنے استاد سے بیو؟"

"ہاں۔" میں نے سندی سے کہا۔ "اسی لیے ادھر آیا ہوں۔"

"کا ہے کو؟" اس نے حاکمانہ لہجے میں پوچھا۔

"اسی سے بات کرنی ہے۔"

"ہم کو نا بولیو؟"

"تم اڈے کے مالک ہو کیا؟"

"اور استاد نا ہی مانن تو.....؟"

"مان لیں گے۔" میں نے یقین ظاہر کیا۔ "مان لیں گے۔ وہ اڈے کی چوکی پر بیٹھے ہیں، اور نہیں مانیں تو ہمیں آ کے جواب دو۔ پھر ہم دیکھیں گے۔"

"کا؟ کا دیکھو؟" وہ برہمی سے بولا۔

"تمہیں کیا بتائیں۔ اچھا ہے، تم جا کے استاد کو بتاؤ اور وقت برباد مت کرو۔" میں نے بے اعتنائی سے کہا۔

مجھے اندازہ تھا کہ اڈے سے استفادہ کے لیے آنے والے کسی بھی شخص کو صورت حال سمجھنے، اپنے ساتھیوں اور شور مچانے والے لوگوں پر اپنا بھرم قائم رکھنے، مجھے پرکھنے اور خود اپنی تشفی کے لیے کچھ ہی نوعیت کی جھٹ کرنی چاہئے۔ وہ اڈے کا کوئی معتبر، معتد آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اسے بھی بہر حال اپنے استاد کی خدمت میں مجھے پیش کرنے کی بے قرادگی ہوگی اور مجھ سے بات زیادہ بڑھ جانے کی صورت میں استاد کی ناراضی کا خدشہ الگ ہوگا لیکن یوں مجھے اچانک سامنے دیکھ کے اور میرا مطالبہ سن کے اسے فوراً ہامی بھی نہیں بھرنی چاہئے تھی۔ اس کے ساتھ آنے والے دونوں ساتھیوں کا نظر اندازی کے لیے پھڑک رہے تھے۔ بیرو بھی سچ و تاب کھا رہا تھا۔ کسی وجہ سے وہ خود پر جبر کیے ہوئے تھے اور وجہ ایک ہی ہو سکتی تھی کہ اپنے نسبتاً مہم ساسھی کا پاس خاطر مانع تھا۔ مہم ساسھی، استاد میدا کا کوئی مقرب خاص ہوگا یا کوئی مشتاق، زور آور اور صاحب الرائے آدمی۔ اس میں کسی حد تک شبہیدگی تھی۔ شبہیدگی اور بردباری کی بھی اپنی ایک فضیلت ہے۔ میں نے استاد میدا کے سوا کسی اور سے بات کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ میرا عزم، میرے لہجے کی پختگی سے عیاں تھا۔ اس نے مزید تکرار سے اجتناب کیا، ہنگامی بھر کے جلی ہوئی آواز میں بولا۔ "ٹھیک ہے۔ جا کے مالک کو بولت ہیں۔ گے"

ہے، تمہارے کو سامنے دیکھ کے اوکو خوشی ہو دے گی۔" میں نے اپنی زبان بند رکھی۔ اکبر علی خاں کے چہرے پر رنگ آرہے، رنگ چارہے تھے۔ میرے اشارے پر وہ بدحواسی سے تانے پر سوار ہو گئے، پھر میں بھی۔ اگلی نشست پر ان میں سے دو آدمی کوچوان کے برابر بیٹھ گئے۔ جیسے ہی تانگے نے حرکت کی، پیچھے ہجوم کا شور بڑھ گیا۔ وہ جو کہتے ہیں، کان پڑی آواز سنانی نہیں دیتی تھی۔ گلی میں کچھ دور جا کے مکانوں کا سلسلہ ختم ہو گیا اور گنجالی بھی کم ہو گئی۔ گلی کا یہ حصہ کچھ چوڑا تھا۔ دونوں اطراف اونچے نیچے، کچے کے مکانات سے ہوئے تھے اور ان کے دروازوں، چھتوں اور کھڑکیوں پر لوگ جمع ہو چکے تھے۔ ہمیں بہت آگے جانا نہیں پڑا۔ ادھر ادھر جھکی ہوئی چھوٹی لال اینٹوں سے بنی ہوئی دیوار کے بیچ میں بنے لکڑی کے ایک بلند اور وسیع پھانک کے سامنے ناگ ٹھہر گیا۔ پھانک کے دونوں طرف کی دیواروں میں درمیانے سائز کی کھڑکیاں بنی ہوئی تھیں۔ دیوار سے ملحق کمروں کی کھڑکیاں ہی ہو سکتی تھیں۔ کھڑکیوں کے اوپر روشن دان تھے۔ اینٹوں کی بوسیدہ ادچی دیوار، قدیم طرز کی کھڑکیوں اور چھت کی منڈیروں کے نیچے روشن دانوں سے کسی جیل کا گمان ہوتا تھا۔ پھانک کے دائیں بائیں دیوار کے ساتھ کوئی سات آٹھ گز لمبے، گز، سوا گز چوڑے چھتروں پر اڈے کے آدمی مضطربانہ ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ ہمارے تانگے کی آمد پر وہ چھتروں سے کود پڑے اور انہوں نے ناگ ٹھہرایا۔ زیادہ عمر کا آدمی تیزی سے تانگے سے اتر کے کسی سے کچھ کلام کے بغیر سیدھا پھانک کے کھلے نعلی دروازے میں داخل ہو گیا۔ ہجوم کچھ فاصلے پر آ کے ٹھہر گیا تھا اور اس کا شور بھی کم ہو گیا تھا۔ پھانک کے باہر موجود اڈے کے آدمی اصل معاملہ جاننے کے لیے وحشت زدہ ہوں گے۔ تانگے میں بیٹھا دھرا آدمی بھی اتر گیا اور اس نے سرگوشیانہ انداز

میں انہیں کچھ بتایا تو سب کی نگاہیں ہی پر مرکوز ہو گئیں۔

اکبر علی خاں اور میں تانگے میں بیٹھے رہے۔ یہ وقت مجھ پر تو جیسا گزر رہا تھا، مگر رہی رہا تھا۔ اکبر علی خاں شاید پچھتا رہے ہوں کہ انہوں نے میری ہم رکابی پر کیوں اصرار کیا تھا۔ ہر طرف لوگ ہی کو گھور رہے تھے۔ یہ نگاہوں کا کھنکھہ یا آنکھوں کا حصار بہت اذیت ناک ہوتا ہے۔ اڈے کے آدمیوں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ہم پر ٹوٹ پڑیں۔

یہ شباب محض شبہ نہیں رہا تھا کہ زخمی ہو جانے والے آدمی کی حالت یا تو زیادہ خراب ہے یا وہ ختم ہو گیا ہے۔ کوئی معمولی قسم کا زخم ہوتا تو ہجوم کی کیفیت ایسی اضطرابی نہ ہوتی۔ مہم ساسھی کو اداسی میں دیر لگ گئی۔ یہ تاخیر میرے لیے تشویش کا باعث ہوئی چاہئے تھی۔ اکبر علی خاں بھی بے دم سے بیٹھے تھے۔ بہتر یہی تھا کہ مہم ساسھی کے ساتھ میں بھی تانگے سے اتر کے اس کے پیچھے چل پڑتا۔ اس نے مجھ سے انتظار کرنے کو کہا بھی نہیں تھا، نہ اپنے ساتھ اندر چلنے کا کوئی عندیہ دیا تھا۔ میں خود ہی ٹھہر گیا تھا۔ اندر یا تو میدا سے اس کی ملاقات فوراً نہ ہوگی یا وہ میرے بارے میں اپنا رویہ معین کرنے اور کسی نتیجے پر پہنچنے کے لیے باہم مشورت میں مصروف ہوں گے۔ انتظار کرانے کی یہ حکمت دانستہ بھی ہو سکتی تھی، اپنا اثر و تسلط قائم کرنے کی ایک کوشش، منتظر شخص کے اعصاب اور حواس کی آزمائش اور یوں اسے نفسی طور پر پھس پا کرنے کی تدبیر۔ تانگے سے اتر کے پھانک کے نعلی دروازے سے سیدھے اندر چلے جانے کی جسارت اب قریب عقل نہیں تھی۔ جلد یا بدیر کسی کو بہر حال اندر سے آنا تھا اور مجھے انتظار کرتے رہنا تھا۔

پندرہ منٹ گزرے ہوں گے یا نہیں۔ میرے لیے تو یہ وقت بہت طویل تھا۔ اندر سے وہی شخص

مردار ہو اور اس نے قریب آنے کے بجائے پھانک کا دروازے پر کھڑے کھڑے جھڑکتے انداز میں ہاتھ ہلا کے مجھے اندر آنے کی دعوت دی۔ دعوت کیا، حکم دیا۔ میں نے اکبر علی خاں کو سوال طلب نظروں سے دیکھا کہ وہ میرے ساتھ اندر چلنے کے لیے آمادہ ہیں یا تاکنے میں ٹھیرے رہنا چاہتے ہیں۔ مجھے حیرت ہوئی، وہ میرے ساتھ ہی تاکنے سے اتر پڑے۔ میرے اندر چلے جانے کے بعد ان کا باہر ٹھیرے رہنا مناسب بھی نہیں تھا۔ اتنے لوگوں کی موجودی میں تنہائی اور کشائش ان پر بڑی گراں گزرتی۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ پھانک کے اندر قدم رکھا۔

پھانک کا اندرونی حصہ کسی ڈیوڑھی کے مانند تھا۔ اندر یہ ڈیوڑھی پھانک کے طول و عرض سے کہیں زیادہ کشادہ تھی۔ دائیں بائیں دو کمروں کے مساوی چھت سے اٹھکی ہوئی جگہ بھی اس میں شامل ہوئی تھی۔ یہاں چار پائیاں پتھیں پڑی ہوئی تھیں۔ ایک کونے میں کھڑو تھی پر کھڑے رکھے ہوئے تھے اور پانی پینے کے لیے کھڑیا مٹی کے آب خورے۔ دیواروں میں جا بجا بنی طاقتوں میں طرح طرح کا سامان بکھرا ہوا تھا۔ فرش صاف ستھرا تھا۔ پھانک کے سامنے کا حصہ کھلا ہوا تھا اور خاصی دور تک کچی زمین دکھائی دیتی تھی اور کہیں کہیں سبزہ بھی اگا ہوا تھا۔ تیز قدموں سے ہم نے عمر آدمی کی پے روی میں پھانک کا اندرونی حصہ عبور کیا اور اینٹوں سے استوار گزرگاہ پر آ گئے۔ گزرگاہ دائیں طرف مز جاتی تھی اور جس پتھیں گز کے فاصلے پر قدم طرز کی ایک چوکور عمارت پر تمام ہو جاتی تھی۔

جیسا کہ میرا قیاس تھا، اندر کچی کے ساتھ انھی ہوئی دیوار سے پوست کوٹھیوں جیسے کمرے تعمیر کیے گئے تھے۔ عمارت اور ان کمروں کے سامنے کھلی جگہ وافر تھی۔ اسے چھوٹا میدان بھی کہا جا سکتا ہے۔ میدان کے ایک گوشے میں روایتی اکھاڑا نظر آ رہا

تھا۔ اس کے ارد گرد گلدز، ڈمبلو، وزن اٹھانے، بل کرنے، الٹا لٹکنے اور بازو بنانے کے ساز و سامان کچھ زمین میں نصب، کچھ ادھر ادھر پڑا ہوا تھا۔ کچی کی دیوار کے سوا چار دیواری کی... باقی تین اطراف کی دیواروں سے آگے قریب قریب بلند اور گنجان درخت ایستادہ تھے۔ یہ درخت بھی کسی فصیل کی طرح تھے۔ پھانک کے دائیں جانب واقع عمارت، چار دیواری کے رتے کے اعتبار سے چھوٹی لیکن یوں بہت بڑی تھی۔ رنگ روغن پرانا ہو چکا تھا۔ چھت کے گنگورے آدھے سالم، آدھے ٹوٹ پھوٹ چکے تھے۔ ساری عمارت اونچے اور موٹے موٹے ستونوں پر کچی ہوئی تھی اور کسی قدر اونچائی پر تھی۔ اندر خانہ ضرور ہوگا۔ ممکن ہے، کچی کسی صاحب ثروت، کشادہ دل کی عویلی رہی ہو اور اس نے اڈے کے کسی استاد کے کارنامے پر خوش ہوا کے دان کردی ہو اور اڈے کے آدمی بعد میں اٹلی ضرورت کے مطابق اکھاڑ پھانچا کرتے رہے ہوں۔ میں نے اڈے کی کوئی ایسی عمارت بھی نہیں دیکھی تھی۔

گزرگاہ ختم ہونے پر چند قدم کا زینہ طے کر کے عمارت کا منتقل، سال خوردہ چوٹی دروازہ تھا۔ دروازے پر لوہے کے کڑے نصب تھے اور ڈھلی ہوئی توکیں۔ شاید عرصے سے بند نہیں کیا گیا تھا۔ کچی خاک دھول میں اتنی، فرش میں دھنسی ہوئی تھی۔ دروازہ ایک چوڑی اور روشن راہ داری میں کھلتا تھا۔ ایک نظر میں سارا نقشہ سمجھ میں آ گیا۔ آئے سامنے اور دائیں بائیں چلتی ہوئی راہ داری چار حصوں میں عمارت تقسیم کر دیتی تھی۔ چاروں طرف بھی اسی طرح کے دروازے ہوں گے عمارت کے دوسرے سرے پر سامنے کا دروازہ تو نظر آتی رہا تھا۔ وہ کچی چوٹ کھلا ہوا تھا۔ کچھ دور بعد راہ داری، ایک بڑے صحن میں ختم ہو کے، صحن کے بائیں اسی سیدھ میں دوبارہ شروع ہو جاتی تھی اور مقنا

دروازے تک جاتی تھی۔ صحن میں پہلی دھوپ کی روشنی افراط سے تھی۔ اس کے اطراف حراب وار دالانوں کا سلسلہ تھا۔ ان کے پیچھے کمرے تھے۔ ستونوں اور محرابوں سے بنیے گئے ہوئے تھے، انہیں تراشائیں جاتا تھا اس لیے خود پر بار لگتی تھیں اور چھت پر چڑھتی تھیں۔ عمارت اندر سے اتنی شکستہ نہیں تھی جتنی باہر سے دکھائی دیتی تھی۔ اندر زندگی رواں دواں تھی۔ اڈے کے کئی آدمیوں سے پہلے تو گزرگاہ ہی میں سامنا ہوا تھا، پھر راہ داری میں بہت سے بے تابانہ ہمارے نظر تھے۔ ہمیں اندر کی جانب بڑھتا دیکھ کے سمٹنے لگے۔ گلی سے بھی کچھ لوگ ہمارے ساتھ پھانگ میں داخل ہوئے تھے۔ میں نے اور اکبر علی خاں نے پیچھے مڑ کے ان کی تعداد جاننے کی کوشش نہیں کی۔ ان کی چاپوں اور سرگوشیوں سے ایک اندازہ ہی کیا جاسکتا تھا۔

راہ داری سے گزرتے ہوئے لگ رہا تھا جیسے ہم اڈے کے استاد کے سامنے نہیں، کسی سردار کے دربار میں جا رہے ہوں۔ راہ داری سے صحن اور صحن کے باہر سیدھے ہاتھ کی جانب دالان کے پاس آ کے قمر آدمی پلٹ گیا اور اس نے ہاتھ اٹھا کے عقب میں آنے والے آدمیوں کو روکا اور قریباً سہ گز کی چوڑے دالان سے گزر کے پہلے پڑنے والے کمرے میں داخل ہو گیا۔

عمارت کتنی ہی مختلف ہو مگر یہ جگہ کسی اڈے کی بیٹھک ہی تھی، کسی وسیع ہال کے مانند وسیع و عریض کمرہ۔ ہر طرف رنگ برنگے شیشوں کی کھڑکیاں، دیواریں گل بوٹوں سے مرصع۔ نقاشی و مینا کاری زوال آمادہ ہوں تو دید باز کا جسم اٹھنے لگتا ہے۔ دیواروں پر کاندہ گل بوٹوں کی بھی ایک آب یادی چاہیے۔ کسی وقت یہ کمرہ شیش محل جیسا کوئی دیوان خانہ ہوگا۔ ستاروں کی طرح چھت اور دیواروں پر جڑے شیش تراشیدہ پارے اپنی جگہیں ترک کر چکے تھے۔ درمیان کی کشادہ جگہ کے بعد، دروازے کے صحن

مقابل، دیوار کے وسط میں ایک کم قامت مگر بڑی چوکی پر چند آدمیوں کے ساتھ گاڈ ٹیکے سے کمرنگائے جو شخص سب سے نمایاں نظر آ رہا تھا، وہی استاد میدا ہو سکتا تھا۔ اس کے دائیں بائیں دو اطراف بھی دیواروں سے بیست، چوڑائی میں مختصر چوکیوں اور درمیانی فرش کے کھلے حصے پر پہلے سے بہت سے آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ بہت سے ہمارے ساتھ آئے تھے۔ سب کی نگاہیں ہم دونوں پر مرکوز تھیں۔ ان کے چہروں پر جھپٹا اضطراب درون خانہ کیفیات کا غماز تھا۔ سرگوشیوں کی ایک گونج کمرے میں منڈلا رہی تھی۔ ہمیں بڑھتا دیکھ کے فرش پر بیٹھے لوگ ادھر ادھر سمٹنے لگے۔ سامنے کی بڑی چوکی سے کوئی دو گز کے فاصلے پر ہم ٹھہر گئے۔

درمیان میں بیٹھے ہوئے آدمی نے ہمارے اتنے قریب آ جانے اور ٹھہر جانے پر پہلو بدل کے ہٹنے کی نکتہ سے لگائی۔ ایک اضطرابی نظر اس پاس موجود لوگوں پر ڈالی اور خاموش رہا۔ اس کا قد متوازن، جسم ٹھیک اور کھٹا ہوا تھا، تانبے جیسی رنگت، گول چہرہ، نقش و نگار بھرے ہوئے، سر کے سیاہ بالوں میں کہیں کہیں سفیدی کی آمیزش، گھٹے اور ٹھنکھٹھکے پالے، روغن آلود اور سلیقے سے پیچھے کی طرف کڑھے ہوئے، تنگ پیشانی، اتنی تنگ بھی نہیں۔ شمالی رنگت کے باریک تنگی کرتے اور چھوٹی مہری کے سفید پاجامے میں لمبوس۔ باریک کرتے سے اندر پہنی سفید ہنڈی جھلک رہی تھی۔ گلے میں تنگ کے دانوں سے مشابہ نیلے پتھروں کی مالا، دائیں کھائی میں چاندی کی مختصر دریا، چہرے پر سب سے نمایاں اس کی آنکھیں تھیں، گہری، کسی قدر اندر دھنسی ہوئیں اور بے حد چمک دار۔ دیدے متحرک تھے۔ خوب جاتی چوبند، چالیس پینتالیس عمر ہوگی۔ اپنی ظاہری وضع قطع سے وہ اڈے کے دادا کے بجائے کوئی مستعد، اپنے گا بک دور سے بھانپ لینے والا دکان دار معلوم ہوتا تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ یا اس کا کوئی حاشیہ بردار کسی سرگوشی کی ابتدا کرے، میں نے ہاتھ اٹھا کے اس کی طرف انگلی اٹھا کے کہا۔ ”تمہی استاد میدا ہو؟ ادھر کے دادا؟“

اس کے جسم میں صنوبری سامو دار ہوا اور چمکیلی آنکھوں سے مجھے سر تا پا دیکھا گیا اور چپ رہا۔ اس کے پہلو شیش ایک پختہ کار آدمی نے زبان کھولی۔

”ایسی کابا ہے؟“

”تم استاد میدا ہو؟“ میں نے ناگواری سے پوچھا۔

مجھ سے مخاطب آدمی کسم گیا، پیشانی پر ٹھکنوں کا حال پڑ گیا اور کوئی جواب نہ دے سکا۔ بے اختیار اس کی نظریں سچ میں بیٹھے شخص پر اٹھیں۔ ”ہمیں صرف استاد میدا سے بات کرنا ہے۔“ میں نے اپنی آواز تھا سے رسمی اور رسمی انداز میں کہا۔

”ایسی کابا ہے؟ ہم کو بولو بھیا۔“ عمر رسیدہ آدمی مصنوعی نغوت سے بولا۔

”تم کو بولانا، اپنے کو صرف استاد میدا سے بات کرنا ہے۔“ میں نے سختی سے کہا۔ میرا اندازہ درست تھا۔ چوکی پر سب سے نمایاں شخص ہی استاد میدا تھا۔ اکبر علی خاں، استاد میدا کو پہچانتے تھے۔ وہ بھی مجھے اشارہ کر سکتے تھے، اچھا ہی ہوا، انہوں نے دخل نہیں دیا۔ ان کے لیے یہ جگہ بڑی اجنبی ہوگی۔ اپنے حواس کی بحالی کے لیے لازماً انہیں کچھ وقت چاہیے تھا یا انہوں نے مصلحتاً خاموشی شعار کی۔

استاد میدا کے آرمودہ کار ساتھی کے چہرے پر براہی ہو یہاں ہو چکی تھی۔ وہ اشتعال میں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ استاد میدا نے اسے روک دیا اور پھینکی ہوئی مسکراہٹ سے بولا۔ ”ہم میدا ہیں۔“

”تمہی ادھر کے استاد ہو؟“ میرے لیے میں تجسس شامل تھا، نظر بھی۔ ”پننا شہر کے راجا؟“

میں بولا اور گاڈ ٹیکے پر کمر سیدھی کر لی۔

”کام کی بات ہی بولتے ہیں اور سلی رکھو، ہم کو زیادہ بات بھی نہیں کرنا۔“ میں نے اونچی آواز میں کہا۔ ”میدا استاد، ادھر اڈے پر بیٹھے نئے تو نہیں لگتے۔ تھوڑا بہت تم کو اڈے کا رہتی رواج بھی معلوم ہوگا۔“

اس کا منہ بن گیا اور بے چینی سے بولا۔ ”گھمائی پھرائی کے کاہی بات کرت ہو؟ صاف صاف بولو۔“

”ہم ادھر پننا شہر میں آگے ہیں۔ تمہارا وقت اب ختم ہو چکا ہے۔ اڈے کی ریت ہے، اڈا اس کے پاس رہتا ہے جو اس کا بل رکھتا ہو۔ تم یہ ریت بھول گئے ہو تو ادھر بہت سے تمہارے پالتو تم کو یاد دلا دیں گے۔ اڈا راج پات نہیں ہوتا، راجا ہمارے تو راج نگار تخت پر بیٹھ جائے۔“

میدا کی دھنسی ہوئی آنکھیں باہر نکل آئیں۔ ارد گرد بیٹھے لوگوں کے چہرے بگڑ گئے۔ عمر ساتھی کچھ زیادہ ہی نمک خوار، وفا شعار تھا کہ اس کا جسم بل کھانے لگا۔ اوروں کا بھی یہی حال ہونا چاہیے تھا۔ اسی لیے اکبر علی خاں نے آہستہ سے مجھے گہنی ماری اور ایک آن کے لیے سبکی، زبرد بر کر دیا۔ یہ موقع انہیں سرزنش کرنے کا نہیں تھا۔ میں تو انہیں ساتھ آنے سے منع کر رہا تھا۔ اب یہاں سے ان کے داہیں چلے جانے، مجھے میرے حال پر چھوڑ دینے اور جو کچھ ہے، مجھے اسے آپ نمٹنے اور بھٹکنے کی درخواست کرنے کا وقت بھی گزر چکا تھا۔

یہ خدشہ ہر لمحہ موجود تھا کہ کہیں وہ کوئی الٹی سیدھی بات، منت گزاری وغیرہ نہ کرنے لگیں۔ مجھی سے غلطی ہوئی۔ انہیں ساتھ رکھنے کی کوئی تنگ نہ تھی۔ وہ کتنا ہی مصر ہوتے، مجھے صاف انکار کر دینا چاہیے تھا۔

چند لمحے توقف کے بعد میدا کی ٹھہری ہوئی آواز گونگی۔ ”جاننت ہیں، اپنے کو سب پتا ہے مہا

راج اسارے ریتی رواج کا، جو نہیں جانے ہیں، ان کو جوتانے تم ادھر آئی گیو ہو۔“

مجھے جبرت ہوئی، اس نے خلاف توقع خود کو بجا بوس کر رکھا تھا۔ ٹھٹھل کہنا تھا، اڈے کے استاد کا یہ عمل دو ہی صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ یا تو وہ صورت حال کی نزاکت بھانپ گیا ہے، اپنے مقابل کی بے باکی اور مظہر آمیز تیور کا اسیر ہو گیا ہے یا اسے خود پر حد درجے اعتماد ہے۔ سوا گلا قدم اٹھانے سے پہلے استاد کے سہاہ وسفید کالین، اس کی پیدائش کر لینا بہتر رہتا ہے مگر شاید کسی نظر ثانی کا مرحلہ تمام ہو چکا تھا۔

”چاقو نکالو استاد! تم کو بولانا، اپنے پاس وقت کم ہے۔“ میں نے جھڑکنے لہجے میں کہا اور اسی دم جب سے چاقو نکال کے تیزی سے کھولا اور خاصی بلندی پر اچھال کے چابک دستی سے دوبارہ ہاتھ میں اچک لیا۔ اتنی بلندی پر چاقو اچھال کے دوبارہ گرفت میں لینے کے لیے نگاہ ہٹائے رکھی پڑتی ہے۔ ٹھٹھل کے بقول، منتظر ہاتھ کو نگاہ کا باندھ کر دینا چاہیے۔ اس توازن سے کسی پچھتاوے کا امکان کم سے کم رہ جاتا ہے۔ میں نے بہر حال ہر ممکن احتیاط کی تھی۔ میرے چاقو نکالنے پر سبھی بے قرار ہو گئے تھے، جو بیٹھے تھے، اٹھ کھڑے ہوئے اور ایک ساتھ بہت سے چاقو ٹھٹھلنے کی آواز آئی۔ وہ میدا کے اشارے کے منتظر تھے۔ میدا کا سکون سکوت دیکھ کے شاید انہیں مایوسی ہوئی۔ ایک اور وجہ تھی ان کے ٹھٹھل جانے کی ہو سکتی ہے۔ میں نے چاقو واپس اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔

”تم اپنے کو یہاں سے باہر کر دینا چاہت ہو؟“ میدا نے بظاہر گلہ مندی سے کہا۔ ”ٹھٹھک سے ساب بہا اور! گت ہے، تمہرے پاس سے بہت کئی ہے پر ابھی تیری عمر باقی کتنی ہے؟“

”ہماری جانے دو استاد، اپنے لیے سوچو۔“

میں نے درستی سے کہا ”تمہاری کتنی رہ گئی ہے،

تمہارے دن ضرور پورے ہو گئے ہیں۔“

اس نے سر جھکایا اور لمبے بھر بعد اٹھا یا تو اس کی آنکھیں بھی ہوئی تھیں، پھر اسے جھرجھری سی آئی تھی کا ایک کس نے بے شک آمیز انداز میں بولا۔ ”پر ایک بات پوچھتے ہیں جو اسباب..... ہم کو ادھر راج سنگھاسن سے ہٹا دیکے پیچھے کیوں پڑتے ہو۔“ یہ کہتے کہتے اس کا لہجہ فہمائی ہو گیا ”کیوں اپنی جان کے پیری بنو ہو۔ الٹ گیتو سارا..... تم خود ہی بولتے ہو، ہم بھی کسی بولتے پر ادھر راج گدی سنبھالے بیٹھتے ہیں۔“

”جانتے ہیں اچھی طرح..... ایسے ہی کسی نے تمہاری میں رکھ کے اڈے کی گدی تمہارے آگے نہیں کر دی ہوگی۔ بل کا توڑ بل ہی ہوتا ہے۔ دوسرے میں دم ہے تو پہلے کو جانا پڑتا ہے۔ اڈوں پر یہی الٹ پھیر رہتا ہے۔ ایک جاتا تو دوسرا آ جاتا ہے۔“ میں نے اکڑی ہوئی آواز میں کہا۔ ”اپنے کو تم سے پیر نہیں پر اپنے لیے کوئی راستہ نہیں چھوڑا تم نے۔“

”ہا میں! ہم ایسا کیت ہیں؟“ اس نے متسخرانہ لہجے پر کمرے میں موجود ہجوم کی ہنسی چھوٹ گئی۔ میدا نے انہیں ڈانٹا اور پلٹیں جھپکاتے ہوئے بولا۔ ”تمہاری ماں نے تو کوئی سکایت نہیں لگائی مہری؟“

”میں تم سے زیادہ بولنا آتا ہے استاد۔“ میں نے ضبط کیا اور کھی ہوئی آواز میں کہا۔ ”اچھا ہے، زبان بھینچ کے رکھو۔ ہاتھ پاؤں اور چاقو کا بل ہی نہیں، اڈے کے استاد کے اور بھی بل ہوتے ہیں۔ وہ تم کو بعد میں بتا دیں گے۔ پہلے تو چاقو نکالو اور کرو گے تو تمہارے یہ پٹھو، تمہاری طرف دیکھنے والے کیا سوچیں گے۔“

دھرج رکھو بلما! یہ اپنے کو آگے پیچھے سے پورا جانت ہیں۔“ میدا سر جھٹک کے بولا۔ ”ٹھٹھوڑی جو کئی رہ گئی ہے، او آج جان جاویں گے۔“

میدا کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ نمودار

آئی۔ گردن گھما کے اس نے چوکی پر بیٹھے اپنے ساتھیوں کو دیکھا اور کسی قدر ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ”تمرا کھیال آوت ہے، آدمی دیکھ کے ہی ہم چاکو کھولتے ہیں۔ ادھر بہت سے تمہاری جوڑی کے ہیں۔ پہلے ان کو بھگت لیا، بعد کو ہم، سامنے آ جاویں گے..... جرورت پڑی تب.....“

”ٹھٹھک ہے۔“ میں نے جھڑکنی آواز میں کہا۔ ”ٹھٹھک ہے، ایسا نہیں نہیں ہوتا۔ پر تم سامنے آنے سے گھبراتے ہو یا تمہاری کمر میں موج آگئی ہے تو اپنے کسی سورا کو آگے کر دو جس پر تم کو اپنے سے زیادہ بھروسا ہو..... اور ایک بات جان لو! استاد خود سامنے آئے یا بدلے میں اپنے کسی رستم کو آگے کر دے۔ رستم کے لانا ہو جانے پر چوکی سے پھر استاد ہی کو نیچے آنا پڑتا ہے۔“

”جانت ہیں، جانت ہیں۔“ میدا کی آواز مجڑے لگی۔ ”پر اتنا آگے کا کیوں سوچتے ہو۔“

”آگے کا ہم کو معلوم ہے۔ اس لیے ایسا بولتے ہیں۔“ اس یقینی لہجے سے اس پر اپنے اعتماد کا اظہار مقصود تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اور بھڑکتا، میں نے کہا۔ ”اور ایک بات بولیں استاد!“

وہ پلٹیں پٹ پٹانے لگا۔ اس کے نتھنے پھول گئے۔

”اچھا ہوگا، تم خود ہی چوکی سے ہٹ جاؤ۔ ایسے استاد کو چوکی چھوڑ دینا چاہیے جسے اپنے بل پر بھروسا ہی نہ رہا ہو۔ تمہارے اترنے کے بعد تمہارے کسی ہڈ حرام کو لاج آئی، کوئی بھی اپنی جان کا دشمن اٹھا تو فیصلہ ہمارے سچ ہو جائے گا، ایک ایک کر کے آخری آدمی تک اڈے کے استاد کے سر پہ تلوار لگی رہتی ہے۔ باہر کا نہیں، اڈے کے اندر بھی تمہارے کسی سر پہلے کو مستی سوچ سکتی ہے۔ یہ تمہارے آنے سامنے بیٹھے، تمہاری مالا پٹنے والا میں کسی کا بھی سر کسی وقت لوٹ سکتا ہے، نتھتے ہو ہماری بات؟“

اتنی دیر میں ترانیاں سن کے اڈے کے استاد کا کوئی بھی شیدائی بے لگام ہو سکتا تھا۔ ٹھٹھل کے اڈے پر ٹھٹھل کے سامنے کوئی اس طرح دعوازی کرتا تو ایک نہیں، ٹھٹھل کے کئی پروردہ بے قابو ہو جاتے۔

اکبر علی خاں نے کئی بار کے ایک بار بھر مجھے منتشر کیا۔ ان کی موجودی کسی بوجھ کی طرح مجھ پر مسلط تھی۔ انہوں نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ ان کا چہرہ میرے سامنے نہیں تھا لیکن ان کی ڈگرگوں حالت کا اندازہ کیا جا سکتا تھا۔

میرے ساتھ آنے پر اب شاید انہیں پچھتاوا ہو رہا ہو۔

بے ٹھٹھک ہم چاروں طرف سے اڈے کے سرکش اور منتقل آدمیوں کے نرغے میں تھے۔ اب تک نہیں تو کچھ بعید نہ تھا کہ دوسرے لمبے استاد میدا کے کسی بہت دیوانے کے دماغ میں اپنے استاد کے سامنے کچھ کرگزر جانے کا سودا سا جائے۔ اڈے پر موجود ہر شخص اس سرخ روئی کے لیے بے تاب ہو گا۔ اکبر علی خاں ایک ذہن، پختہ کار، معاملہ فہم اور اعلیٰ تعلیم یافتہ آدمی تھا۔ ولایت میں وکالت کی تعلیم حاصل کی تھی۔ ایک دنیا دہمی تھی۔ جلد یا بدیر انہیں یہ نتیجہ اخذ کر لینا چاہیے تھا کہ میری باوہ کوئی بے صل سے کہ بے سبب۔ چاقو پر میری دست رس کا انہیں علم نہ تھا لیکن شناسائی کی اس مختصر مدت میں انہیں اچھی طرح میرے ہوش و حواس کی درستی کا اندازہ ہو جانا چاہیے تھا۔

اصل تو یہی ہوش و حواس کا توازن، ان کی درستی ہے۔ کسی غیر ارادی، ناگہاں لغزش کا امکان تو ہر وقت رہتا ہے۔ یہ اڈا، یہاں کے لوگ، سبھی کچھ پھیرے لیے اجنبی تھا۔ میدا اور اس کے آدمیوں کی تشکیلی سے میرا ارادہ، آئینہ اقدام شرط تھا اور ایک نہیں، بیک وقت کئی سمتوں اور پہلوؤں پر نظر رکھنی لازم تھی۔ اڈے کے استاد اور اس کے حاشیہ برداروں کو اڈے کی وضع اور طور طریقوں کی تلقین،

ان پر مسلسل اثر اندازی، ایسی دلیلوں کی پورش جو ساخت اور بے وزن نہ ہوں اور حاصل یہ کہ کسی تاخیر کے بغیر اپنے مقصد کا حصول۔ ٹھہل کہنا تھا کہ دلیل کی کاٹ جاتو سے تیز ہوتی ہے اور شخص حجت پر مبنی ہونو کنہ پھٹنے کا کام بھی نہیں کر پاتی۔ وہ کہتا تھا، دلیل کو دہائی نہیں ہونا چاہیے۔ نہ ان کا وار ایسا شدید ہو کہ مخاطب بدحواس ہو جائے یا ہو جائیں، عقل و ہوش سے عاری۔

میدانہ ظاہر اتنا مضطرب نہیں لگ رہا تھا جتنا اس صورت حال میں اور میری لاف زنی سے ہونا چاہیے تھا۔ اس کا حال کچھ عجیب تھا۔ سبھی چہرہ ٹھنما جاتا، آنکھیں سرخ ہو جاتیں اور کبھی ایسا لگتا جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں اور سنا ہے تو اعتبار کے لائق نہیں سمجھا۔ بیش تر وہ مطمئن اور مستعد نظر آتا رہا تھا۔ یقیناً زور کے علاوہ اپنے دوسرے اوصاف کی وجہ سے وہ اتنے بہت سے لوگوں اور پٹنا ایسے خاصے بڑے شہر میں ممتاز ہوا ہوگا۔ کسی قدر توقف کے بعد وہ تھیکے لچھے میں بولا۔ ”پوری طرح سمجھ میں آوت ہے سب! ساتھ تمہارا مان بھی دیکھتے ہیں۔“

”نہیں ہوتا تو اس طرح منہ اٹھائے، سینہ پھلائے سامنے نہیں آجاتے۔“

”اچھا ہی ہوا، تم آپ ادھر چلے آئے۔ ہم بھی تمہارے کو دیکھنے چاہتے تھے، پر تم اتنی دیر کیوں لگا دیو بیجا سب، کدھر چھپ گئے تھے؟“ میدانہ پھلے پن سے بولا۔

”سمجھو جتنی دیر تم کو ادھر گدی پر راج کرنا تھا، اتنی دیر ہم کو بھی لگنی تھی۔ ابھی تم کو بولانا تم نے یہی ایک راستہ لھلا چھوڑا تھا، نکتے دوسرے بھی تھے لیکن اپنے پاس وقت نہیں ہے۔“

”ابھی بھی کدھر چھپ گئے؟ تم تو ادھر چوکی پر راجا بن واسطے آ ہو۔“

”اپنا کوئی ارادہ نہیں تھا ادھر آنے کا، تمہاری چوکی، راج گدی سے اپنا کیا بیرو پر اور راستے اسی

طرح کھلیں گے۔“ میں نے ایک چاہیے سانس لی اور تند لچھے میں کہا۔ ”اور ویسے بھی ٹھیک ہی ہوا۔ تم جیسے استاد کو شہر کے اڈے کی چوکی پر نہیں ہونا چاہیے۔ اڈوں کے لوگ چوراہے، اٹھالی کیرے نہیں ہوتے۔ مگلی کے کتوں کی طرح انہیں بھونکنے کا نئے کے لیے چھوڑ نہیں دیا جاتا، مگلوں میں پنا ڈالا جاتا ہے۔ اپنا بھی تھوڑا بہت اڈا کیروں سے ساتھ رہا ہے۔“

”دوسری جگہ یہ پکا ہووے ہے؟“ میدانہ آنکھیں پھاڑ کے پوچھا۔ میری تلخ کھلی کا اس پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔

”دوسری جگہوں پر ایسا اندھیر نہیں ہوتا۔“

”رستہ کھلا رکھتے پھر تہرے لیے؟ ہاں بھیا جدھر تمرا من کرے، کل پڑو۔ تم ادھر دن کے اجالے میں اپنے تین آدی پر ہاتھ اٹھاؤ، دو کو آدھا کر دیو، تیسرے کو ٹوکھانے لگائے دیو۔ ہاں۔“

”اور اب چوتھے کی باری ہے۔“ میں نے دہکتی آواز میں کہا۔

میدانہ کا ٹھیرا مصنوعی تھا۔ اس کے جسم میں لہریں اٹھیں۔ قریب بیٹھے سا بھی اپنی جگہوں پر سنے اور بندھے نہرہ سکے۔

”میں..... میں..... مجھے کچھ بولنے کی اجازت ہے؟“ یکا یک اکبر علی خاں نے ایک قدم آگے آگے جھپکنے ہوئے کہا۔ سبھی چونک پڑے۔ اکبر علی خاں کا لہجہ مفاہانہ اور ہاتھ احتجاجی اور کسی قدر فریادی انداز میں اٹھا ہوا تھا۔

اکبر علی خاں نے میدانہ کو مخاطب کیا تھا۔ میدانہ کی آنکھوں میں چمک ہو پیدا ہوئی۔ اس کے کچھ کہنے سے پہلے میں نے سختی سے اکبر علی خاں کو متنبہ کیا۔ ”آپ کچھ نہیں بولیں گے۔“

”بولو وکیل سب! میدانہ فیاضانہ تیور سے بولا۔ ”کا، کا بات ہے؟“

”نہیں جناب، آپ اس بدتمش سے کوئی کلام

نہ کریں۔ یہ اس لائق ہی نہیں۔“ میں نے اکبر علی خاں کو دوبارہ منع کیا۔

”بولو وکیل سب! بولو۔“ میدانہ جینے سے بولا۔

اکبر علی خاں کی حالت اضطرابی ہوئی، بے چارگی سے میری طرف دیکھا کیے، سبھی میدانہ کی طرف۔

”یہ عدالت نہیں ہے جناب، ان لوگوں کو آپ کی زبان نہیں آتی۔ آپ اپنا کہا ضائع کریں گے۔“ میں نے تعلقینی لچھے میں کہا۔

”میں صرف، صرف حقائق بتانا چاہتا ہوں۔“ اکبر علی خاں ٹھنی ٹھنی آواز میں بولے۔

”مگر کس سے؟ یہ شخص اندھا بہرا ہے کیا؟ سبھی میں بہت سے لوگ موجود تھے۔ انہوں نے اسے آنکھوں دیکھا نہیں بتایا ہوگا کیا؟“

اکبر علی خاں کا جسم بل کھانے لگا۔

میدانہ غور سے سن رہا تھا۔ ”آپ کا اس اونچا سر والے ہوا سب سے کوئی رشتہ نانا تا لاگت ہے کا، وکیل سب!“

”نہیں میدانہ بھائی، ایسا کچھ نہیں ہے۔“ اکبر علی خاں نے پنا تلا جواب دیا۔

”اوہی تو ہم بھی سوچیں ہیں، آپ ان کے بات کیسے چڑھ گیو۔ ای اک نمبری چا کو باج، پل بھر میں جمین آسان تل پت کر دیو۔ آپ پچھری عدالت کے بندھو، کھاندانی بھلے ماس، سہر میں آپ کے نام کا ڈکا ڈکا جوت ہے۔“ میدانہ کا طنز مستحکم آمیز تھا اور کچھ ایسا کاری نہیں تھا۔ اس نے بہ ظاہر حیرانی سے پوچھا۔ ”پھر کا ہے؟“

اکبر علی خاں کچھ کہنا چاہتے تھے کہ میں نے میدانہ سے کہا۔ ”سارا رشتہ نانا ابھی صاف کر دیں گے۔ پہلے چا تو دکھاؤ استاد!“

میدانہ نے میری برہمی پر توجہ نہیں دی اور اکبر علی خاں سے بولا۔ ”ہاں وکیل سب، ہم آپ سے کچھ

پوچھتے ہیں۔ کب سے جانت ہو آپ اپنے سیر بہر کو؟“

”زیادہ دیر سے نہیں۔“ اکبر علی خاں نے منانت سے جواب دیا۔ ”ابھی دوپہر سے۔“

”ابھی اسی دوپہر یا سے سے؟“ میدانہ پلکیں جھپکنے لگا۔ ”ادھر مئی میں آپ بھی تھے کا؟“

”نہیں صاحب، میں وہاں نہیں تھا۔“ اکبر علی خاں نے مضطربانہ سر ہلایا۔

”پھر آپ..... آپ؟“ میدانہ کے چہرے پر کش مکش نمودار ہوئی اور چکارائی آواز میں بولا۔ ”بولانا وکیل سب! ہم کا سب، سب کھل بتا دو۔“

”بہتر ہے آپ یہاں سے چلے جائیں۔“ میں نے برحسب سے کہا۔ ”اور زمینان رکھیں، میں اس منہ زور، اس بن ماس کو دکھ لوں گا۔ یقین کیجئے، اس کا وقت آ گیا ہے۔ اس کے سامنے کسی وضاحت اور دلیل و حجت سے کچھ حاصل نہیں۔ یہ دوسری طرح کا آدی ہے۔“

”خدا کے لیے مجھے کچھ بات کرنے دیجیے۔“ اکبر علی خاں نے شکستہ لچھے میں مجھ سے منت کی۔ ان کی عاجزی اور رنجیدگی بہ ناراضی غالب تھی۔ مجھے میری بدکھائی اور تلخ نوالی سے باز رکھنے کے لیے بس ان کا ہاتھ جوڑنا ہی رہ گیا تھا۔ کسی آخر کوشش کے طور پر انہوں نے حتی انداز میں سرگوشی کی ”بعد کو آپ کو اختیار ہے۔ آپ کہتے ہیں تو چلا بھی جاؤں گا میں۔“

”کا، کا ہے؟ ہم سے بولو وکیل سب، بے ہتھکڑ ہوئی کے ہم کا بولو۔“ میدانہ بے قراری سے بولا۔

میرے لیے اب خاموش ہو جانا ہی مناسب تھا۔

”میرا ان صاحب، اس نوجوان سے کوئی تعلق نہیں ہے میدانہ بھائی۔“ اکبر علی خاں نے میری خاموشی پر گہری سانس بھری اور دونوں لچھے میں

مقبول ترین مصنف **محی الدین نیک** جن کی کہانیاں کھولتے ہیں لوگوں سے پرہمی جاتی ہیں

8 بہترین کہانیوں کا مجموعہ



کانیا ایڈیشن شائع ہو گیا ہے

خوبصورت

گیٹ اپ

قیمت 100 روپے
والنگ 25 روپے

کمپیوٹرائزڈ

کتابت

محی الدین نواب کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ "ایمان کا سفر" بھی دستیاب ہے

کتاب کی قیمت بمقدار خراج بذریعہ منی آرڈر پیشگی روانہ کریں

کتابیات پبلی کیشنز

پوسٹ بکس 23 کراچی 74200

فون: 021-5804300 ای میل: kitabiat1970@yahoo.com

C-63/11 ایکس پریس ڈی ایچ اے مین کورنگی روڈ (آخر کار لوٹی بس اسٹاپ کے سامنے) کراچی 75500

کہا۔ "میں آپ کو بتاتا ہوں، میں اور بھوی بچے گھر میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے کہ انہوں نے دروازے پر دستک دی اور بتایا کہ یہ اس شہر میں اجنبی ہیں اور بہت پریشانی میں ہیں۔ پیچھے پوچھیں۔ ساری بات بتائی کے پٹنا شہر میں آنے کا ان کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ یہ تو آگے جا رہے تھے کہ سفر میں کل رات ان کے بڑے بھائی کی طبیعت خراب ہو گئی۔ جلد علاج کے لیے انہیں آگے کا سفر ملٹوی کر کے پٹنا شہر رکنا پڑا اور انہوں نے پٹنا میڈیکل کالج اسپتال کا رخ کیا۔ رات بھر بھائی کے سرخانے اسپتال میں رہے۔ آج صبح بڑا ڈاکٹر مریض دیکھ کے جا چکا تھا۔ انہوں نے نرس سے اجازت لی اور رشتے داروں کو بھائی کی حالت کے بارے میں تار دینے کے لیے یہ بڑے ڈاک خانے گئے تھے کہ ان کا بھائی نے چھین لیا۔ انہوں نے اس کا پتھا کیا۔ وہ آدمی بھاگتا ہوا ڈاک خانے کی بازو والی جگہ میں داخل ہو گیا اور اس نے ایک جگہ ان کے بالکل سر پہ آ جانے پر چاقو تان لیا۔ انہوں نے اسے قابو میں کر لیا اور اپنا ہوا حاصل کر لیا تھا کہ ایک دوسرے آدمی نے ان کا راستہ روک لیا، دوسرا پھرتیرا۔

یہ جگہ سے نکل آئے اور اسپتال واپس جانے کے لیے تانگے میں بیٹھ گئے۔ کچھ راستہ طے کر لیا تھا کہ دیکھا، پولیس اور بہت سے آدمی ان تک پہنچنے کے لیے بھاگ رہے ہیں۔ سڑک کے کسی سوڑ پر وہ لوگ پل بھر کے لیے اوجھل ہو گئے تھے کہ یہ تانگے سے کود کے فریبی گئی میں گھس گئے اور گئی گئی گھومتے، چھپتے پھرے اور مجبوراً انہیں ہمارے گھر کے دروازے پر دستک دینی پڑی۔ انہیں بھائی کے پاس جلد اسپتال پہنچنے کی فکر تھی۔ پولیس کے ہاتھ آ جانے اور کسی بڑے بھگڑے میں پڑنے سے وقت اور نکل جاتا۔ ان کی زبانی سارا واقعہ سن کے مجھے ہم دردی ہوئی۔ میں نے مشورہ دیا کہ تمہیں چار دن میں حالات دب جانے یا ٹھیک ہو جانے تک، بہتر ہوگا، یہ میرے گھر ٹھہرے رہیں۔ میں اسپتال جا کے ان کے بھائی کی دیکھ بھال کر سکتا ہوں۔ ان کا کہنا بھی ٹھیک تھا کہ جس تانگے میں انہوں نے اسپتال سے بڑے ڈاک خانے تک سفر کیا تھا، اسی تانگے سے اسپتال واپس جا رہے تھے۔ استاد میدا اور اس کے آدمیوں کے لیے تانگے والے کو ڈھونڈنا کانا مشکل نہ ہوگا۔ وہ اسپتال پہنچ گئے تو وہاں ان کے بھائی کے پاس مجھے دیکھ کے ان کا شک میرے گھر پہ جا سکتا ہے۔ اس طرح میں خواہ خواہ کسی پریشانی سے دوچار ہو سکتا ہوں۔ مجھے تو اسی شہر میں رہنا ہے۔ استاد میدا کے سینے میں میری پھالس چبھ سکتی ہے۔ میں نے کہا، پھر یہ ایسا کریں

دونوں کے ہاتھوں میں کھلے چاقو تھے۔ وہ اپنے پہلے ساٹھی کی ناکامی کا بدلہ لینے کے لیے ان پر وار کرتا جاتے تھے، انہوں نے اپنا چاقو نہیں نکالا تھا۔ ان کا کہنا ہے، انہوں نے بہت کچھ کہا، کہا کہ انہیں کہیں جلد ہی پہنچنا ہے۔ شاید اسپتال کے بارے میں بھی بتایا تھا۔ یہ اپنا ہوا دینے پر بھی تیار ہو گئے تھے۔ وہ دونوں بہت غصے میں تھے۔ انہیں ہر حال میں اپنا ہوا دینا پڑتا تھا۔ ایک آدمی انہوں نے بس میں کر لیا تھا کہ دوسرے نے کچھ نہ دیکھا۔ اس کی ذرا سی چوک سے ان کی پکڑ میں آئے اس کے ساٹھی کو بھی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ کچھ یہی ہوا، وہ آدمی دیوانہ ہو چکا تھا۔ چاقو اس کے ہاتھ میں تھا۔ یہ کہتے ہیں، انہوں نے اس کے وار سے خود بچنے اور

کہ مجھے اپنے گھر کا پتا بتائیں، میں ان کے رشتے داروں کو پتہ آنے کے لیے تار دے دیتا ہوں۔ وہ کل پارہوں تک آجائیں گے۔ اس وقت تک یہ میرے گھر پیچھے رہیں۔ پھر کسی دن، کسی مناسب وقت، اندھیرا ہو جانے کے بعد رات کو کسی وقت چپکے سے یہ پتہ شہر سے نکل جائیں۔ انہوں نے میرا ہر مشورہ مسترد کر دیا۔

”یہ نوجوان آدمی ہیں۔ اچانک انہوں نے فیصلہ کیا انہیں خود استاد میدا کے پاس جانا چاہیے۔ میں انہیں منع کرتا رہا۔ یہ نہیں مانے۔ مجھے نہیں معلوم یہاں آنے کا ان کا فیصلہ کس قدر جذباتی ہے یا استاد میدا کو اس کی پرانی جگہ سے بے دخل کر دینے کا بھروسہ اس حد تک درست ہے۔ میں نے احتیاطاً ان کے ساتھ رہنا مناسب سمجھا، شاید میرے ساتھ ہونے سے بات اتنی نہ بڑھ پائے۔ جو کچھ میرے علم میں ہے، میں نے آپ کو بتا دیا ہے میدا بھائی۔ میں انہیں بالکل نہیں جانتا، آج ہی آنا سامنا ہوا ہے لیکن میں نے دیکھا ہے، اپنے بھائی کے پاس جانے کے لیے یہ بہت بے چین تھے۔ بھائی کے لیے یہ کچھ بھی کر گزار سکتے ہیں۔“

اکبر علی خاں کو موقع کی نزاکت کا شدت سے احساس تھا۔ انہوں نے خوش وضعی سے جیسے ایک ایک لفظ چن چن کے، آواز کے کسی زبردوم کے بغیر، بڑی حد تک غیر جانب داری سے ساری روداد گوش گزار کی۔ مدعا کی ترسیل کے لیے سماعت اور گویائی کا توازن لازم ہے۔ انہوں نے اپنے بیان میں مخاطبین کی سماعت کی استطلاعات کا خیال رکھا اور عدالتی طرز بیان سے اجتناب کیا۔ عدالتی بیان میں دلیلیں مسلما کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اکبر علی خاں نے سادگی شعاری کی تھی، سادگی اور اختصار، جزئیات اور صراحتوں سے بڑھنے اور سننے والے کا تجسس و اشتیاق متاثر ہوتا ہے۔ سطور کم، مین السطور زیادہ، یہی بلاغت کا قریب ہے۔ نہ کہتے ہوئے بھی

انہوں نے کبھی کچھ کہہ دیا تھا۔ وکیل وہ کتنے ہی بڑے ہوں، ان کا بیان ان کی طبیعت ذہانت کی آئینہ داری کر رہا تھا۔ ہر فضیلت کی پہلی شرط ذہانت ہے۔ انہوں نے ہر غیر ضروری ذکر سے پرہیز کیا تھا۔ ہول میں ہمارے قیام، چاقو لہراتے ہوئے ان کے گھر میں میری آمد کی ناگہانی، پردہ دار خواتین کی بے پردگی اور انہیں بیت میں رکھنے کے جرم کی گفتنی نالغشی سے انہوں نے پہلو تہی کی تھی۔

سارے ہال میں خاموشی چھا گئی۔ میدا کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس نے دخل دیا نہ میں نے۔ اکبر علی خاں کے چپ ہو جانے پر کچھ گزر گئے، میدا بے حرکت بیٹھا رہا پھر اس نے پہلو بدل کے حلقے کا لمبا کش لیا، اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور ایک ہل کے لیے آنکھیں میچ لیں۔ اس کی پیشانی پر شگفتگی گہری ہو گئی تھی۔

میری خاموشی کا اب کوئی جواز نہ تھا۔ میدا کے منقہ، مثبت تاثر کا انتظار کرنا اب بے محل اور بے مصلحت تھا۔ میں نے اونچی آواز میں اسے مخاطب کیا۔ ”وکیل صاحب کو جو بولنا تھا، بول چکے میدا استاد! سمجھو، وکیل صاحب نے تم سے کچھ بولا اور نہ تم نے کچھ سنا۔ ان کے جھوٹ جج بر دھیان مت دو اور اپنا میرا وقت اور برباد مت کرو۔“ میں نے بھرتی سے چاقو کھول لیا۔ ”اپنا فیصلہ اسی پر ہونا چاہیے۔ تم کو کبھی زبان آتی ہے نا۔“

اکبر علی خاں نے مایوسی سے میری طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔

میدانے میرا کہا درگزر کیا اور ہاتھ اٹھا کے اکبر علی خاں سے پوچھا۔ ”اوتو سب تمیک ہے۔ جو آپ بولے، ہم پورے دھیان سے سن لیے، پر آپ کا بھجوت ہیں، ہمارا مطلب ہے، آپ کتنا جانت ہیں، ای سارا سیدھا ہی بولت ہیں کا؟“

”میں نے جو دیکھا اور سنا ہے، وہی آپ کو بتایا ہے۔“ اکبر علی خاں ابھی ہوئی آواز میں بولے۔

”ایک بات صاف کر دوں میدا بھائی، میں ان کا وکیل بن کے یہاں نہیں آیا، میں نے آپ سے ان کی کوئی سفارش بھی نہیں کی ہے لیکن کچھ..... کچھ باتیں۔“ کہتے کہتے اکبر علی خاں رک گئے۔ ان کے ہونٹ میچ گئے، غلط بھرا بل کیا اور مایوسی سے بولے۔ ”جانے دیجیے، بہتر ہوگا، آپ دونوں خود ہی منٹ لیجیے۔“

”اوکا..... کا بات؟“ میدا اچھل کے بولا۔ ”اوتو آپ جیسا بولت ہو، بعد کو ہم دیکھ ہی لیں گے۔ ہم کو ہی سارا دیکھنا ہے، پر آپ بولو، آپ کا..... کا کہنا چاہت تھے؟“

”کچھ نہیں میدا بھائی۔“ اکبر علی خاں کی آواز بھاری ہو گئی۔ ”یہ ہمارے گھر اپنی مرضی سے آئے تھے، ہماری دعوت پر، ہماری خوشی سے نہیں، اور انہوں نے ہمیں کچھ سوچنے سمجھنے، کچھ کرنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔“

میدا اچھل پڑا۔ اس نے اکبر علی خاں کو بات پوری کرنے نہیں دی۔ ”جرور چاقو نکالا ہونے گا۔ چاقو سے ٹھیلن کا ان کا بہت چاؤ لگتا ہے۔ ای ہی نا؟“

اکبر علی خاں نے تائیدی کی نہ تردید۔ بردباری سے بولے۔ ”شروع میں انہوں نے زور ڈالا تھا، ڈالنا ہی چاہیے تھا لیکن جلد ہی ہماری ساری حیرت دور کردی، دکھ بھی اور خوف بھی۔ انہوں نے گھر کے کسی فرد کو تنگ نہیں کیا، کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔ اپنے آنے کی وجہ بتائی اور گھر میں اس طرح داخل ہونے کی معافی چاہی۔ کچھ دیر گھر میں رہنے کی اجازت چاہی۔ اس کے سوا کچھ نہیں..... میں نے بہت کریدی اور ان کے جواب پر کسی اور طرف دیکھنے سوچنے کی ضرورت ہی فحسوس نہیں ہوئی۔“

انہوں نے اسپتال اور ڈاکٹر کا نام بھی بتایا۔ میں نے آپ کو ابھی بتایا ہے کہ یہ دو تین دن ہمارے گھر ٹھہرے رہنے کے مشورے پر راضی نہیں ہوئے۔“

اکبر علی خاں کے لہجے میں پہلے سے کبھی زیادہ اعتماد

تھا۔ کہنے لگے۔ ”اتنی عمر میں ہم نے بھی کچھ دیکھا بھالا ہے میدا بھائی، اپنا کام ہی ایسا رہا ہے بھانت بھانت کے لوگوں سے واسطہ پڑا ہے، ایک سے ایک بڑھ کے۔ تھوڑی بہت آدمی کی پہچان ہونی چاہیے۔ آپ کے آدمی اور پولیس والے ان کے پیچھے نہ ہوتے تو یہ ہمارے گھر میں کیوں داخل ہوتے۔ کوئی اور بات، کوئی اور ارادہ ہوتا ان کا تو یہ ہم سے کسی اور طرح پیش آتے۔ میں نے دیکھا ہے، ان میں حوصلے کی کمی نہیں۔ یہ پولیس کے سامنے بھی آجاتے اگر انہیں کسی جگہ تک پہنچنے کی بے گلی نہ ہوتی۔“

میدا کی بھوس چڑھ گئیں اور نتھنے پھڑکنے لگے۔ نخوتی لہجے میں بولا۔ ”پولیس کو تو ہم ابھی ادھری بلوا سکت ہیں۔ آپ کو پتا ہے ویل سب۔“ اس کی آواز تڑننے لگی۔ ”اپنا ایک آدمی چلا گیا، بہت پرانا ساتھ تھا اپنا۔ چاقو گھماوت تھا، بجلی لپکت تھی اس کے انگ انگ میں۔ اس حرام چادے کا اتنا کھون نکل گیا کہ اسپتال کے رستے میں دم توڑ گیا۔ تمہارے اس سکتی وان، سری مان کے کارن اس کی ہتیا ہو گیا۔ ایسویس کو کسی دیکھا لگتا ہے ویل سب، ہم سے زیادہ آپ جانت ہو۔ ای ہم سے چاقو کی بات کرت ہیں۔ پہلے ہمارے آدمی کا حساب چیتا کر دیں۔ اسارے کا دیر ہو دے گی، پولیس ادھر آ جاوے گی۔“

”اشارہ کرنا، بلاؤ پولیس کو، سوچتے کیا ہو پھر؟“ میں نے پھینکارتی آواز میں کہا۔ ”پر ہم کو معلوم ہے استاد، تم ایسا نہیں کرو گے، اپنے ان پٹوؤں کو کیا جواب دو گے، کس اند سے سامنا کرو گے ان کا، کیا سوچیں گے یہ ایسے استاد کے لیے جو چوکی پر بیٹھا اینڈ تار ہا، چوکی سے چبے رہنے کے لیے استاد کے پاس پولیس کی آڑ رکھی تھی۔ تم خوب جانتے ہو گے، ایسے راجا کو پر جا کب تک سہن کرے گی، کب تک بچوں پہ بٹھائے گی اسے۔“

میداکا چہرہ سلگ رہا تھا، سنے کی نے اس کی انگلیوں میں لڑواں تھی۔ اس کے ساتھیوں کے بیچ کتاب کا بھی کچھ بکھی عالم تھا۔

”ہم تو خود ادھر آئے ہیں حساب صاف کرنے۔“ میں نے دانستہ اپنی آواز کسی قدر مدغم کی۔ ”اپنے پرانے آدمی کے پتھر جانے یہ تمہارا خون بہت ٹھوٹا ہے۔ بڑا چاقو کھاتا تھا وہ، بڑی بکلی تھی رگ رگ میں۔ اس کو تو پورا دیکھنا بھی نہیں آتا تھا استاد! چاقو کے ٹھیل میں ہاتھ، آنکھیں اور دماغ بانڈھ کے رکھنا پڑتا ہے۔ یہ تال میل نہ ہو تو وہی ہوتا ہے جو اس کے ساتھ ہوا۔ اسے تو کب کا ڈھیر ہو جانا چاہیے تھا۔ لگتا ہے، بھی کوئی اٹھیل نہیں پڑا تھا اس کے سامنے۔ تم اپنی بات کرتے ہو۔ ہمارے راستے بند کر کے ہمیں کتنا دکھ پہنچایا تم نے، اسے تم کیا جانو گے اور پولیس کی بات کرتے ہو، چونکہ سے اتر کے پہلے ہمارے سامنے آد۔ اپنا وعدہ بھجوا سے۔ اتنے لوگوں کے بیچ بولتے ہیں، پولیس کے سامنے ہم خود آ جائیں گے۔“

”میری بات سنئے۔“ اکبر علی خاں نے دونوں ہاتھ اٹھا کے بہ شدت تمام رخ زند انداز کی۔ ”میری بات سنئے میدا بھائی۔ آپ کے آدمی کو انہوں نے نہیں مارا۔“

”نہیں مارا۔۔۔۔۔“ استاد میدا بھڑک اٹھا۔ ”آپ مرگے سراسر۔ کابولت ہو۔“ وہ بھن بھناتی آواز میں بولا۔

”میری بات سنئے میدا بھائی۔ لگتا ہے جو کچھ میں نے پہلے کہا ہے، آپ نے اس پر پورا دھیان نہیں دیا۔“ اکبر علی خاں نے ٹھہر ٹھہر کے کہا۔ ”سچھے، جیسا کہ کہتے ہیں، ایسا ہی ہوا اگر۔۔۔۔۔ تو آپ ان کا راستہ کھونا کرنے کے سوا کچھ نہ کر پائیں گے۔ بعد کو پچھتاوا بھی ہو سکتا ہے آپ کو۔ میں ان کا کہنا دہراتا ہوں۔ ان کا کہنا ہے، انہوں نے چاقو نہیں نکالا تھا۔ آپ کے آدمی کا چاقو اس کے ساتھی

کی پہلی میں جا کھا ہے۔ انہوں نے مرنے والے کو بجانے کی کوشش کی تھی۔ بات کہاں سے شروع ہوئی تھی۔ پہلے آپ کے آدمی نے شہر میں انہیں اس نوجوان کا بٹو چوری کیا۔ بٹو اوپن لینے کے لیے انہیں اس کا پیچھا کرنا چاہیے تھا یاد دیکھتے رہ جاتے، چپ کھڑے اپنے لٹ جانے کا تمنا دیکھتے رہتے۔ مسافر کا بٹو، سفر میں اس کی پونجی چھن جائے تو اس کی کیا حالت ہوگی۔ مگلی میں جیب کترے کا پیچھا کر کے انہوں نے بٹو حاصل کر لیا۔ ظاہر ہے، انہیں اپنے آپ پر بھروسہ تھا کہ یہ ایسی آسانی سے چور کو فرار ہونے نہ دیں گے۔ نہ ہوتا تو وہیں، ڈاک خانے میں پھینچنے چلا تے رہ جاتے۔ بٹو اٹنے کے بعد بات ختم ہوئی تھی لیکن اسی وقت آپ کے دو آدمی ان کے آڑے آگئے۔۔۔۔۔ بتائیے، پھر یہ کیا کرتے۔ آپ ان کی جگہ ہوتے تو کیا کرتے، اور کوئی ہوتا تو۔۔۔۔۔؟ ان کی جیب میں چاقو تھا۔ انہوں نے بات بڑھ جانے کے خیال سے جیب ہی میں پڑے رہنے دیا۔ چلیے، یہ جو کہتے ہیں، اس پر نہ جائے۔ سب غلط ہے لیکن مگلی کے لوگ! انہوں نے بھی کچھ دیکھا ہے۔ وہ آپ سے کتنی دور ہیں اور۔۔۔۔۔ اور یہ کہاں بھاگے جارہے ہیں۔ پولیس بلو کے آپ انہیں ہتھ کڑیاں ڈلو سکتے ہیں لیکن پولیس کا کام ایک حد یہ جانے کا ختم ہو جاتا ہے۔ پچھری کی بات دوسری ہوتی ہے۔ وہاں شطرنج کی بازی جیتی ہے، بال کی کھال نکالی جاتی ہے۔ پھر ایک جگہ سے دوسری جگہ، تیسری جگہ۔ بات آگے تک چلی جاتی ہے۔ یہ بار جائیں یا جیت جائیں، آپ کا جانے والا ساتھی کسی صورت واپس نہیں آئے گا۔ جس بیمار بھائی اور اسپتال کے بارے میں یہ کہہ رہے ہیں، وہ بھی کسی دوسرے شہر میں نہیں ہے۔“ اکبر علی خاں نے بے چارگی سے ہاتھ پھیلائے اور تھکے ہوئے لہجے میں بولے۔ ”میں اس سے زیادہ کیا کہوں۔ آپ سمجھ دار ہیں۔“

شاید میدا کو تو قہقہے، اکبر علی خاں اسے کچھ اور قائل کرنے کے لیے نکتہ آفرینیاں کریں گے لیکن یوں اچانک اپنی عرض گزار سے دست بردار ہو جانے پر وہ چونک سا پڑا اور اس نے اپنے قریب بیٹھے معمر آدمی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ معمر آدمی کے ہڈی سے سیاہ ہونٹ بھڑ بھڑا کر رہ گئے۔ دونوں نے ایک دوسرے سے کچھ نہیں کہا۔ غصہ و غضب کے علاوہ اب میدا کے چہرے پر کس کش و کشائش بڑی نمایاں تھی۔ سنے کی نے منہ سے چپکائے اس نے جلدی جلدی کئی کس لیے اور گلی آواز میں بولا۔ ”اب آپ ان کی وکالت کرو ہو دیکھ سب۔“

”صرف ان کی نہیں، سوچئے تو آپ کی بھی۔“ اکبر علی خاں نے کسی ہجک کے بغیر کہا۔ ”یہ تو میری رائے سے میدا بھائی۔ میرا کیا زور ہے آپ پر؟ آپ نہ مائیں، حکم ہو تو زبان ہی بند رکھوں۔“ ”اپنے لیے بھی کوئی حکم کرو استاد!“ اکبر علی خاں کے چپ ہوتے ہی میں نے کہا۔ لہجے لفظوں کے رنگ بدل دیتے ہیں۔ میرے یہ ظاہر سرد لہجے میں آگ سی لگی ہوئی تھی، میدا کے جسم دجاں میں بھی منتقل ہوئی ہوگی۔ میں نے نئی سے پھر اسے نوکا۔ ”چونکہ سے نہیں اترنا تو پولیس کو بلواؤ۔ جو کچھ بھی ہے، ٹھوڑی مہربانی کرو، جلدی کرو۔“

اکبر علی خاں نے دبے لہجے میں مجھے پولیس کے حوالے کر دینے کی صورت میں طویل اور پیچیدہ مرحلوں کے عواقب سے میدا کو آگاہ کرنا ضروری سمجھا تھا۔ انہیں کیا معلوم تھا پچھری عدالت تو دور کی بات ہے، صرف ایک دن اور مجھے منتقل کے پاس نہ پہنچانے کا عذاب بھگتنا ہوگا۔ اتنا وقت میں نے جس طرح گزارا ہے، وہ میں ہی جانتا ہوں۔ میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ یہ ایک دن بھی مجھے جیسے تیسے کاٹنا ہے۔ ایک دن یا ڈیڑھ دن۔ بس اس سے زیادہ نہیں۔ پٹنے سے ٹکلتا ایسا دور نہیں ہے۔ انہیں خبر

لٹنے کی دیر ہوگی۔ پہلی گاڑی سے چل پڑیں گے۔ کل تک جامو، جرو، زور اور جانے کون کون یہاں پہنچ جائیں گے۔ کل استاد میدا ہاتھی اور شاید یہ اڈا ہی قائم نہ رہے۔ وہ ایسے ہی لوگ ہیں۔ اپنے مرئی استاد منتقل کی حالت دیکھ کے تو وہ اور پاگل ہو جائیں گے۔ میدا کے پاس پھر کیا جائے اماں رہ جائے۔

میں میدا سے یہی کچھ کہنا چاہتا تھا کہ مجھے پولیس کے حوالے کرنے سے اڈے پر اس کی حکم رانی بے شک جاری رہے گی لیکن تاکہ، صرف ایک رات اور ایک دن کے لیے۔ پھر یہاں سب کچھ بدلا ہوا ہوگا۔ میں نے اس سے کچھ نہیں کہا کہ اب مزید کہنے سننے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ کچھ ہی دیر جاتی تھی، میدا کو بہر حال کسی نتیجے پر پہنچنا ہی تھا اور یہ آسان کام نہیں تھا۔ مجھے احساس تھا کہ اڈے کے اتنے لوگوں کے درمیان کسی عزت مندانہ فیصلے کے لیے اب اسے میری اعانت کی ضرورت ہے۔ ابتدا ہی میں اس کے پیش و پس سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ چونکہ سے دست برداری پر آمادہ نہیں ہے۔ وہ نا پختہ، پٹی عقل کا آدمی نہیں معلوم ہوتا تھا کہ ایک اجنبی چاقو بردار کے مطالبے پر سینگ آگے کیے ذکر اتنا ہوا اٹھ کھڑا ہو۔ اڈے کے تین آدمیوں کی پس پانی کا واقعہ اس اجنبی شخص سے منسوب تھا اور جس تیور سے اس نے اڈے کے استاد کی عمل داری میں، اس کے حاشیہ برداروں کے درمیان آگے ایک طرح کی پورٹس ویلغار کی تھی، اڈے کا کوئی بھی استاد ہوتا تو یہی عمل و تامل کرتا۔ میدا کو بھی میرا میزان کرنے کے لیے کچھ مہلت مطلوب ہوگی۔ کچھ میں نے بھی دراز کی وقت سے عملاً چشم پوشی کی تھی۔ اڈے کے آزمودہ کار استاد کا ارادہ دگرگوں کرنے کے لیے وقت کا اتنا انصراف تو لازم ہی تھا۔ چاقو گھماتے، لہراتے ہوئے میری جانب سے مسلسل دعوت مبارزت اور مسلسل یاد

دہانی سے استاد کی فکر و تشویش میں اضافہ ہی ہوتا رہا ہوگا۔

ادھر اکبر علی خاں نے درمیان کا کوئی فسانوی راستہ نکالنے کے لیے اپنی سی کوشش کی تھی۔ ان کی موجودگی سے اتنا ضرور ہوا کہ میدا استاد کی فہمائش و سرزنش کا جو کام مجھے کرنا اور کرتے رہنا تھا، اس کی زحمت نہیں کرنا پڑی۔ اکبر علی خاں نہ ہوتے تو مجھی کو سارا کچھ دیکھنا تھا۔ میں اکیلا ہوتا تو شاید اتنی دیر نہ لگتی مگر وضع و مروت میں جو شخص ساتھ آیا تھا، ایک شریف انفس، تعلیم یافتہ، صاحب دل، صاحب نظر شخص۔ بت کی طرح کھڑے رکھنے کے بجائے اسے بھی اپنی مفاہمت، صلح جو یا نہ کاوش کا کوئی موقع ملنا چاہیے تھا۔

پہلی نظر میں میدا مجھے کوئی مشکل آدمی نظر نہیں آیا تھا۔ ہوتا بھی تو میں تو اس کے اڈے، اس کی قلم رو میں آچکا تھا۔ مجھے ہر حال میں اس سے صبر کرنا آسانی کرنا تھی۔ واپسی کسی طور ممکن نہیں تھی۔ میرا تخمینہ غلط بھی ہو سکتا تھا۔ نھل کے کہنے کے مطابق مقابل کی نا دیدہ برتری کی ایک گنجائش ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہیے اور اپنی کسی اتفاقی کوتاہی کا امکان بھی۔ اور نھل ہی کا کہنا تھا کہ چاقو آزمائی سے پہلے مقابل کی نفسی و اعصابی نکلست اور بخت کے لیے ہر ممکن حربہ آزمانا چاہیے۔ یہ بھی ایک حقیقت تھی، میں ہی جانتا ہوں کہ تمام تر یقین اور خود اعتمادی کے باوجود اس دو بد و صداقت سے پہلو تکی کی خواہش مجھے بھی تھی کہ میرا دل دماغ تو نھل میں اٹکا ہوا تھا۔ میں کتنا ہی اپنے آپ کو ہاتھ کے رکھوں، مجھے تو وہاں اسپتال میں نھل کے سر بانے ہونا چاہیے تھا۔ پولیس طلب کر کے مجھے اس کے حوالے بھی کیا جاسکتا ہے۔ اس پہلو پر تو میں نے نور ہی نہیں کیا تھا۔ اڈوں کو پولیس کی دخل اندازی سے دور رکھا جاتا ہے۔ اڈوں کا تو خود پولیس ایسا نظام ہوتا ہے اور اڈے کے استاد کی پشت پر صرف اس کا

بل ہوتا ہے، پولیس کی پشت پناہی نہیں۔ یہ استاد کی بہتی وہیں ماندگی ہے کہ خود کو محفوظ رکھنے کے لیے پولیس کو آگے کار بنائے۔ میدا سے مجھے اس کم ظرنی و گینگی کی امید نہیں تھی۔ اڈے کے آدمیوں کے لیے بھی ان کے استاد کی یہ نادر حرکت بڑی سبکی کی بات تھی۔

آئینے پر چھائی دھند شتم ہو رہی تھی۔ اب مجھے بہت کچھ صاف نظر آ رہا تھا لیکن ایسا یقین بھی نامناسب تھا۔ میدا نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ جواب خاصا مشکل بھی تھا۔ اس دوران اکبر علی خاں نے جب سادھے رکھی، مایوسی میں یا میری طرح کسی خوش گمانی میں۔ بہر حال تو لگا اور تادیل و تکرار کا مطلب تمام ہو چکا تھا۔

استاد میدا مجھے گھورتا اور حق سے شغل کرتا رہا، پھر اس نے پہلو میں بیٹھے ممبر آدمی سے قریب ہو کے کچھ کہا۔ ”ممبر آدمی کی پیشانی سگری اور ہونٹ پھیل گئے۔ دونوں ہند لیسے ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتے رہے۔ ”ممبر آدمی کبھی اذکار، کبھی اقرار میں سر ہلاتا رہا اور اس نے میدا کا بازو پکڑ کے کچھ سمجھانے کی کوشش کی، بڑبڑاتے ہوئے نزدیک بیٹھے ساتھیوں کو متوجہ کیا۔ ان کے چہرے بھی سلگ رہے تھے۔ لگتا تھا، ”ممبر آدمی کی ہم نوائی کر رہے ہیں۔ میدا کا منہ بگڑ رہا تھا اور یکا یک اس نے جھکنے سے حقے کی فرش پر ڈالی، دونوں بازو سینے، پھیلائے جیسے تازہ دم ہونا چاہتا ہو۔ جیب میں ہاتھ ڈال کے ہاتھ باہر نکالا تو خالی نہیں تھا، بند چاقو ہاتھ میں تھا۔ یہ دیکھ کر میں نے بھی ہاتھ پیر سیدھے کیے، دائیں بائیں جسم گھمایا، چاروں طرف نگاہ دوڑائی اور اکبر علی خاں کو اشاروں میں تسلی دی، ان کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ چوکی پر اور آس پاس، آنے سے سامنے اور کھڑے ہوئے لوگوں کی بھین بھناہٹ ہال میں گونجنے لگی تھی۔

میدانے چاقو کھول کے دھار پر اٹھی پھیری۔

”ممبر آدمی کے ہاتھ چوے۔ ”ممبر آدمی نے انکار میں شدت سے سر ہلایا۔ میدا اٹھا ہی چاہتا تھا کہ ”ممبر آدمی نے اس کی کٹائی گرفت میں لے لی اور آنکھیں بھیج کے تھپتی انداز میں کچھ تادیبی۔ میدا کے چہرے پر بیزارگی اور ناگواری نمایاں تھی۔ ارد گرد بیٹھے ہوئے لوگ اس کے اور قریب ہو گئے اور گھبرا سا ڈال دیا۔ میدا آمادہ نظر نہیں آتا تھا مگر جیسے زچ ہو گیا ہو، منہ موڑ کے اور سر جھکائے اس نے ”ممبر آدمی کے بڑھے ہوئے ہاتھ کے آگے چاقو کر دیا۔ ”ممبر آدمی نے جھپٹنے کے انداز میں چاقو تحویل میں لے لیا۔ ہر طرف شور مچا۔ ”ممبر آدمی نے ہاتھ بلند کر کے انہیں خاموش رہنے کی ہدایت کی اور ادھر میدا کی کمر تھک کے منمنیت کا اظہار کیا اور میری طرف نگاہیں مرکوز کیں۔ پہلے ایک دو بار، چاقو والا ہاتھ فاصلے کے تعین کے لیے آگے پیچھے کیا۔ میری نظریں بھی اس پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے ناپ تول کے اتنی اونچائی سے چاقو اچھالا کہ درمیان کی لمبائی پر شتم ہو۔ چاقو ٹھکا ہوا تھا۔ چاقو سے اس کی دست برداری اور میری گرفت کا وقفہ لمحوں پر مشتمل تھا۔ میں نے سارا ہوش چاقو کو دستے سے پکڑنے میں صرف کیا اور مجھ سے کوئی چوک نہیں ہوئی۔ ”ممبر آدمی کا منشا میری سمجھ میں آچکا تھا۔ اب میری باری تھی۔ مجھے اپنا چاقو اسی چابک دستی اور مشائی سے اس کا اور اپنا فاصلہ ذہن میں رکھ کے اچھالنا تھا۔ ”ممبر آدمی بھی منتظر تھا۔ پہلے میں نے میدا کا چاقو سکون سے بند کیا پھر اپنا چاقو پھینکا۔ مجھے حیرت ہوئی اور کسی قدر خوشی تھی۔ اس کبر سنی کے باوجود چاقو پکڑنے میں ”ممبر آدمی سے ذرا سی کوتاہی سرزد نہیں ہوئی۔ احتیاط سے چاقو بند کر کے اس نے میدا کی طرف بڑھایا۔ بادل خواستہ، لمبی سانس بھیج کے اور آنکھیں چہ ہا کے میدانے چاقو جیب میں رکھ لیا۔

”تم جاسکتے ہو۔ ” ”ممبر آدمی نے دھڑکتی

آواز میں مجھے مخاطب کیا۔ ”پر تمہارے کولوٹ کے ادھر آتا ہے۔

میں نے سر کو خفیف جنبش دی اور ختمی لہجے میں کہا۔ ”تمہاری یہ مرضی ہے تو یہی سہی۔ استاد میدا کا چاقو میرے پاس ہے اور مجھے اپنا چاقو واپس لینا ہے۔ کسی کی بھینٹ ہے وہ، اور اپنے کو بہت راس ہے۔ میں اسے ہر دم ساتھ ہی رکھتا ہوں۔

”ممبر آدمی کوئی جہاں دید اڈا گیر تھا۔ ہو سکتا ہے، میدا اسی کا پروردہ ہو۔ میدانے اس کے ہاتھ کو بوسہ بھی دیا تھا۔ جس مہارت سے ”ممبر آدمی نے میری جانب چاقو پھینکا اور میرا چاقو اچکا تھا، کچھ اسی طرح پٹا اس کا لب و لہجہ تھا۔ اس ساری حکمت کی صراحت اس نے ضروری سمجھی۔ وہی اس کی مقامی طرز بیان تھی۔ اس نے کہا کہ کسی فیصلے تک بیٹھنے میں دیر یوں ہوتی کہ انتہی نوجوان (یعنی میں) مختلف صورت حال میں یہاں آیا ہے۔ اڈے کے تین آدمیوں کے ساتھ پیش آنے والے واقعے میں وہ ٹوٹ ہے۔ ان تینوں میں ایک تو زندگی بار بیٹھا ہے۔ اڈے کا ہر آدمی اپنے پرانے ساتھی کی ناگہاں موت، اس کی جدائی پر دل کیر ہے۔ خطا کار کو بدترین انجام تک پہنچانے بغیر کسی کو نہیں آئے گا۔ نوجوان کی طرف سے اڈے کے استاد سے چوکی سے اتر جانے کا مطالبہ اور اسی کے ہاتھوں یا اس کی وجہ سے چند گھنٹے پہلے اڈے کے سرکردہ آدمی کے خون کا واقعہ دوا لگ لگ باتیں ہیں۔ نوجوان کو اس قسم گری کی سزا ضرور ملنی چاہیے اگر واقعی وہ مرتکب پایا جائے۔ رہا اڈے کی چوکی پر قبضے کا معاملہ، تو استاد میدا اڈے کے ریتی رواج سے خوب واقف ہے۔ بے شک کوئی بھی، کسی وقت حاضر استاد کی تاہلی پر اٹھی اٹھا سکتا اور اپنی اہلیت کا دعو کر سکتا ہے۔ ثابت کر دینے پر اڈے کی سربراہی اسی کو سزاوار ہے۔

نوجوان شخص اڈے کی چوکی پر حق جتانے آتا تو

دگر صورت ہوتی۔ فیصلے میں ایسی دیر نہ لگتی لیکن دو باتیں گنڈہ ہو رہی تھیں۔ نوجوان کا کہنا ہے کہ اس کا بھائی شہر کے اسپتال میں زیر علاج ہے اور تیار دار اس کے سوا کوئی نہیں، اور بھائی کے پاس اسپتال پہنچنا اس لیے ممکن نہیں رہا کہ استاد میدا کے حکم سے شہر کے راستے اس پر بند کر دیے گئے ہیں۔ استاد میدا اور اس کی گدی سے اسے ایسا سروکار نہیں۔ مجبوری میں یہی ایک تدبیر اسے بھائی دیکر اڈے کے استاد کو بے دخل کر کے خود اڈے کا استاد بن جائے۔ سامنے اڈے کا مستند استاد ہوتو وہی انتشار یا کسی بے حد شخص اعتماد ہی میں کوئی اتنا بڑا دغا کر سکتا ہے۔

استاد میدا نے اپنے ساتھیوں کے مشورے اور شہر کے معزز شخص وکیل اکبر علی خاں کے بیان پر اعتبار کرتے ہوئے نوجوان کے راستے میں حائل بندشیں دور کر دی ہیں اور مبارزت سہرست ملتی کر دی ہے۔ استاد اور اس کے ساتھی شقاوت اور سنگ دلی کا کوئی الزام اپنے سر لینا نہیں چاہتے اور حقیقت جاننے کے خواہش مند ہیں۔ اس مہلت سے انہیں تھاق کی چھان بین کا اچھا موقع مل جائے گا اور جیسا کہ وکیل صاحب کا خیال ہے، وہی سچ ہوا تو نوجوان خاطر جمع رکھے، اڈے کی طرف سے وہ ہر قسم کے بعض وعناد سے بھر اہوگا۔

چاقوؤں کی مشتکی سے مراد ہے کہ دونوں فریقوں کے درمیان پیچہ آزمائی۔ وجوہ ملتی کی گئی ہے، ختم نہیں، انکار نہیں کیا گیا۔ التوا کی رعایت میدا استاد کی کشادہ دلی اور خود اعتمادی پر جموں کی جائے کہ ذہنی فشار سے دوچار اپنے مقابل سے معرکہ آرائی وہ اس وقت مناسب نہیں سمجھتا۔ اس اعتراف کے باوجود اڈے کی چوکی سے نوجوان کو کوئی واسطہ نہیں، بھائی کی صحت کی بھائی کے بعد اسے بہر حال اپنے دعوے کی پے روی کے لیے اڈے واپس آنا ہے۔ اس نے اڈے کے اتنے

لوگوں کے سامنے ان کے استاد کی منہی حیثیت پر کچھ اچھالی ہے۔ اڈوں کی روایت کی میل استاد میدا پر لازم ہے۔ اسے ثابت کرنا ہے کہ وہی اڈے کی گدی پر برقراری کا حق رکھتا ہے۔ اس کے ساتھی بھی اسی گواڈے کے استاد کی حیثیت سے دیکھتے رہنا چاہتے ہیں۔ استاد میدا ان پر سایہ بنا رہا ہے۔ انہیں یقین ہے کہ زور اور چالو بازی میں دور دور تک اس کا ثانی نہیں اور وہی ان کے درمیان رہے گا، اور وہ بھی جانتے ہیں کہ اڈے کے دو طلب گار ایک دوسرے کے مقابل ہوں تو کسی ایک کو اپنی توانائی کی قیمت چکانی پڑتی ہے۔ نوجوان نے اپنی برتری ثابت کر دی تو استاد میدا کے جاں نثار، اڈے کے یہی لوگ اس کے خیر مقدم میں کوئی بخل بھی نہیں کریں گے کہ اڈوں کا یہی طور ہے۔ اس عارضی مدت میں نوجوان خود کو ہر طرح محفوظ سمجھے۔ نگرانی کے باوجود اڈے کا کوئی آدمی اس سے باز پرس نہیں کرے گا۔ نوجوان بھی گرہ میں باندھ لے کہ اسے اڈے واپس آ کے مبارزت کا موقوف معاملہ نشانا ہے۔ استاد میدا اس کی جلد واپسی کا مظہر رہے گا۔ اس دوران اس نے شہر سے فرار کی کوئی حرکت کی تو وکیل اکبر علی خاں کو ذمے دار سمجھا جائے گا۔ وہ نوجوان کی ہم دردی میں اس کے ساتھ آئے ہیں اور انہوں نے اس کے حق میں اڈے کے استاد کو قائل کرنے کی موثر کوشش کی ہے۔ یہ پہلو وکیل اکبر علی خاں کے ذہن نشین رہے کہ ان کا واسطہ اسی شہر سے ہے اور اڈے کے لوگ ایک حد تک ہی فیاضی اور درگزر کی استطاعت رکھتے ہیں۔

اڈے پر سناٹا چھایا رہا۔ معمر آدمی کا لہجہ اتنا درشت تھا۔ ایسا نرم۔ سکوت میں اس کی بوڑھی آواز کی گونج بڑھتی تھی۔ میں پورے انتہاک سے سنا کیا۔ عدالت کے کسی جج کے مانند اس نے فیصلہ سنا دیا تھا۔ میں نے اسے نہیں ٹوکا کہ یہ اکبر علی خاں جج میں کیسے آگئے۔ میرے ساتھ ان کے آجانے،

ہم دردی کا اظہار کرنے اور حقیقت حال سے آگاہ کرنے سے مراد میری شناخت کہاں ہوئی۔ شناخت وغیرہ کا تو کوئی ذکر ہی نہیں آیا۔ کہنے کو بہت کچھ تھا لیکن نہ عمر آدمی چاہتا تھا نہ میں نے اس کی یا وہ کوئی پر حرف زنی مناسب سمجھی۔ ایسی پیچیدہ اور نازک صورت حال میں گھرا آدمی یہی کچھ کر سکتا تھا، اور مجھے غیبت جان کے خاموش رہنا تھا۔ مجھے تو اڈے سے نکلنے اور اسپتال پہنچنے کی جلدی تھی۔ اخلاقیات کا شکر یہ بھی ادا کرنا چاہیے تھا لیکن یہ تشکر میری جانب سے ان ساروں پر مرتب ہونے والے تاثر کی کمی کرتا۔ عمر آدمی کی سوچ بوجھ سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اڈے پر اسی کا دماغ کام کرتا ہے۔ اس نے اڈے کے لوگوں میں میدان کا وقار اور دیدہ بہ جمال رکھنے اور دوسری طرف اڈے کو کسی ناخوش گوار واقعے سے محفوظ کرنے کے لیے اپنے جتن خوب کیے تھے۔ اس نے ہر گوشے اور ہر سٹ کا خیال رکھا تھا۔ اس کا نام مجھے اب تک معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ اڈے سے رخصت کے وقت کچھ رسمی کلمات ادا کرنے ضروری تھے۔ میں نے بھی ہوئی آواز میں عمر آدمی کو مخاطب کیا۔ "میں آؤں گا بڑے صاحب۔ سلی رہیں، مجھے اپنا جاقو واپس لینا ہے۔ میں ضرور آؤں گا، پھر دیکھ لیں گے۔"

یہ اتنا ہی اس وقت موزوں تھا۔ عمر آدمی کی بھی یہی خواہش ہوگی۔ میں نے اکبر علی خاں کو اشارہ کیا۔ وہ تو کم سم سے تھے۔ میرے ٹوکنے پر چونک پڑے۔ سامنے چوکی پر بیٹھے پورا ادھر ادھر کھڑے اڈے کے لوگوں کو ہم نے پچھلتی نظروں سے دیکھا اور دروازے کی طرف پلٹ گئے۔ پیچھے کھڑے لوگوں نے دائیں بائیں ہٹ کے ہمارے لیے راست بنا دیا۔ ہم دروازے سے نکلنا ہی چاہتے تھے کہ عمر آدمی کی بلند آواز پر رکنہ پڑا۔ اکبر علی خاں کو اس نے پکارا تھا۔ وہ ان سے محذرت کرنے لگا۔ "آپ پہلی بار ادھر آئے ہو وکیل ساب، اور ہم

تسری کوئی آؤ بھگت نہ کر سکے۔ سے ہی لٹا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں دھنوا بوبکی لاش آ رہی ہے۔ ادھر سبھی اسی کارن اسٹینڈ ہیں۔ آپ جانو اس سے....." عمر آدمی کی آواز چننے لگی۔

اکبر علی خاں نے سرجھکا کے سلام کرنے کے انداز میں ہاتھ اٹھایا، جواب دینے کی کس مکش سے دو چار رہے اور کچھ کہہ نہ پائے۔ "عمر آدمی کو بھی احساس ہو گیا تھا۔ اس نے بھی ہاتھ اٹھا کے سلام کا جواب دیا اور اکبر علی خاں کو مشکل سے نکالنے کے لیے لمحے بھر بعد استاد میدان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میں نے آہستہ سے اکبر علی خاں کو ہنسا دیا تو وہ گھبرا سے گئے اور کسی معمول کے مانند میرے ساتھ چل پڑے۔

اڈے کی عمارت میں اب شور بھوٹ پڑا تھا۔ میرے جی میں آتا تھا کہ بھاگ کر فاصلہ طے کروں لیکن ہم دونوں متوازن رفتار سے عمارت سے نکل آئے، درمیانی کھلا حصہ اور ڈیوڑھی عبور کر کے سڑک پر آ گئے۔ عمارت کی طرف جاتے ہوئے دو تین آدمیوں سے آمتنا سامنا ہوا تھا۔ اندر سے کوئی ہمارے پیچھے نہیں آیا۔ چار دیواری کے باہر بھی اکا دکا آدمی موجود تھے۔ تانگے والا قریب ہی لگی میں ایک کنارے کھڑا ہمارے انتظار میں پریشان پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے اضطراب کا سبب یہی ہو سکتا تھا کہ اڈے کے آدمیوں کی زبانی اسے کچھ ہتک مل گئی ہو۔ یہ تو اسے اچھی طرح معلوم ہی تھا کہ یہ جگہ کون سی ہے۔ تانگے کی چیچھی نشست پر ہم دونوں بیٹھ گئے۔ دھوپ کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ آگے چوک کی دکانوں کی چیل پہل بھی کم تھی۔ گلی اور چوک سے گزر کے ہم چوڑی سڑک پر آ گئے اور گھوڑے نے سر ہٹ بھاگنا شروع کر دیا۔

اکبر علی خاں نے شیروانی کے اوپر کے من کھول دیے۔ کئی بار انہوں نے پیشانی پر ابھرنے والی بوندیں رومال سے خشک کیں۔ دروازے کے بعد

ان کے چہرے پر آتے جاتے رنگ ٹھیر سے گئے تھے۔ دیر تک انہوں نے مجھ سے کوئی کلام نہیں کیا۔ میں نے ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تو جیسے انہیں لب کشائی کا موصولہ ہوا۔ ان کے ہونٹ کھپکھپائے، سن سنائی آواز میں بولے۔ "یہ سب کچھ کیا تھا میاں؟"

"جو آپ نے دیکھا، وہی تھا۔" میں نے کہا۔

"مگر مگر یہ کیا ہوا بھائی؟"

"کیا ہوا۔" میں نے آنکھیں میچ کے کہا۔ "جو ہونا تھا، وہی ہوا۔"

"آپ، آپ کو اندازہ تھا؟" وہ حیرانی سے بولے۔

"دہاں جا کے کچھ دیر بعد ہو گیا تھا۔"

"یعنی کہ ہم، ہم اس طرح....."

"اس طرح چلے آئیں گے۔"

"ہاں میاں!..... مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا۔"

"آپ کیا سمجھ رہے تھے؟"

"میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، دماغ ہی کام نہیں کر رہا تھا۔ ایسی جگہ اور ایسے لوگوں سے پہلی مرتبہ سابقہ پڑا تھا۔" اکبر علی خاں وحشت زدگی سے بولے۔ "دل دھڑکتا رہا کہ آنے والا لمحہ کیا رخ اختیار کر لے، کس کروٹ چاہیے۔"

"آپ نے بڑی جرات کی۔" میں نے کہا۔

"کیسی جرات۔" اکبر علی خاں بیجا بیجا انداز میں بولے "جو منہ آیا، بکلتا گیا۔ بس یقین تھا کہ کچھ کہہ رہا ہوں۔ جسے آپ جرات کہہ رہے ہیں، اس کی وجہ یہی تھی۔"

"زور نہ یہ سب کچھ مجھے کہنا پڑتا، ویسے میں نہیں چاہتا تھا کہ آپ ذلل دیں۔"

"مجھے معلوم تھا لیکن میں کب تک چپ رہتا، سوچا کہ شاید اسی طرح کچھ بات بن جائے۔"

"آپ نے میرا کام آسان کر دیا۔"

"کیا کر دیا۔" اکبر علی خاں بکھری ہوئی آواز

میں بولے۔ "ایک بات تو بتائیے میاں، اگر واقعی وہ بد ذات مقابلے پر آمادہ ہو جاتا؟"

"نہیں ہوتا۔"

"کیوں، کیسے..... یہ آپ دثوق سے کیسے کہہ سکتے ہیں؟"

"جس وقت اسے ہونا چاہیے تھا، اس نے وہ وقت نکال دیا تھا۔"

"لیکن اگر ہو جاتا، فرض کیجئے، اگر ہو جاتا؟"

"تو میں تو اسی غرض سے گیا تھا۔"

"یعنی آپ....." وہ سٹ پٹا کے بولے۔ "آپ!"

"ہاں" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "یوں تو ہو کچھ بھی سکتا تھا لیکن میں ایسا نہیں چاہتا تھا۔ میں تو دہاں ہوتے ہوئے بھی دہاں نہیں تھا۔ مجبوری کی بات دوسری ہے۔ اس لیے میں بار بار اسے دعوت دیتا رہا۔ ہو سکتا ہے، اس نے مجھے پھل دیوانہ سمجھا ہو کہ ایسے شخص کے منہ لگنا ٹھیک نہیں۔ ایسا شخص تو کچھ بھی کر سکتا ہے۔"

"مجھے تو یہی دھڑکا لگا ہوا تھا۔" اکبر علی خاں سراپستگی سے بولے۔ "آپ اس کی عزت کس پر مشکلس وار کر رہے ہیں، اس کے اتنے بہت سے ساتھیوں کے سامنے، کہیں اس کی غیرت کا پیمانہ چھلک نہ جائے۔"

"اور اس کی محتاط روی کی وجہ بھی تو یہی ہو سکتی ہے کہ اڈے کے اتنے لوگوں کے سامنے شرمندگی نہ اٹھانی پڑ جائے۔"

"ہاں ہاں، یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے۔" اکبر علی خاں اضطرابی لہجے میں بولے۔ "میرے چہرے پر ان کی بے قرار نظریں منڈلا رہی تھیں۔" لیکن ایک بات..... ایک بات، سے مجھے آپ نے مطمئن نہیں کیا۔"

"میں آپ کو ہر بات سے مطمئن کر دوں گا۔"

میں نے نرمی و دشاہت سے کہا۔ "مگر اس وقت مجھ

سے کوئی سوال جواب مت کیجیے۔ میں آپ کو ابھی کچھ نہ بتا پاؤں گا۔ اس وقت تو بس کسی طرح جلد سے جلد اسپتال.....

”مناسب ہے۔“ وہ کسمسا کے چپ ہو گئے اور کچھ توقف بعد آہستگی سے بولے۔ ”گھر نزدیک ہے۔ آپ نے دو پہر بھی کچھ نہیں کہا۔ کچھ دیر ٹھہر کے کیوں نہ اسپتال چلے، زیادہ وقت نہیں لگے گا۔“

”نہیں، ابھی نہیں۔“ میں نے صاف انکار کر دیا۔ ”نہ جانے میرے وہاں نہ ہونے پر کیا چہ میگوئیاں ہو رہی ہوں۔ ڈاکٹر راتے کیا سوچ رہا ہوگا اور ٹھنڈ بھائی کے ہوش و حواس بحال ہوئے تو مجھے پاس نہ دیکھ کے وہ تو بہت پریشان ہو جائیں گے۔ نرس کتنے ہی عذر کرے لیکن آپ نہیں جانتے، وہ کیسے آدی ہیں۔ اس حالت میں وہ اٹھ کھڑے نہ ہو جائیں۔ انہیں ذرا بھی شبہ ہو گیا، کتنی ہی حالت خراب ہو، وہ نکل پڑیں گے۔ وہ ایسے ہی ہیں۔“

”ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی۔“ اکبر علی خاں ادا سی سے بولے۔ ”آپ بھی ٹھیک کہتے ہیں۔ آپ کو پہلے اسپتال ہی جانا چاہیے۔“

”جیسے ہی ان کی طرف سے تسلی ہوئی، میں آپ کے گھر آؤں گا۔ مجھے تو آپ سب سے دست بستہ معافی مانگنی ہے۔“ میں نے کہا۔

”کیا مطلب، کیا میں آپ کے ساتھ اسپتال نہیں جاسکتا؟“ وہ شکایتی انداز میں بولے۔

”جاسکتے ہیں، کیوں نہیں مگر دیر ہو گئی ہے۔ پہلے آپ کو گھر جانا چاہیے۔ وہاں سب آپ کی راہ دیکھ رہے ہوں گے۔“

”آپ کو مجھے اپنے ساتھ لے جانے میں کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟“ ان کے شکوے میں ناراضی بھی شامل ہو گئی تھی۔

”نہیں نہیں، آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“ میں نے معذرت کی۔ ”مجھے تو ادھر گھر والوں کی فکر ہے۔ انہیں مطمئن کر کے کچھ دیر بعد آپ اسپتال

آجائے۔“

”نہیں جناب، میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ یہ کیا بات ہوئی۔“ اکبر علی خاں فیصلہ کن لہجے میں بولے۔

انہوں نے کو پوان کو کچھ ہدایت کی۔ ایک ڈیڑھ فراگ بعد تا ناگہ دائیں طرف کی سڑک پر مڑ گیا۔ دفتر بند ہونے کا وقت تھا۔ سڑکوں پر سوار یوں اور پیدل چلنے والوں کی بھیجھڑی ہو گئی تھی۔ تاکنے کی رفتار میں بھی فرق آ گیا تھا۔ جیسے جیسے اسپتال نزدیک آرہا تھا، میرا دل بیٹھا جاتا تھا۔ میرے اختیار میں کچھ بھی نہیں تھا اور مجھے کسی جرم کا احساس ہو رہا تھا۔ معلوم نہیں، یہ کیسی ندامت تھی جو مجھے بلکان کر رہی تھی۔ غلطی میری ہی تھی۔ میں اسپتال سے نکلتا، نہ یہ سب کچھ پیش آتا۔ پھر جب جب کترے نے بڑا اڑایا تو اس کے تعاقب کی مہارت دوسری غلطی تھی۔ اکبر علی خاں کا بھجان واضطراب بے جا نہیں ہے۔ میں نے انہیں جیسے تیسے چپ کر دیا ہے لیکن استاد امیدا کے اڑے پر جا، بھڑوں کے چمٹنے میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف تھا۔ بہر حال اب پشیمانی سے کیا حاصل تھا۔ آدی سے غلطیاں ہوتی ہیں۔ زندگی میں غلطیوں کا کتنا دخل ہے۔ غلطیوں سے زندگی کا سلسلہ چلتا ہے، کم غلطیاں، زیادہ غلطیاں، چھوٹی غلطیاں، بڑی غلطیاں۔ کبھی بڑی غلطی سے کچھ نہیں ہوتا، کبھی ایک چھوٹی غلطی زندگی بھر کا روگ بن جاتی ہے۔ آدی کو اشرف الخلقوں کہا جاتا ہے۔ آدی تو بہت ناموس، بہت ادھورا ہے۔ ایک دماغ ہی اس کے قابو میں نہیں تو کس بات کا افتخار، کبھی برتری۔ کہتے ہیں، آدی دماغ کے سوا کچھ نہیں اور دماغ تو بہکن، بھٹکانا رہتا ہے۔ دماغ کو آدی کا مصلح ہونا چاہیے تاکہ دماغ آدی پر حاوی ہو۔ دیکھا جائے تو آدی سارا گردن سے اوپر ہے، یہ کم قامتی، دراز قدی تو ایک گان ہے۔ آدی کے قد کی پیمائش تو گردن سے اوپر کے

حصے سے ہونی چاہیے۔ ایک جگہ سڑک ٹوٹی ہوئی تھی۔ تاکنے کو گھوم کے چاہنا پڑا۔ دھوپ سینے لگی تھی۔ پانچ بج چکے تھے۔ تاکنے والے کو کراہی ادا کرنے کے لیے میں نے چپ میں ہاتھ ڈالا تھا، اکبر علی خاں سامنے آ گئے اور انہی نے پیسے ادا کیے۔ تاکنے کی نشست کے نیچے رکھا ہوا بیگ بھی انہیں یاد تھا۔ میں تو بھول ہی چکا تھا۔ انہوں نے بیگ بھی مجھے اٹھانے نہیں دیا اور میرا ہاتھ تھامے ہوئے اسپتال میں داخل ہو گئے۔

شام کے وقت اسپتال میں عیادت کاروں کا جھوم ہوتا ہے۔ ام نے جلدی جلدی فاصلہ طے کیا۔ ٹھنڈ کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے میری سانس پھولنے لگی تھی۔ اسپتال کے اس حصے میں جہاں سب سے کشادہ اور آرام دہ کمرے بنے ہوئے تھے، نسبتاً سکون تھا۔ میں تیزی سے کمرے میں داخل ہوا چاہتا تھا کہ جسم کو بھونکا سا لگ۔ کئی ڈاکٹر اور نرسیں ٹھنڈ کے بستر کے گرد موجود تھے۔ میں نے بے اختیار اکبر علی خاں کو دیکھا۔ انہوں نے بیگ ایک کونے میں رکھ کر میرا شانہ تھپ تھپایا۔ ام دے قدموں پٹنگ کی طرف بڑھے اور ڈاکٹروں کے پیچھے جا کے کھڑے ہو گئے۔ میں آگے جانے کے لیے بڑھ گیا تھا۔ اکبر علی خاں نے مجھے روک لیا۔

ڈاکٹر زسوں کو ہدایتیں دیتے اور دھیمی دھیمی باتیں کرتے رہے۔ ان میں ڈاکٹر راتے بھی تھا۔ میں نے ان کی گفتگو سننے کی کوشش کی لیکن میرے تو حواس ہی منتشر تھے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ چند منٹ بعد ڈاکٹر راتے، ٹھنڈ کے بستر سے ہٹ گیا۔ وہ اپنے ساتھی ڈاکٹروں سے مشورہ کر رہا تھا کہ اس کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ چونک پڑا۔ ”تم، تم کہاں تھے؟“ اس نے میری جانب اٹھی اٹھا کے اٹلیر یزی مٹا پوچھا۔

”کیا، کیا حال ہے ان کا؟“ میں نے جھپٹتی

آواز میں کہا۔

اس نے شانے اٹھائے۔ ”ابھی دماغ کے ایک ماہر ڈاکٹر، ڈاکٹر زینکی کو بلا کے دکھایا ہے۔ اتفاق سے ان دنوں وہ انگلستان سے پیکر دینے یہاں آئے ہوئے ہیں۔ ایکس ریز دیکھ لیے گئے ہیں، کچھ اور ڈاکٹر فریڈی نے بھی تجویز کیے ہیں۔“ اس کے لہجے میں درشتی تھی۔

”سب ٹھیک تو ہے ڈاکٹر صاحب؟“ میں نے اکتی زبان سے پوچھا۔

اس نے فکر مند انداز میں سر ہلایا۔ ”ہم کوشش کر رہے ہیں۔“

”یہ تو ایک فرسودہ ہلیہ ہے۔ اس سے مریض اور بیمار دار کی کتنی قسمیں ہوتی۔ ظاہر ہے، آپ اپنی کوشش کر رہے ہوں گے لیکن مجھے کچھ اور بتائیے۔“ اس کا جسم تن گیا، چہرے پر رنگ آیا۔ ”اس کے سوا بتانے کو ابھی کچھ نہیں۔“ وہ بے گداز آواز میں بولا۔

”ایکس ریز میں اور کیا کیا اور کیا.....؟“

مجھ سے پوچھنا جا سکا۔

”ابھی کچھ خاص نہیں۔ ٹرین کے جھٹکے سے سر کے اوپر کی جلد پٹیک لگی ہے۔ سر کا خول کسی حد تک متاثر ہوا ہے اور گردن..... کچھ رپورٹیں اور آئی ہیں۔ ان کا انتظار ہے۔ تمہیں بتانا گیا تھا کہ بعض رپورٹیں آنے میں ایک دو دن لگ سکتے ہیں۔ دوامیں دی جا رہی ہیں۔ آپریشن کا فیصلہ نہیں کیا گیا۔“ ڈاکٹر نے کئی بندگی آواز میں بتایا۔ ”پر تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟“

”میں معافی چاہتا ہوں، مجھے، کوئی ان ہوتی پیش آ گئی تھی۔“ میں نے کاجت سے کہا۔

”راستہ بھول گئے تھے؟“ اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔

”کیا بتاؤں ڈاکٹر صاحب۔ اب ایسا نہیں ہوگا۔ اب میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گا، آپ سے وعدہ کرتا ہوں۔“

اس نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

”میرے لیے کوئی خدمت ہوتو بتائیے۔“ میں

نے عاجزانہ کہا۔

وہ مسکرا پڑا اور میرے گال پر ہلکی سی چپت رسید

کی۔ ”نوصلہ رکھو، نوجوان آدمی، رات کو پھر آؤں

گا یہاں۔ سر بیض کو دوسری دو آؤں کے ساتھ نیند کی

دوا بھی دی ہے۔ انہیں آرام کی ضرورت ہے، اور

تمہیں بھی۔“ وہ میری سینے پر ٹھونکا مارنا ہونے

بولاً۔ ”لگتا ہے تم نے بھی اچھا وقت نہیں گزارا، کچھ

تازہ دم ہو جاؤ اور تم بھی کچھ دیر کے لیے آرام کر لو۔

نرس تمہارے بھائی کی دیکھ بھال کے لیے موجود

ہے اور دیکھو!“ اس نے تاکید سے لہجے میں کہا۔

”تجربہ دار کی حالت مریض پر اثر انداز ہوتی ہے۔“

اس نے ساتھ رکے ہوئے ڈاکٹروں کو چلنے کا

اشارہ کیا۔ دوسرے لمحے وہ سارے کمرے سے

چلے گئے۔ صرف ایک نرس رہ گئی۔ مجھے جیسے جانے کیا

ہوا، کمرے سے بھاگ کے میں نے ڈاکٹر رائے کا

تعاقب کیا۔ وہ ابھی چند قدم دور ہی گیا ہوا کہ راستہ

روک کے میں اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس پر

حیرانی طاری ہوئی۔ میں نے اس کے ہاتھ، اپنے

ہاتھوں میں جکڑ لیے۔ ”آپ انہیں ٹھیک کر دیجیے

ڈاکٹر صاحب۔“ یہ التجا کرتے ہوئے میری آواز

بھرا گئی۔

”تمہارے کہنے کی ضرورت نہیں۔“ وہ چڑسا

گیا، پھر اس کا لہجہ بدل گیا۔ اس نے شفقانہ انداز

میں کہا۔ ”یہ ہمارا پیشہ ہے، فرض بھی۔ ہر مریض

ہمارے لیے ایک نیا جین ہوتا ہے میرے بچے، ہماری

طرف سے تم کوئی فکر مت کرو۔“

میں نے اپنی پلکیں اس کے ہاتھوں سے مس

کیں۔ ”اب آپ ہی ہیں ڈاکٹر صاحب۔“ میری

آواز ڈول رہی تھی۔ ”خدا کے لیے۔“

جواب میں اس نے میرے سر پر ہاتھ پھیر کے

میرے بال بکھیر دیے اور آگے بڑھ گیا۔

اکبر علی خاں بھی میرے پیچھے پیچھے باہر آگئے

تھے۔ کمرے میں واپس آ کے چھینکتے ہوئے ہم نے

بٹھل کے بستر کا رخ کیا۔ میں نے تو آنے کے بعد

اس کی شکل ہی نہیں دیکھی تھی۔ وہ گہری نیند میں تھا۔

میں نے اس کے ساتھ بہت سفر کیے۔ وہ تو نیند کی

جیسے کوئی رسم ادا کرتا تھا۔ ذرا سی آہٹ پر اس کی

آنکھ کھل جاتی۔ وہ تو سوتے میں جا گتا رہتا۔ کل

رات ڈاکٹر کو کھلے بھی ڈاکٹر رائے سے یہی کہہ رہا تھا

کہ اس نے نیند کی طاقت و درگولیاں بٹھل کو دی

تھیں۔ اس پر اثر ہی نہیں ہو رہا تھا۔ وہی شخص اب

بے سدھ پڑا تھا۔ اس طرح بے خبر تو میں نے اسے

کبھی نہیں دیکھا۔ میری آنکھیں بھر آئیں۔ میں نے

اس کی کھائی پکڑ کے حرارت دیکھی۔ ہاتھ گرم تھا

لیکن اتنا نہیں۔ اکبر علی خاں مجھے اس کے پاس سے

ہٹانے کے صوفے پر لے آئے اور میرے قریب ہی بیٹھ

گئے۔

”اپنے آپ کو سنبھالیے میاں! آپ تو بڑی

ہمت والے ہیں۔ اب اندازہ ہو رہا ہے وائٹی آپ

کیسی اذیت میں تھے۔ وہاں ان لوگوں کے

درمیان خود کو کس طرح جکڑ کے رکھا تھا۔ یہاں بھی

آپ کو اسی برداشت کی ضرورت ہے۔“ وہ آہستہ

سے مجھے سمجھاتے رہے، کہنے لگے۔ ”اس سے بڑا

اسپتال شہر میں نہیں ہے اور دور دور تک نہیں ہے اور

یہ جو ڈاکٹر رائے ہے، یہ بھی بہت مشہور ڈاکٹر

ہے۔ مزاج کا ذرا سخت ہے، اکھڑی اکھڑی باتیں

کرتا ہے لیکن ہاتھ میں شفا ہے۔ یہ کوئی کسر نہیں

چھوڑے گا۔۔۔۔۔ یہ دیکھ کے مجھے تو بڑی حیرت ہوئی۔

آپ کی خاصی تیز باتیں اس نے سنیں، ورنہ لوگ

کہتے ہیں، وہ تو ناک پر مٹی بیٹھتے نہیں دیتا۔ کیا جاؤ

کیا آپ نے؟“

”معلوم نہیں، میں نے تو سیدھی بات کی تھی۔“

میں نے پڑمردگی سے کہا۔

”آپ بھی جاؤ مگر ہیں میاں، خدا نے آپ کو

کیسی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ آپ سے ملاقات

میری زندگی کا ایک باندھا واقعہ ہے۔“ ان کے لہجے

سے وارنٹی جھلک رہی تھی۔

”آپ کیا کہہ رہے ہیں، میں تو۔۔۔۔۔“

”میں سچ کہہ رہا ہوں۔“ وہ میری بات کاٹ

کر بولے۔ ”میں تو بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں، مگر یہ

موقع نہیں۔ آپ ڈاکٹر رائے سے کیسی عمدہ

انگریزی، کس روانی سے بول رہے تھے۔ میں تو

دیکھتا ہی رہا، اور وہاں استاد میدا کے ٹھکانے پر آپ

کاتوریہ کچھ اور ہی تھا۔“

میں سر جھکائے بیٹھا رہا۔

”خبر جانے دیجیے، پھر بات کریں گے۔ بہت

سی باتیں جی میں اندر رہی ہیں، پھر سہی۔ اب آپ

ذرا سکون سے بیٹھیے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ بیکار

میرے پاس سے اٹھ گئے۔

نرس سیورین بٹھل کے پہلو میں رکھی تین خانہ

کھلی الماری کی چیزیں ترتیب دینے میں مصروف

تھی۔ انہوں نے نرس کے پاس جا کے کچھ سرگوشی کی

اور آ کے دوبارہ میرے قریب بیٹھ گئے۔ ”اب آپ

کا کیا ارادہ ہے؟“ وہ کترائی ہوئی آواز میں

بولے۔ ”میرا مطلب ہے آپ نے کیا سوچا ہے؟“

میری سمجھ میں نہیں آیا، وہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔

”کسی کو خبر کیجیے گا؟“ انہوں نے چھینکتے ہوئے

پوچھا۔ ”مجھے نہیں معلوم، آپ کے کہنے خاندان کی کیا

صورت ہے لیکن میرا خیال ہے، بہتر ہوگا، کسی قریبی

عزیز، عزیزہ کو بلا لیں، اگر کوئی آسکے۔ آپ کی

دوسرا ہٹ ہو جائے گی۔ آپ کا یہاں سے نکلنا تو

مشکل ہے اب، اور کہیں جائے بھی تو کیوں۔ میں

انہیں تاروں کا۔“

”ہاں ہاں۔“ میں نے بے سوچے سمجھے گردن

ہلا دی۔

”سوچ لیجئے آپ بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ کس کے

آنے سے بھائی صاحب کو تسلی ہو سکتی ہے اور کون

آپ کا بوجھ کم کرنے کا سبب بن سکتا ہے۔“ ان کے

مخاطب لہجے میں کسی قسم کی مغفرت نہیں تھی۔

”سوچتا ہوں، کسی کو کیوں پریشان کروں۔

میں اکیلا ہی ان کی دیکھ بھال کر سکتا ہوں۔ مجھے اور

کون سا کام ہے، اور اس سے بڑا کام میرے لیے

اور کیا ہو سکتا ہے۔“

”بہن کی سعادتمندی اور محبت ہے۔ ٹھیک

ہے، کسی کو مت بلائیے اور پھر میں بھی تو ہوں یہاں

آپ کے ساتھ۔ مجھے بھی کوئی ایسے کام نہیں۔ ہفتے

میں چار دن کاٹ جاتا ہوں، تین چار ٹکٹوں کے

لیے۔ چند دن نہیں جاؤں گا۔“

”آپ کی مہربانی ہے مگر آپ اپنے مشاغل

جاری رکھیے۔ آپ کو میں نے پہلے ہی کیا کم دکھ دیا

ہے۔ اس وقت کا خیال آتا ہے تو اپنے آپ سے چ

ہوتی ہے۔ آپ سب کو اذیت دینے کے بجائے

سید حامد اے اڈے پر چلا جاتا تو۔۔۔۔۔“

”واہ صاحب!“ اکبر علی خاں سر تاپا بے قرار

سے ہو گئے۔ ”اب آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔

بے شک وہ ایک بڑی، بہت بڑی اذیت تھی لیکن

اس کا صلہ کیسا دل نواز ہے۔ آپ کو ایسی صورت

حال میں یہی کچھ کرنا چاہئے تھا۔ بخدا، سوچتا ہوں،

آپ کے بارے میں۔ کسی اجنبی گھر کے دروازے

پر دستک دینے۔ اور اس کے بعد جو کچھ ہوا

وہ۔۔۔۔۔ وہ سب کچھ کرتے ہوئے آپ خود کیسی

اذیت میں ہوں گے۔ کیا ہی اچھا ہوا، وہ ہمارا گھر

تھا، کسی اور کا بھی ہو سکتا تھا۔“

”شکر ہے۔ وہ آپ کا گھر تھا۔ ایک نفیس طبع،

معاملہ فہم اور شفیق آدمی کے گھر کے دروازے کی

طرف میرے قدم اٹھ گئے۔ گھروں کے انتخاب کا

تو موقع ہی نہیں تھا۔ کسی دوسرے گھر میں جانے

کیسے لوگوں سے سامنا ہوتا۔“

”اسی کو شاید حسن اتفاق کہتے ہیں۔“ وہ

مسکرائے بولے۔

ایک اچھوتی سرگزشت

چھلاوا

بیسویں صدی کی ایک نہایت پر اسرار خاتون
صبیحہ بانو کی آپ بیتی

- * دولت مند، آزاد خیال، پردقار، خوبصورت اور خطرناک صبیحہ بانو، جنہیں لوگ جانتے ہیں مگر نہیں جانتے!
- * جرائم پیشہ افراد انہیں ”چھلاوا“ کہتے ہیں!
- * صبیحہ بانو کی زندگی بہت عجیب اور خطرناک حالات سے گزرتی رہی ہے۔ انہوں نے جب اپنی زندگی کے کچھ حالات قلم بند کئے تو انہیں پڑھ کر ہزاروں لوگ ان سے ملنے اور انہیں جاننے کے متمنی ہو گئے۔ اسی لئے ان کی آپ بیتی کی اشاعت اردو زبان میں ایک ریکارڈ ہے۔

اس کتاب کا انہوں ایڈیشن شائع ہو چکا ہے

صفحات 1120 قیمت 300 روپے ڈاکنگ 23 روپے

کتاب کی قیمت بمعہ ڈاک خرچ بذریعہ منی آرڈر پیشگی روانہ کریں

کتابیات پبلی کیشنز، کراچی
kitabiat1970@yahoo.com • 021-5804300
63-فیر II ایسیٹیشن ڈی ایچ اے مین روڈ کورنگی روڈ کراچی 75500
پوسٹ بکس 23 کراچی 74200

گا۔ کوئی عذر نہ کیا جائے تو بھی انہیں طرح طرح کے دوسے اور خدشے گھیر لیں گے۔ زریں تو بہت ذہین، بہت حساس ہے۔ تارک مضمون کیا ہی تھا پھر اگلے لکھا جائے، کتنا ہی ہکا بھکا ہو، وہ تو ہراساں ہو جائے گی۔ فیض آباد میں اس کی موجودگی بھی ضروری ہے۔ ساری حویلی اس کے دم سے آباد ہے۔ ابھی فرورزاں اور یاسمین وہاں نئی نئی ہیں۔ حویلی میں ان کی دل بستگی کے لیے زریں کی ضرورت ہے۔ اور انہیں بے خبر رکھنا بھی مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ بعد کو کبھی شکایت کریں گے کہ بھٹل سے آخر ان کا بھی کوئی رشتہ، ان کا بھی کوئی حق ہے۔

بھٹا میں سوچتا، اتنا ہی الجھ جاتا۔ فیصلے کا مرحلہ ہو تو دماغ بھی بالکل ساتھ نہیں دیتا، کئی حصوں میں بٹ جاتا ہے۔ ایک ہی بات سمجھ میں آتی تھی کہ ابھی کچھ انتظار کرنا چاہیے۔ خدا کرے، بھٹل جلد ہی ٹھیک ہو جائے۔ کل رات وہ اپنے بیروں سے یہاں آیا تھا۔ ایک رات میں اس کا کیا حال ہو گیا۔ کل اس کی حالت میں بہتری بھی آ سکتی ہے۔

میں اسی اندیشہ و فکر میں الجھا ہوا تھا کہ اسپتال کی مخصوص وردی پہننے دو موڈ ملازم ہاتھوں میں تھت اٹھائے کمرے میں داخل ہوئے۔ انہیں دیکھ کے نرس سیورین اٹھ کھڑی ہوئی۔ دونوں ملازم بکٹ، کیک پیسٹری، سمو سے اور چائے پر مشتمل ناشتے کا سامان لائے تھے۔ اکبر علی خاں صونے کے آگے رکھی لمبی میز پر تشریاں اور چمچے رکھنے میں سیورین کا ہاتھ بٹانے لگے۔ یہ سارا ناشتہ انہیں کے ایما پر آیا ہوگا۔ تھوڑی دیر پہلے اسی مقصد سے وہ سیورین کے پاس گئے ہوں گے۔

”اب آپ انکوارٹ کیجیے۔ مجھے بھی اب کچھ بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ دیکھئے، سمو سے کیسے کرا گرم ہیں۔“ مجھے آمادہ کرنے کے لیے انہوں نے سودا گروں جیسا طریقہ اختیار کیا۔

اکبر علی خاں نے کسی کو بلا لینے کا نہایت صاحب مشورہ دیا تھا۔ میں خود اسی شخص وٹج میں تھا، کسے نہیں۔ بھٹل کی نسبت سے زریں کا چہرہ ہی سب سے پہلے سامنے آتا ہے۔ تار بٹنے ہی وہ چل پڑے گی۔ ارشد، توبر اور جہاں کیر فیض آباد میں ہیں۔ اب تو نصیر بابا بھی وہیں ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کے ہم راہ وہ آ سکتی ہے اور نیساں، سلمیٰ اور خانم وغیرہ میں کسی کو بھی ساتھ لاسکتی ہے۔ اسپتال میں رات کے وقت ایک ہی بیمار دار رہ سکتا ہے، باقی دوسرے گرائڈ ہوگی میں رات گزار لیں گے۔ زریں سے زیادہ بھٹل کی خدمت کون کر سکتا ہے۔ سیمائی تو اس کا ہنر ہے۔ آدی دھوپ ہوتا ہے آدی چھاؤں، کبھی دھوپ بھی چھاؤں۔ زریں تو سر بیہر کوئی جھرسایہ دار ہے۔ اس گل اندام کا تو وجود ہی نہیں ہے، ریشم سے عبارت ہے۔ آدمیت کا اس سے سوا اعلیٰ ترین وظیفہ کیا ہو سکتا ہے کہ خود کو دوسروں پر ترک کر دیا جائے۔ اس کی مثال تو شمع کے مانند ہے جو روشنی بھرتی اور تمام ہوتی رہتی ہے۔ اپنے سرھانے اسے دیکھ کے بھٹل کو بہت سکون ہوگا۔ وہ اس کی بات بہت مانتا، بہت اس کے نازاٹھاتا ہے۔ اس شیوہ ناز برادری کے تسلسل کے لیے لازم ہے کہ وہ جلد سے جلد ٹھیک ہو جانے کی کوشش کرے۔ زریں اس کے لیے امید کا درجہ رکھتی ہے۔ امید ہی تو زندگی کی توانائی ہے۔ امید بجائے خود زندگی ہے۔

ادھر گلنے بھی تار دیا جاسکتا ہے۔ تاریخینے کی دیر ہوگی۔ زورا، جمرو اور جامو کو ذرا سی تاخیر گوارا نہ ہوگی۔ ان میں سے کوئی بھی کل رات بازادہ سے زیادہ پرسوں صبح تک یہاں آجائے گا لیکن زریں ہو، جامو ہو یا جمرو اور زورا۔ آج صبح ہی ڈاک خانے سے پٹنا شہر پہنچنے کی اطلاع انہیں دی ہے۔ اسی دن دوسرا تار ملنے سے سب کھٹک جائیں گے۔ اور انہیں بلانے کے لیے کوئی تو عذر کرنا ہی پڑے

میری بھوک غائب تھی لیکن منع نہ کیا جا سکا۔ اکبر علی خاں نے سیورین کو بھی شرکت کی دعوت دی اور اس کی معذرت پر اصرار بھی نہیں کیا۔ انہوں نے اپنے ہاتھ سے چائے بنالی اور جیسے میں کوئی مہمان ہوں، میزبانہ برتاؤ کرتے رہے۔ چائے پیتے ہوئے مجھ سے کچھ اور قریب ہو گئے وہ راز دارانہ انداز میں کہنے لگے۔ ”ایک بات ذہن میں انگ رہی ہے میاں۔ اسے میرا وہم ہی چاہیے۔ اصل میں قانون کے پیشے سے وابستگی ہے۔ ہر دیدہ و نادیدہ پر نظر رکھنے کا مجھے عارضہ سا ہو گیا ہے۔“

کے لیے کوئی عزیز تو موجود ہوگا۔ کم از کم ایک طرف سے سکون رہے گا۔ دوسری جانب رہا پوتیس سے نینتے کا معاملہ..... دیکھ لیا جائے گا پھر..... کچھ وقت تو قانونی مراحل میں لگ جاتا ہے۔“

”کیا بات ہے؟“ میں نے تردد سے پوچھا۔
”میرا خیال ہے، یہی مناسب رہے گا آپ کسی کو یہاں بلا لیں۔“ وہ رک رک کے بولے۔
”کیوں، کیوں؟“ میں نے الجھ کے پوچھا۔
”دیکھیے، میدا کے ٹھکانے سے ہم یہ سلامت واپس آ گئے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کچھ درست ہو گیا ہے لیکن..... وہ پہلو بدلنے لگے۔“

”میرا خیال ہے، یہی مناسب رہے گا آپ کسی کو یہاں بلا لیں۔“ وہ رک رک کے بولے۔
”کیوں، کیوں؟“ میں نے الجھ کے پوچھا۔
”دیکھیے، میدا کے ٹھکانے سے ہم یہ سلامت واپس آ گئے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کچھ درست ہو گیا ہے لیکن..... وہ پہلو بدلنے لگے۔“

”ایسے لوگوں کا کیا بھروسہ۔ بددماغ لوگ ہیں۔ کسی وقت دماغ پھر جائے۔ مرنے والے کی آخری رسوم کے وقت وہاں موجود لوگ بھڑک نہ جائیں۔ اپنے ساتھی کے اس طرح جدا ہوجانے کا صدمہ انہیں مشتعل بھی کر سکتا ہے، اور کتنے ہی وہ میدا کے فرماں بردار ہوں، برہمی میں اس سے باز پرس بھی کر سکتے ہیں کہ ایسی آسانی سے آپ کو کیسے جانے دیا گیا۔ ٹھیک ہے، وہ لوگ اس وقت خاموش رہے لیکن ضروری نہیں، بعد کو بھی چیپ سادھے رہیں۔ بعد کی کیا ضمانت ہے۔ میری مراد ہے، میدا کے ٹھکانے کا کوئی آدمی، مرنے والے سے زیادہ قریب کوئی بھی جنونی آدمی پولیس کا رخ نہ کر لے۔ اور وہی بات ہوگی، پولیس تو تماشے کی منتظر رہتی ہے۔ فرض کیجیے، ایک فی صد بھی میرے اس خدشے کا امکان ہے تو یہاں بھائی صاحب کی تیار داری

”میرا خیال ہے، یہی مناسب رہے گا آپ کسی کو یہاں بلا لیں۔“ وہ رک رک کے بولے۔
”کیوں، کیوں؟“ میں نے الجھ کے پوچھا۔
”دیکھیے، میدا کے ٹھکانے سے ہم یہ سلامت واپس آ گئے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کچھ درست ہو گیا ہے لیکن..... وہ پہلو بدلنے لگے۔“

نہیں۔“

”یہی تو میں عرض کر رہا ہوں میاں۔“ وہ زور دے کے بولے۔

”ایک دن اور دیکھتے ہیں، کسی کو بلانے اور آنے میں اتنی دیر نہیں لگے گی۔“

وہ ایک مہذب آدمی تھے۔ میری تھکی تھکی آواز سے انہوں نے اخذ کر لیا کہ ان کے وہم و قیاس میری ناگواری و نا سازگی کا باعث ہو رہے ہیں۔ ایک تیز فہم شخص کو سمجھ لینا چاہیے تھا کہ ٹھکانے کی تیار داری کے لیے کسی کو بلانے میں تاہل کی وجہ کوئی مجبوری اور مصلحت بھی ہو سکتی ہے۔ وہ خاموش ہو گئے اور انہوں نے موضوع بدل دینے کی بلاغت کی۔ سمو سے کا ایک گلزار میرے سامنے کیا۔ منہ سلوٹا کر لیجیے۔“

میں نے ان کی خواہش کی تعمیل کی۔
”شیرینی منہ میں رکھ لی رہتی ہے اور ذائقے بدلتی رہتی ہے۔ دیر ہو جائے تو منہ کا مزہ کڑوا سینگھا ہو جاتا ہے۔ اس کا توڑ منگ ہی سے ممکن ہے۔“ انہوں نے خوش کلامی کی۔

غذا کی اپنی کوششہ کاری ہے۔ کہتے ہیں، غذا، غم کی توہین ہے لیکن پھر آدمی کیا کرے۔ اپنے بیمار کے ساتھ بیمار ہو جائے۔ کسی جانے والے کے ساتھ خود بھی چلا جائے۔ کیا عجب ہے، دکھ سنے کے لیے بھی توانائی کی ضرورت پڑتی ہے۔ میں نے بہت کم کھا لیا تھا لیکن مجھے اپنا جی کسی قدر ٹھیرا ہوا لگتا تھا، تشہنشی سے دکھ دو چند ہو جاتا ہے اور سر ہلکی سے جاتا نہیں۔ شاید کچھ پووں ہے کہ حالت غم میں اشتہا مٹتی نہیں، دلی دلی، چھپی چھپی رہتی ہے لیکن آدمی کو خود اچھا نہیں لگتا۔ حالت غم میں تو اسے اپنا غم ہی عزیز ہوتا ہے۔

اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ سیورین نے کمر روشن کر دیا۔ دوپہرا کبر علی خاں گھر سے نکلے تھے۔ ان کے گھر والے پریشان ہو رہے ہوں گے۔ گئے بھی

وہ میرے ساتھ تھے، ایک چاقو بردار کے ساتھ جو ان کے گھر میں ناگہانی بلا کی طرح وارد ہوا تھا۔ کتنی ہی بات صاف ہو گئی ہو، میری ہیبت تو ان کے دلوں پر نقش ہو چکی ہوگی۔ اکبر علی خاں کو گھر جانے کے لیے میں نوکتے نوکتے رہ جاتا تھا۔ کہیں وہ برانہ مان جائیں۔ غالباً میں بھی کچھ یہی چاہتا تھا کہ وہ یہیں میرے پاس بیٹھے رہیں۔

روٹی کو اپنے اظہار کے لیے اندھیرے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اندھیرا جتنا گہرا ہو رہا تھا، کمرے میں جلتے جلتے اتنے ہی روشن ہوتے جاتے تھے۔ اکبر علی خاں کو خود ہی احساس ہوا، کہنے لگے۔ ”جی تو نہیں چاہ رہا مگر گھر جانا چاہیے۔ مجھے اجازت دیں میاں۔“

”گھر میں سب شدت سے منتظر ہوں گے۔ یہی بہتر ہوتا کہ آپ انہیں بتا کے آتے۔“
”آپ کو نہیں معلوم، نزہت خانم عام قسم کی جذباتی خاتون نہیں۔ ان میں بہت تحمل ہے۔“ اپنی بیگم کا ذکر کرتے ہوئے ان کا لہجہ شیدا نیت سے لب ریز تھا۔

”مگر در تو ہو گئی ہے۔“ میں نے زریب کہا۔
”ہاں، لیکن نزہت ہمیں غیر ذمے دار نہیں سمجھتیں۔“ وہ وثوق سے بولے اور صوفے سے اٹھتے اٹھتے مجھے تاکید کرنے لگے کہ رات کا کھانا میرے ساتھ ہی کھائیں گے، وہ گھر سے کھانا لائیں گے۔

میں نے بہت کہا کہ اس زحمت کی ضرورت نہیں۔ ایک تو مجھے بھوک نہیں، دوسرے اب رات ہوائی چاہتی ہے۔ گھر جا کے وہ آرام کریں اور تازہ دم ہو کے صبح آجائیں۔

”دل نہیں مانے گا۔ گھر سے یہاں تک کا فاصلہ بھی اتنا نہیں ہے۔ بس میں آ رہا ہوں۔ اب آپ کچھ نہ کیجیے۔“ انہوں نے فیصلہ سنا دیا۔
دروازہ عبور کرتے ہوئے وہ رک گئے اور

بولے۔ ”گھر تو آپ کو یاد ہوگا؟“
 ”کیوں؟“ میں نے تجسس سے پوچھا۔ ”آپ تو آ رہے ہیں۔“
 ”بس یوں ہی۔“ ان کا جسم لہرا سا گیا۔ ”ایسے ہی خیال آیا۔ خدا نخواستہ کوئی ایسی ویسی صورت ہو تو مجھے اطلاع مل سکے۔ احتیاطاً میں گھر کا پتہ لکھ دیتا ہوں۔“
 ”کچھ نہیں ہوگا۔“ میں نے ان کا بازو تھام کے کہا۔ ”آپ اطمینان سے جائیے۔“
 وہ مطمئن نہیں ہوئے تھے۔ اسی کیفیت میں دروازے سے نکل گئے۔ کچھ دور تک میں نے ان کا ساتھ دیا پھر ان کے اصرار پر کمرے میں لوٹ آیا اور میرے قدم سیدھے تھل کے بستر کی جانب اٹھے۔ اس کی حالت وہی تھی، اپنے آپ سے بے خبر۔ میں نے آہستہ سے اسے آواز دی۔ اس کے جسم میں جنبش نہیں ہوئی۔ ناچار میں نے سیورین کی طرف دیکھا۔ اس نے ہونٹوں پر اٹھی رکھ کے مجھے منع کیا اور جلدی سے اپنے لیے مخصوص کرسی سے اٹھ کر میرے پاس آگئی اور میرے پہلو میں کھڑی ہوگئی۔ کسی اچھی خبر کے آسے میں، میں نے اس سے پوچھا۔ ”اب کیا حال ہے ان کا؟“
 میرے لہجے میں چھپی حسرت اس پر عیاں ہوگئی۔ وہ ایک خوش طبعیت لڑکی تھی، مستعدی سے بولی۔ ”حرارت نہیں ہے اور اچھی علامت ہے۔“
 ”یہ کوئی بات کیوں نہیں کرتے؟“ میں نے شکستہ آواز میں پوچھا۔
 ”انہیں مسلسل نیند کی دوائیں دی جا رہی ہیں۔“
 ”ڈاکٹر لوگ کیا کہتے ہیں؟“ میں نے بے چینی سے پوچھا۔
 ”وہ ہمیشہ پر امید رہتے ہیں۔“ وہ نرمی سے بولی۔
 ”بتاتے کیا ہیں؟“ میں نے تکرار کی اور اپنے

لہجے کی ترشی پر قابو نہ پاسکا۔ ”آپ کو تو کچھ بتایا ہوگا۔“
 ”ابھی واضح طور پر کچھ نہیں۔“ وہ متانت سے بولی۔ ”لیکن ظاہر ہے، جلد ہی وہ کسی نتیجے پر پہنچ جائیں گے۔“
 مجھے اندازہ ہو گیا کہ سادہ و شایستہ سیورین کے پاس میری خوش نویدی کے لیے صبح سے کچھ سوائیں۔ نرس ایکی کی طرح اس نے بھی مہربانہ انداز میں مجھے آرام کا مشورہ دیا۔ نئی آسانی سے ایک آدی، دوسرے آدی کو سکون و آرام کی تلقین عطا کر دیتا ہے۔ یہ جانے بغیر کے دوسرے کے کہاں خانے میں کسی شورش یا بے سیورین کو یا تو واقعی کچھ معلوم نہیں تھا یا کوئی احتیاط درپیش تھی۔ اس کی اس کم نشی، رکی رکی جواب دہی پر جی میں آتا تھا کہ کسی دوسرے لہجے میں باز پرس کروں مگر میں اسے تشتمل نظروں سے دیکھا کیا۔ اس کے چہرے پر بڑی معصومیت تھی۔ وہ تو ایسی نازک تھی کہ ذرا اونچی آواز پر کھلا، مرجھا جائے۔
 ”گھبرا ایسے نہیں۔“ وہ نرم و دلائم آواز میں بولی۔ ”ڈاکٹر رائے رات کو آئیں گے۔ رات کو وہ ہسپتال نہیں آتے۔ صرف آپ کی خاطر آئیں گے۔ آپ پر وہ بہت مہربان ہیں۔“
 ”میرے بجائے میرے بھائی پر مہربان ہوں تو بہتر ہوگا۔“
 ”اٹھی کی وجہ سے آئیں گے۔“ میرے لہجے کی تیزی سے وہ اداس ہوئی اور کچھ توقف کے بعد میرا دھیان بنانے کے لیے دل گداز لہجے میں بولی۔ ”آپ کو اتنی دیر کیوں ہوگی؟ مجھے تو فکر ہو رہی تھی۔ آپ نے کہا تھا، آپ کے لیے شہر نیا ہے۔“
 ”مئی داستان ہے۔ بس ایسے ہی۔“ میں نے بیزاری سے کہا۔
 ”ڈاکٹر رائے وقت پر آگئے تھے۔ وقت کے وہ بڑے پابند ہیں۔ آپ کے بارے میں پوچھنے پر

میں نے ان سے نہیں کہا کہ آپ کو گئے دیر ہوگئی ہے۔ دوسری رات انہوں نے پوچھا تو مجھے بتانا پڑا، لباس تبدیل کرنے اور کچھ ضروری سامان لانے گرائڈ ہوئی تک گئے ہیں، بس آتے ہی ہوں گے۔ ڈاکٹر رائے کے مزاج کا کوئی بھروسہ نہیں۔ ہسپتال میں سبھی ان سے دور دور رہتے ہیں۔“ اس کی پٹلیں تھمک رہی تھیں۔ جیسا کہ میں سمجھ رہا تھا، وہ ایسی کم سخن بھی نہیں تھی۔ کچھ ایسے طور سے باتیں کرتی تھی جیسے پہلی بار نیا کچھ بول رہی اور نیا کچھ سن رہی ہو۔ میں نے اس کا شکر یہ ادا کیا۔ وہ اکبر علی خاں کے بارے میں پوچھنے لگی۔ ”کیا آپ کا ان سے کوئی رشتہ ہے؟“
 ”رشتوں کے لیے رشتے داری ضروری ہے اور نہ مدت۔“ میں نے کہا۔
 ”آپ انہیں پہلے سے نہیں جانتے تھے؟“
 ”ہاں، کچھ ایسا ہی ہے۔“
 وہ حیران ہوئی اور مردوۃ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ اسی اثنا میں تھل نے لمبی سانس لی اور اس کا جسم بے کل سا ہوا۔ صاف نظر آتا تھا کہ درد و کرب کی کوئی لہر اس کے تن بدن میں اٹھی ہے۔ سیورین متحرک ہوگئی۔ میرا تو سر پھرانے لگا۔ سیورین نے ایک پہلو سے دبا ہوا تھل کا ہاتھ رسائی سے باہر نکالا۔ میں نے دھڑکنی آواز میں اسے پکارا۔ اس کے ہونٹے حرکت میں آئے، ایک لمحے کے لیے آنکھیں کھلیں، ماتھے پر سلوٹیں ابھریں۔ دوسرے لمحے وہ غافل ہو گیا۔ سیورین نے اشارے سے مجھے مزید آوازیں دینے سے روک دیا۔ ہوا میں ہنسی تھی۔ سیورین نے اس کے جسم پر سیلف سے چادر ڈھانپ دی۔
 میں وہیں تھل کی پابندی کھڑا رہا۔ وہ تو کوئی اور آدمی لگ رہا تھا۔ میرے ہاتھ پیر کھلے ہوئے تھے اور آس پاس کوئی بندش بھی نہیں تھی۔ لگتا تھا جیسے میں

کسی تھکنے میں کسا ہوا ہوں۔ میں تو کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ کیسی بے جا رگی، نا کارگی ہے کہ میں اس کے کسی کام نہیں آ سکتا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مجھ سے اس کی خبر گیری میں کہاں کو تباہی ہو رہی ہے۔ میں پھر کیا کروں، کہاں جاؤں، کون سا ہنر، کون سا داؤد آزماؤں کہ وہ تھل جائے اور میری حالت اس سے کون سی جدا ہے۔ وہ سب سے بے گانہ ہو کے بستر پہ پڑ گیا ہے۔ میرا ہوش اور میرے دست و بازو بھی کس کام کے ہیں۔ میرا حال تو اس سے برا ہے۔ اسے میری فکر نہیں کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے۔ میری تو جان بچی جا رہی ہے۔ کسی بیمار کو علم نہیں ہوتا کہ دوسرے ثابت و سالم اس کے مدعی، اسے اپنے آپ سے زیادہ عزیز رکھنے والے کیسے ویران ہو جاتے ہیں۔
 جانے کتنی دیر ہوئی، میں تھل کے بستر کے سرخانے بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ سیورین کب میرے پاس آئی۔ مجھے احساس ہی نہیں ہوا۔ اس کی دھیمی آواز کی دستک پر میں چونک پڑا۔ وہ نزدیک ہی کھڑی تھی۔ اس نے جیکے سے میرا ہاتھ تھاما تو میں سست پنا سا گیا اور مجھے پشیمانی بھی ہوئی۔ کسی معمول کی طرح میں نے اس کی بے روی کی۔ وہ مجھے تھل کے بستر سے ہٹانے تک لے آئی۔ خوش چہرگی سے خوش اطواری مشروط نہیں ہے۔ اس میں دونوں خوبیاں یک جا ہوگئی تھیں۔ ہسپتال کے ان شاہانہ کمروں کے لیے اپنے ہنر میں ماہر نرسوں کا انتخاب کیا گیا ہوگا اور انہیں مریض کے ساتھ ساتھ بیمار دار سے حسن سلوک کی تربیت بہ طور خاص دی گئی ہوگی۔ بیمار داروں کو کچھ کم توجہ کی ضرورت نہیں پڑتی۔ سیورین کی خوش شعاری میں خوش نہادی کا بھی دخل تھا کہ اس کی راہ و رسم میں تکلف و تصنع کی گرائی نہیں تھی۔ میں نے صونے کے موٹھ سے گردن نکال کے آنکھیں میچ لیں۔ سیورین بھی شاید یہی چاہتی تھی۔ میری طرف سے مطمئن ہو کے وہ

دروازے کے کنارے رکھی کرسی پر جا بیٹھی۔

میں نے طرح طرح کے وہم و گمان کی پورش سے خود کو محفوظ کرنے اور یک سو ہونے کی کوشش کی لیکن آدمی کو اپنے اختیار کا پارا کس قدر ہے۔ میرا سارا جسم ٹوٹ پھوٹ سا رہا تھا۔ اکبر علی خاں کی موجودگی میں ایسی ناتوانی اور بے بسی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ ان کے جانے کے بعد سب کچھ بکھرا ہوا لگتا تھا، بہت شور ہو رہا ہو جیسے، ایک ہاؤ ہو جی ہو اور ہجوم میں، میں اکیلا کھڑا ہوں، اور کوئی کسی کی نہ سن رہا ہو، کوئی کسی کی طرف نہ دیکھ رہا ہو جیسے۔

میں صوفے پر نیم جاں پڑا تھا کہ کسی کی بہت ہلکی آواز پر آنکھیں بند نہ رہ سکیں۔ وہ نرس ایگی تھی۔ اس کا مطلب تھا، بیورین چلی گئی ہے۔ جاتے وقت اس نے مجھے بتانا مناسب نہ سمجھا ہو گا حالانکہ میں سو کہاں رہا تھا۔ میں تو اپنے آپ سے دور ہو جانے، اپنے آپ سے اوجھل ہو جانے کے جنن کر رہا تھا۔ ایگی نے ہنسنے کے ہوتے مجھے سلام کیا، حال پوچھا اور معذرت چاہی کہ ڈاکٹر رائے اسپتال آچکے ہیں اور کسی وقت کمرے میں آسکتے ہیں، اس لیے اسے میرے آرام میں خلل ہونا پڑا۔

میں فوراً اٹھ گیا اور میں نے کمرے سے ملحق غسل خانے میں جلدی جلدی چہرے پر پانی چھڑکا۔ کاش پانی ہی آدمی کے دوران خانہ عمارت دینے کی قوت بھی ہوا کرتی۔ اپنا حلیہ کسی قدر درست کر کے میں کمرے میں واپس آیا۔ پندرہ بیس منٹ گزر گئے۔ میری نظر میں دروازے پر تکی ہوئی تھی، پھر میں باہر نکل گیا۔ گھومتی ہوئی مختصر راہ داری میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس سرے سے اس سرے تک میں نے کئی پھیرے لگائے۔ ڈاکٹر رائے کا نام و نشان نہیں تھا۔ اسے دیکھنے کے لیے میں نے اسپتال کی مرکزی عمارت جانے کا ارادہ کیا اور چند ہی قدم چلا ہوں گا کہ دور سے آئیں سنائی دیں۔ اس دیاں سے کہ ڈاکٹر رائے یوں راہ داری میں

مجھے ٹھہراتا دیکھ کے مگدر نہ ہو، میں کمرے تک لوٹ آیا۔ وہ ڈاکٹر رائے ہی تھا۔ اس کے استقبال کے لیے میں کمرے سے باہر کھڑا رہا۔ اس کی رفتار اتنی کم تھی نہ اتنی تیز۔ مجھے دیکھ کے اس نے میرے سلام کے جواب میں سر کو ضیف جنبش دی اور اپنے ادھیڑ سا بھی ڈاکٹر سے گفتگو کرتا ہوا کمرے میں داخل ہو گیا۔ مجھے اس کا یہ مغایرانہ طور اچھا نہیں لگا، سو اس کے پیچھے جانے کے بجائے میں دروازے کے پاس سکر اسٹنا کھڑا رہا۔

دونوں ڈاکٹر انہماک سے ٹھٹھل کا معائنہ کرتے رہے۔ انہوں نے نبض دیکھی، پیر کے انگوٹھے گھنٹے، ڈاکٹر رائے نے اس کا سر ٹولا، دیا یا اور ہونٹے اٹھا کے آنکھیں دیکھیں اور اپنے ساٹھی سے کوئی سر گوتی کی۔ دونوں نے پابندی سے لگے ہوئے احوال تانے پر بار بار نظر ڈالی۔ ڈاکٹر رائے نے ٹھٹھل کو آہستہ سے پکارا تو مجھ سے اپنی جگہ ٹھہرانہ جا سکا لیکن ایک قدم بعد میں نے خود کو روک لیا۔ میں نے دیکھا، ڈاکٹر رائے کی آواز کے جواب میں ٹھٹھل کے جسم میں کچھ حرکت ہوئی ہے۔ ڈاکٹر رائے نے اس کا حال پوچھا جا پا، دو بارہ، سہ بارہ۔ ٹھٹھل کے ہونٹ بددائے ہوں گے کہ ڈاکٹر نے سر جھکا کے اپنا کان اس کے قریب کر دیا، اتنے قریب کے ٹھٹھل کی گہری سانسیں اس کے گال سے مس ہو رہی ہوں گی۔ ٹھٹھل نے کوئی جواب دیا، یہ میں نہ جان سکا۔ شاید کچھ بھی نہیں۔ ڈاکٹر رائے کچھ نہ پاتا تو اتنی جلد وہاں سے نہ ہٹا۔ ٹھٹھوں تک وہ اپنے ساٹھی سے مشورہ کرتا رہا اور دو بارہ پہلے کی طرح ٹھٹھل کے سرہانے چلا گیا اور آہستہ آہستہ اس کے سر پہ ہاتھ پھیرنے لگا۔ ہو سکتا ہے، دبا بھی رہا ہو۔ ٹھٹھل کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہوئی ہیں یا کوئی کراہ اٹھتی ہے، وہ یہی جانتا چاہتا ہوگا۔ میری نگاہیں مسلسل ڈاکٹر رائے کے چہرے پر جھنک رہی تھیں۔ ڈاکٹر وہاں کے چہروں کی بے تاشی ان کی تعلیم کا حصہ ہوتی

منڈلائے لیکن تازگی کے احساس نے مجھے باندھے رکھا۔
"کافی ہو گے؟" اس نے دھیرے سے کہا۔
میں دنگ رہ گیا۔
"کافی یا چائے؟"
"جو..... جو آپ کو پسند ہو۔" میری زبان ہلکا گئی۔

"تمہیں کیا مرغوب ہے؟"
"کافی ہی ٹھیک ہے۔" میں نے دلی آواز میں کہا۔
اس نے نرس ایگی سے کافی منگوانے کی فرمائش کی۔ میری طرح ایگی کو بھی یقین نہیں آیا۔ ایک ٹائپ کے لیے اس پر سناٹا طاری رہا پھر پتلی چھپتی باہر نکل گئی۔ ڈاکٹر رائے میرا ہاتھ پکڑے صوفے پر آ گیا اور اس نے اپنے ساٹھی ڈاکٹر کو بھی بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔

مجھے اپنی کم تھی، جلد بازی اور بے اعتنائی پر شرمندگی ہو رہی تھی۔
"تم کب آئے تھے یہاں؟" ڈاکٹر رائے نے چھتتی ہوئی آواز میں یکا یک مجھ سے پوچھا۔
"کل..... کل رات....." میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"گویا ابھی چوبیس گھنٹے بھی نہیں ہوئے۔ سر کی اندر دنی چوٹ ہے، چوٹ سے ہونے والے نقصان کی نوعیت جاننے کے لیے چند میٹ ضروری ہیں۔ ان کا نتیجہ دیکھنے کے بعد ہی کچھ کہنا مناسب ہوگا۔"
"جی، جی ہاں، میں سمجھتا ہوں۔"
"تم نہیں سمجھ رہے۔"
میں چپ رہا۔

"تمہاری عمر ہی ایسی ہے اور یوں ہی تم ایک الگ نوجوان ہو۔ ویسے نوجوانوں کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔"
"مجھ سے ان کی حالت برداشت نہیں

ہے یا پھر یہ معمول کی بات ہے۔ صبح وشام طرح طرح کے سرخیض آزمائے آزمائے وہ ان کی آہ و بکا کے عادی ہو جاتے ہیں۔ معمول کی باتوں اور مناظر سے عام آدمی بھی سرسری گزر جاتا ہے۔ ڈاکٹر رائے نے عقب میں مستعد کھڑی نرس ایگی کو کوئی ہدایت دی۔ ایگی تن دہی سے ٹوٹ بک میں درج کرتی رہی۔

پھر کہیں ڈاکٹر رائے کو میرا خیال آیا۔ میرے سامنے آ کے وہ ٹھہر گیا اور تیز چھتتی آنکھوں سے مجھے دیکھتا رہا۔ میں خاموش رہا۔ "کیسے ہو تم؟" اس کا لہجہ اتنا سپاٹ نہیں تھا، لہجہ نہ چہرہ۔
میں نے ہونٹ ہنسی لے لیے اور کچھ نہیں کہا۔
"ٹھیک تو ہو؟" وہ آگزی ہوئی آواز میں بولا۔
"ٹھیک کیسے ہو سکتا ہوں۔"

"ہونٹہ!" اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ در آئی۔ "کچھ ناراض لگتے ہو، کیا بات ہے؟"
"کوئی بات نہیں..... کچھ نہیں۔" میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ "آپ سے کوئی ناراض ہو سکتا ہے۔"
"تم ہو سکتے ہو۔"
"میں کہاں..... میں..... مجھ سے آگے کچھ نہ بولا جا سکا۔"

"تم نے کچھ پوچھا نہیں بھائی کے لیے؟"
"کیا حاصل، معلوم ہے، کیا جواب ملے گا، وہی رائے رٹائے، مجھے بڑے جملے۔"
"تم کیا سنا جاتے ہو؟"
"آپ جانتے ہیں۔" میں نے مختصر کہا۔
"کہنے کے لیے کچھ ہو جی تو کچھ کہا جائے۔"
اس کی آواز بھاری ہو گئی۔

"اس لیے میں بھی نہیں پوچھ رہا۔ آپ کو زحمت ہوگی خواہ بخواہ۔"
"اب تم ایک اچھے لڑکے بن گئے ہو۔"
ایک ساتھ بہت سے جواب ذہن میں

ہوری۔“ میں نے تپیدہ آواز میں کہا۔

”تعلق کی بات ہے۔“

”آپ کو کیا بتاؤں، یہ کون ہیں..... آپ نہیں

سمجھیں گے، یہ میرے لیے کیا ہیں۔“

”کوئی بھی کسی کے لیے اتنا اہم ہو سکتا ہے۔“

”وہ میری زندگی ہیں۔“ اپنے لہجے کی شدت

مجھے خود گراں گزری۔

”یہ جذبہ اب کیسا غلظا ہوتا جا رہا ہے۔“ وہ

دیدے ہٹا کے بولا۔

”آپ بہت بڑے ڈاکٹر ہیں۔ سب لوگ

یہاں یہی کہتے ہیں۔“ میں نے اس کی منت کی۔

”بس ڈاکٹر صاحب، آپ انہیں اچھا کر دیجیے۔ میں

آپ کا..... آپ کا.....

میری بات ادھوری رہ گئی۔ نرس ایکی تیزی سے

کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے پیچھے ایک

باوردی خدمت گار بھی تھا۔ اس نے پیالیاں،

دودھ، شکر اور کانی کے برتن میز پر جانے شروع

کر دیے۔ دو سیٹیوں میں انگریزی سکٹ، شلگ میوہ

بھی وہ ساتھ لایا تھا۔

”ایکی اہم بناؤ، دودھ پرائے نام، آدھ مچھ

شکر۔“ ڈاکٹر رائے نے ایکی کو حکم دیا۔

ایکی تمام تر نفاست سے کانی بنانے لگی۔ ڈاکٹر

رائے دوبارہ میری طرف متوجہ ہوا۔ ”تم کیا کہہ

رہے تھے؟“

”میں کہہ رہا تھا..... مگر نہیں، جانے دیجیے۔“

میں نے مایوسی سے کہا۔ ”مجھے آپ کو کیا باور کرانا

ہے۔“

”ہاں“ وہ سر ہلانے لگا۔ ”بہتر ہے، کچھ مت کہو

اور باتیں کرتے ہیں۔“

”کیسی بات؟ کسی کام میں جی نہیں لگ رہا

ڈاکٹر صاحب۔“

”ہشت“ اس نے منہ بنایا۔ ”تم پڑھے لکھے

نوجوان ہو، تمہیں معلوم ہوگا کہ زندگی وقت کے

چھوٹے بڑے ٹکڑوں میں ٹٹی ہوئی ہے۔ ہر کام میں

وقت لگتا ہے۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں مگر وقت کا پیمانہ گھڑی

نہیں ہونا چاہیے۔ گزشتہ چوبیس گھنٹے آپ نے بھی

بتائے ہیں، میں نے بھی، لیکن مجھ پر قیامت کی

طرح گزر رہے ہیں، پہاڑ کے مانند۔ ممکن ہے، آپ

پر جو تیس گھنٹے کم گزرے ہوں۔“

اس کے شانے سپدھے ہو گئے۔ ”تم نے بڑی

اچھی بات کہی لیکن کوئی نہ کوئی پیمانہ تو بنانا ہی پڑتا

ہے۔ زندگی محض تصوریت یا عینیت نہیں۔“

”اور زندگی محض مادیت اور حقیقت بھی نہیں

ہونا چاہیے۔“

”دو اور دو تو چار ہی ہوتے ہیں عزیز من۔“

”کبھی پانچ بھی ہو جاتے ہیں۔ جناب، شکر یہ

پانچ اور چھ ہو جانے والا پیمانہ آپ نے ایجاد نہیں

کیا۔“

”کبھی کبھی کی بات ہے نا!.....“ وہ لطف لینے

ہوئے بولا۔ ”اس کے لیے پیمانے کی ایسی کہا

ضرورت۔“

”لیکن یہ کبھی کبھی زندگی کا ایک مستقل مظہر

ہے، پھر کسی طرح اس کی تشریح، کس طرح اسے

بیان کیجیے گا؟“

”یہ شاذ و نادر، اوزان و پیمائش سے ماسوائی

رکھو۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔

”یعنی آپ ایک ڈاکٹر، پانچ یا بیسے پاسات

ہو جانے والے مظہر سے انکاری نہیں۔ میں بھی کہا

التجا کر رہا ہوں کہ وقت کے ان ٹکڑوں سے کچھ سا

کٹیجیے، مسجانی کا کوئی کرشمہ، کوئی اعجاز۔“

اس کی آنکھوں کی چمک فزوں ہو گئی۔ ”میرا

اندازہ غلط نہیں تھا۔“

”کیسا اندازہ جناب؟“ میں نے تعجب سے

پوچھا۔

”یہی کہ تم سے دل پسپ اور معنی آفریں نکال

ہو سکتا ہے۔“ اس نے کافی کی پیالی ختم کرتے ہوئے کہا اور ایک سے ایک اور پیالی کی فرمائش کی اور میرے آگے بکٹ کی پلیٹ بڑھالی۔ ”تم نے نہیں لے۔ یہ تو کھانے پینے کی عمر ہے۔“

”مگر وقت نہیں۔“ میری بڑ بڑا ہٹ شاید اس نے نہیں سنی۔ میں نے اس کا شکر یہ ادا کیا اور پلیٹ سے بکٹ اٹھالیا۔

”یہاں اسپتال میں تمہیں خالص چیزیں ہی ملیں گی۔ ذائقے میں مزے دار نہ ہوں مگر ہوتی خالص ہیں۔“

یہ ایک میرے ذہن میں ایک گمان نے ڈبک مارا اور میرا سارا وجود ہی ڈمگ گیا۔ مجھ ایک اجنبی سے ڈاکٹر جیسے تند خو شخص کی یہ رغبت اختیاری اور شعوری تو نہیں؟ اسے میری حالت اور وحشت کا احساس ہو گیا ہے۔ کہیں مجھ پر خالص لطف و کرم شعل کی طرف سے بے اطمینانی کے سبب سے تو نہیں؟ میری استقامت کے لیے وہ کوئی پیش بندی تو نہیں کر رہا؟ ابھی ابھی تو اس نے شعل کا معائنہ کیا ہے۔ اس کے نور آہی بعد اس کی مہربانی سوا ہوئی ہے۔

میرے مساموں سے پسینہ پھوٹ پڑا۔ میں نے اپنی بدگمانی سر سے جھکنے کی کوشش کی لیکن آنکھوں میں اندھیرا اترنے لگا تھا۔ ڈاکٹر رائے کی کہی ہوئی باتوں کی بازگشت دماغ میں گونج رہی تھی۔ میری نفسی کے لیے خوش امیدی کے فراخ دلانہ اظہار میں اسے کیا عار ہے۔ اسے کوئی امید تو بہم دمو ہو۔ بنیادی طور پر وہ ایک اچھا آدمی ہے۔ مجھ پاگل کے لیے زینہ بہ زینہ آگاہی ہی مناسب رہے گی، ایسی کسی تدبیر ہے تو وہ عمل پیرا نہیں؟ مجھ پر نوازش کی ارزانی اور شعل کے معاملے میں محتاط بیانی میں دور بینی کا کوئی پہلو تو منظر نہیں ہے؟

میرا سر گھوم رہا تھا اور شاید کافی کی پیالی میرے ہاتھ سے گر پڑی کہ زس ایسی نے سلیقے سے اپنی

گرفت میں لے لی۔

”کیا بات ہے؟ تم چیپ کیوں ہو گئے؟“ ڈاکٹر رائے نے چونک کے پوچھا۔ میں نے کچھ نہیں کہا مگر وہ ایک تجربہ کار آدمی تھا۔ میری کیفیت اس ہزار چہشم سے سمجھی کیسے رہ سکتی تھی۔ وہ بے تاب سا ہو گیا۔ ”اوہ، اوہ، یہ بیٹھے بیٹھے تمہیں کیا ہو گیا میرے بچے۔ یقیناً کوئی برا خیال، برے خواب کی طرح تم پر مسلط ہو گیا ہے۔ نانا..... میرے عزیز، جو صلہ رکھو۔“

میري آنکھیں جل رہی تھی۔ آنکھوں کی آگ پانی بن جاتی ہے۔ میں نے بہت ضبط کیا لیکن آنسو ندرک سکے۔

ڈاکٹر اور مضطرب ہو گیا۔ اس نے میرے ہاتھ جکڑ لیے۔ ”ایسا کچھ نہیں ہے۔ دو اور دو، پانچ کی کرشمہ کاری کا مرحلہ ابھی نہیں آیا۔ ابھی تو ہم اپنے ناپ تول کی کوشش کر رہے ہیں اور کسی امید ہی میں..... میلے کسی نتیجے پر تو پہنچیں۔ میں نے وقت کی بات کی تھی، کوئی مایوسی کب ظاہر کی۔“

”ڈاکٹر صاحب۔“ مشکل تمام میں نے کئی چھٹی آواز میں کہا۔ ”آپ مجھے کچھ بتائیے۔“

”کیا کچھ؟“ وہ چونچتا کے بولا۔ ”میں نے تم سے کیا پچھایا ہے؟“

”آپ نے صاف کچھ بتایا بھی نہیں۔“ میں نے یاسیت سے کہا۔ وہ اپنا سر تیزی سے ہلانے لگا۔ ”اوہ، نہیں، میں نے تم سے کیا کہا ہے، یہی ناکہ ابھی بعض طبی تجزیوں کا انتظار ہے۔ سہ پہر جب تم یہاں نہیں تھے، میں اس شعبے کے ماہر ڈاکٹر فرینکی کو لے کے آیا تھا۔ انہوں نے بھی یہی کہا۔ میں تمہیں کچھ صاف بتانے کی صورت میں نہیں ہوں، ہم مریض کے عزیزوں سے کوئی ایسی سیدھی بات نہیں کرتے جو بعد کو پشیمانی کا باعث ہو۔ ہم ابھی مشاہدے کے مرحلے میں ہیں میرے بچے!

یہ ایلو پتھی طب ہے، یونانی، آہورودیک اور ہیومیو پتھی نہیں۔ اس کا اپنا طور طریقہ ہے۔ تم کسی دید، شناسی یا باہر سڑک کے کنارے چونکی پر بیٹھے کسی پہلوان، اطالی اور بعض دیکھ کے جسم کے اندر کا حال، سارا کچا چٹھا جان لینے والے حکیم کے پاس نہیں آئے۔“ اس کی آواز پر کشیدگی بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے سر جھکا لیا۔ ڈاکٹر بھی چپ ہو گیا۔ کچھ دیر خاموشی رہی پھر اس نے میری کمر چھکی۔ ”لگتا ہے، پہلے تمہارا علاج کرنا چاہئے۔ یہ تیز دلی اور روانہ دھونا تمہیں زیب نہیں دیتا۔ چلو، ایک بہار اور حوصلہ مند نوجوان کی طرح اب کھڑے ہو جاؤ اور خوش دلی سے مجھے رخصت کرو۔ اپنے بارے میں میری رائے بدلنے کا دکھ مجھے مت دو۔“

یہ کہتے ہی میرا بازو تمام کے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے بھی اپنے بوجھل جسم کے ساتھ اٹھنا پڑا۔ ابھی وہ کمرے میں تھا کہ دروازے پر اسپتال کے مخصوص لباس میں دہلا پٹا ایک آدمی دکھائی دیا۔ ڈاکٹر رائے کو دیکھ کے وہ پلٹ جانا چاہتا تھا کہ ڈاکٹر کی کڑکتی آواز پر شعلک کے رک گیا۔ ڈاکٹر کے اشارے پر زس ایسی نے تیز قدموں سے آگے جا کے اس کی آمد کا مقصد پوچھا۔ اس نے کانا پھوسی کے انداز میں ایسی کو جانے کیا بتایا کہ ایسی جزیر نظر آنے لگی۔ اس دوران ڈاکٹر رائے، اس کا ساتھی اور میں دروازے پر پہنچ گئے۔

”کیا ہے؟“ ڈاکٹر نے رکھائی سے پوچھا۔ ”جناب! یہ کہتا ہے، باہر صاحب سے ملنے دو پولیس والے آئے ہیں۔“ ایسی نے جھپکتے ہوئے بتایا۔

”کیا؟“ ڈاکٹر قریباً چیخ کر بولا۔ ”پولیس!“ دوسرے لمحے اس نے میری طرف دیکھا۔ میں نے بھی سن لیا تھا۔ ایسی نے میرا نام ہی لیا تھا۔ میں تو دم بہ خود ہو گیا تھا۔ ”تمہارے لیے پولیس؟“ ڈاکٹر وحشت آمیز جہرائی سے بولا۔ ”کیوں، کس وجہ

سے؟ یہ کیا معاملہ ہے۔“ ”میں ابھی کچھ کہہ نہیں سکتا۔“ اس کے سوا مجھے کوئی جواب نہیں سوچا۔

”کیا بولتے ہیں وہ لوگ؟“ ڈاکٹر رائے نے ہندوستانی میں براہ راست قاصد سے پوچھا۔ ”وہ سب سے ملنا چاہتے ہیں جناب۔“ قاصد میا کے بولا۔ ”کس واسطے، کیوں؟“ ڈاکٹر برہنگی سے بولا۔

”اپنے کوچیس مالوم جناب۔“ قاصد حواس باختہ ہونے لگا۔ ”وہ لوگ کچھ نہیں بولے۔“ ”ٹھک ہے۔“ میں نے بے نیازی ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ ”آپ جاییے، میں ان سے مل لیتا ہوں۔“

”مگر وہ، وہ کیوں آئے ہیں یہاں؟“ ڈاکٹر کی فکر و تشویش میرے بے پروایانہ لہجے سے بھی کم نہ ہوئی۔ ”یہ اسپتال ہے۔“ وہ پھر کے بولا۔ ”کوئی بات ہی ہوگی۔“ میں نے چلی آواز میں کہا۔ ”میں دیکھ لیتا ہوں۔“

ڈاکٹر رائے حیرت و اضطراب کے عالم میں کھڑا میری شکل دیکھتا رہا۔ اس نے کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں شانے اچکائے۔ ”مناسب ہے، تم دیکھ ان کو۔“ وہ ٹھہر کے بولا۔ ”اور سنو! کوئی ایسی ویسی بات ہو تو مجھ سے مت چھپاؤ۔“

”میں کچھ نہیں چھپاؤں گا آپ سے، مجھ پر بھروسہ رکھیے۔ آپ اطمینان سے گھر جائیے۔“ میں نے بے ظاہر اعتماد سے کہا۔

میري حالت عجیب تھی۔ ڈاکٹر رائے کے سامنے قاصد آیا تھا۔ مجھے ایسا لگا، میری کوئی چوری پکڑی گئی ہے۔ میں ڈاکٹر کے سامنے بے لباس ہو گیا ہوں۔ میں اسے تفصیل کیا بتاتا، میری کوئی غلطی، میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ صفائی پیش کرنے کا وقت نہیں تھا۔ ایک طرف اسے دلاسا دینے کا

فریضہ انجام دینا تھا، دوسری طرف پولیس والے میرے منتظر تھے۔ پولیس کی آمد کا سبب ایک ہی ہو سکتا تھا۔ جس خدشے کا اظہار اکبر علی خاں نے کیا تھا، وہی ہوا۔

”کدھر ہیں وہ لوگ؟“ ڈاکٹر نے پوچھا۔ اس کا چہرہ بگڑ گیا تھا۔

قاصد نے اسے بتایا کہ مرکزی عمارت کے ملاقاتی کمرے میں پولیس والوں کو بھادیا گیا ہے۔ وہ سادہ لباس میں آئے ہیں۔ ڈاکٹر نے حکم دیا کہ انہیں کمرے میں نہ آنے دیا جائے۔ کمرے سے باہر سبزہ زار میں کرسیاں لگوا دی جائیں۔

ڈاکٹر پھر وہاں نہیں ٹھہرا۔ اس نے شب بخیر کہا نہ میں نے۔ وہ تو کم سا ہو گیا تھا۔ جانے کیسے کیسے شکوک اس کے دل و دماغ میں گھر گھر کرنے لگے ہوں گے۔ میں نے بھی گریز کیا کہ اس صورت حال میں شب بخیر کی رسم ادائیگی بڑی بے عمل معلوم ہوتی تھی۔

ڈاکٹر کے چلے جانے کے بعد کمرے میں آ کے میں نے ایک بار پھر ٹھکل پر نظر ڈالی۔ اسے تو کسی بات کا ہوش ہی نہیں تھا۔ نرس ایکی بھی کھوئی کھوئی، سبھی کبھی نظر آتی تھی۔ بار بار اچھی نگاہوں سے مجھے دیکھتی تھی۔ پولیس ہیبت و دہشت کی علامت ہے۔ آنا سامنا ہو جائے لوگ تو فرار کے راستے ڈھونڈتے ہیں۔ ہو سکتا ہے، نرس ایکی یہ نہ سوچ رہی ہو کہ میں بھی کچھ یہی کروں گا۔ میں نے مسلسل خانے

جا کے منہ دھویا۔ بال درست کیے، لباس کی ٹکٹیں دور کیں اور خود کو استوار کیا۔ اب جو کچھ بھی ہو۔ تمام بدترین نتائج ذہن میں رکھتے ہوئے مجھے پولیس کے سامنے پیش ہو جانا چاہیے۔ پولیس دروازے پر کھڑی ہے اور میرے پاس کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ اکبر علی خاں آیا ہی چاہتے ہوں گے۔ دیر ہوئی ہے مگر وہ آئیں گے ضرور۔ میں ان کی بات مان لیتا تو آرجنٹ ناراب تک ٹھکتے پہنچ چکا ہوتا۔ میں نے نرس ایکی سے کاغذ اور قلم فراہم کرنے کی درخواست

کی۔ اس کے پاس دونوں چیزیں تھیں۔ میں نے کلکتے کے اڈے کا پتہ اور پیغام لکھا اور ایکی کو تائید کی میری عدم موجودگی میں اکبر علی خاں نامی ایک صاحب آئیں تو یہ قعدان کے حوالے کر دیا جائے۔

پیغام مختصر تھا کہ تار ملتے ہی پہلی گاڑی سے وہ چل پڑیں۔ پہلے میں نے اسپتال کا پتہ لکھا تھا، پھر اسے کات کے ہونٹ کا نام لکھ دیا۔ اسپتال کا پتہ دیکھ کے وہ سارے گھبرا جاتے۔ سفر کاٹنے نہیں کتنا۔ تار کے اخراجات کے پیسوں کے لیے میرا ہاتھ جیب میں گیا تھا لیکن اکبر علی خاں کے شیشہ احساس کے خیال سے میں رک گیا۔

”ان لوگوں کے ساتھ تمہیں بھی جانا ہے؟“ ایکی نے آزدگی سے پوچھا۔ ”کیا کہا جا سکتا ہے۔“ میں نے سرسری لہجے میں کہا۔

وہ کچھ اور پوچھتی یا کہتی کہ پولیس کی آمد کی اطلاع دینے والا قاصد دروازے پر نمودار ہوا۔ اس کے کچھ بتانے سے پہلے میں نے دروازے کا رخ کیا۔ کمرے کے آگے چوڑی راہ داری تھی۔ اس کے پار چھوٹے سے قطعے پر گھبراہٹ بچھا ہوا تھا۔ کنارے کنارے پھولاری تھی ہوئی اور فاصلے فاصلے پر پستہ قد درخت استادہ تھے۔ راہ داری میں چلتے

تعموں کی روشنی کسی حد تک سبزہ زار بھی روشن کر رہی تھی ہر طرف سکوت چھایا ہوا تھا۔ سکوت، سکون نہیں ہوتا۔ میرے سینے میں تلاطم برپا تھا۔ سامنے سبزے کے بیچ میں بید کی کرسیوں پر دونوں پولیس والے سر جوڑے پختے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ چند قدم کا فاصلہ طے کر کے میں ان کے پاس پہنچ گیا۔ ان میں

ایک کی عمر چالیس بہت تالیس، دوسرے کی تیس تیس کے درمیان ہوگی۔ کوٹ پتلون پہنے ادھیڑ آدمی کا قد درمیانہ، حدی کسی قدر فربہ تھا۔ موچھیں ہلکی ہلکی تھیں، رنگت سانولی اور کپٹیوں پر سفیدی جھلک رہی تھی۔ کرتے پاجامے میں لمبوں نو جوان آدمی کا

جسم چھریا، قد کھنپا ہوا تھا۔ رنگت اس کی بھی سانولی تھی۔ وضع قطع سے دونوں پولیس والے ہی لگتے تھے۔ مجھے سامنے دیکھ کے دونوں کھڑے ہو گئے۔ چند لمحوں تک نظروں نظروں میں مجھے ٹوٹتے رہے۔ میں بھی اس اثنا میں ان کا اندازہ کرتا رہا۔

”کیا بات ہے؟“ سلام کرنے کے بجائے اور ان کے کچھ بولنے سے پہلے میں نے اچھتی آواز میں پوچھا۔

”آپ ہی ہو، ادھر میڈا کے ٹھکانے پر جانے والے؟“ نو جوان شخص تیزی سے بولا۔

میں نے سر ہلا کے اقرار کیا۔

”آپ کا نام؟“ لگتا تھا، اپنے لہجے کے تعین میں اسے دشواری ہو رہی ہے۔

”کام بتائیں۔“ میں نے سادگی سے کہا۔

دونوں نے بے تابانہ ایک دوسرے کو دیکھا۔ ادھیڑ آدمی کا منہ میڑھا ہوا۔ ”کام بھی بتادیں گے۔“

”کون ہو آپ؟“ تھوڑا اچھتے ہارے میں بتاؤ۔“

میں نے اپنی آواز متوازن ہی رکھی۔

”کوٹوالی سے آوے ہیں۔ یہ انسپکٹر شری دھن راج جی ہیں۔ ہمارا نام رام پرساد ہے، سب انسپکٹر رام پرساد۔“ نو جوان نے چستی سے جواب دیا۔

اس چستی میں مناسب کا کلمہ و تقاضا خرمایاں تھا۔

”پولیس والے ہو آپ؟“ میں نے تعجب کا اظہار کیا۔

”وہ اسپتال کا کیوٹر کچھ نا ہیں بولیں؟“ ادھیڑ شخص نے تکی ہوئی آواز میں کہا۔

”بولا تھا کچھ ایسا، پر آپ وردی بنا آئے ہو۔“

اپنے بیچان کی پردہ پوشی کے لیے مجھے اپنا ہونٹھیرا ہوا اور دھیمہ سا رکھنا چاہیے تھا۔

”ہم سے کو اسپتال کا دھیان تھا۔“ نو جوان نے بیگلت عذر خواہی کی۔

نو جوان بولا۔

”کیسی جان کاری؟“ میں نے غصے سے پوچھا۔

”میڈا کا آدمی دھنوا کا کھون کے ہارے میں۔“ نو جوان ادھر ادھر دیکھ کے بولا۔

”پر ہم کیسے جانیں، آپ پولیس ہی کے آدمی ہو؟“ میں نے کسمسا کے کہا۔

”کا..... کا مطلب؟“ نو جوان چڑسا گیا۔

”پہچان بنا ہم آپ لوگ سے کیا بات کریں۔ اپنے کو کیا معلوم، آپ.....“

”اچھ، اچھ، اچھ۔“ ادھیڑ آدمی میری بات کاٹ کے بولا۔ ”ٹھیک ہی بولیں ہیں۔ پہچان کروائے دوا پنی۔“

نو جوان نے کرتے کی جیب سے گتے کا شکستہ دوپسیدہ کارڈ نکالا۔ ادھیڑ شخص نے بھی اگلساتے ہوئے کوٹ کی اندرونی جیب سے کارڈ نکال کے

نو جوان کی طرف بڑھا دیا۔ نو جوان نے دونوں پہچان نا سے میرے آگے کر دیے۔ میں نے انہیں ہاتھ میں لیے بغیر کہا۔ ”ٹھیک ہے۔“

کم از کم ایک طرف سے اطمینان ہو گیا تھا کہ وہ مجھے ساتھ لے جانے یا گرفتار کرنے نہیں آئے ہیں۔ اس کا اندازہ تو شروع ہی میں ہو چکا تھا۔ ورنہ وہ سیدھے وارنٹ دکھاتے اور اپنے اصلی لب و لہجہ میں مخاطب ہوتے لیکن وہ میری جستجو میں اسپتال

آئے تھے اور اپنی آمد کے سبب کا اشارہ نو جوان پولیس والے نے کر بھی دیا تھا۔ ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ دھنوا کے خون کے ہارے میں انہیں کس قسم کی معلومات مطلوب ہیں۔ ایسی صورت میں اختصار ایک مجرب تدبیر ہے۔ یوں بھی، کہتے ہیں کہ کم گوئی میں بہت حفظ و امان ہے۔ دھند صاف ہو جانے تک مجھے بہت محتاط رہنا تھا۔ طول کلامی میں زبان بیک سکتی اور انہیں کسی اور طرف سوچنے پر مائل کر سکتی تھی۔ میں نے جو بوجہ ایک بات کہہ دینی

جاسوسی ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ

ایک کیمیا گر کی داستان شوق جو مقصد کی تلاش میں در بدر پھرتا رہا

ادھر آدھی رات

مصنف اقلیم علیم
راوی صفدر علی

عمل
شوق
تلاش
700/-
شوق

کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ
بذریعہ منی آرڈر پیشگی روانہ کریں

قیمت فی حصہ - 60 روپے
اک خرچ فی حصہ - 23 روپے

کتابیات پبلی کیشنز

پوسٹ بکس 23 کراچی 74200
فون: 5895313-5802552-5802551
kitabiat1970@yahoo.com

راہیلے کے لئے C-63 فیروز آباد سٹیشن ڈی ایچ اے بین روڈ گورنری روڈ کراچی 75500

ضروری تھی۔ "ایک بات بتادیں آپ کو۔ جو بولنا ہے بھل کے بولیں تو اچھا ہے، گھما پھرا کے نہیں۔"
"کھلا ہی بولیں گے۔" ادھر آدی ایشی ہوئی آواز میں بولا۔
کچھ تامل کے بعد اپنے افسر کی طرف دیکھتے ہوئے نوجوان نے تاسف سے ابتدا کی۔ "ابھی دھنوا کی ارٹھی کا کریا کرم اولوگ کر رہے ہیں۔" میں نے کوئی تاثر ظاہر نہیں کیا۔
"آپ سچ میں تھے، ہم کو بولیں، کیسو ہو گیو ایسا؟"
"ادھر گلی میں بہت سے تلاش میں تھے۔ جا کے ان سے نہیں پوچھا؟" میں نے تندی سے کہا۔
"او تو ہم سارا اونچ نیچ پوچھا، پوچھا دیکھ ہی رہت تھی۔" ادھر آدی کو میری جی اچھی نہیں لگی۔
"میدانے بیجا ہے آپ کو؟" میں نے انہیں بھگانے کی کوشش کی۔ جلد سے جلد ان کی آمد کی ٹوہ لینے کے لیے مجھے خود بھی سوالوں کی شوشہ طرازی کرتے رہنا چاہیے تھی۔
"او، رنڈی کا جنا۔" ادھر آدی کرسی پر چل گیا۔ "او، ہم کو بھیجتا بھڑوا۔"
نوجوان نے اپنے افسر کی ناگواری کم کرنا چاہی۔ "پولیس کی اپنی جے داری..... (فرض) پہنچی ہے۔"
"ادھر تو اپنے کو لوگا، شہر کی ساری پولیس میدان کے ہاتھ میں ہے۔" میں نے کہا۔
"ادھر کا مہاراجا لگت ہے کا سہرا۔" نوجوان پھنکار لی آواز میں بولا۔
"اس کے اشارے پر پولیس کچھ جانے بونجھے بغیر ہمارے پیچھے چنگنی اور ہمارے راستے بند کر دیے۔"
"پولیس کو اس وجہت کچھ بتانا ہیں تمہانا۔" نوجوان منہ پھیر کے بولا۔
"اب تو تاجل گیا۔" میں نے گویا اپنے آپ

سے کہا۔
"جو تاجل چلا، جان لیں گے اس کو بھی ترنت ہی۔"
"میدان میں تو آپ سرکار کی طرف سے آئے ہو پھر؟" میں نے نرمی سے پوچھا۔ میرے سوال پر نوجوان نے صہٹ اپنے افسر پہ نظر کی۔ افسر نے ہونٹ سکڑ کے جواب دیا۔ "ہم اپنی اور (طرف) سے آدے ہیں۔"
"اپنی اور سے؟" میں نے تذبذب سے کہا۔
"کھون کا مالا ہے، کیس آگے بھی جا سکے ہیں۔ ہم پہلے آپ سے مل کے آگے پیچھے کا سارا جان لینا چاہیں ہیں۔" نوجوان نے وضاحت کی۔
"ابھی آپ نے کتنا جانا ہے؟"
"بھھو، کو چھ بھی نہیں جانا۔" ادھر آدی کی تیوری پر بل پڑ گئے۔
"پر کچھ جان کے ہی آئے ہوں گے ادھر۔ اپنا نام بتا پھر کسی نے بتایا جو ہم تک پہنچ گئے۔"
"سارے سہر کو پتا ہے۔ بچہ بوڑھا جان، سب کو پتا ہے۔ درن کرنے کو تر نہیں ہیں بھی آپ کا۔" نوجوان کی آواز میں پہلی مرتبہ طنز غالب تھا، استہزا بھی۔
"ایسا کیا کیا ہے ہم نے؟" میں اب اپنے آپ کو اتنا بندھا ہوا محسوس نہیں کر رہا تھا۔
"ادھر آپ میدان کے ٹھکانے پر کا ہے کو گیو تھے۔ کتا کتا خجراتا؟ ایک سے ایک حرامی چلا ہے ادھر۔ سہر بھر میں تو پھر ہوا ہوی ہو بے کرے گی۔ پہلی بار لوگ ہاگ سے کتا سہر کے باہر کا کوئی آدی میدان کو آگھیں دکھانے آئے ہوتھا۔ سہر کے بھیڑ تو کب سے ہر مائی کا لال نے چوڑی پہنا ہوا تھا۔ کلانی میں..... اور کسی کو دوسواں نا ہیں ہے۔" نوجوان نے میدان کو غلیظ گالی دی۔ "کا بولیں، اس کا دھاگ سہر میں ایسا جمے ہے کسی کو یلین نا ہیں۔" نوجوان کی آواز سلگ رہی تھی۔ وہ رکا اور کہنے لگا۔ "ہم آپ کی

جہان سے سننا چاہیں ہیں، ہم کو بولو، کا ہوا تھا ادھر؟

”ہم نے طے کیا تھا کہ اب کسی سے بات نہیں کریں گے۔ ایسا ویسا کچھ ہوا تو سیدھے پکھری جا کے زبان کھولیں گے۔“ میں نے تجھے ہونے لہجے میں کہا۔ ”پر آپ ادھر آئے ہو تو ٹھیک ہے۔ ہم بتاتے ہیں۔“

میں نے گاڑی میں ٹھہل کو جھکا گئے، سفر ملتوی کر کے پناہ ترنے، اسپتال آنے، صبح ڈاک خانے جانے اور وہاں پیش آنے والا واقعہ مختصر آٹایا۔ میں نے کہا کہ اسپتال پہنچنے میں دیر ہو رہی تھی۔ پولیس کے چکر میں بڑکے جانے کتنا وقت لگ جاتا۔ یہی ایک راستہ رہ گیا تھا کہ میدا کے اڈے پر جا کے بات کی جائے۔ یہ معلوم تو ہو ہی چکا تھا کہ میدا کو کون سی زبان آتی ہے۔ کوئی منت کرنے کے بجائے میں نے اس سے چوکی سے اتر جانے کو کہا۔ اس کے چوکی سے اتر جانے پر بھی کچھ خود بہ خود ٹھیک ہو جاتا۔ میں نے پھر اسی کی زبان میں بات کی۔

”بعد کا سارا ہم جا میں ہیں۔ اپنے دو چار آدمی بھی ادھر میدا کے ٹھکانے پر رہت ہیں۔“ ادھیڑ پولیس افسر گردن میڑھی کر کے بولا۔

”پھر ہمارا کیا بولنا.....“ میں نے کہا۔ ”ابھی جا کو بدلی میں بات نکل گیو۔ ٹھیک ہے پر کل ناہیں تو برسوں، دس پندرہ دن بعد.....“ میں نے ادھیڑ آدمی کی بات مکمل کی۔ ”اس کے پاس جاتا ہے۔“

”جاتا ہے۔“ نو جوان کی بے قراری دیدنی تھی۔

”اپنا چا تو اس کے پاس ہے، واپس تو لینا ہے اسے۔“ میری آواز میں ذرا سی تپش نہیں تھی۔

”آپ..... آپ.....“ نو جوان نہ جانے کیا پوچھنا چاہتا تھا کہ منشر ہو گیا بل کھا کے بولا۔ ”وہ بھونکی کا بہت جمانے سے ادھر راج کرت ہے۔“

ایک نمبر کا چاکو باج ہے۔“

”دیکھ لیں گے۔“ میں نے سر ہلا کر کہا۔ ”ہتھیار راج میں آتا ہے تو کسی ایک کو زمین دیکھنی پڑتی ہے۔“

”پھر کا آپ اس کے ٹھکانے پر بیٹھنا چاہیں ہیں؟“

”اپنے کو اس کے ٹھکانے، چوکی سے کوئی واسطہ نہیں۔ ہمیں اس شہر میں نہیں نکلنا، ہم نے اسے بھی صاف بول دیا تھا۔ ہم نے کہا، اپنے کو آگے جانا ہے۔ پناہ تو ہم بھائی کی وجہ سے آگے۔ اس نے ہماری بات مان لی۔ مٹی کے لوگوں نے سارا دیکھا بھالا تھا، انہوں نے بھی کچھ بتایا ہوگا اس کو۔“

میری سادہ بیانی پردہ اور مضطرب ہوئے۔ ادھیڑ آدمی نے پھر وہ سوال کیا جو اس کے سر میں تکا بنا ہوا تھا۔ وہ یقین کرنا چاہتا تھا کہ دو یوزا میدا سے مبارزت کا دعوا میں نے کسی عزم، کسی مل بوتے ہی پر کیا ہوگا۔ اس نے انکی زبان سے پوچھا کہ نتیجہ مختلف نکلا، میں میدا پر قابو نہ پاسکا تو.....! مجھے بھی بڑھ چڑھ کے بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ میں نے یہ امکان تسلیم کیا تو دونوں بے مزہ اور بے آرام ہوئے اور جلد ہی انہیں قرار آ گیا۔ انہوں نے میرے سکون سے شاید وہی نتیجہ اخذ کیا جو میں اپنی زبان سے کہتے ہوئے پہنچا رہا تھا۔ پھر انہیں انجام سے غرض بھی کیا تھی۔ انجام کچھ بھی ہو، ان کا کون سا زیاں تھا لیکن ان کے کچھ کبے بغیر اتنا تو نظر آنے لگا تھا کہ نہ تو میدا کے فرستادہ ہیں، نہ اس سے کوئی ہم دردی رکھتے ہیں۔ البتہ اس کی ہزیمت کے مشتاقی ہیں اور میرے پاس ان کی آمد کا ایک مقصد مجھے دیکھنا، میرے عزم و ارادہ کا اندازہ کرنا ہے۔

”بہت چربی چڑھ گوی تھی اس سوہ کو۔“ اگست ہے، او جان کس، اب اس کا دکھت سہتم ہو چکا ہے۔“ نو جوان نے مجھے ہمیز کرنے کے لیے کہا۔ اس نے کچھ غلط نہیں کہا تھا۔ میں چپ رہا۔

”پر اپنے کو کوئی بھروسا ناہیں اس پر، اچھی طرح جائیں ہیں ہم اس کو۔ دکھت ناہیں دیو، اس راڈن نے سے یو۔ من میں اس کے کسی اور پر کارگروا پکڑن کا بھی ہو سکے ہے۔ ہو سکت ہے کہ نا ہیں؟“ نو جوان نے بڑبڑاتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔

”ہو سکتا ہے۔“ میں نے مایوسی سے کہا۔ ”اسے ہی تو ہم بولیں ہیں۔“ ادھیڑ آدمی اڈ کے بولا۔ ”آپ کو پھر بہت سہیل کے رہنا ہووے گا۔ اس کے پالتو جناور شہر میں ڈکراتے پھریں ہیں۔“

”ہم کیا کر سکتے ہیں ہمیں تو سب سے پہلے اپنے بھائی کی فکر ہے۔“ ”اسی کارن ہم ادھر آئے ہیں، آپ کو دیکھنے بھی..... اور اپنی کوئی مدد، سہایتا کی جرورت ہو تو بھی.....“

میں نے پھر ان کا شکر یہ ادا کیا۔ ”ناہیں ناہیں۔“ نو جوان نے جو شیعے انداز میں اصرار کیا۔ ”کوئی بات، کوئی اپاے من میں ہو تو آپ بولیں۔“

”کیا بولیں، آپ خود ہی سارا دیکھ چکے ہیں۔“ ”اوبد ماس سہر کا سب سے بڑا حرا ہی ہے۔“

پھر ہم کیا کریں، آپ ہی مشورہ دیں۔“ ”اب ہم آگے ہیں نا۔“ نو جوان پولیس افسر نے شکرگزاری کے انداز میں کہا۔ ”پر دیکھیں سب! ایک آدمی کا کھون ہو گیا ہے۔ بہت بڑی بات ہے ای، چھوٹی موٹی ناہیں۔ لاگت ہے، ادھیڑا دگا باج پہلے آپ کو اس چکر میں پھنساوے گا۔ ٹھیک ہے، مٹی کے لوگ سارا کچھ دیکھے ہیں، پر ان کا کا بھروسا، اوتو سسرے مٹی کے مادھو ہیں۔ بے پندے کے لوئے۔ میدا سے دشمنائی کا ہے مول لیں گے۔ ہم کو پتا ہے، آپ اپنا چاکو ناہیں لٹالے تھے۔ دھوا کو اس کے مٹی سا مٹی کا چاکو کھبا

ہے۔ اور ادھر سارے نہیں، تو پولیس کے بھی کچھ دلال لوگ میدا کا نمک کھاویں اور سسرے سر ملاویں ہیں۔ ٹھکانے سے ملیدہ ماہن آوے ہے برابر۔ پکا تال سیل بنا ہے دونوں میں۔ ادھی اڑجن ڈال سکیں ہیں..... پر آپ..... آپ سمانت رہو، ہم سوچیں ہیں آگے کا۔“

ہم دردی کی وجہ میری سمجھ میں دیر سے آئی اور مجھے اپنی دیرنہی پر غصہ بھی آیا۔ اس مہربانی کی وجہ میدا سے عداوت، پیشہ دارانہ فرض شناسی اور دور اندیشی نہیں تھی بلکہ وہ دونوں کچھ زیادہ ہی پولیس والے تھے۔

مجھے ان کا شکر یہ ادا کرتے رہنا چاہیے تھا۔ نو جوان کا لہجہ اب خاصا مفاہمانہ ہو گیا تھا، اشتیاق سے بولا۔ ”آپ لوگ، مطلب ہے، آپ کے بھائی اور آپ کا کریں ہیں؟“

میں نے اسے بتایا کہ فیض آباد شہر کے علاقے میں تھوڑی بہت زمینیں ہیں۔

”زمین دار ہیں آپ؟ اوتو لاگت ہی تھا اپنے کو۔“ نو جوان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

شہر کے سب سے بڑے اسپتال اور اسپتال کے سب سے مہنگے کمرے میں علاج و معالجے کا حوصلہ کوئی اقبال مند شخص ہی کر سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے، انہیں شہر کے سب سے بڑے ہوٹل میں ہمارے قیام کا بھی علم ہو۔ وہ پولیس والے تھے۔ نرس، ڈاکٹر، مجھے ڈاک خانے لے جانے والا لایکا، ہوٹل کا منیجر اور عملے تک ان کی رسائی مشکل نہ تھی۔ میدا کے اڈے، مٹی کے لوگوں اور راہ کیروں سے اب پھر کے عرصے میں انہوں نے اس قدر معلومات حاصل کر ہی لی تھیں۔ وہ پوری تیاری کر کے آئے تھے۔

”اپنی کوشش ہووے گی، آپ ان کٹ کھنا لوگن، ان جو جنم سے دور دور ہیں۔ ادھر بھائی کی دیکھ بھال میں کوئی کھوت نہ پڑے۔“ ”آپ کی مہربانی۔“ میں اور کیا کہتا۔

میں نے کہا جا یا کہ صرف دونوں کی بات ہے۔
 ٹھٹھل اور میری پریشانیوں کے لیے اسے لوگ
 اکٹھے ہو سکتے ہیں کہ وہ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ میں
 نے ان سے نہیں کہا کہ وہ غلط جگہ آگئے ہیں، یہاں
 سے انہیں کچھ حاصل نہ ہوگا۔ ان کے گریبان پر
 ہاتھ ڈالنے، ان کی خدمت کرنے کو بہت جی کرنا تھا
 لیکن یہی بہتر تھا کہ ان کے فرمودات جوں کے توں
 قبول کر لیے جائیں۔ انہوں نے بہر حال ایک
 اعانت ضرور کی تھی، ایک ایسے گوشے کی طرف
 انہوں نے اشارہ کیا تھا جو مجھے خواص باختہ سے اجھل
 رہا تھا۔ میدا اور اس کا سر پرست بر جو اپنی عطا کی گئی
 مہلت میں میرا قصہ ہی پاک کر دینے کی کوشش
 کیوں نہیں کریں گے؟ میدا اور بر جو ایک زمانے
 سے اڈا چلا رہے ہیں۔ ٹھٹھل کے بقول جاتو اور
 بازو کے زور کے ساتھ اڈا گیری میں دماغ کے زور
 کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ ان بھی اڈے کی چوکی
 سے بچنے رہنے والوں کو میری موجودگی میں اپنا راج
 پات تمام ہو جانے کا خدشہ بجا طور پر لاحق ہونا
 چاہیے۔ اڈے کا استاد ہی نہیں، چوکی سے ہٹ
 جانے پر اس کے نفس ناطقہ، حاشیہ بردار بھی متاثر
 ہوتے ہیں۔ ان کی عزت و حرمت، ان کی بقا
 خطرے میں ہے۔ میں نہیں رہوں گا تو سب کچھ
 یوں ہی قائم رہے گا۔ ادھر اڈے کے بہت سے
 لوگوں کے سینوں پر ایسے ہم نشیں دھوا کی جواں
 مرگی کا بار ہے۔ دیوانگی کا پورا جواز ہے، عذر بھی
 بہت معقول ہے کہ دھوا کا کوئی فدائی، ایک سرکش
 بے لگام ہو گیا تھا۔ یہ شیران کا، پولیس کی پشت پناہی
 انہیں حاصل ہے۔ اتنی جلدی اور تیزی مشکوک
 ہو سکتی ہے۔ سو میری نابودی کے فیصلے میں انہیں کچھ
 دخل کرنا چاہیے لیکن کیا عجب، دماغ میں کچھ بھی ما
 جائے..... اور یہ اسپتال کوئی قاعدہ نہیں۔ کوئی بھی کسی
 وقت میرے سر پر آدھک سکتا ہے۔ سامنے سے نہیں
 تو عقب سے آسکتا ہے۔ بے وضعی فیسری تو کیا جائز

دنا جائز۔ حاصل یہ کہ مجھے تو اب اپنے سائے سے
 بھی بھٹا رہتا ہے۔
 ”آپ کبھی رہے ہیں نا؟“ مجھے گم دکھنے کے
 نوجوان افسر نے ٹوکا۔
 ”جی، جی ہاں۔“ میں نے سانس لے کے
 کہا۔ ”ہر بات سمجھ میں آ رہی ہے۔“
 ”کچھ ناہیں ہووے۔ بھگوان کرے، سارا
 ٹھیک ہی رہے، پر اپنے کو تو آگے پیچھے کا دھیان
 رکھنا ہے۔“ نوجوان نے مجھے تلقین کی۔
 ”پولیس بازو کا اپنا ایک تریکا ہے۔ کانونا آپ
 مانگ سکتیں ہیں پرنٹو کا پتا، پولیس کا، کوئی بکا ڈ آدی
 ہوا۔“ اڈیٹر پولیس افسر نے اپنا انتہا جاری رکھا۔
 میں نے کہا جا یا کہ دعوتو میری طرف سے بھی
 کیا جاسکتا ہے۔ کل سچ عدالت کا دروازہ کھٹ کھٹا یا
 جاسکتا ہے۔ شہر میں ایک اجنبی جس کے ساتھ پیار
 بھائی تھا، کبھی کسی زیادتیوں کا بدمعاش بنا رہا۔ اس کی
 جمع پونجی چھینی تھی۔ مزاحمت پر قاتلانہ حملہ کیا گیا۔
 دھوا کو جاتو نہیں لگتا تو اجنبی نشانے پر تھا۔
 انہوں نے اس کے لیے شہر کے راستے تنگ کر دیے
 اور اب وہ اسے ختم کر دینے کے درپے ہیں کہ اس
 نے شہر کے اڈے کے استاد کو اس کی چوکی سے بے
 دخل کر دینے کی جرات کی تھی۔ گواہ موجود ہیں، ایک
 نہیں، بہت سے۔ روپے پیسے کی بات سے تو سچ
 بولنے کے لیے انہیں خریدنا جاسکتا ہے۔ آج کل سچ
 بھی خریداجاتا ہے۔
 ایسے ایسے بے سرو پا خیال میرے سر میں
 منڈلا رہے تھے۔ اچھا ہوا جو میں نے اپنی زبان بند
 رکھی ورنہ وہ میرے متعلق کیا سوچتے۔ عدالت، اس
 کے مرحلے، الزامات، صفائیاں، پیشیوں پر
 پیشیاں۔ ہمیں کون سا یہاں غصیرے رہنا ہے۔ کچھ
 عرصے کے لیے عدالت کی طرف سے پولیس کا
 حفاظتی دستہ تعینات ہو جائے گا اور تاریخیں پڑنی
 رہیں گی۔ سچ کا اپنا زور و اثر کس قدر، عدالت، میں

اسے ثابت کرنا پڑتا ہے اور آدی کی عمر صرف ہو جاتی
 ہے۔ یہ عدالت کی بات جانے کیسے میرے دماغ
 میں آگئی۔ آدی کے پاس دماغ ہونے سے مراد یہ
 نہیں کہ دماغ ہر وقت اس کا ساتھ دے رہا ہے۔
 کہتے ہیں، دو خونیاں آدی کو جانور سے میز کرتی
 ہیں۔ بولنے اور سوچنے کی قوت یا صلاحیت مگر
 دونوں کا کچھ ٹھیک نہیں۔ دونوں کتنا اور کہاں تک
 آدی کا ساتھ دیتی ہیں۔ زبان بہک جاتی ہے دماغ
 بہک جاتا ہے۔ دونوں آدی کا ساتھ دیتے تو دنیا ہی
 بدلی ہوئی۔ آدی کے یہ دونوں اوصاف تو بہت خام
 اور ناتمام ہیں۔

”آپ بولو تو اسپتال اور آس پاس سمجھید
 کیڑواں میں آدی پھیلا دے دیں؟ اولوگ میدا کا
 سب آدی کو جانت ہیں۔ تھوڑا کھر چا پانی ہووے گا
 پر کام پکو ہو جاوے گا۔“ نوجوان کو حرف مطلب
 زبان پر لانے میں اتنی دیر لگ گئی۔

مجھے کوئی اچھنچا نہیں ہوا اور شاید جو مجھے کہنا
 چاہئے تھا، میں نے وہی کہا کہ جو بہتر سمجھیں، کریں۔
 میرے اس خسروانہ عندیے سے ان کے
 چہروں پر سکون دسرت کے آثار نمودار ہوئے۔
 دولت کا عجب کرشمہ ہے۔ آدی کو آدی کا اسیر کر دیتی
 ہے۔ پاس ہو تو گرویدگی میں کمی نہیں آتی، پاس نہ
 ہو تو دیوانہ بنائے رکھتی ہے۔ جلوہ گری کی تو بات ہی
 اور ہے، ذکر ہی اس کا محور کن ہوتا ہے، جس پر لٹاؤ،
 اس کا تو عالم ہی کیا، جس سے ہاتھ چھینے رکھو، وہ ایک
 نظر عطا، لطف و عنایت کی ایک نظر کے آسرے میں
 زندگی گزار دیتا ہے یا گنوا دیتا ہے۔ کوئی اور وقت
 ہوتا تو میں دونوں پولیس افسروں کو ٹھانچے مارنا اور
 دھکے دے کے باہر نکال دیتا لیکن میرے پاس پیسا
 تھا، انہیں اس کی ہوس تھی۔ وہ میری ضرورت تھے،
 میں ان کی ضرورت تھا۔ وہ کسی دولت کے طلب گار
 ہوں گے۔ مسائل کا ظرف بھی تو کشادہ ہونا چاہیے،
 اور یہ تو ٹھٹھل کا معاملہ ہے۔ مسائل کا ہر طرف چھوٹا

پڑتا۔

بہت دیر سے نرس ایچی خاصی فکر مند نظر آ رہی
 تھی۔ پولیس سے بڑے بڑے رسم پناہ مانگتے ہیں۔
 وہ تو ایک عورت تھی۔ بار بار کمرے سے باہر آ کے وہ
 ہمیں دیکھ جاتی۔ اس بار وہ مجھے دکھائی دی تو میں
 بے آواز دے کے اسے روک لیا۔ وہ منتظر ہی تھی۔
 کتنی ہوئی ہمارے قریب آگئی۔ میں نے اس سے
 درخواست کی کہ مہمانوں کی خاطر تو واضح کچھ انتظام
 ہو سکتا ہے۔ میں نے اسے انگریزی میں مخاطب کیا
 تھا، اس لیے کہ اب تک وہ مجھ سے اسی زبان میں ہم
 کلام رہی تھی۔ اس نے موڈ بانہ انداز میں سر جھکا یا
 اور راہ داری میں بائیں طرف چلتی ہوئی نظروں
 سے دور ہو گئی۔

گوروں کی زبان بھی ان کی طرح دولت
 و شہمت، طاقت و عظمت کی علامت ہے، اسے
 بولتے ہوئے آدی زیادہ دانا و بیباک اعتبار کے لائق
 معلوم ہوتا ہے۔ کچھ شدید میرے سامنے موجود
 پولیس افسروں کو بھی تھی۔ ”ای کا، کاجروت ہے۔
 اپنے کو پتا ہے، ای اسپتال ہے، کھاتو تواجو کی جگہ
 ناہیں۔“ نوجوان نے چلتی آواز میں کہا۔ اس کے
 بزرگ ساتھی نے بھی ہم نوالی کی۔

”ان کمروں میں انہوں نے مہمانوں کے لیے
 ایسا کچھ انتظام کیا ہے۔“ میں نے اس کے احترام کی
 روش ترک نہیں کی۔

”ای کمروں کا، کابات ہے گورا لوگ بھی ادھر
 آ کے ٹھہرت ہیں۔“ نوجوان پولیس پٹ پنا کے
 بولا۔ دونوں کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔
 خوشامد ہر ایک کو مرغوب ہوتی ہے لیکن کبھی نسیمی
 وضع و صورت میں قبول کی جاتی ہے۔ آدی کیا
 کرے، تعریف و توصیف کرنے والے کو
 دھتکار دے کہ وہ حد سے تجاوز کر رہا ہے۔ اپنا
 عرفان، مدد و کسب سے زیادہ ہوتا ہے۔ لوگ یہ
 بھی کہتے ہیں کہ اسی کو سب سے کم ہوتا ہے۔ اس

کے مداح تعریف و توصیف کی تکرار سے اس کی خود شناسی کی صلاحیت دھندلا دیتے ہیں۔ نوجوان افسر کہنے لگا کہ لگتا ہے، میدا کا وقت آ ہی گیا ہے۔ ہر ایک کے اقبال و انتہا کا ایک وقت ہوتا ہے۔ خدا نے مجھے اسی لیے شہر پنا بھیج دیا ہے۔

میں نے دانستہ شوشہ چھوڑا کہ ایک صورت یہ بھی ہے۔ دیر کیوں کی جائے، کیوں نہ کل صبح نکلتے ہی اپنا چاقو واپس لینے کے لیے اڈے کا رخ کر لوں۔ اڈے کی چوکی پر جگہ بنانے کے بعد خود بہ خود سارا معاملہ منٹ جائے گا۔

یہ سن کے دونوں ٹھوسے گئے، پھر ادھیڑ افسر نے اگلی زبان سے کہا کہ مجھے ابھی اپنے بھائی کے علاج کی طرف پوری توجہ دینی چاہیے۔ بھائی کی ناگفتہ بہ حالت کے دباؤ میں مبارزت کا مرحلہ متاثر ہو سکتا ہے۔ بہر حال کھلے چاقو درمیان میں ہوں گے۔ ہتھیاروں کی موجودگی میں زندگی اور موت کا فاصلہ کم ہی رہ جاتا ہے۔ ذرا سی چوک سے ایسی غلطی ہو سکتی ہے جس کا ازراہ شکل ہو جائے۔

وہ کچھ غلط نہیں کہہ رہا تھا لیکن اس کی سچائی نیک نیتی پر مبنی نہیں تھی۔ ہوتی تو محسوس ہو جاتی۔

”ہم کا بے کوا دھر آئے ہیں۔ ہم ہیں سب۔ پہلے آپ بھائی کو دیکھو، اپنی کجھ میں ایسی آوت ہے۔ باقی تو آپ..... آپ جانو۔“ نوجوان نے اپنے افسر کی فہمائش میں اضافہ کیا۔

میری دل جوئی کے لیے انہوں نے بہت سی باتیں کیں۔ مجھے اب وہ بالکل بدلے ہوئے لوگ لگ رہے تھے۔ وہ بیٹھے بیٹھے منقلب ہو گئے تھے۔ یہ وہ لوگ نہیں تھے جن سے کچھ دیر پہلے میرا سامنا ہوا تھا۔ جیب سے خریدی ہوئی چیزوں کی طرح ان پر اب مجھے اختیار حاصل تھا اور میں نے طے کر لیا تھا، جو وہ کہیں گے، اس پر سودے بازی نہیں کروں گا۔ دولت سے کسی پہلو سگون ملتا ہو تو دولت کا اس سے بڑا مصرف کیا ہے۔ دولت کی سب سے بڑی

خریداری شاید آدمی کی خریداری ہے۔ یہ آدمی کو موم بنا دے، ریشم بنا دے، آدمی کو آدمی بنا دے اور آدمی کو جانور بنا دے۔ ”آپ لوگ کچھ بتاؤ گے یا مجھ پر چھوڑ دیں گے۔“ میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

میری بات ان کی کجھ میں دیر سے آئی، ادھیڑ آدمی کو پہلے۔ اس کا جسم لہرا لہرا گیا اور اس نے دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔ ”کابا ت کرت ہو سب۔“

”نہیں نہیں، کچھ کہنا ہو تو جھگ نہ کریں۔“

”ہم کا بولیں، آپ خود سمجھ دار ہو۔“

”ٹھیک ہے، پھر ہم پر چھوڑ دیں اور کسی بات کی فکر نہ کریں، آپ نے اچھی کہا تھا، ہم ہیں نا، ہم بھی آپ سے یہی کچھ کہتے ہیں۔ ہمیں تو اپنا بھائی سب سے زیادہ عزیز ہے۔“

مجھے ڈر تھا، اس دوران کہیں اکبر علی خاں نہ آجائیں۔ اسپتال کے ملازم چائے اور کھانے پینے کی چیزیں لے آئے تھے اور وہی ہوا۔ راہ داری میں قدموں کی آہٹیں گونجیں۔ وہ اکبر علی خاں ہی تھے۔ کوئی نو عمر لڑکا بھی ان کے ساتھ تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑی کٹی (ٹفن کیریر) لٹکی ہوئی تھی۔

مجھے سبزے پر بیٹھا دیکھ کر اکبر علی خاں میری طرف ہی آ گئے۔ دو انجینی میرے ساتھ تھے۔ انہیں پریشان ہو جانا چاہیے تھا۔ یہی حال دونوں افسروں کا ہوا۔ انہوں نے میرے ساتھ کھڑے ہو کر اکبر علی خاں کا استقبال اور ہاتھ جوڑ کے تمسکا کر لیا۔ ایک کرسی خالی تھی۔ اکبر علی خاں اس پر بیٹھ گئے۔ نو عمر لڑکا ان کی ہدایت پر کمرے میں چلا گیا۔

اس سے پہلے کہ وہ اور مکدر ہوتے، میں نے دونوں افسروں کا تعارف کر لیا۔ وہ اکبر علی خاں کو اچھی طرح جانتے تھے اور انہیں معلوم تھا کہ میدا کے اڈے پر میرے ساتھ جانے والے بھی وہی تھے۔

میں نے چائے کے برتن پھینچ کر ان تینوں کا دھیان بنانا چاہا۔ اکبر علی خاں خاصے متوجہ تھے،

کہنے لگے۔ ”خبریت، آپ لوگ کیسے آ گئے؟“

”کابولیں۔“ نوجوان افسر معذرت اور ستائش ملی جلی آواز میں بولا۔ ”ساب کو دیکھن واسطے آ گویں۔“ اس نے کم و بیش وہی کہا جو مجھ سے کہہ چکا تھا کہ میدا کے اڈے پر جا کے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے والے شخص کا سن کے ان سے برداشت نہیں ہوا۔ وہ مجھے دیکھنے کے لیے آ گئے۔ بڑی طور پر اس کا بیان سچ تھا۔

”وہ تو ان کی مجبوری تھی۔“ اکبر علی خاں نے اگڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

”یہ خواخواہ کسی سے اڑنا نہیں چاہتے تھے مگر کیا کرتے؟“

”ان کی جگہ یو پو کوئی اور ہوتا تو ایسوی تھوڑی چلا جات تھا۔“

ادھیڑ افسر بے ساختہ بولا۔ ”کوئی بات تو اٹک ہو سکتی دیکھ سب!“

دونوں افسروں نے جلدی جلدی چائے ختم کی۔ میرے اصرار پر رسا انہوں نے دو ایک بکٹ لیے اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ اکبر علی خاں کے آنے کے بعد وہ کشادگی محسوس کر رہے تھے۔ میں نے بھی انہیں نہیں روکا۔ راہ داری کے آخری سرے تک میں نے اور اکبر علی خاں نے انہیں تپاک سے رخصت کیا۔ یہ تپاک بڑا اوجبی تھا۔ چلتے چلتے میں نے جلد ہی دوبارہ ملنے کا اشتیاق ظاہر کرتے ان کی دل جوئی کر دینا ضروری سمجھا۔

مجھے معلوم تھا، اکبر علی خاں ان دونوں کے سامنے چپ ہو گئے تھے، ان کے جانے کے بعد چپ نہ رہ سکیں گے۔ ہم سبزے پر رکھی کرسیوں پر آگے بیٹھے ہی تھے کہ انہوں نے کوئی نامل نہیں کیا۔

”کیوں آئے تھے یہ؟“ انہوں نے ناگواری سے پوچھا۔

”میں نے نہیں بلایا تھا۔“ میں نے کہا۔

”ظاہر ہے آپ کیوں بلاتے مگر آنے کی وجہ کیا

تھی؟“

”انہوں نے بتایا تو تھا آپ کو۔“ میں نے دلی زبان سے کہا۔

”صرف اتنا ہی؟“

”وہ پولیس کے آدمی تھے۔“ میں نے ہزاری سے کہا۔

”میدانے نہیں بجا تھا؟“

”کس لیے، میدا انہیں کیوں بھیجتا؟“

”سن گن لینے، تاڑ بھاڑ لینے کے لیے۔“

”تو مجھے کیا کرنا چاہیے تھا؟“

”اور کیا کہہ رہے تھے؟ مجھ سے کچھ چھپا تو نہیں رہے میاں۔“ اکبر علی خاں کی آواز میں دل سوزی تھی۔

”پولیس والے تھے، نوڈ کو بیچنے آئے تھے۔“

”بیچنے۔“ وہ اٹھ بھل بڑے۔ ”پھر، پھر؟“

”میں نے انہیں خریدا لیا۔“

”خریدا لیا کیا مطلب؟“

”میں نے ان سے بات کر لی۔“

”کس سلسلے میں؟“

”ان کا گداز، ان کی ہم دردی خریدنے کے لیے۔ وہ یہی بیچے آئے تھے۔“

”کتھن میں سودا ہوا؟“

”یہ میں نے ان پر چھوڑ دیا۔ نرخ پوچھنا نامناسب معلوم ہوتا تھا۔ عطیے کی صورت رہے تو اچھے۔“

”گو یا ابھی نقد کچھ ادا نہیں کیا؟“

”کچھ ساکھ بن گئی ہے شاید۔“ میں نے تکی سے کہا۔

”مجھے پوری بات بتائیے۔“

میں سوچتا رہا، انہیں کیا بتاؤں، کیا نہیں مگر پھانے کو تھا بھی کیا۔ میں نے اختصار سے ساری رواد گوش گزار کر دی۔

وقت گزر گیا۔ انہوں نے کوئی رد عمل ظاہر

نہیں کیا تو میں نے پوچھا۔ ”کس فکر میں پڑ گئے آپ؟“

”کچھ نہیں۔“ وہ متردد لہجے میں بولے۔

”سوچ رہا ہوں، بات ابھی ختم نہیں ہوئی۔ ایک بات انہوں نے بھی غلط نہیں کہی۔ میدا یا اس کے آدمی اس مہلت میں..... وہ کہتے کہتے رک گئے۔“

”وہ مجھے دوبارہ اڈے پر جانے کے قابل ہی نہیں چھوڑیں گے۔ یہی تا؟“

”یہ خیال میرے دماغ میں بھی آیا تھا لیکن ایسی جگہوں اور ان لوگوں کے رسم و رواج پر آپ کا یقین دیکھ کر، میں چپ رہا۔“

”ایسا کہیں ہوتا نہیں ہے۔“ میں نے مایوسی سے کہا۔ ”اور مجھے تو اب بھی شبہ ہے۔“

”یعنی اب تک آپ کو..... وہ رنجیدہ ہونے لگے۔“ مگر مجھے ان لوگوں پر کوئی بھروسہ نہیں۔ صاف بات ہے۔ آپ مائیں نہ مائیں۔ وہ میدا کا دست راست بر جو بہت گھاگ اور کاپیاں شخص ہے۔ اس نے مہلت لی ہے، دی نہیں ہے اور جیسا کہ آپ کا اعتماد تھا، اسے اپنے پروردہ کا انجام نظر آ گیا تھا۔ اس وقت مجھے یہ مہلت بڑی غیرت محسوس ہو رہی تھی لیکن اب..... ان سے کچھ بعید ترس ہے میاں۔“

”پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟“ میں نے پوچھا۔

”کیا کہوں۔ دماغ کام نہیں کر رہا۔ اس کے معنی تو یہ ہوئے، وہ پولیس والے ٹھیک کہہ رہے تھے، آپ ہر طرف سے گھرے ہوئے ہیں۔“

”کوئی نہ کوئی راستہ تو نکالنا ہی پڑے گا۔“ اکبر علی خاں بہت گھبرا گئے تھے۔ ان کی پریشانی کم کرنے کے لیے میں نے ہلکی آواز میں کہا لیکن یہ تسلی بڑی مصنوعی تھی۔

”اب تو مجھے اپنا یہ شک بھی درست معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کو کہیں میدا ہی نے نہ بھیجا ہو۔ وہ یہ جاننا چاہتا ہوگا کہ اس کے ٹھکانے سے جانے کے

بعد اب آپ کے ارادے کیا ہیں۔“

”ایسی صورت میں تو کچھ بھی ممکن ہے۔“

”انہوں نے آپ سے آپ کے ارادوں کے بارے میں کچھ پوچھا تھا؟“

”ہاں ہاں، پوچھا تو تھا کچھ ایسا۔“

”اور آپ نے کیا جواب دیا؟“

”میں نے وہی کہا جو میرا ارادہ ہے کہ مجھے اپنا جاتو واپس لینے میدا کے اڈے پر جانا ہے۔“

”اوہ!“ انہوں نے شدت سے آنکھیں پھینچ لیں، ماتھے پر شکنوں کا جال پڑ گیا۔ ”معاف کیجیے، کیا ضرورت تھی آپ کو یہ کہنے کی۔“

”ہاں، مجھے شاید اپنا عزم اسنے آپ تک ہی رکھنا چاہیے تھا۔“ میں نے نفرت سے کہا۔

”اس کے بعد وہ کیا بولے؟“ انہوں نے تیزی سے پوچھا۔

”انہوں نے میرا ارادہ اور ہمہیز کیا اس وقت میں نے جانا کہ وہ میدا کے بھیجے ہوئے نہیں ہیں۔ انہوں نے میدا کو بہت برا بھلا کہا۔ مغلظات سنائیں۔“

وہ خاموش ہو گئے، میں بھی۔

شبنم گرتی محسوس نہیں ہو رہی تھی لیکن سبزہ نم ہو گیا تھا۔ بہت دھیمی دھیمی ہوا چل رہی تھی۔ نرس ایلی نے باہر آ کے ہمیں چونکا دیا۔ وہ کھانے کے لیے پوچھ رہی تھی۔ اکبر علی خاں ایک دم کھڑے ہو گئے۔

”میں تو بھول ہی گیا۔“ وہ پشیمانی سے بولے۔

”کھانا ٹھنڈا ہو گیا ہوگا۔“

ہم کمرے میں چلے آئے اور ٹھیل کو ایک نظر دیکھ کے پھر باہر آ گئے۔ ایلی کا مشورہ تھا، دہی کھانوں کی خوشبو..... کمرے میں رنج بس جاتی۔ ایلی نے کینٹین کے ملازم سے رکابیاں منگوائیں۔ اکبر علی خاں کے ساتھ آنے والے لڑکے نے بھی اس کی مدد کی۔ کھانا ابھی نیم گرم تھا۔ وہ کوئی پانچ چھ آدمیوں کا کھانا لے آئے تھے۔ جھوک نہ ہو تو اشتہا انگیز خوشبو بھی

ان لوگوں کے لئے جو خوبصورت کتابیں پڑھنے کے شوقین ہیں

ہزاروں دلوں کی دھڑکن

محی الدین نواب

کے قلم سے

(بیماری) آپ کی (اس) (معاشرے) کی (کتابیں)

ایمان کا سفر

قیمت - 150 روپے

ڈاکٹریج - 25 روپے

دو کتابیں جن کو آپ آنکھوں سے نہیں بندھو دھڑکنوں سے دھینکے اور کتابیاں جنہیں پڑھ کر آپ کہیں گے کہ آپ کو ایسی ہی کتابوں کی تلاش تھی

- | | |
|----------------|--|
| ایمان کا سفر | میرا ایک مسافر ان کے حواس سے رہنا پورا نہیں اس لئے ہزاروں کہتے کہ ان کے حواس کو مارنا ہے۔ |
| چورشت | ہماری منہبہ کتاب میں دہلی شدت کا نام کی کتاب میں ہے جس میں ایک فلسفہ کے چور روز سے ایک چور کا نام لیا گیا ہے۔ |
| سداسا گن | میں نے لکھا کہ شبنم نے میرا نام لیا اور پھر وہ دیکھی اور وہ ایک منہبہ کتاب میں لکھی ہے کہ ایک نرس نے اس میں لکھا ہے۔ |
| میٹھا زہر | میں نے لکھا کہ شبنم نے میرا نام لیا اور پھر وہ دیکھی اور وہ ایک منہبہ کتاب میں لکھی ہے کہ ایک نرس نے اس میں لکھا ہے۔ |
| آئینہ خانہ | میں نے لکھا کہ شبنم نے میرا نام لیا اور پھر وہ دیکھی اور وہ ایک منہبہ کتاب میں لکھی ہے کہ ایک نرس نے اس میں لکھا ہے۔ |
| آؤ کا باپ | میں نے لکھا کہ شبنم نے میرا نام لیا اور پھر وہ دیکھی اور وہ ایک منہبہ کتاب میں لکھی ہے کہ ایک نرس نے اس میں لکھا ہے۔ |
| یشووا کے سچا | میں نے لکھا کہ شبنم نے میرا نام لیا اور پھر وہ دیکھی اور وہ ایک منہبہ کتاب میں لکھی ہے کہ ایک نرس نے اس میں لکھا ہے۔ |
| جہنم کی چاندنی | میں نے لکھا کہ شبنم نے میرا نام لیا اور پھر وہ دیکھی اور وہ ایک منہبہ کتاب میں لکھی ہے کہ ایک نرس نے اس میں لکھا ہے۔ |
| مستانی اپنی | میں نے لکھا کہ شبنم نے میرا نام لیا اور پھر وہ دیکھی اور وہ ایک منہبہ کتاب میں لکھی ہے کہ ایک نرس نے اس میں لکھا ہے۔ |
| کلی کا کفن | میں نے لکھا کہ شبنم نے میرا نام لیا اور پھر وہ دیکھی اور وہ ایک منہبہ کتاب میں لکھی ہے کہ ایک نرس نے اس میں لکھا ہے۔ |

رقم بذریعہ منی آرڈر پیشگی روانہ فرمائیں

پوسٹ بکس 23

کتابیات پبلی کیشنز

کراچی 74200

فون: 5802552-5895313 فیکس: 5802551
kitabiat1970@yahoo.com

پہلی پہلی گنتی ہے۔ اکبر علی خاں کی وجہ سے میں نے ساتھ دیا۔ کھانا خاصا لذیذ تھا مگر لذت بھی تو نشاٹا خاطر سے شروع ہے۔ میں لقمے نوکلتا رہا۔ اکبر علی خاں بھی رسم نبھایا کیے۔ کھانے کے دوران انہیں خیال آیا۔ ”کچھ پیش بندی تو کرنی ہوگی۔“
 ”دو ہی صورتیں ہیں۔“ میں نے سمجھی ہوئی آواز میں کہا۔ ”ایک تو یہ صاحب، کسی طرح جلد سے جلد ٹھیک ہو جائیں۔“ میرا اشارہ مٹھل کی طرف تھا۔

”خدا کرے، آپ کی زبان مبارک ثابت ہو۔“ اکبر علی خاں تڑپ سے گئے۔ ایسی تڑپ جو کسی اپنے ہی میں ممکن ہے۔ ”اور دوسری صورت؟“ انہوں نے بے قراری سے پوچھا۔
 ”دوسری یہی رہ جاتی ہے کہ آپ پہلی فرصت میں تار دے دیں۔“

لقمہ ان کے ہاتھ میں رہ گیا۔ ”ہاں ہاں، بے شک۔ یہ بھی ایک صورت ہے، ان حالات میں نہایت صاحب۔ کاش آپ شام ہی کو ہاں کر دیتے۔“

”اب بھی کتنی دیر ہوئی ہے۔ تار گھر تو ہر وقت کھلا رہتا ہے۔ تار وقت پر مل گیا تو کل رات یا پرسوں صبح تک کوئی نہ کوئی ضرور آ جائے گا۔“
 ”ارجنٹ تار دیا جائے گا۔ رات کو بھی پہنچایا جاتا ہے۔ پھر تو مجھے جلدی کرنی چاہیے۔“
 ”پہلے آپ کھانا تو ختم کر لیں۔“

”میرا ارادہ دیر تک بیٹھنے کا تھا۔ آپ کا دل بھی بہلا رہتا ہے۔ مجھے آنے میں دقت لگ گیا۔ آپ کو معلوم ہے، والدہ بہار ہیں۔ شام کے وقت ان کی طبیعت عموماً بگڑ جاتی ہے۔ آج تو ڈاکٹر کو بلانا پڑا۔“

”پھر تو آپ کو نہیں آنا چاہیے تھا۔“
 ”کیسے نہ آتا۔ وعدہ جو کیا تھا آپ سے۔“
 ”زہرت نے کھانا تیار کر لیا تھا۔ وہ تو بھی آنا چاہتے

تھے۔ میں نے کہا، رات ہو گئی ہے بھی۔ کل چلیں گے۔ سب آپ سے ملنے کے لیے بے تاب تھے۔“
 ”میں تو دوپہر ہی ان سے ملا تھا۔“ میں نے ادا سی سے کہا۔

”اس وقت کی بات اور تھی۔ میں نے جا کے جب بتایا کہ باپ میاں کی ایک ایک بات حرف بہ حرف درست تھی۔ واقعی اپنی کے بھائی اسپتال میں ہیں اور علاج..... علاج تخصیص کے مرحلے میں ہے تو بھی شرمندہ ہوئے۔“

”النا شرمندہ ہوئے۔“ میں نے زہر خند سے کہا۔ ”مجھے تو ان کے سامنے جانے کے خیال ہی سے ندامت ہو رہی ہے۔“

”واہ صاحب، کیسی ندامت۔“ وہ شکرتی لہجے میں بولے۔ ”خبر چھوڑیے۔ یہ بیٹھا لیجیے۔ کھانا تو آپ نے کھایا ہی نہیں۔ زہرت خانم نے یہ صلہ اپنے ہاتھ سے بنایا ہے۔ تجربے کرنی رہتی ہیں۔ کہیں لبنانی صلہ کی ترکیب بڑھ لی..... سچی، بس طبع آزمائی شروع ہو گئی۔“ اکبر علی خاں نے رکابی میں صلہ نکال کے میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے ایک چمچ لیا۔ بہت خوش ذائقہ تھا۔ واقعی نفاست سے تیار کیا گیا تھا۔ ”میری طرف سے شکر یہ ادا کر دیجیے گا۔“ میں نے کہا۔

”کل وہ آئیں گی۔ آپ خود کہہ دیجیے اور ہاں، اگر آپ کہیں تو تار دے کے میں واپس آ جاؤں۔“

”نہیں نہیں۔“ میں نے شدت سے انکار کر دیا۔ ”رات اب بھی زیادہ ہو گئی ہے۔ آپ جا کے آرام کریں۔“

”آپ کو نیند نہیں آئے گی اور صبح پوچھیے تو مجھے بھی نہیں آئے گی۔ خدا آپ کے بھائی کو جلد صحت یاب کر دے۔ گھر میں سبھی نے دعا کی ہے۔ زہرت تو کبہ رہی تھیں، کل محلے کی عورتیں بلا کے آت کریر کا ورد کر دائیں گی۔“

ان سے آج دوپہر ملاقات ہوئی تھی۔ جس طرح برسوں کا تعلق محو میں ختم ہو جاتا ہے، لحوں میں برسوں جیسا تعلق قائم بھی ہو جاتا ہے۔ تعلق خاطر کے لیے وقت کے طول و عرض کی کوئی شرط نہیں۔ کوئی ایک نگاہ بھی ایسی کارگر ہوئی ہے کہ آدمی زندگی وقف کر دے، زندگی سچ دے۔ کبھی زندگی بھر کی رفاقت سے کچھ فرق نہیں پڑتا، آدمی کی تنہائی اور تشنگانی ختم نہیں ہوتی۔

اکبر علی خاں جلد ہی چلے گئے۔ کچھ دیر میں اکیلا باہر بیٹھا رہا۔ تنہائی سے مراد خاموشی نہیں ہے۔ تنہائی میں آدمی خود سے ہم کلام ہوتا ہے۔ مخاطب کو خاموش کیا جا سکتا ہے، اپنے آپ کو نہیں۔ شبنم سے کپڑے رسمانے لگے تو میں نے کمرے کا رخ کیا۔ کمر اسنان تھا۔ میں مٹھل کے بستر پر نہیں گیا۔ اسے اس طرح بے حال دکھ کے میرا ہی ہونے لگتا تھا۔ اپنی اپنی مخصوص آرام کرسی سے اٹھ کے میرے پاس آئی۔ مجھے اندازہ تھا کہ اسے مجھ سے کیا کام ہو سکتا ہے۔ اس نے وہی سوال کیا جس کا جواب میں دینا نہیں جانتا تھا۔ میرے جواب سے اس کی بے چینی وحشت میں بدل جاتی۔ ”کچھ خاص نہیں۔“ میں نے سرسری طور پر کہا۔ ”کچھ شبہ ہو گیا تھا انہیں۔ دور ہو گیا تو چلے گئے۔“

ایسی ایک بردبار عورت تھی، اپنی حدود سے واقف، سو اس نے تجاوز نہیں کیا۔ میں بھی کچھ پوچھنا چاہتا تھا، وہی ایک سوال جو کئی بار میں نے کیا تھا۔ اب پوچھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی لیکن مجھ سے رہنا نہیں گیا۔ میرے عاجزانہ لہجے پر مسکرا پڑی۔

”میں ڈاکٹر نہیں ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے اس کی آواز پر یاسیت غالب آ گئی۔

”نرس بھی آدمی ڈاکٹر ہوتی ہے۔ تمہارا تجربہ بھی کم نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

”کاش میں کچھ بتا سکتی ایک بات ہے۔ مجھے ڈاکٹر رائے پر اعتماد ہے۔ وہ بہت بڑے ڈاکٹر

ہیں۔“ اس نے وثوق سے کہا۔
 ”یہ تو میں کل رات سے سن رہا ہوں۔“
 ”اور کچھ غلط تو نہیں سن رہے۔ یہ تو اچھی بات ہے۔“

”لیکن ڈاکٹر رائے تو کچھ کہتے ہی نہیں۔“
 ”وہ ایک ذمے دار ڈاکٹر ہیں۔“

”لگتا ہے، وہ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں۔“
 ”ڈاکٹر رائے نے غلط نہیں کہا تھا۔ تم ایک

بڑے سنجے ہو۔“ اس کے ہونٹوں پر اس کی خاص مشافقا نہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ میرا کندھا تھپ تھپاتے ہوئے۔ وہ مٹھل کے بستر کی طرف گئی اور کرسی پر بیٹھ کے آنکھیں موند لیں۔ یوں وہ مجھے بھی آرام کی ترغیب دینا چاہتی تھی۔ میں صوفے پر بیٹھا رہا۔ پھر مریض کے ذاتی نگہ دار کے لیے مخصوص بستر پر آ کر دراز ہو گیا۔

مٹھلی آنکھوں کے سامنے موجود افراد، مناظر اور اشیاء، آدمی کے تصور کی بے کرائی محدود کر دیتے ہیں۔ بند آنکھوں کے آگے تو ایک جہاں کھل جاتا ہے۔ پھر کوئی حد اور کوئی حساب نہیں۔ بند آنکھیں تو اور بیٹھا ہو جاتی ہیں۔ آنکھ بند کرتے ہی میرے سامنے کوئی فرد ماہ و سال کھل گئی تھی، اپنی عدالت آپ۔ آپ ہی منصف، آپ ہی مدعی۔ کون سی کوتاہی ہوئی، کس کا حق چھینا گیا، کس سے زیادتی کی گئی۔ یہ کون سے گناہوں کی سزا میں ہیں جو ختم ہی نہیں ہوتیں۔ یا سبب اور فروزاں کو اس کینے سید محمود علی کے چنگل سے چھڑا کوئی جرم تھا کیا؟ انہیں آباد کرنے کی خاطر فیض آباد جانا ضروری تھا۔ وہاں گئے ہوئے وقت بھی خاصا گزر گیا تھا۔ ایک دن عوبلی سے نکلنے کی غلطی کیا ہوئی کہ شہر سے باہر جانے پر پابندی لگا دی گئی اور جب اجازت ملی تو..... جہاں اتنے دن ہو گئے تھے، ایک دو دن فیض آباد میں اور گزرا رہے جاسکتے تھے۔ مٹھل نے زہرت کا خیال کیا نہ عوبلی میں نو وارد فروزاں اور یا سبب

جاسوسی ڈائجسٹ میں سلسلہ از شائع ہونے والی مقبول ترین کہانی

علی یار خان کی سرگزشت

KHAN STATIONERS &
GENERAL STORE
Shop F/890, Bhabra Bazar,
Nishtar Road, Rawalpindi

قیمت فی حصہ: 60 روپے

ڈاک خرچ فی حصہ: 23 روپے

مکمل سیریز منگوانے پر
کاپی قیمت 600 روپے
ڈاک خرچ منوال

فلسطین کی جنگ آزادی میں شامل ایک
پاکستانی جاں ناک قابل فراموش جدوجہد

جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں
جب خون جگر برفاب ہوا

کتابیں
تعمیر
تعمیر
تعمیر

کتاب کی قیمت بذریعہ پیشگی ڈرافٹ، منی آرڈر یا کراسڈ چیک ارسال فرمائیں

کتابیات پبلی کیشنز

پوسٹ بکس 23 کراچی 74200

فون: 5802551-5895313-5802551

kitabiat1970@yahoo.com

راہیلے کے لئے: C-63 فیئر III یکمیشن ڈی ایچ اے میں کورنگی روڈ کراچی 75500

آئی تھی اور ابا جان اسے گھر میں رکھنے پر تیار نہیں تھے، تو مجھے ان کے سامنے سینہ سپر ہو جانا چاہیے تھا۔ وہ کیا کر لیتے، گھر سے نکال دیتے تو بات دوسری تھی۔ سب لوگوں کو چھوڑنے کا اتنا بڑا فیصلہ میں نے کیوں کر لیا۔ میں ابا جان کے پیروں پر سر رکھ کے دہائیاں دیتا تو وہ پتہ بھی سکتے تھے۔ ائی، ائی، کرشاجی، پیرودادا، کانتے، مارنی اور جانے کون کون..... کہتے ہیں، جو گزر گیا، وہ مٹی ہو گیا، آدی ہو یا وقت۔ آج جو موجود ہے اس کی فکر کرنی چاہیے..... مگر آدی کو گزرے ہوئے ماہ و سال سے نجات کہاں ملتی ہے، گزرے ہوئے وقت کی زنجیریں تو اسے جکڑے رہتی ہیں۔ ہر آج، بیٹے ہوئے گل کے خمیر سے اٹھتا ہے اور آدی کو جین لینے نہیں دیتا۔ ائی اور مٹی ہو گئیں پر سامنے تو اب بھی آجاتی ہیں، کرشاجی، پیرودادا، کانتے، مارنی، ان کا بھی یہی ہے، جب دیکھو منہ اٹھائے طے آتے ہیں..... آدی مٹی ہو جاتا ہے، نقش تو مٹی نہیں ہوتے۔ نقش تو اس وقت تک محفوظ رہتے ہیں جب تک نقش محفوظ رکھنے والا یہی مٹی نہ ہو جائے۔ کاش زندگی بہت مختصر ہوا کرتی، ایک دن، دو دن، ایک مل، دو مل۔ انجام تو ایک ہی ہے۔ وقت زیادہ ملے یا کم پر یہ زیادہ وقت کی زندگی تو بڑی عذاب ہے۔

یکایک ایک ہوک سی اٹھی۔ میں بستر پر اٹھ کے بیٹھ گیا۔ سینہ جیسے کوئی دھتک رہا تھا۔ کمرے میں پرانے نام روشنی تھی۔ ایسی آرام کرسی پر نیم دراز تھی۔ ٹھنڈے سے معمول بے خبر تھا۔ میں نے کمرے پر نظر ڈالی۔ ہر چیز ٹھہری ہوئی، جوں کی توں تھی۔ ایسی نے دروازہ بند کر دیا تھا۔ میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ ایسی کے منتشر ہوجانے کے خیال سے میں نے اٹھ کے پانی پینے کا ارادہ ملتوی کیا اور دوبارہ بستر پر لیٹ گیا۔

اس وقت دروازے پر دستک کا شبہ ہوا۔ نیم خوابیدہ ایسی مجھ سے پہلے چونک پڑی۔ اس نے

کا۔ حویلی کے ہر کیمین کی یہی خواہش تھی کہ ابھی چند دن اور ہم ان کے پاس رہیں۔ جب ہم رخصت ہو رہے تھے، سب کی آنکھیں بھری ہوئی تھیں۔ میں نہ ہوتا تو ٹھنڈے رک جاتا، میں نہ ہوتا تو ٹھنڈے نہیں جاتا ہی کیوں۔ وہ تو اتنی عزیز ازجان، اپنی بیٹی زریں کے پاس ہی رہتا۔ زریں میں تو اس کی جان لگی ہوئی ہے۔ ٹھنڈے رک جاتا لیکن میں جو ایک مسلسل مطالبہ، مستقل تقاضا، اس کے سامنے کھڑا تھا۔ روز ہزاروں ریل گاڑیاں ادھر سے ادھر جاتی ہیں۔ اسی دن ہمیں روانہ ہونا اور اسی گاڑی سے سفر کرنا تھا جس کا انجن آگے جا کے خراب ہو جانا تھا اور یہاں پٹنا شہر میں ہوا چھین گیا تھا تو اس غاصب کے تعاقب کا گناہ کیوں مجھ سے سرزد ہو گیا۔ ایک غلطی کے بعد دوسری غلطی۔ کہتے ہیں، سارا ہاتھ آسان کے تپور پر ہے۔ کوئی مصلحت، کوئی اس کی رجز ہوئی ہے۔ آسان کا یہی طور ہے تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔ آسان کی نظر میں یہ لغزشیں ہیں تو آدی سے ہوتی رہیں گی۔ اب تو ہر بات پر شبہ، ہر قدم پر کسی خطا کا گمان ہوتا ہے۔ کیا معلوم، کون پیچھے سے پھرا گھونپ دے، کچھ کا منہ کھول دے۔ کتنے کون سی بات بری لگ جائے، کون سا راستہ کب بند ہو جائے۔ کوئی امتحان ہے یہ.....؟ تو کیسا امتحان ہے جو ختم نہیں ہوتا۔ امتحان ہی میں آدی تمام ہو جاتا ہے کیا!

میں کروٹیں بدلتا رہا، ایک کے بعد ایک منظر۔ ہوا میں رکھی کتاب کے ورق جیسے پلٹتے جاتے ہیں۔ کہاں سے کہاں تک، کتنے گلے کوچے، کتنے چہرے، کیسے کیسے لوگ، مز کے پیچھے دیکھو تو دماغ پھٹ جائے۔ کتنے لوگ لپیٹ میں آ گئے۔ کہتے ہیں، آدی کے ختم ہو جانے کے بہانے بن جاتے ہیں۔ بہانہ پھر کس کا ہوا؟ اس رات نہ میں اپنا گھر چھوڑ کے کورا کے ساتھ نکل جانے کا ارادہ کرتا نہ اتنے لوگوں کا بہانہ بنتا۔ اب تو کوئی شاری نہیں۔ کورا اپنا لینے گھر

بے کلمی سے میری طرف دیکھا۔ لکڑی کے اونچے اور چوڑے دروازے کے بالائی حصے میں چھوٹے چھوٹے چوکور خانے شیشے کے تھے۔ ایک نے پردہ کھینچ دیا تھا۔ باہر کا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ دروازے کے قریب ہی تھی۔ دروازہ کھولنے کے بجائے گھبرائی ہوئی آواز میں اس نے انگریزی میں پوچھا۔ ”کون ہے؟“

جواب میں ایک دو لمحے خاموشی رہی پھر کسی نے بے رٹلی سے کہا۔ ”باہر صاحب کے کچھ مہمان آوت ہیں۔ ان کو باہر بھیج دیو۔“

میں بستر سے اچھل کے دروازے پر پہنچ گیا۔ میں نے آواز پہچاننے کی کوشش کی۔ بیک وقت بہت سے شکوک ذہن میں اٹھے۔ اشارے سے میں نے ایسی کو اپنے بارے میں کچھ جاننے سے منع کیا۔

دروازے سے ہٹ کے ایسی کچھ فاصلے پر کھڑکی کی جانب چلی گئی۔ کھڑکی پر باریک جالی نصب تھی۔ اندر عام دروازے کی طرح لکڑی اور شیشے کے پت تھے۔ تازہ ہوا کے لیے ایک پت کھلا ہوا تھا لیکن کھڑکی پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ میں آڑ میں ہو گیا۔ ایسی نے پردہ ذرا سا کھسکا یا۔ ”باہر سب ادھرنا ہیں ہے۔“ ایسی نے پہلے انگریزی پھر ہندوستانی میں جواب دیا۔

”سب کدھر گئے ہیں؟“ باہر سے کسی نے پنجابی آواز میں پوچھا۔

”وہ ادھرنا ہیں ہے۔“ ایسی نے بہ ظاہر بے اعتنائی سے کہا۔ ”ہول گیا ہے۔“

”ہول۔ کون سا ہول؟“ یہ آواز پہلے سے مختلف تھی اور لکڑی ہوئی تھی۔

”اپنے کو؟“ میں معلوم، رات ادھر ہی ریٹ کرے گا۔ سویرے آنے کو بولتا ہے۔“ ایسی نے اس بار کسی جھجک کے بغیر پوچھا۔ ”آپ کون ہے؟“ ابھی ایسی نے اتنا کہا تھا کہ راہ داری میں دور

سے کہیں بھاگتے قدموں کی جا پیں گونجیں اور بھنائی سرگوشیاں۔ چاپوں اور سرگوشیوں کا ملا جلا شور قریب ہوا اور ایسی تیزی سے دروازے سے دور ہوتا گیا۔

ایسی لکڑی کے پاس کھڑی رہی۔ کچھ ہی دیر میں سناٹا چھا گیا۔

ایسی نے کھڑکی کا پردہ ٹھیک کیا۔ میں بھی آڑ سے ہٹ کے صوفے پر چلا آیا۔ اتنی رات گئے آنے والے میری تلاش میں آئے تھے۔ یہی ہو سکتا تھا کہ انہیں اسپتال میں داخل ہوتے ہوئے اسپتال کے عملے اور دربانوں نے نہیں دیکھ لیا تھا اور ان کا تعاقب شروع کر دیا تھا۔ میری جستجو میں آنے والے ہمارے کمرے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے لیکن انہیں زیادہ در دروازے پر ٹٹنے کا موقع نہ مل سکا۔ راہ داری میں اسپتال کے دربانوں اور محافظوں کے سر پہ پہنچ جانے کی وجہ سے وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ یہی کچھ ہو سکتا ہے۔

میرا جسم ڈھیر ہو گیا تھا۔ سانس لینے اور کچھ سوچنے سے پہلے ایسی کے سوالوں کے جواب کے لیے مجھے تیار ہو جانا چاہیے تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ مجھے بھی اپنے آپ کو جواب دہی کی بہت بے یقینی ہے۔ ایسی پختہ عمر عورت تھی، اپنے کام میں طاق، بے اعتماد لہجے میں بات کرتی تھی، اپنے کام اور اپنی ذات پر اسے بہت اعتماد تھا۔ اس وقت اس کا حال مختلف تھا۔ بے گانہ نگاہوں سے مجھے دیکھا کہ میرے سر پر سیٹنگ نکل آئے ہوں جیسے۔ وہ سیدھی میرے پاس آئی اور سامنے کے صوفے پر بیٹھ گئی۔ ”کون تھے یہ؟“ اس نے دھڑکتی آواز میں پوچھا۔

جواب آسان نہیں تھا۔ رات کو دو پولیس افسروں کی غیر متوقع آمد کے بارے میں اسے کس طرح مطمئن کر دیا تھا لیکن اب میں اسے کیا بتاؤں گا۔ تک سارے اسپتال میں گردش کرنے والی چ

میکوٹیوں کے خیال سے میرے حواس کام نہیں کر رہے تھے۔ بہت کچھ ایسی پر منحصر تھا کہ وہ اپنی زبان کس حد تک کھولتی ہے۔ ڈاکٹر رائے اور اسپتال کے پتھنیں کو کیا کچھ بتاتی ہے۔ رات ہی ڈاکٹر رائے پولیس افسروں کی آمد کی اطلاع پر کھٹک گیا تھا۔ اب اسے میرے اور شعل کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے میں کیا دشواری ہوگی۔ وہ ایک سخت مزاج شخص ہے۔ اس کی بدگمانی اور برہمی.... مشکل صورت حال سے دو جا کر سکتی ہے۔

”کیا بات ہے؟“ نرس ایسی سرا سبتگی سے بولی۔ ”کون تھے یہ؟“

میں نے آنکھیں میچ لیں اور چنچنی آواز میں کہا۔ ”مجھے نہیں معلوم.... لیکن وہ میرا ہی نام لے رہے تھے اور میری تلاش میں آئے تھے۔“

ایسی کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔

”میں نہیں بتانا نہیں چاہتا تھا کہ اس لیے کہ تمہارا کوئی واسطہ نہیں تھا۔“ میں نے آسان بیچ کرنے کی کوشش کی۔ ”لیکن وہ یہاں تک آ گئے۔ تم یقین کرو یا نہ کرو لیکن اب تمہیں بتانا ہی پڑے گا کہ کل رات سے اب تک میرے ساتھ کیا کچھ ہوا تھا۔ یہ ہے۔ کل رات سے پہلے اس شہر میں مجھے کوئی نہیں جانتا تھا۔ ہمیں یہاں آنا ہی نہیں تھا مگر بھائی کی حالت کی وجہ سے آگے سفر جاری رکھنا ممکن نہیں رہا تھا۔“

شاید یہی مناسب تھا کہ میں اس سے کچھ نہ چھپاؤں اور میں نے کچھ نہیں چھپایا۔ میں نے اس قدر اختصار در رکھا کہ اسے میرے بیان میں کوئی گروہ اور پیچیدگی محسوس نہ ہو۔ سیاق و سباق کے بغیر اس سادہ شعاری نظر میں ہی عرض حال ناممکن ہوتا۔ وہ درمیان میں نہیں بولی، ایک بار میری آواز بیٹھ گئی تو اس نے اٹھ کے مجھے ہائی پایا اور مبہوت انداز میں سٹی رہی۔ اس نے وہی سنا جو میں نے کہا تھا اور وہی سمجھا جو میں چاہتا تھا کیوں کہ وہی سچ تھا اور

کیوں کہ وہ ایک نیک دل خاتون تھی۔ میں چپ ہوا تو وہ آد ب دیدہ ہوئی۔

”ہم کوئی چوراہے تک نہیں ہیں۔ ہم نے کسی کا حق غصب نہیں کیا۔ بھائی کی حالت تمہیں معلوم ہے۔ ایسے میں کون کسی جھڑپے منٹے میں پڑنا چاہے گا۔ پانچ ہی ہوگا کوئی۔“ میری آواز رندہ سننے لگی۔

”یہ سارا کچھ ناقابل یقین سا ہے۔ ایسے برے، بے ایمان اور بد معاش لوگ رہتے ہیں اس شہر میں۔“ وہ حیرانی سے بولی۔ ”اور.... اور یہ، یہ لوگ کیا کرنے آئے تھے؟“

”ظاہر ہے، ایک ہی بات ہو سکتی ہے۔“ میں نے کہا۔

”یعنی وہ تمہیں.... تمہیں.... اس نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے اور آنکھیں بند کر لیں۔“ وہ میرے خدا....

”ان کی آواز پر میں باہر نکل جاتا، اگر ان سے پہلے وہ پولیس افسر نہیں آتے۔ پولیس افسروں کی آمد کے بعد مجھے چوکنٹا ہو جانا چاہیے تھا۔“

”اوہ، اوہ....“ اسے جھرجھری آ گئی۔ ”یعنی وہ پولیس افسر جو تم سے ہم دردی جتانے آئے تھے، یہ ایسی کے آدمی تھے۔“

”ہو سکتا ہے۔ وہ میدا کو بری طرح گالیاں دے رہے تھے۔ وہ میدا کے فرستادہ بھی ہو سکتے ہیں۔ انہوں نے سارا مکمل وقوع دیکھ لیا تھا۔ اسپتال کے اس حصے میں ویسے بھی سناٹا ہوتا ہے۔ اتنی رات گئے تو انہیں یہ سب کچھ بہت آسان معلوم ہوا ہوگا۔ کچھ مجھ سے بھی غلطی ہوئی۔ پولیس افسروں کی زبانی میدا کے ارادوں کا سن کے میں نے کہا کہ پھر تو مجھے کل سویرے سورج نکلنے ہی میدا کے اڈے کا رخ کرنا چاہیے لیکن صرف غصہ ہی نہیں، یہ جتانے سے مقصد کچھ اور بھی تھا۔ پولیس افسروں کے سامنے اپنے عزم کی پختگی کا اظہار بھی مقصود تھا۔ یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ ان پولیس افسروں کا کوئی ہاتھ نہ ہو۔ جیسا کہ

انہوں نے خدشہ ظاہر کیا تھا۔ چاقو بدلنے کی رسم ادا کر کے میدا نے سر پہ منڈا لانا خطرہ نالا ہے۔ اب اسے میرا کام تمام کرنے میں جلدی کرنا چاہیے۔ دھوا کے جنونی ساتھیوں کے غم و غصہ کا جواز تو موجود ہی ہے۔ دربانوں نے انہیں دیکھ لیا اور ادھر میں کمرے سے باہر نہیں نکلا۔ میں نے ایسی کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے میرے کچھ کبے بغیر کمرے میں میری موجودی سے انکار کر دیا۔ ہو سکتا ہے، انہیں یقین آ گیا ہو اور وہ مایوس لوٹا چاہتے ہوں کہ تعاقب میں آنے والوں نے انہیں اور بوکھلا دیا۔

”مجھے کچھ شبہ ہو گیا تھا۔“ ایسی کی آواز ہانپ رہی تھی، کہنے لگی ”رات وہ پولیس والے آئے تھے، پھر رات گئے، اتنی رات گئے تمہیں پوچھتے ہوئے ان لوگوں کی آمد پر میرا ہاتھ ٹھکا کہ نہیں کوئی گزرتا ہے۔ تم جانتے ہو گے کہ ان خاص الخاص کمروں کے ہر کمرے سے ملحق نرس کا ایک چھوٹا کمرہ بھی ہوتا ہے۔ رات بھر نرس وہیں رہتی ہے اور وقفے وقفے سے مریض کو دیکھنے آتی رہتی ہے۔ ضرورت پڑنے پر مریض اور اس کا سامی تیار دار بھی کھینٹی بجاکے اسے طلب کر سکتا ہے۔ گزشتہ رات میں اپنے کمرے میں تھی اور شاید تین چار مرتبہ مریض کا معائنہ کرنے آئی تھی۔ آج ڈاکٹر رائے نے خاص طور پر مجھے مریض کے کمرے میں رہنے کی ہدایت کی تھی۔ انہوں نے نیند آور دواؤں میں کمی کی تھی اور مریض کا رد عمل دیکھنے کے لیے میرا اس کے پاس رہنا ضروری تھا۔ عموماً رات کو ہم کمروں میں چینی نہیں لگاتے۔ یہ ایک بڑی محفوظ جگہ ہے۔ ایسی واردات کا تو یہاں کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ دوسرے کسی انتہائی اہم ضرورت میں چینی کھلوانے میں وقت صرف ہونے کا بھی احتمال رہتا ہے۔ لیکن چونکہ آج رات میرا قیام اسی کمرے میں تھا، میں نے چینی لگا دی۔ میں کہہ نہیں سکتی، کیوں؟ شاید اس لیے کہ تمہارے پاس آنے والے پولیس افسر دیکھ

کے میرے چھٹی حس بیدار ہو گئی تھی..... اور یہ لوگ آگئے۔ انہوں نے دروازہ کھول کے اندر آنے کی کوشش کے بجائے دستک دینا مناسب سمجھا۔ وہ خود بھی گھبرائے ہوئے ہوں گے۔ دروازہ کھلا ہوتا اور وہ دھکا دے کے اندر داخل ہو جاتے اور اگر میں نہ ہوتی، کمرے میں صرف تم ہوتے اور اگر ہم دونوں بھی ہوتے تو.....“ ایسی کا جسم لرز گیا۔ اس نے جلدی سے سینے پر کراس بنایا اور خوف زدگی سے بولی۔ ”خداوند نے ہم سب پر رحم کر لیا۔“

”ہاں میں نے کھلی کھلی آواز میں اقرار کیا۔“ پھر تو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔“

اس کے ہم درد اندرونی سے مجھے حوصلہ ہوا۔ اسی لیے میں نے سیاق و سباق کے ساتھ سارا احوال اس کی جناب میں کہہ دیا ضروری جانا تھا۔ اب میں اس سے گزارش کر سکتا تھا۔ میں نے کہا۔ ”سسر! تم ڈاکٹر رائے کو کچھ نہ بتاؤ تو بہتر ہوگا۔ کیا ضرورت ہے، انہیں بتایا جائے کہ وہ لوگ ہمارے کمرے پر آئے تھے۔“

”تھر..... مگر ان کا تعاقب کرنے والے دربانوں نے انہیں ہمارے کمرے پر نہیں لے گئے۔“

”مگر..... مگر ان کا تعاقب کرنے والے ضرور دیکھ لیا ہوگا۔“ وہ ہچکچا کے بولی۔

”امکان یہی ہے، نہیں دیکھا ہوگا۔ ہمارے کمرے کے دروازے پر موجود لوگ، دربانوں کی بلند ہوتی ہوئی چاقوں پر بھاگ کھڑے ہوں گے۔ انہوں نے پھر کوئی کوشش نہیں گنویا ہوگا۔“ میں نے ایسی کو قائل کرنے کی کوشش کی اور کئی لہجے میں کہا۔ ”سسر! ڈاکٹر رائے کے مزاج سے تم واقف ہو۔ جانے وہ ہمیں کیا سمجھیں۔ مفرور، جرائم پیشہ، کیا کیا۔ کوئی اتنی سیدھی بات ان کے دماغ میں آئی تو ہم کیسی مصیبت میں پڑ سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے، اسپتال سے نکل جانے کا حکم دے دیں۔ پھر ہم کہاں کہاں بھاگتے پھریں گے، کون سے اسپتال کا رخ کریں گے۔ بھائی کی حالت اس در بدری کی

متحمل ہو سکتی ہے؟ یہ تم بہتر جانتی ہو۔ بھائی کی صحت یابی کے بعد تم جو چاہو، ان سے کہہ دینا۔“

وہ چپ ہو گئی اور گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

”تم نراکت سمجھ رہی ہو؟“ میں نے عاجزی سے کہا۔

وہ گہری سانس بھر کے رہ گئی۔

میں نے پھر اس سے اصرار نہیں کیا۔ بہت دیر خاموشی کے بعد وہ ہڑبڑا کے بولی۔ ”لیکن ناکام ہو جانے کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ وہ شیطان دوبارہ یہاں نہیں آئیں گے۔“

”اکبر علی خاں کے ذریعے میں نے تار دلوادیا ہے۔ کل رات یا پرسوں صبح تک کوئی نہ کوئی ضرور آجائے گا۔“

”پھر کیا ہوگا؟“

”پھر میں انہیں دیکھ لوں گا۔“

”کیا..... کیا دیکھ لوں گے؟“

”اس عرصے میں بہت محتاط رہنا ہوگا۔“ مجھے خیال آیا اور میں نے بات بدل کے کہا۔ ”اس دوران ہم خود بھی پولیس کی مدد لے سکتے ہیں۔ وہ پولیس والے، اگر واقعی میدا کے آدمی نہیں تھے تو جیسا کہ انہوں نے کہا تھا، روپے پیسے کے عوض میرے لیے سیر کا کام کر سکتے ہیں اور اب امید یہی ہے، اس ناکامی کے بعد دو ایک دن تو کوئی بھی اسپتال آنے کی جرأت نہیں کر پائے گا۔ وہ خود بھی ہوشیار ہو جائیگا اور کیا عجب ہے، اس دوران بھائی ٹھیک ہو جائیں۔ مجھے تو پہلے ان کی فکر ہے، ان کی طرف سے ذرا سکون ہوتا دیکھنا۔ میں انہیں دیکھ لوں گا۔ ایسا اندھیر ہوتا نہیں کہیں۔“ میں نے ٹھٹھل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”انہوں نے مجھے کسی کام کا نہیں..... میری آواز حلق میں گھٹ گئی۔

”اوسے، اوسے، سب ٹھیک ہو جائے گا، خدا پر بھروسہ رکھو۔“ ایسی، وہ غم گسار خاتون، سانسے کے سونسنے سے اٹھ کے اٹھتے ہوئے میرے پاس

آگئی اور میرا سراپتی آغوش میں لے لیا۔ ”سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم ایک ہمت والے لوبوان ہو، اور مرد..... مرد روئے نہیں۔ یہ کام تو ہمارا ہے۔ ہم عورتوں کا۔“ وہ میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی اور خود اس کی آواز پھٹکنے لگی۔ میں سسکیاں بھرنے لگا۔

باقی رات بھی آنکھوں میں کٹ گئی تھی۔ جیسے ہی سورج طلوع ہونے کے آثار ہوئے، ایسی کو بتائے بغیر میں کمرے سے نکل گیا اور سن گن لینے کے لیے راہ داری سے آگے چلا گیا۔ سارا اسپتال جاگ رہا تھا۔ صفائی کرنے والے خاک روپ کو کمرے کی طرف بڑھتا دیکھ کے میں فوراً ہی واپس آ گیا۔ خاک روپ کو آج اپنے کام سے زیادہ رات ہونے والی واردات سے ایسی کو خبر کرنے کی فکر تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے پھٹی آنکھوں اور پھٹی پھٹی آواز میں ایسی کو بتایا کہ رات اسپتال میں ڈاکٹر آئے تھے۔ ان کے چہرے ڈھانوں سے چھپے ہوئے تھے۔ تعداد میں چار پانچ ہوں گے یا اس سے زیادہ۔ اسپتال کے عام دروازے سے داخل ہونے میں انہیں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ ان خاص کمروں کے حصے پر تعینات بوڑھے دربان کو انہوں نے چند ضربوں سے ادھ موا کر دیا لیکن رات کی ڈیوٹی پر موجود اسپتال کے ملازمین میں سے کسی نے انہیں دیکھ کے شور مچایا اور تعاقب شروع کر دیا۔ کئی اور ملازم بھی اس کے ساتھ ہو گئے۔ ڈاکٹر پہلے تو ادھر ادھر چھپتے پھرے اور کوئی راستہ نہ دیکھ کے انہوں نے واپس ہو جانے میں عافیت سمجھی۔ وہ بے تحاشا بھاگ رہے تھے۔ انتھونی نامی اسپتال کا ایک لوبوان ملازم تاک لگائے بیٹھا تھا۔ اس نے اوٹ سے نکل کے کسی کے سر پر لاشی ماری اور اسے دبوچ لیا۔ ڈاکو نے اس کے پیٹ میں پھرا گھونپ کے جان چھڑائی۔ زخمی انتھونی نے آدھ گھنٹے میں دم توڑ دیا۔ ڈاکو نے جس بوڑھے دربان کو مارا پیتا تھا،

اس کی حالت بھی نازک ہے۔ پولیس آچھی ہے اور گفتیش کر رہی ہے۔

ایک نے میری طرف دیکھا اور کچھ نہیں بولی۔ میرے اور ایک کے لیے ناشتہ لانے اور کمرے میں نولے چادریں وغیرہ بدلنے والے ملازمین نے بھی کم و بیش یہی رواداد برائی۔ مبالغہ بہ تدریج نمودار ہوتا ہے۔ حاشیہ آرائی اور خلتی کے لیے انہیں وقت ہی کتنا ملا تھا۔ شکر ہے، ان میں سے کسی کو معلوم نہیں تھا کہ، ان کے بہ قول ڈاکو، ہمارے کمرے کے دروازے پر آکے ٹھہرے تھے۔

مجھے شدت سے ڈاکٹر رائے کا انتظار تھا۔ وہ کسی قدر تاخیر سے آیا۔ اس کا چہرہ سگ رہا تھا۔ میرے سلام کا جواب اس نے سر کی جنبش سے دیا اور کوئی بات نہیں کی۔ میں نے بھی اس کے نزدیک جانے سے پہلو تھکی کی۔ اس کے ساتھ دو اور ڈاکٹر تھے۔ ان تینوں اور ایک نے شعل کے بستر کا محاصرہ کر لیا تھا۔ میں دور کھڑا دیکھتا رہا۔ انہوں نے خاصا وقت لیا پھر نرس کو ہدایات دے کے ڈاکٹر رائے میری جانب پلٹا۔ اس کے سامنے آجانے پر میرا جسم غیر ارادی طور پر تن گیا۔ کچھ بہتر علاقے ہیں، شاید آپریشن کی ضرورت نہ پڑے۔“ اس نے

بھاری آواز میں مزہ دہ سنایا اور کہنے لگا۔ ”لیکن اصل فیصلہ دوپہر پور نہیں آنے پر کیا جائے گا۔“

پرسوں رات سے اب پہلی بار ڈاکٹر رائے کے منہ سے کوئی امید افزا بات سنی تھی۔ میرے ہونٹ کھپکھپانے لگے اور مجھ سے کچھ کہنا نہ جا سکا۔

”رات وہ پولیس والے کیوں آئے تھے؟“ اس نے دھمکتی آواز میں پوچھا۔

”ایسے ہی بس..... کوئی خاص بات نہیں۔ آپ فکر مند نہ ہوں۔ انہیں..... نہیں کچھ شبہ ہو گیا تھا۔“ میں نے بے تعلقی اور بے پروائی کا اظہار کیا۔

”کیسا شبہ؟“ وہ چونک کے بولا۔ ”کوئی اور بات تو نہیں۔“

”اور کیا بات ہوتی۔“ میں نے کسماس کے کہا۔

”میں نے آپ سے کہا تھا، میں آپ سے کچھ نہیں پھپھایاں گا۔“

نرس ایک بھی قریب کھڑی سن رہی تھی۔ ”تمہیں معلوم ہے، رات اسپتال میں کیا ہوا؟“ ڈاکٹر بکڑے تپوروں سے بولا۔

”سنا تو ہے کچھ.....“ میں نے پھکی مسکراہٹ سے کہا۔

”یہاں پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا۔“

”جواب تک نہ ہو سکا، ضروری تو نہیں کہ آئندہ بھی نہ ہو۔“ میں نے بددلتے ہوئے کہا۔

”یہ بہت سنگین معاملہ ہے۔“ ڈاکٹر رائے چپتی آواز میں بولا۔ ”پولیس آگئی ہے۔ مجھے ان سے ملنا ہے۔ تم سے دوپہر کو بات ہوگی۔“ چلتے چلتے وہ رک گیا۔ اس نے ساتھ کھڑے ہوئے معاون ڈاکٹروں کو آگے جانے کا اشارہ کیا۔ نرس ایک کے دور ہو جانے کے بعد وہ دیکھے لہجے میں بولا۔ ”اگر وہ ڈاکو تھے تو اسپتال میں ان کا کیا کام۔ یہاں سے انہیں کیال سکتا تھا؟“

”ہاں۔ لیکن، ممکن ہے، انہیں کسی آدمی کی تلاش ہو۔“ میرے منہ سے نکل گیا۔

”آدمی؟“ وہ اچک کے بولا ”آدمی کی کیوں؟“

”آپ کہہ رہے ہیں نا.....“ میں نے اپنی زبان کی لغزش کی تلافی کرنا چاہی۔ ”انہیں یہاں روپیہ پٹیا تو نہیں مل سکتا تھا۔“

وہ ٹھوسا گیا پھر چپتی آواز میں بولا ”تمہارے پاس کوئی بڑی رقم یا کوئی اور قیمتی چیز تو نہیں؟“

میں نے تعجب سے اسے دیکھا۔ ”ٹھوڑی بہت تو ہے۔“

”کل دوپہر تم کہاں کہاں گئے تھے؟“

”پہلے گراؤنڈ ہوٹل پھر تار دینے کے لیے بڑے ڈاک خانے۔“ میں نے ہچکچکی کے کہا۔ بعد کی

مصرفیات کا میں اسے کیا بتاتا۔

”کہیں اور تو نہیں۔ یاد کرو، تم یہاں بہت دیر سے آئے تھے، غالباً شام کے وقت؟“

”آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟“

”مطلب ہے، کہیں تم نے کسی سے اپنے پاس موجود رقم کا ذکر تو نہیں کیا۔ ذرا سوچو، کس کس سے ملے تھے تم؟“

”کسی سے نہیں لیکن..... لیکن ہاں۔ میں نے احتیاطاً ایک معقول رقم ہوٹل میں جمع کرائی تھی۔ یہ رقم بھائی کے کپڑے بدلتے وقت ان کی جیب سے نکلی تھی۔ سفر میں عموماً بھائی اچھی رقم ساتھ لے کے چلتے ہیں۔“

”ہوٹل والوں نے تمہیں کوئی رسید دی تھی؟“

”جی، جی ہاں۔“ میں نے جیب ٹولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ رقم ہوٹل میں ہے تو پھر.....“ وہ سوچ میں پڑ گیا۔

”آپ کیا سمجھ رہے ہیں؟“ میں نے تذبذب سے پوچھا۔

”تم کہتے ہو، تمہیں اس شہر میں کوئی نہیں جانتا۔“

”جی ہاں، بس کل اتفاقاً ایک صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ ان کا نام اکبر علی خاں ہے۔ وکیل ہیں اور یہاں کسی کانج میں قانون پڑھاتے ہیں۔ وہ تمہاری عمرہ آدمی ہیں۔ شاید آتے ہوں انہیں۔ رات بھی آئے تھے، گھر سے کھانا لے کے۔ پولیس والوں سے رات ان کی ملاقات بھی ہوئی تھی۔“

مجھے یاد آیا، کل شام ڈاکٹر رائے شعل کو دیکھنے آیا تھا تو اکبر علی خاں موجود تھے۔ میں نے کہا۔ ”وہی صاحب جو کل شام کمرے میں میرے ساتھ تھے۔ شاید آپ بھول گئے۔“

”رات کو جو پولیس والے آئے تھے، تمہیں بتائیں ہے وہ پولیس والے ہی تھے؟“

”انہوں نے شناخت نامے دکھائے تھے۔“

”تم نے دیکھے تھے؟“

”نہیں، انہوں نے جیب سے نکالے تو میں مطمئن ہو گیا۔“

”دیکھے نہیں۔“

”ہاں، دیکھے تو نہیں مگر آپ.....؟“

”وہ کوئی اور بھی ہو سکتے ہیں، بہرہ ہے۔“

میری وضاحت سے پہلے اس نے قیاس آرائی کی۔ ”ناز بھائی نے آئے ہوں، ہو سکتا ہے بعد کو رات گئے آنے والوں کا ان سے کوئی تعلق ہو۔“

میں نے کوئی رائے ظاہر نہیں کی۔ میرے لیے چپ ہو جانا ہی بہتر تھا۔ تاہم یہ بھی کہ جس سچ پر ڈاکٹر رائے سوچ رہا ہے، میں اسے ہمبیز کر دوں۔ تیرہ دیک کے لیے ایک جنت لازم ہو جاتی۔ مجھے حیرت تھی، اس نے کسی طرح تال میل پیدا کر لیا کہ رات کو آنے والے نہیں میری جستجو میں نہ آئے ہوں۔ ڈاکٹر رائے کو تو پولیس میں ہونا چاہیے تھا۔

”ٹھیک ہے۔“ اس کے ہونٹ پھیل گئے۔

”دیکھتے ہیں۔“ اس نے اچھے ہوئے لہجے میں کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

اس کے جاتے ہی میں لپک کے چند قدم کے فاصلے پر موجود ایک کے پاس پہنچا اور اس سے ممنونیت کا اظہار کرنا چاہا لیکن وہ کھڑکی کھڑکی ہی نظر آ رہی تھی۔ مجھے شک ہوا، رات دروازے پر دستک دینے والے حملہ آوروں کے بارے میں اپنے دیرینہ رفیق کار ڈاکٹر رائے کو بے خبر رکھنے کے تاحسف اور ندامت سے زیر بار نہ ہو۔ مجھے کچھ پوچھنے ہوئے جھومک ہوئی۔ ”اب پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔“ میں نے اس کی دل جوئی کے لیے کہا۔ ”تم نے سن لیا سسر ڈاکٹر صاحب کیا کہہ رہے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ بھائی کی حالت میں بہتری نظر آرہی ہے۔ اور، اور شاید آپریشن کی ضرورت نہ پڑے۔“

میری کوشش کارگر ہوئی۔ ایسی کا بھجا ہوا چہرہ کھل اٹھا۔ ”ہاں، وہ پر امید نظر آ رہے تھے۔“

”تم سے بھی کچھ کہا؟“ میں نے بے چینی سے پوچھا۔

”ڈاکٹر رائے قبل از وقت بڑی بات نہیں کرتے۔“

”اب تک انہوں نے ایک لفظ اطمینان کا نہیں کہا تھا۔ تمہیں کیا بتاؤں سسر! ڈاکٹر صاحب کی زبانی اتنا سننے کے لیے مجھ پر کیا عالم گزرے ہیں۔“

”بس اب ساری دھند چھٹ جائے گی، ساری رکاوٹیں دور ہو جائیں گی، دیکھنا۔“

میری آواز میرے قابو میں نہیں رہی۔ میں نے تیزی سے ایسی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں جکڑ لیا اور سینے سے لگا کے کہا۔ ”تم نے بہت احسان کیا ہے مجھ پر۔“

مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ ”تم آدھے باکل ہو۔“ وہ ہنس پڑی۔ ”تم منع نہیں کرتے تو بھی میں سوچ سمجھ کے زبان کھولتی اور دیکھو..... یہ شکر یہ اب مت ادا کرنا..... یہ اتفاق ہے کہ اسپتال کا کوئی آدمی ان لوگوں کو ہمارے کمرے کے دروازے پر کھڑے ہوئے نہ دیکھ سکا اور نہ میری خاموشی سے بھی کیا ہوتا۔“

میں نے کئی بار اس کا ہاتھ چوما، آنکھوں سے لگا لیا۔ مجھے اپنا وجود اب بہت ہلکا سا لگ رہا تھا۔ نرس سیورین کے آجانے پر مجھے دعا میں دیتی ہوئی ایسی رخصت ہو گئی۔ اس دوران میں تین چار مرتبہ نھل کے بستر کی جانب گیا اور ہر مرتبہ اس کی بے آزاری کے خیال سے میں نے اسے آواز نہیں دی۔

ٹھیک گیارہ بجے اکبر علی خاں آ گئے۔ میں نے سب سے پہلے انہیں یہی نوید سنائی کہ ڈاکٹر رائے نے صبح کے معائنے میں نھل کے لیے کہا ہے۔ ان کی آنکھیں بھی چمکنے لگیں۔ انہوں نے بتایا کہ رات یہاں سے جاتے ہی انہوں نے کلکتے تاروے

دیا تھا، ارجنٹ تار۔ عملے سے مستعدی کی درخواست بھی کر دی تھی پھر صبح احتیاطاً یہاں آنے سے پہلے ایک اور تار روانہ کر دیا ہے۔

سیورین کمرے میں تھی۔ میں اکبر علی خاں کو رواداری میں لے آیا اور میں نے رات کا سارا واقعہ انہیں سنایا تو وہ ہکا بکا رہ گئے۔ انہیں یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ میں سچ بول رہا ہوں۔ پھر میں نے ڈاکٹر رائے کے بارے میں انہیں بتایا کہ صبح اس کے سوال و جواب کی ایک آزمائش سے میں کس طرح گزرا ہوں۔ ڈاکٹر رائے پھر اس امکان پر اٹک گیا کہ رات آنے والے پولیس افسر اور ان کے بعد آنے والے حملہ آوروں میں کوئی تعلق بھی ہو سکتا ہے۔

یہ سن کے اکبر علی خاں ہم سم سے ہو گئے۔ وہ بہر حال ایک وکیل تھے۔ کتنے چینی روز و شب کا وظیفہ بھی۔ کہنے لگے۔ ”میاں! آپ کہہ رہے ہیں کہ رات کے حیران کن واقعے کی تفتیش کے لیے صبح سے پولیس اسپتال آئی ہوئی ہے۔ فرض کیجئے، ڈاکٹر رائے نے اپنے اس شبے کا ڈکڑ پولیس سے کر دیا تو پولیس تو آپ کی طرف بھی آ سکتی ہے۔ پھر آپ کیا نہیں گے ان سے، رات آپ سے ملاقات کرنے والے پولیس افسر کون تھے؟“

مجھ سے فوراً کوئی جواب نہ بن پڑا۔ میں تو اکبر علی خاں کی صورت دیکھا کیا..... اس نکتے پر میں نے سوچا ہی نہ تھا۔ بے شک ڈاکٹر رائے کو اسپتال میں موجود تفتیش کاروں سے یہ کہنے میں کیا عار ہوئی کہ گزشتہ رات اس کے زیر علاج، شہر میں اتنی ہی ایک مریض کے تیماردار بھائی کے پاس نوحے کے خلاف دو پولیس افسر آئے تھے۔ اسپتال میں دھرنا دیے ہوئے پولیس والے رات کے واقعے کے اندھیرے میں کسی کرن کی امید میں میرے پاس آ سکتے ہیں۔ پھر میں ان سے کیا کہوں گا کہ بتاؤں گا کہ ان کے نام کیا تھے، چلیے کیسے تھے اور آگے

کا مقصد کیا تھا۔ یہ مسلسل کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ۔ کیسا یہ جنجال ہے۔ ایک عذاب ختم نہیں ہوتا کہ دوسرا شروع ہو جاتا ہے۔ میں نے کون سا جرم کیا ہے جو مجھ سے جواب طلبی کی جارہی ہے۔ میرا سر چکرانے لگا۔ میں نے پولیس والوں کو سچ بتا دیا کہ رات کو ان کے ہم پیشہ، میڈ اسٹاد کے سلسلے میں آئے تھے تو میرا یہ اعتراف ڈاکٹر رائے تک منتقل ہو جائے گا۔

وہ مجھ پر دروغ گوئی کے الزامات عائد کرے گا۔ میری تو ہر بات اسے الٹی نظر آئے گی۔ نرس ایسی کی طرح، گزشتہ روز کی ساری روداد اسے سنا دیتا ہوں تو اس کا خلاق دماغ کیا کیا قیاس آرائیاں کرنے لگے۔ بات پھر بہت دور جا سکتی ہے، فیض آباد، کلکتے، جانے کہاں کہاں۔

”کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی پڑے گا میاں۔“ اکبر علی خاں مجھ سے زیادہ فکر مند لگ رہے تھے۔ ”آپ کہیں کہ آپ یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے کہ رات آنے والے دو آدمی، جیسا کہ ان کا دعویٰ تھا، پولیس افسر ہی تھے۔ آپ کہیں کہ انہیں آپ کی شکل سے کوئی دھوکا ہو گیا تھا۔ بات صاف ہو گئی تو وہ معذرت کر کے چلے گئے، کچھ ایسی ہی مصلحہ انداز میں بات کرنا ہوگی۔“

”ظاہر ہے، بات تو بنانا ہی پڑے گی۔“ میں نے بے چارگی سے کہا۔

”آپ کی کوشش ہونی چاہیے کہ پولیس تفتیش کے دوران ڈاکٹر رائے موجود نہ ہوں۔“

”میری کوشش سے کیا ہو سکتا ہے۔“ میں نے ناگواری سے کہا۔ ”میرا بس تو آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔“

اکبر علی خاں مجھے حوصلے کی تعلیم دینے لگے۔ چالاک کہ سردست خود انہیں اس کی بڑی ضرورت تھی۔ میں نے چڑکے کہا۔ ”ٹھیک ہے جو ہونے والا ہے، اس پر میرا اختیار ہے نہ آپ کا۔ جو ہوگا،

دیکھا جائے گا، اور زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا۔ رات آنے والے لوگ کس ارادے سے آئے تھے، کام باب بھی ہو سکتے تھے۔ اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے۔“

”نوید کیجئے میاں۔ میں تو تصور بھی نہیں کر سکتا کہ وہ اتنا آگے جا سکتے ہیں۔ آپ ہی کہہ رہے تھے کہ بڑا بڑا ٹھکانے والے ایسے بدعہد نہیں ہوتے۔ اب دیکھ لیا آپ نے۔“

”مجھے اب بھی یقین نہیں کہ انہیں میدانے بھیجا تھا۔“

”پھر کس نے..... کون بھیج سکتا ہے انہیں اتنے بڑے اقدام پر..... کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“ اکبر علی خاں کی آواز سچ گئی۔

”وہ مرنے والے دھوا کے قریبی ساتھی بھی ہو سکتے ہیں۔ میڈ اپنے اڈے کے لوگوں کو باندھے رکھنے میں ناکام رہا ہے شاید۔ آپ کو یاد ہوگا، میں نے میڈا کے اڈے پر کہا تھا کہ اڈے کے استاد کو اسے آخری آدمی تک نگاہ رکھنی پڑی ہے..... یا پھر وہ لوگ بھی ہو سکتے ہیں جو میڈ اسٹاد سے بڑی محبت و عقیدت رکھتے ہوں اور انہیں شبہ ہو کہ میڈا سے اپنا چاقو واپس لینے کسی وقت بھی میں اڈے آ سکتا ہوں۔ نتیجے میں ان کا محبوب استاد چوکی پر شاید قائم نہ رہ سکے۔ ایسے لوگ میڈا کی محبت میں اسے بتائے بغیر میری طرف آ سکتے ہیں۔“

”مجھے نہیں معلوم۔“ اکبر علی خاں کے ماتھے پر سلوٹیں ابھر آئیں۔ ”میرا جہازم پیشہ لوگوں سے بہت واسطہ رہا ہے لیکن اس قماش کے لوگوں سے کچھ کم بلکہ نہ ہونے کے برابر۔ آپ کا یقین بھی بے سبب نہیں ہوگا۔ بہر حال اس سے فرق بھی کیا پڑتا ہے۔ وہ کوئی بھی ہوں، میڈا کے اشارے پر آئے ہوں یا اسے لاعلم رکھ کے۔ میں تو سوچتا ہوں..... خدا نخواستہ.....“ اکبر علی خاں کہتے کہتے رہ گئے۔ انہوں نے آنکھیں بھیج لیں۔

اپنے آپ کو جاننے کی جستجو میں ہے۔ درختم ہی نہیں ہوتے۔ سات در کے بعد خزانہ مل جاتا ہے۔ زندگی کے اسرار و رموز کون سے در میں چھپے ہوئے ہیں۔ آدمی در کے بعد در سر کرتا چلا جا رہا ہے اور اس کی حیرت کم نہیں ہوتی، بڑھتی ہی جا رہی ہے۔

سیورین نے چائے کے برتن سیلف سے میز پر رکھے اور ہم سے دودھ اور چینی کی مقدار پوچھ کے چائے بنائی۔ اکبر علی خاں ٹھیک ہی کہتے تھے۔ موت کتنی ہی اہل ہو، زندگی کی ہٹ دھرمی اپنی جگہ ہے۔ زندگی موجود ہے تو آخری لمحے تک خوش فطریاں، خوش گمانیاں جاری رہتی ہیں۔ موت فراموش کرتے رہنا ہی زندگی ہے۔ موت اور زندگی کی آنکھ چھولی میں زندگی جیت چکی تو جانی ہے، نتیجتاً رہتی ہے۔ زندگی کی ان چھولی چھولی جیتوں پر موت شاید ہنستی ہے۔ زندگی کو معلوم نہیں ہوتا کہ موت اسے ڈھیل دیتی ہے، اس سے کھلوا کر رہتی ہے اور کسی ایک دن پٹنگ کاٹ دیتی ہے، کسی ایک دن پٹنے میں بری طرح دیوبچ لیتی ہے۔ یہی اس کا شیوہ ہے۔ ایک دن ضرور اس کا ہوتا ہے اور چون اس کے نہیں ہوتے، وہ بھی کچھ اس کی چشم پوشی، درگزر کے سبب سے۔

دوپہر تک پولیس کا کوئی آدمی نہیں آیا۔ مصل کی بیماری کے دوران پولیس کی تفتیش سے مجھ کو اس باختہ کی وحشت میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ کچھ بھی سوچ کے شاید ڈاکٹر رائے نے اپنا شبہ خود تک محدود رکھا ہو اور پولیس کو پہلے اپنے طور پر چھان بین کا موقع دیا ہو۔

ایک بجائی جا چکا تھا۔ اکبر علی خاں کا ملازم بڑا سا فن لے کے آیا۔ ان سے کچھ کہنا کہ اس تکلف کا یہ عمل ہے نہ اس کی ضرورت ہے، فضول تھا۔ گزشتہ رات کی طرح بھوک نہ ہونے کے باوجود میں نے رسم نبھائی۔ ہمارے اصرار پر سیورین بھی ساتھ بیٹھ گئی۔ اس نے ایسے خوش ذائقہ کھانے شاید

پہلی بار کھائے تھے، مسلسل تعریفیں کرتی رہی۔ اسے کھاتے دیکھ کے بے اختیار مجھے زہریں اور فروزاں کی یاد آئی۔ وہ بھی کچھ اسی انداز سے کھانا کھاتی تھیں۔ کھانا پکاتا ہی نہیں، کھانا کھانا بھی ایک ہنر ہے۔ نازک اندامی کو نازک خیالی اور نازک اطواری بھی لازم ہے۔ قدرت نے ایسا ریشم، ایسا پھول، اتنا نعل اور تر شا ہوا بنایا ہوتا تو دیگر شایستہ، نرم و لطیف حرکات و سکنات سے کیا ملاحظت ہو جانی ہے۔ غالباً بھی تکمیل ہوئی ہے۔ کہتے ہیں، کسی شخص کے میزان کے لیے دسترخوان اور سفر سب سے کھری کسوٹی ہوتی ہیں۔ کچھ تو یوں بے شمار ہیں لیکن کلیوں پر زندگی بسر نہیں کی جاسکتی۔ ایک جیسے آدمی بھی بھی ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں۔

کھانا کھاتے ہی اکبر علی خاں فن لانے والے ملازم کو ساتھ لے کے رخصت ہو گئے۔ میں انہیں اسپتال کے مرکزی دروازے تک پہنچانے گیا۔ راستے میں انہوں نے بتایا کہ ان کی والدہ کی طبیعت سنہل نہیں ہے۔ ماں کا ذکر کرتے ہوئے ان کی آواز سوز و گداز سے مغلوب ہو جاتی تھی۔ میں نے کہا کہ والدہ کے پاس رہنے کی ضرورت سمجھیں تو شام کو یہاں آنے کی زحمت کیوں کریں اور براہ مہربانی یہ کھانے وغیرہ کا تکلف نہ کریں تو بہتر ہوگا۔ وہ مسکراتے ہوئے سر ہلانے لگے اور بولے۔

”زحمت کیسی برادر۔ خدا را ایسی اجنبیت نہ برتیں۔ آپ کو معلوم ہے، خدا گواہ ہے، لگتا ہے، کوئی پنچر احوال گیا ہے۔“

میں ان سے نہ کہہ سکا کہ میرا بھی کچھ یہی حال ہے۔ وہ یہاں آتے ہیں تو ڈھارس ہی بندھ جاتی ہے۔ اس شہر میں کوئی پہنچا۔ وہ چلے جاتے ہیں تو دل گھبرانے لگتا ہے۔

انہیں رخصت کر کے واپس کہے میں پہنچا تو مصل کے بستر کے اطراف ڈاکٹروں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی، ڈاکٹر رائے اور کئی ڈاکٹر۔ ان میں گورا ڈاکٹر بھی

تھا۔ سیورین بھی ان کے ساتھ مصروف تھی۔ میرے آنے کی آہٹ کسی کو نہ ہوئی۔ ان کے منتشر ہوجانے کے خیال سے کچھ دیر تو میں وہیں دروازے کے نزدیک کھڑا رہا۔ مصل پر ان لوگوں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ مجھ سے یہ دیکھا نہیں جاتا تھا اس لیے میں باہر چلا آیا۔ انہوں نے بہت دیر لگائی۔ کھڑے کھڑے پاؤں اکڑنے لگے۔ دماغ ہی پر اگندہ ہوتا دل کیا، آنکھیں کیا اور پاؤں کیا، سبھی بے جان ہیں۔ یہ جسم تو دیکھنے کا ہے۔ وہی بات ہے، آدمی تو بس دماغ ہے، حاکم مطلق۔ بانی سارا جسم تو اس کا محکم ہے۔ کتنی دیر ہو رہی تھی، میرا دل ڈوبا جاتا تھا دماغ ڈوبا جاتا تھا۔

انداز سے ڈاکٹر رائے کی آواز آئی تو میں نے جھانک کے کمرے میں دیکھا، ڈاکٹر مصل کے پاس سے ہٹ گئے تھے۔ میں تیزی سے کمرے میں داخل ہوا۔ ”اوہ میرے تاراض نوجوان دوست!“ ڈاکٹر رائے نے لبتکے ہوئے مجھے پکارا۔ ”کہاں ہوتی؟“ ”میں..... میں یہیں تھا، باہر۔“ میری آواز بکھٹ گئی۔

”تمہارے لیے ایک اچھی خبر! ہمارے معزز مہمان ڈاکٹر فرینکی نے ساری رپورٹس دیکھ لی ہیں۔“ اس نے ستائش آمیز انداز میں پہلو میں کھڑے گورے ڈاکٹر کی طرف اشارہ کیا۔ ”شکر کرو کہ صرف اوپر کی جلد متاثر ہوئی ہے۔ وہیں سوجن ہے اور سر کھولنے کی ضرورت نہیں۔“

میں ٹوسن ہو گیا۔ اپنی سماعت پر مجھے شبہ ہوا اور میری دریدہ آنکھوں میں دریا اٹھ آیا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کہوں، کس طور ڈاکٹر رائے سے شکر گزاری کروں۔

”تمہارا بھائی دو آئیں رو نہیں کر رہا۔ یہ ایک اچھی علامت ہے۔“ گورے ڈاکٹر نے سنجیدگی سے ڈاکٹر رائے کی تائید کی۔ ”یہ سراسر معاملہ بہت نازک ہوتا ہے نوجوان!“

میں نے مصطر یا نہ سر ہلایا۔

”اور سنو!“ ڈاکٹر رائے نے مجھے متنبیہ کیا۔ ”بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ سرجری سے جلد نجان برآمد ہو جاتے ہیں اور جلد نجان کے لیے سرجری نہیں کی جاتی تا وقتیکہ اس کے بغیر کوئی چارہ نہ ہو، سمجھے۔“

”جی، جی ہاں۔“ میں نے بدحواسی سے کہا۔ ”مریض کے بارے میں نہیں معلوم لیکن اس کا یہ چھوٹا بھائی اپنے بڑے بھائی میں خود سے زیادہ شامل ہے۔“ میرا بازو تمام کے ڈاکٹر رائے نے گورے ڈاکٹر سے کہا۔

”اور اسی لیے میں کہتا ہوں، مشرق میں آدمی موجود ہے۔ مغرب میں تو نہیں کھو گیا ہے۔“ ڈاکٹر فرینکی نے پر حکمت تباک سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور بولا۔ ”تم سے مل کے خوشی ہوئی۔“ میں نے دونوں ہاتھوں میں اس کا ہاتھ بکڑ لیا۔ ”امید ہے، جلد ہی تم اپنے محبوب بھائی کو صحت یاب دیکھ سکو گے۔“ گوروں کے مزاج اور لہجے کی طرح ڈاکٹر فرینکی کی مسکراہٹ بھی جھٹکا تھی۔ اس کا شکر یہ ادا کرتے ہوئے میری آواز بھر آئی۔

”شام کو ملیں گے۔“ ڈاکٹر رائے منٹنا کے بولا اور اس نے ہاتھ پھیلا کے گورے ڈاکٹر کو چلنے کا اشارہ کیا پھر کا ایک رک کے مجھ سے پوچھنے لگا۔ ”پولیس تو نہیں آئی یہاں؟“

”نہیں، بالکل نہیں۔“ میرے شانے سیدھے ہو گئے۔ ”کیوں؟“

”آسکتی ہے کسی وقت۔ ہر ایک سے پوچھ رہے ہیں وہ۔ یہ جاننے کے لیے کہ رات آنے والے اسپتال میں زیر علاج مریض یا اس کے کسی نگہ دار کی حویج میں تو نہیں تھے۔“

”آجانے دیجیے۔“ میں نے بے نیازی ظاہر کی۔

میں نے ان سے کچھ نہیں کہا۔ میری کسی

رائے سے وہ منتشر ہو سکتے تھے۔ اچھا ہے، وہ خود ہی ہاتھ پاؤں ماریں..... دیکھتے ہیں بہر حال....." بہیم انداز میں یہ کہنا ہوا ڈاکٹر رائے اپنے ساتھی ڈاکٹروں کے ساتھ کمرے سے نکل گیا تھا کہ ان سے معذرت کر کے پھر دروازے کی طرف پلٹنا اور سرگوشی میں اس نے مجھے مشورہ دیا۔" میں سمجھتا ہوں، گزشتہ رات غلطی میں آنے والے پولیس افسران کا ذکر تم بھی ان سے کیوں کرو۔ یقین سے کچھ کہا بھی تو نہیں جاسکتا، کون تھے وہ۔"

میرے کوئی جواب دینے سے پہلے دو مجھ سے دور ہو گیا۔

میں نے یہ ظاہر کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ اسے جلدی تھی۔ اس نے مجھے موقع بھی نہیں دیا۔ اس کے جانے کے بعد دیر تک میں طرح طرح کے واہموں میں گھرا گھرا ہوا اور جیسے کسی نے مجھے نوکا۔ اس مشفق ڈاکٹر نے ایک اور بات بھی تو کہی ہے۔ جس کے آگے تمام دور دراز اندیشے ثانوی ہیں۔ دوسرے لمحے میرے پاؤں تھل کے بستری کی جانب امد پڑے۔ تھل کے چہرے پر سکون کے آثار تھے۔ میں نے بہت دیر ہی آواز میں اسے پکارا۔ اس کی پیشانی تنگ اور پلکوں میں جنبش ہوئی۔ ادھر سیورین نے آنکلی سے میرا شانہ تھپک کے مجھے منع کیا۔ مجھے اس کی مداخلت بہت بری لگی اور میں بیچ و تاب کھا کے رہ گیا۔ کوئی اور سامنے ہوتا تو شاید میں اس سے جھگڑ پڑتا مگر وہ سیورین تھی، شاخ گل کے مانند، ذرا تیز آواز میں بات کرتے ہوئے ڈر لگے، شاخ ٹوٹ نہ جائے، پھول کھلانا نہ جائے۔

وہاں سے ہٹ کے میں صوفے پر آ گیا۔ کچھ دیر بعد اپنے کاموں سے نمٹ کے وہ بھی میرے پاس آ کے بیٹھ گئی۔ لمحوں تک چپ رہی پھر ہمک کے بولی۔ "آج تو آپ سے کوئی بات ہی نہیں ہو پائی۔"

میں نے مسکرانے کی کوشش کی اور اس شیشہ احساس نے یہ رعایت نصیبت جانی، پہلو بدل کے دل کیر لیجے میں بولی۔ "کل رات اسپتال میں یہ کیا ہو گیا۔ اٹھوئی بے چارہ مارا گیا۔"

"تم جانتی تھیں اسے؟" میں نے پوچھا۔

"اسپتال میں بھی اسے جانتے تھے۔" اس نے پاس بھری آواز میں بتایا۔ کل رات ہی تو ملا تھا۔ ڈیوٹی ختم کر کے جا رہی تھی کہ آتنا سامنا ہو گیا۔ بہت منع کیا، نہیں مانا، بڑے دروازے تک مجھے پہنچانے گیا۔ بڑا دل چسپ، زندہ دل نوجوان تھا وہ۔ میری اس کی اچھی دوستی تھی، یوں یہاں وہ بھی کا دوست تھا۔ ہر کسی کے کام کے لیے تیار ہر وقت ہنستا، مسکراتا رہتا۔ کل رات وہ اتنا ہی زندہ تھا جتنا کوئی صحت مند اور خوش باش شخص ہو سکتا ہے..... ایک رات میں یہ کیا ہو گیا؟"

"ایک رات کیا، دوسرے مل کی خبر نہیں۔" میں نے خفی سے کہا۔ "بس یہی کچھ ہے۔ کوئی ہم سے پہلے چلا جائے گا، کسی سے پہلے ہم چلے جائیں گے۔ پہلے کون، بعد کو کون۔ کچھ نہیں معلوم۔"

اٹھوئی کی بیوی شیری میری رشتے دار ہے۔ خوب صورت، بڑی اچھی لڑکی۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے اور دونوں کے خاندانوں میں نزدیک و دور کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ بڑی لمبی کہانی ہے۔ "سیورین آہ بھر کے بولی۔

"کیسی کہانی؟" میں نے جس سے پوچھا۔

"شیری کا باپ تھا اس عجیب ضدی طبیعت کا آدمی تھا۔ شیری کے بچپن میں اس کی ماں مر گئی تھی۔ باپ نے اپنی اکلوتی بیٹی کی پرورش کی اور دوسری شادی بھی نہیں کی۔ حسین ہونے کے ساتھ شیری بڑھی کھسی اور بڑی سمجھ دار تھی۔ چھوٹی عمر میں اس کے رشتے آنے لگے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ تمہارا بیٹی کو جدا کرنا نہیں چاہتا تھا، رشتے مسترد کرتا رہا۔ اس دوران ایک نوجوان شیری سے کچھ قریب ہو گیا

تھا۔ شیری بھی اسے پسند کرنے لگی تھی۔ وہ تھامس کے گھر آنے جانے لگا تھا۔ شیری سے شادی کے لیے اس نے باقاعدہ درخواست کر دی تھی اور تھامس نے انکار نہیں کیا تھا لیکن اچانک ایک روز نوجوان ایسا غائب ہوا کہ آج تک نام و نشان نہیں ملا۔ اس کے والدین گیا شہر میں رہتے ہیں۔ اب تو کئی سال ہو گئے ہیں۔ سنا ہے، آج تک بیٹے کی واپسی کی راہ تک رہے ہیں۔

”کیا شہر کا تھادہ؟ کیا نام تھا؟“

گیا کے نام سے میرے بڑبڑا جانے پر سیورین نے چونک کے پوچھا۔ ”آپ کا تعلق بھی گیا سے ہے؟“

کیا ضروری تھا کہ میں اقرار کروں۔ میں نے اچھتی آواز میں کہا کہ گیا شہر میں میرے عزیز رہتے تھے۔

سیورین ایک صاف دل لڑکی تھی، بھرا نہیں کی اور مجھے بتایا کہ اس نوجوان کا نام علی فرزند جون تھا۔ سب اسے جونی کہتے تھے۔

مجھے شبہ ہوا تھا کہ میرے اسکول اور کالج کے وقت کا کوئی ساتھی نہ ہو۔ وہاں بہت سے عیسائی طلبہ تھے۔ جانے کیوں مجھے اس کا نام جاننے کی بے چینی ہوئی تھی۔ مجھے تو گیا چھوڑے ہوئے زمانہ ہو گیا تھا۔ میری دخل اندازی سے سیورین الجھ سی گئی۔

”پھر نہیں ملا وہ؟ یہاں پنپنے میں کیوں رہتا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”ڈاکٹری کی تعلیم کے لیے اسے یہاں داخلہ ملا تھا۔ یہ اسپتال بھی تو اسی کالج سے وابستہ ہے۔“

ناں میں جواب نہیں دے پا رہا تھا۔ شاید سردی کی ایک رات لڑکے کے گھر میں آگ لگ گئی۔ اس پاس کے کئی مکان لپٹ میں آگئے۔ لڑکے کے بھرے پرے خاندان میں صرف اس کی ماں بچی جو بڑی طرح جھلس گئی تھی۔ چھ سات مہینے موت سے لڑتی رہی اور نہیں بچ پائی۔ لوگ طرح طرح کی باتیں کرتے تھے۔ کوئی شہادت نہیں تھی کہ تھامس اتنا ہول ناک اور سفاک بھی ہو سکتا ہے، وہ بھی اپنے ہی خاندان کے لیے لیکن لوگوں کو وہم ہو گیا تھا اور شیری کے رشتے آنے بند ہو گئے۔ تھامس سے لوگ کنارہ کش ہونے لگے۔“

مجھے چپ دیکھ کے سیورین کو میری گراں خاطر کی احساس ہوا۔ وہ ٹھنک سی گئی۔ ”میں کیا داستان لے لی تھی۔“ وہ شرمندگی سے بولی۔ ”آپ بھی کیا کہتے ہوں گے۔“

”نہیں، بالکل نہیں۔ میں پوری توجہ سے سن رہا ہوں۔“ میں نے سنبھل کے کہا۔ ”پھر شیری، اتھوئی کو کس طرح ملی؟“

”وہ تو بہت بعد کی بات ہے۔“ سیورین ادا سی سے بولی۔

میں نے حیرت کا اظہار کیا تو میری غیر دل چسپی کی بدگمانی نہیں اس کے دماغ سے دور ہوئی۔ میں اس سے کیا کہتا کہ میں سن بھی رہا تھا اور جانے کہاں کہاں جھنک بھی گیا تھا۔

”بس کیا ہوا۔“ وہ کہنے لگی۔ ”ریاست رام پور کا کوئی نواب زادہ کسی کام سے پٹنا آیا تھا۔ شیری اس وقت کالج میں پڑھتی تھی۔ نواب زادے نے کہیں اسے دیکھ لیا۔ شیری کے کوائف حاصل کرنا نواب کے لیے کیا مشکل ہوں گے۔ کسی طرح اس نے تھامس سے رابطہ کر لیا۔ یہ رابطہ دیکھتے دیکھتے گہرے مراسم میں بدل گیا۔ تھامس کی خوش بودی کے لیے نواب نے نئے نئے تحائف کی بارش کر دی تھی۔ تھامس اتنا خوش حال تھا نہ ایسا بد حال۔ ایک زمانے

سے وہ کسی بڑے گورے افسر کا معتمد تھا۔ سنا ہے، گورا افسر اس کی ذہانت اور دیانت کا بڑا قائل تھا، حد سے زیادہ اعتماد کرتا تھا۔ اس کی وجہ سے پٹنا کے نواح میں تھامس کو بڑھاپے میں گزر بسر کے لیے کچھ زرعی زمین مل گئی تھی۔ افسر کی ترقی ہوئی اور وہ کلکتے چلا گیا۔ اس نے تھامس کو بھی ساتھ لے جانا چاہا۔ تھامس نے معذرت کر لی۔ پٹنا اس کا آبائی شہر تھا۔ اپنے گھر سے اس کی بے شمار یادیں وابستہ تھیں۔ یہاں اس کی عزیز ترین بیوی رہتی تھی۔ ادھر شیری تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ کلکتا شہر کی گھنائی اور افراتفری اس کے مزاج سے مناسبت نہیں رہتی تھی۔ اسے اپنی شیری کا بھی خیال تھا، کلکتے میں وہ کہیں کم نہ ہو جائے۔ شیری اس کی زندگی تھی۔

نواب زادے کے پاس کیا کچھ نہیں تھا۔ سنا ہے، اس کی جاودہ شہمت اور اثر و رسوخ سے تھامس بہت متاثر ہو گیا تھا۔ دونوں میر شکار کو جانے لگے تھے۔ نواب زادہ باپ بنی کو اپنی ریاست اور زمینوں پر لے گیا۔ شیری کے کالج کی چھٹیاں انہوں نے رام پور اور بنی تال وغیرہ میں گزاریں۔ شیری نے مجھے بتایا تھا کہ اس کا باپ نواب کی بہت عزت کرتا تھا مگر ایک دن نواب نے شیری کے لیے اپنے بے پناہ جذبات کا اظہار کر دیا اور منت کی کہ زندگی بھر کے لیے وہ شیری سے رفاقت کا آرزو مند ہے۔ نواب کو اس حقیقت کا علم تھا کہ تھامس اپنی بیٹی کی جدائی کے خیال سے آزرده ہو جاتا ہے۔ نواب نے تھامس کو اپنے ساتھ رہنے، شیری کے لیے ایک الگ گھر، محل جیسا ایک گھر بنانے کی پیش کش بھی کی تھی اور وعدہ کیا تھا کہ شیری اس کی پہلی اور آخری شادی ہوگی۔ تھامس کی کوئی شرط ہو یا وہ کچھ اور تحفظ چاہتا ہو تو محل کے بتائے۔ مہذب، نفاست پسند، خوش لباس، رفتار رفتار میں خوش ذوق، مصوری اور موسیقی کا دل دادہ، بے اندازہ دولت کا مالک اور نہایت منکسر مزاج نواب زادے نے آکس فورڈ میں اعلیٰ

تعلیم حاصل کی تھی اور مشرق کی محبت میں ڈوب کے دلالت سے واپس آیا تھا۔ وجہ اور دل کش شخصیت کا حامل تھا۔ کوئی بھی لڑکی اس کی رفاقت پر ناز کرتی۔ نواب سے وابستگی ہر اعتبار سے بہتر زندگی کی ضمانت تھی۔ نواب کا حال یہ تھا کہ وہ شیری اور اس کے باپ کے آگے بچھا بچھا جاتا تھا۔ اتنی نوازشیں، اس قدر تپاک سے کوئی سنگ دل سے سنگ دل بھی پھٹل جاتا۔“

سیورین نے رک کے ایک نظر میری طرف دیکھا اور جیسے میرے انہماک سے مطمئن ہونے کے ڈوبی ڈوبی آواز میں کہنے لگی۔ ”شیری کو تو یقین تھی کہ اس بار اس کا باپ شاید انکار نہ کر سکے۔ تھامس نے یہ معقول غدر کیا کہ وہ عیسائی ہے اور رتے میں بھی نواب زادے سے کوئی نسبت نہیں رکھتا۔ نواب نے کہا کہ اس کے مذہب میں عیسائی عورت سے شادی کی اجازت ہے اور وہ کوئی ایسا کڑھ مذہبی آدمی بھی نہیں۔ شیری کو اس کے ساتھ زندگی بسر کرنے میں کوئی اجنبیت نہ ہوگی۔ اسے شیری کے مذہبی معاملات و مشاغل سے بھی کوئی غرض نہیں ہے۔ اسے شیری چاہیے۔ اور اگر ایسا ہی ہے تو وہ اپنی ساری دولت شیری کے نام کرنے کے لیے تیار ہے۔ نواب زادے کی تمام تر یقین دہانیوں اور ضمانتوں کے باوجود تھامس لیت دل کرتا رہا۔ صاف انکار بھی اس کے بس میں نہیں رہا تھا۔ وہ جتنا نواب سے کترانے کی کوشش کرتا، نواب کی شدت اتنی بڑھتی جاتی تھی۔ تھامس ان دنوں بہت پریشان رہنے لگا تھا۔“

سیورین کہہ رہی تھی۔ ”شیری نے اسے بتایا تھا۔ نواب چاہتا تو کسی اور طرح اس کے باپ کو مجبور بھی کر سکتا تھا۔ نواب کی ریاست، اس کے محل میں قیام کے دوران شیری اس کے زور و اثر کی شاہد تھی۔ خدام کی ایک فوج اس کے اشاروں کی منتظر رہتی تھی۔ نواب نے ایسی کوئی کاروائی نہیں کی۔ کچھ

اس وجہ سے بھی وہ نواب کا احترام کرنے لگی تھی۔ شیریں کے بقول، اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی نواب کے ساتھ آنے والے دنوں کے خواب دیکھنے شروع کر دیے تھے مگر اس کا باپ جانے کیا چاہتا تھا۔ شیریں کے لیے جانے اس نے کیا سوچ رکھا تھا۔ دنیا کا دستور ہے، بیٹیوں کا گھر ماں باپ کا گھر نہیں ہوتا۔ پھر ایک روز تمہارا کو کیا سوچا۔ وہ شیریں کو ساتھ لے کے نکلتے چلا گیا اور چند روز بعد واپس آ گیا۔ نکلتے سے آنے کے بعد اس نے نواب سے ہاں کہہ دی اور شیریں کا تعلیمی سال مکمل ہو جانے تک کی مہلت مانگ لی۔“

”پھر نواب باقی نہیں رہا۔“ میں نے بے ساختہ کہا۔

سیورین کی بڑی بڑی آنکھیں پھیل گئی۔

”آپ کو معلوم ہے؟“

”یوں ہی..... پھیلا سارا کچھ سننے کے بعد.....“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”اب یہ مت کہنا کہ ایسا ہی ہوا۔“

”مگر یہی ہوا۔“ سیورین بھی بھٹی آواز میں بولی۔ ”نواب کو اس کی زمینوں والے مکان میں کسی نے گولی مار دی۔ یہاں تو خبر بھی نہیں آئی لیکن پٹنے میں نواب کے چند دوست تھامس اور اس کے روز افزوں مراسم سے واقف تھے۔ تحقیقات کرتے کرتے پولیس تھامس کے پاس آ گئی۔ نواب کی موت کے وقت تھامس، پٹنے میں تھا۔ پولیس نے خاصا وقت صرف کیا اور کچھ حاصل نہ کر سکی۔ نواب

زادے کا قصہ جلد ہی پانا ہو گیا۔“

”پھر یہ انتہی؟..... اس صورت حال میں انتہی کس طرح؟“ میں نے بے چینی سے پوچھا۔

”کھینچے، شیریں نے اپنے آپ سے نانا توڑ لیا۔“

سیورین کی آواز اور دھندلا گئی، کہنے لگی کہ شیریں نے بالکل اپنے آپ کو ترک کر دیا تھا۔ وہ خاموش خاموش رہنے لگی تو جوان لڑکیاں بہت خواب دیکھتی

ہیں۔ شیریں نے ساری کھڑکیاں دروازے بند کر لیے تھے۔ جب چپ کاغذ جالی اور گھر واپس آ جاتی۔ کسی سے کوئی رسم و رواج نہ رہتی۔ کاغذ کے ساگی جو کبھی اس کی ایک نگاہ خوش انداز کے لیے بے قرار رہتے تھے، کھینچے کھینچے رہنے لگے۔ حسین لڑکیوں کے یوں بھی فسانے بن جاتے ہیں۔ آدمی نگاہوں کی زبان زیادہ سمجھتا ہے۔ کاغذ سے گھر، گھر سے کاغذ تک کلی کوچوں سے گزرتے ہوئے لوگوں کی نگاہوں سے واسطہ توڑتا ہی تھا۔ نواب کی موت کے بعد شیریں کی روز تک کاغذ نہیں گئی تھی لیکن گھر بھی اسے کاٹ کھانے دوڑتا تھا، تعلیمی مصروفیات کا کوئی بہانہ تو بہر حال تھا۔

دن گزرتے گئے۔ اور ایک روز انتہی دیوار کی طرح سامنے آ کے کھڑا ہو گیا۔ دلیر، بے باک، سر پھرا انتہی مالی اعتبار سے کم تر تھا لیکن دل کا بڑا امیر۔ سیورین کی بعد گریجویٹیشن کے لیے اسے شیریں کے کاغذ میں داخلہ لیا گیا تھا۔ یہاں اس نے پہلی بار شیریں کو دیکھا اور پاگل ہو گیا۔ بلکہ اس کے ساتھیوں نے اسے شیریں سے دور رہنے کی تلقین کی ہوگی۔ انتہی کی وار کھلیاں شیریں کو متاثر نہ کر سکیں۔

شیریں اپنے آپ سے بھی تو ڈرنے لگی تھی۔ جوان سال انتہی کو وہ اپنی بد قسمتیوں اور محرومیوں کا حصہ بنانا نہیں چاہتی تھی۔ انتہی میں دل داری کی بڑی خوبیاں تھیں۔ شیریں کی مسلسل پہلو تھی، حد سے زیادہ بے حسی پر دل برداشتہ ہونے کے بجائے وہ کچھ اور دیوانہ ہوا۔ شیریں نے ایک بار تو اسے بری طرح دھکا دیا تھا۔ حالانکہ یہ بھی وہ تندی اس کے مزاج کے برعکس تھی۔ ثابت قدم انتہی، شیریں کو زندگی میں واپس لانے کی کوششوں میں بشار رہا۔

شیریں کو خود پر مسلط کیے ہوئے جبر سے تنہائی تو بہت محسوس ہوتی ہوگی۔ جبر شعوری تھا۔ غیر شعوری طور پر کسی پناہ کسی سہارے کی ضرورت تو اسے محسوس ہوتی چاہیے۔ انتہی اپنے گداز، اپنے التفات

پر واندہ وار غار کرتا رہا۔ شیریں کب تک اپنے آپ سے روٹھی رہتی۔ انکار کو بھی ایک تاب استقامت چاہیے۔ وہ تو ایک دل کیر، ایک ناتواں لڑکی تھی۔ اس نے انتہی کے آگے سر ڈال دی۔

سیورین کہہ رہی تھی کہ شیریں کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ناکام ہونے کے لیے انتہی نے اس کی جانب پیش قدمی نہیں کی ہے اور وہ دوسرے نوجوانوں کی طرح نہیں ہے، وہ تو کچھ اور ہے مگر جیسا کہ لوگ کہتے تھے، شیریں کا باپ، اس کا شفیق باپ! کوئی شہادت نہیں تھی کہ اس کا باپ ہی اس کی آرزوؤں اور خواہیوں میں رکاوٹ بنا رہا ہے۔ یہ شخص ان ہونیوں کا ایک سلسلہ بھی تو ہو سکتا ہے۔ اس کا باپ ایک تجر بہ کار، ہوش مند اور بڑھا لکھا شخص ہے۔

شیریں کی ماں بچپن میں اسے چھوڑ گئی تھی۔ اس کے باپ نے اسے بیروں چلنا سکھایا، وہ تو شیریں کے لیے ایک سایہ، کوئی ستون بنا رہا ہے۔ شیریں کی قسمت خراب ہے تو اس کے باپ کا کیا تصور۔ کوئی باپ، اور تمہارا جیسا باپ اپنی بیٹی کے لیے کیا برا

چاہ سکتا ہے۔ بے شمار سلی امیز جوازوں کے باوجود شیریں کو بچپن بھی نہیں آتا تھا۔ اس نے انتہی سے گزارش کی کہ بہتر یہی ہوگا کہ ان کے مراسم کے احوال سے تمہارا بے خبر رہے۔ انتہی کے لیے یہی کیا کم تھا کہ اس کی کوشش رایگاں نہیں گئیں۔

شیریں کا پتھر کسی طور پھٹا تو سہی۔ بالآخر اس کے اندھیرے وجود میں کوئی جوت چلی تو سہی۔

وہ ایک دوسرے سے ملنے رہے اور انہوں نے جانا کہ وہ دونوں تو ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں، وہ تو کب سے ایک دوسرے کی تلاش میں تھے۔

وہی تو ایک دوسرے کی منزل ہیں۔ وہ انتہی ہی تھا جسے شیریں ڈھونڈ رہی تھی اور وہ شیریں ہی تھی جس کے بغیر انتہی ادھورا تھا۔ یوں سوچنے تو ہر کیا آدمی

ادھورا ہوتا ہے اور کوئی دوسرا ہی اس کا وجود مکمل کرتا ہے اور وہ دوسرا قسمت سے کسی کو ملتا ہے۔ کبھی

کسی کو کوئی نہیں مل پاتا اور زندگی یوں ہی اندھیرے پن میں گزر جاتی ہے۔

شیریں بھی سیورین کے کاغذ میں پڑھتی تھی۔ شیریں نے بہت بعد کو کاغذ میں داخلہ لیا تھا۔ دونوں خاندانوں کا ریکی خاندانی تعلق تھا۔ شیریں کے کاغذ میں آ جانے کے بعد وہ ایک دوسرے سے بہت قریب آ گئی تھیں۔ نواب کے سائے کے بعد شیریں، سیورین سے کنارہ کش رہنے لگی تھی۔ سیورین نے اس کی دل جوئی کی کوشش کی تو شیریں سر جھکا کے رہ گئی۔ سیورین نے پہلے تعلیم مکمل کر لی تھی۔ کاغذ سے رخصت ہونے کے بعد وہ ایک دوبار شیریں سے ملنے اس کے گھر گئی لیکن شیریں نے بس جیسے پرانے تعلق کی رسم نبھائی اور سیورین نے اس کے گھر جانا بند کر دیا۔ وہ تو جب شیریں، انتہی سے وابستہ ہوئی تو اسے سیورین سے اپنی بے وضعی، بے سلوکی کا احساس ہوا۔ وہ خود سیورین کے گھر آئی اور دونوں میں جوش اور جذبے سے پرانا تعلق بحال ہوا۔

انتہی نے شیریں کی خواہش کے مطابق ہر ممکن احتیاط کی تھی لیکن کب تک! ایک روز توغ کے خلاف شیریں کی تعلیمی رپورٹ لینے کے لیے تھامس اپنے دوست، کاغذ کے پرنسپل کے پاس پہنچ گیا۔ وہ ایسے وقت کاغذ پہنچا جب چھٹی ہونے والی تھی۔

شیریں اسے وہاں نظر نہیں آئی۔ دن کی آخری کلاس میں اسے کلاس میں ہونا چاہیے تھا۔ پرنسپل سے ملاقات کے بعد تھامس اسے تلاش کرتا ہوا کاغذ کے اس گوشے میں جا نکلا جہاں شیریں اور انتہی ایک دوسرے میں کم تھے۔ تھامس نے دور سے انہیں دیکھ لیا تھا مگر وہ ان کے قریب نہیں گیا۔ شیریں اور انتہی کو کچھ احساس نہ ہو سکا کہ تھامس ان کا گھر آ

ہے۔ کوئی اور باپ ہوتا تو وہاں سے چلا جاتا لیکن وہ تھامس تھا۔ وہ ان دونوں کے باہمی روابط کا اندازہ کرنے لیے اپنی جگہ ٹھہرا یا پھر آہستہ آہستہ ان کے پاس گیا۔ اسے سر پہ کھڑا دیکھ کے دونوں ہڑ ہڑا

بازی (139)

بازی (139)

بازی (139)

بازی (139)

بازی (139)

بازی (139)

بازی (139)

بازی (139)

بازی (139)

بازی (139)

بازی (139)

گئے۔ تھامس نے ان سے کچھ نہیں کہا، ایک لفظ بھی۔ وہ شیری کو ساتھ لے کے گھر چلا گیا۔ شیری نے بھی اس سے کوئی کلام نہیں کیا۔ دونوں باپ بیٹی نے ایک دوسرے سے کچھ اور کئی بات نہیں کی تھی۔ دوسرے دن تھامس نے شیری کو کالج جانے نہیں دیا لیکن خود کالج جا کے پرنسپل سے انھونی کو کالج سے نکال دینے کا مطالبہ کیا۔ یہ بات ایسی نہیں تھی کہ انھونی کو کالج سے نکال دینے کا جواز بنتی۔ پرنسپل نے انھونی کو متنبہ کرنے کا وعدہ کیا۔ تھامس نے پھر خود شیری کے ساتھ کالج آنا جانا شروع کر دیا۔ وہ کالج چھلنے اور بند ہونے تک اس پاس منڈلاتا رہتا۔ عین وقت پر شیری کو گھر لے جانے کے لیے کہیں سے نمودار ہو جاتا۔ اس نے شیری کو پھر نڈھال کر دیا تھا۔ شیری نے کسی ذریعے سے کچھ عرصے کے لیے انھونی کو دور دور رہنے کی ہدایت کر دی تھی۔ انھونی کچھ دنوں تک تو برداشت کرتا رہا پھر اس نے جرات کی اور ایک شام تھامس کے گھر پہنچ گیا اور اس نے کسی رد و قدح کے بغیر شیری سے شادی کا دعوا کر دیا۔ تھامس نے تمام تر بردباری اور تحمل سے سنا اور کسی قسم کے رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ انھونی نے اسے جتلیا کر شیری کی مرضی بھی یہی ہے۔ ان دونوں نے ہمیشہ ساتھ رہنے کا عہد کیا ہے اور وہ شیری کے حصول کے لیے کچھ بھی کر کر سکتا ہے۔ مناسب ہوگا کہ تھامس ان دنوں کی خوشی کی خاطر ہاں کر دے۔ انھونی کا تیور سرکشانہ تھا۔ تھامس کو یقیناً ناگوار ہوا ہوگا۔ جواب میں اس نے مناسبت سے کہا کہ اسے سوچنے کا وقت دیا جائے۔ انھونی کے پاس کیا چارہ تھا۔ وہ چھپے اور کھپے سے تو تھامس سے اتر نہیں کرا سکتا تھا، دوبارہ آنے کا کہہ کر ناشارونامراداؤں چلا آیا۔

شیری بہت خوف زدہ تھی کہ اس کے باپ نے ایک بار پھر مہلت طلب کی ہے۔ خدا خیر کرے۔ اس نے اپنی راز داں سیوریں کے توسط سے انھونی

کو اپنا خیال رکھنے کی تاکید اور سردست خاموش رہنے کی اجازت کی۔

انھونی نے اس کے بعد صبر آزمائیت گزارا۔ تھامس عرصے سے سرکاری ملازمت میں تھا اور اپنے گورے افسر کا نکلنے تبادلہ ہو جانے کے بعد اس نے طویل رخصت لے لی تھی۔ پولیس اور دیگر سرکاری محکموں میں اس کا اچھا اثر و رسوخ تھا۔ سبھی واقف تھے کہ پٹنے میں ایک مدت سے تعینات گورے افسر کا وہ کس قدر پسندیدہ ماتحت تھا۔ تھامس نے انھونی کو کالج سے نکلوانے کی کوشش جاری رکھی اور ناکام ہوتا رہا، البتہ پرنسپل کو مجبور کر کے شیری اور انھونی پر طرح طرح کی سختیاں، پابندیاں عائد کروانے میں کامیاب ہو گیا۔ پرنسپل نے دونوں کو خبردار کر دیا تھا کہ آئندہ شیری کے باپ تھامس کو کوئی شکایت ہوئی تو دونوں کو کالج سے فارغ کر دیا جائے گا۔ دونوں دور دور سے بس ایک دوسرے کی صورت دیکھتے اور دیکھتے رہ جاتے۔ بات کرنا تو دور کی بات ہے، وہ قریب بھی نہیں آتے۔ ان کے گہرے ربط و مضابطہ پر تھما جانے والے کالج کے بعض شورہ پیش طالب علم ساتھیوں کو انہیں ستانے اور زچ کرنے کا ایک موقع ہاتھ آ گیا تھا۔ دونوں کی تعظیم متاثر ہونے لگی۔ کالج میں ان سے ہم دردی رکھنے والے دوست بھی تھے۔ ان کے ذریعے برائے نام نامہ و پیام کا سلسلہ ممکن ہو گیا تھا۔ وہ ایک دوسرے کو آرزو بخش کا یہ وقت گزر جانے کا آسرا دلاتے اور اپنے عزم، اپنے عہد کا اعادہ کرتے رہتے تھے۔ ان کی ناقص درسی کارکردگی پر ایک دن پرنسپل نے دونوں کو الگ الگ طلب کر کے سخت کہا لیکن دونوں کا کہیں دل نہیں لگتا تھا، کلاس میں، کتابوں میں، گھر میں، نہیں بھی۔ دونوں کو گرد و پیش کا کچھ ہوش ہی نہ رہا تھا۔ دور ہو جانے کے بعد وہ ایک دوسرے کے اور قریب ہو گئے تھے۔ چھٹیاں ہوئیں تو اور قیامت

آگئی۔ شیریں گھر میں بند ہوگئی۔ کالج میں دید و باز دیکھ کر ایک رعایت بھی، وہ بھی نہ رہی۔ ناچار انتھونی نے شیریں کے گھر کے گرد چکر کاٹنے شروع کر دیے۔ کہیں کسی کھڑکی، روزن، کسی اوٹ سے شیریں کی ہنسل دکھائی دے جائے۔ انتھونی، محلے والوں کی نظروں میں آگیا تھا۔ تھامس کی شکایت پر پولیس اسے تھانے لے گئی۔ پولیس کو جواز تراشنے کا ہنر آتا ہے اور سوخون بھی معاف ہوتے ہیں۔ کئی دن تک وہ جو روٹم کی مشق کرتے رہے، کئی دن تک انہوں نے انتھونی کو روکے رکھا اور ایسی حالت کر دی کہ دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے میں کئی دن لگ گئے۔

انتھونی اپنے آپ سے مجبور تھا۔ اس نے پھر حوصلہ کیا۔ اتنے آزار اور رسوائیوں کے بعد تھامس اسے اپنے گھر دیکھ کے حیران و پریشان تو ضرور ہوا ہوگا لیکن اس نے خود کو قابو میں رکھا اور سنجیدگی و سرد مہری سے پھر انکار کر دیا۔ اس مرتبہ اس نے وجہ بھی بتائی کہ انتھونی اس کی ماہ جمال بیٹی کے لیے کسی طور اہل نہیں ہے۔ پہلے وہ کچھ کر کے دکھائے، تعلیم حاصل کرے۔ اچھی ملازمت یا کوئی معقول کاروبار کرے تب تھامس کے پاس آئے، تھامس ہم دردی سے غور کرنے کا وعدہ کرتا ہے۔ یہ بڑی کڑی شرطیں تھیں۔ دیوانوں سے کہا جائے کہ وہ ایسے ہی دیوانگی چھوڑ دیں۔ دیوانگی کا سبب بھی تو پہلے دیکھا اور دور کیا جائے۔ مایوسی میں انتھونی ہوش و حواس سے اور بے گانہ ہونے لگا۔ بیٹے کی دگرگوں حالت دیکھ کے اس کے باپ نے تھامس کی خدمت میں خود حاضری دی اور تھامس کو راضی کرنے کے لیے پٹنا کے کئی بااثر لوگوں کو بھیج دیا۔ وہ لوگ تھامس کے پاس گئے اور انتھونی کی شرافت، سچائی، دیانت، جواں سالی اور شیریں سے اس کی والہانہ شینگی اور شیدائیت کے واسطے دیے۔ تھامس اس سے مس نہ ہوا۔

کالج کھلنے پر انتھونی اور شیریں نے کالج جانا شروع کر دیا تھا۔ تھامس کا وہی معمول تھا۔ صبح بیٹی کو کالج پہنچانے جانا اور کالج بند ہو جانے پر ساتھ لے جانا۔ شیریں اور انتھونی کی حالت سے متاثر ہو کے ان کے چند قریبی دوستوں نے کالج کے اوقات کے دوران دونوں کی ملاقات کا بندوبست کر دیا۔ شیریں اور انتھونی بہت سہ چکے تھے۔ اب انہیں ایک دوسرے سے جدا ہونے کا یارا نہیں تھا۔ ساتھیوں کے تعاون سے وہ کسی طرح ایک دن کالج سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔

پھر تیسری بار انتھونی، شیریں کے ساتھ تھامس کے گھر گیا اور اس نے بتایا کہ انہوں نے چرچ میں شادی کر لی ہے۔ بہتر ہے، تھامس خوش دلی سے انہیں قبول کر لے۔ شیریں تو اب انتھونی کے ساتھ اس کے گھر جا رہی ہے، اپنے گھر، جواب اس کا اصل اور مستقل گھر ہے۔ ماں باپ کے گھر سے ہر لڑکی کا تعلق عارضی ہوتا ہے۔

تھامس گنگ رہ گیا، کچھ نہ کہہ سکا، پاس بھری، حسرت بھری نظروں سے بیٹی کی طرف دیکھا گیا۔ شیریں کی خاموشی اس کے لیے اور تازیانہ ہوئی۔ شیریں، انتھونی کے گھر آگئی۔ دونوں کو توقع تھی کہ اب تھامس کی باری ہے، وہ ان کے پاس ضرور آئے گا اور آخر کار ان پر اپنی شفقتیں ارزاں کرے گا۔ وہ نہیں آیا۔ دو تین روز ہی گزرے ہوں گے انہیں معلوم ہوا، تھامس ختم ہو چکا ہے۔ اس نے خود کو آگ لگا لی تھی۔ اس کے ساتھ مکان کا کچھ حصہ بھی جل گیا ہے۔ جس وقت بڑی پینچ، مکان تو انہوں نے بچایا، تھامس کو نہ بچا سکے۔

شیریں کو اپنے باپ سے ایسی سفاکی کی امید نہیں تھی۔ وہ تو ذہیر ہوگئی۔ وصیت کے مطابق، آبائی مکان، زرعی زمین، نقدی کی شکل میں عمر بھر کی جمع پونجی، شیریں کی ماں کے زیورات، سارا کچھ چرچ کے نام، چرچ کی نذر کر دیا گیا تھا۔ پادری کو علم تھا

کہ شیریں، تھامس کی اکلوتی اولاد، وہی اس کی جائیداد کی اصل وارث ہے اور شیریں کے سسرال کی مالی حالت اتنی اچھی نہیں ہے، شیریں کچھ بھی ساتھ لے کے سسرال کے گھر نہیں گئی ہے۔ اسے اختیار تھا وہ تھامس کا عطیہ قبول کر لے یا مسترد کر دے۔ اس نے آدمی ملکیت شیریں کو واپس کرنا چاہی۔ شیریں نے پادری کی پیشکش منظور نہیں کی۔ پادری نے اپنے نائبین سے صلاح و مشورہ کر کے تمام تر جائیداد شیریں کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا۔ شیریں نے اسے بھی مسترد کر دیا اور انتھونی کے ساتھ حسرت کی زندگی کو ترجیح دی۔ اب انتھونی کے جانے کے بعد گھر میں صرف ایک مرد رہا ہے، انتھونی کا چھوٹا بھائی، اور وہ ابھی بہت چھوٹا ہے۔

مجھے کیا کہنا چاہیے تھا، کچھ نہیں معلوم تھا۔ سیوریں کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی تھی۔ آنسو بڑی راحت ہوتے ہیں۔ میری آنکھیں تو آنسوؤں سے بھی عاری تھیں۔ ایسا لگتا تھا، جیسے سیوریں نے جان بوجھ کر مجھے کچھ بتلانا چاہا ہو۔ میں اس سے کیا کہتا، ایک انتھونی اور ایک شیریں کیا، جانے کتنے ایسے ہی بس ایک آدمی کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔ ایک آدمی، وہی مستعد، وہی محور، وہی منزل۔ ہر راستے میں انہیں وہی ایک شخص نظر آتا ہے۔ وہ ایک آدمی نہ ملے تو کیا مال و زر، کیا طاقت و اقتدار، کیا علم و ہنر، سب سچ، سب پتھر، سب مٹی ہے۔ ایک آدمی ہی سبھی مٹی کے لیے سب سے بڑا خزانہ ہوتا ہے۔ وہ خزانہ مل جائے تو اسے اپنی زندگی مل جاتی ہے، اسے دنیا مل جاتی ہے۔ ایک آدمی، ایک آدمی کا حاصل، بانی سارا کچھ ہے معنی، بے جواز، لا حاصل۔ ایسا کیوں ہے اور کیا ہے یہ سب کچھ۔ یہ کچھ وہی بتا سکتا ہے جو اپنے مطلوب کے زنداں کا امیر ہے اور مطلوب اس کے زنداں کا۔ وہ جو دو آدمی، الگ چہروں، الگ رنگوں کے نظر آتے ہیں، وہ تو ایک ہی ہوتے ہیں۔ ایک کے بغیر دوسرا

ناکمل، پہلا بھی ناکمل، دوسرا بھی ناکمل۔ ان کی تکمیل یک جہتی کی صورت ہی میں ممکن ہوتی ہے۔ "شیریں تو مر جائے گی۔" سیوریں ہلکتی آواز میں بولی۔ "اس کا تو اب کوئی نہیں رہا۔ وہ تو لٹ گئی ہے۔"

"تم۔ تم اس کے پاس جاؤ تو کہنا کہ زندگی یہی تماشا، یہی شعبہ بازی کرنی رہتی ہے۔ کچھ نیا نہیں ہے۔" میں نے نئی سے کہا۔ "اس کے پاس جانے کی ہمت نہیں ہے مجھ میں۔"

"تمہیں تو زیادہ سے زیادہ اس کے پاس ہونا چاہیے۔" "میں چلی بھی جاتی لیکن ڈاکٹر رائے..... وہ بہت سخت آدمی ہیں۔ کچھ بھی ہو جائے، زمین مل جائے، آسمان پھٹ پڑے، ان کا حکم ہے کہ ڈیوٹی پر حاضر رہو۔" سیوریں نا تو اتنی سے بولی۔ "اور ان سے اجازت لے بھی لیتی تو وہاں جا کے کیا کرتی، شیریں سے کیا کہتی، اسے کیا دلا سادتی کہ انتھونی واپس آ جائے گا۔"

"کوئی واپس نہیں آتا مگر جو لوگ موجود ہیں، جو اپنے ہیں، وہی دکھ درد بتاتے ہیں۔ ان کی موجودگی بھی دلاسا ہوتی ہے۔ اور ڈاکٹر رائے ایسے سخت آدمی بھی نہیں ہیں۔"

"مگر میں..... مجھ سے شیریں کی حالت دیکھی نہیں جائے گی۔ میں نے وارڈ بوائے سے پوچھا تھا۔ کہتا تھا کہ وہ تو کچھ ہلکتی ہے نہ سنتی ہے، نہ پتلیں ہلکا کاتی ہے۔ کسی کو پہچان نہیں رہی ہے، وہ تو....." سیوریں پھر سسکتے لگی۔ "یہ انتھونی..... کیا ضرورت تھی اسے ان لوگوں کا چھپا کرنے کی..... بالکل پاگل..... بالکل آدمی تھا وہ۔"

میں چپ رہا۔ "شیریں کے لیے انتھونی، تھامس کو پسند نہیں تھا۔ جو تھامس کو پسند نہیں آتا تھا، اس کا بھی انجام

ہوتا تھا۔ تھامس کی روح تو بے گل ہوگی۔“
 سیورین نے سارا الزام روح پر ڈال دیا تھا۔
 یہ روح کا عذر بھی انسانوں نے خوب وضع کر لیا
 ہے۔ اسے کیا معلوم تھا، نرس ایبی جانتی تھی کہ وہ
 لوگ، رات کے آخری پہر آنے والے لوگ کس
 ارادے اور کس تعاقب سے آئے تھے۔ انھونی تو
 چارباہن گیا۔ میں اسپتال میں نہ ہوتا تو وہ لوگ اس
 طرف کا رخ کیوں کرتے۔ انھونی میں بڑا جوش اور
 جذبہ تھا۔ اسے یہی کرنا چاہیے تھا۔ اس کی جگہ میں
 ہوتا تو یہی کرتا۔

”تم شیری کے پاس جاؤ تو.....“

میری بات پوری ہونے سے پہلے سیورین
 ڈوٹی آواز میں بولی۔ ”ہاں میں جاؤں گی اس کے
 پاس..... مجھے جانا ہی ہوگا۔“

”اس سے کہنا کہ انھونی واپس نہیں آسکتا۔
 انھونی کی دو بہنوں اور بھائی کی ذمے داری ہے اس
 پر۔ وہی اب گھر سنبھال سکتی ہے۔ وہ ایک پڑھی لکھی
 لڑکی ہے۔ اور.....“

”مگر شیری کے پاس اب کیا رہا ہے۔“
 سیورین مایوسی سے بولی۔ ”کچھ بھی نہیں بچا۔“
 ”ایک بات کہوں تم سے؟“ میں نے آہستگی
 سے کہا۔

”ہاں ہاں۔ وہ بے تابی سے بولی۔
 ”ایک صورت ممکن ہو سکتی ہے۔ جو میں کہنا
 چاہتا ہوں، اسے غور سے سننا اور پہلے سن لینا، پھر
 کچھ کہنا۔“

”کیا بات ہے؟“ وہ ہزبڑا سی گئی۔
 ”شیری کی زندگی گزارنے، یہ برا وقت نالنے
 کے لیے اتنی رقم دی جا سکتی ہے کہ اسے کوئی پریشانی
 نہ ہو۔ یہ اسپتال کا مکان بھی اس سے چھین جائے
 گا۔ کیوں کہ انھونی کے چلے جانے کے بعد وہ یہاں
 زیادہ دیر نہیں رہ سکتی۔ وہ نیا مکان خرید لے۔ کم از کم
 آئندہ پانچ سال تک کے لیے اس کی بہتر گزار بھر کا

انتظام کیا جا سکتا ہے۔ اس مدت میں وہ یقیناً اس
 قابل ہو جائے گی کہ اپنے آپ بھی کچھ کر سکے، اپنی
 ادھوری تعلیم مکمل کر سکے۔ انھونی کے چھوٹے بھائی
 کی تعلیم، اس کی بہنوں کی شادی کر سکے۔ یہ مالی قسم
 کے سہارے بڑی تسلیم ہوتے ہیں۔ ذرا اس کی
 حالت سمجھو تو اسے یہ بتا دینا اور میرا نام کسی طور نہ
 آئے تو مناسب ہوگا۔ یہ رقم کسی وقت بھی ادا کی
 جا سکتی ہے۔ باقی شیری اور اس کے خاندان کو کسی
 اور چیز کی ضرورت ہو تو کسی ذریعے سے مجھے مطلع
 کیا جا سکتا ہے۔ میرے دوست اکبر علی خاں بننے ہی
 میں رہتے ہیں، وہی جن کے ساتھ دو پہر ہم نے
 کھانا کھایا تھا۔ وہ ایک بڑے وکیل ہیں اور بہت
 نفیس آدمی۔ میری درخواست پر وہ شیری اور اس
 کے گھر کی خبر گیری کر سکتے ہیں، اگر تم اس معاملے
 سے الگ رہنا چاہو۔“

سیورین مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگی۔
 ”مجھے شبہ ہے، ایک خود دار لڑکی کو یہ سارا کچھ
 قبول کرنے میں تامل ہوگا مگر اسے یقین دلانا تمہارا
 کام ہے کہ میری کوئی غرض اس سے وابستہ نہیں
 ہے۔ میں تو یہاں رہوں گا بھی نہیں۔“ میں نے
 کہا۔ ”وہ آمادہ ہو جائے تو مجھے خوشی ہوگی۔ اس
 بد نصیب سے کہنا کہ کوئی بھی ایسی اعانت انھونی کے
 نقصان کی تلافی نہیں کر سکتی مگر اب انھونی نہیں
 ہے۔ اس کے بغیر زندگی تو گزارنی ہے۔ اور سنو!
 شیری سے ہم دردی اپنی جگہ ہے لیکن یہ میرے اپنے
 اطمینان، اسے سکون کی بات ہے۔“

”آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“ سیورین سرا سہمہ
 انداز میں بولی۔
 ”تم نے جو سنا، وہی میں نے کہا۔“ میں نے
 نپٹی لی آواز میں کہا۔

سیورین آگے کچھ نہ بول سکی اور مجھ سے بھی
 کچھ نہ کہا جا سکا۔
 اس سے پہلے کہ سیورین مجھ سے غیر ضروری

سوال کرتی، ایک نظر ٹھٹھل کو دیکھ کے میں کمرے
 سے باہر آ گیا اور اسپتال کے مرکزی عمارت تک چلا
 گیا۔ شام کو مریضوں سے ملاقات کا وقت شروع
 ہو چکا تھا۔ صدر دروازے سے مریضوں کے
 دوست اور اعزاء کے دستے اسپتال میں داخل
 ہو رہے تھے۔ عمارت کے سامنے کے سبزہ زار میں
 دو پہر ٹھٹھی بھیڑ نہیں تھی۔ انھونی کی تدفین میں
 شریک ہونے والے اب وہاں نہیں تھے۔ انھونی کا
 جنازہ اٹھایا جا چکا ہوگا۔ ممکن ہے، انہوں نے اسے
 خاک کے سپرد بھی کر دیا ہو۔ مجھے یاد نہیں، کہیں بڑھا
 تھا، جو کچھ اس دنیا میں نظر آتا ہے، سب مٹی کی ششکلیں
 ہیں۔ اپنی عمر پوری کرنے کے بعد ساری ششکلیں مٹ
 جاتی ہیں اور سب مٹی ہو جاتا ہے۔ اور کسی نے کہا
 تھا، آدمی کی ساری زندگی فریب کی زندگی ہوتی ہے،
 زندہ رہنے کا فریب، دیکھنے، سننے اور بولنے کا
 فریب۔ جس کا انجام فنا ہے، اس کا دیکھنا، سننا اور
 بولنا کیا معنی رکھتا ہے۔ سب سنا ہوا مٹی، سارا دیکھا
 ہوا مٹی، سارا بولا ہوا مٹی ہے۔ انھونی مر گیا۔
 لوجوانی میں مر گیا۔ کچھ اور وقت زندہ رہتا تو بھی
 مر جاتا۔ لوگ اسے دفن کے قبرستان سے لوٹ رہے
 ہوں گے۔ انہیں جلدی بھی ہوگی زندگی کی طرف
 لوٹنے کی۔ جانے کتنے ادھورے کام یاد آ رہے
 ہوں گے۔ قبرستان سبھی کو برا لگتا ہے حالانکہ
 سارے راستے اسی کی طرف جاتے ہیں قبرستان یا
 ششانشان گھاٹ یا برج خوشاں یا کوئی اور۔ وہی ایک
 سوال، آدمی پیدا کیوں ہوتا ہے کہ مر جاتا ہے۔ کسی
 کے پاس اس کا جواب نہیں۔ موت پر سب کا اختتام
 ہو، اس زندگی پر کیا ناز، کیسا افتخار، کس بات کی
 محنت، زندگی سے بڑا طلسم شاید کوئی نہیں، اور کوئی
 طلسم مستقل نہیں ہوتا۔

مرکزی عمارت سے دائیں طرف راہ داری
 میں جاتے ہوئے مجھے چند پولیس والے بھی نظر
 آئے۔ وہ ابھی تک اسپتال کے کونے گوشے ٹول

رہے ہوں گے۔ کتے ان سے زیادہ چست ہوتے
 ہیں، بوسوگتھ تو لیتے ہیں۔ ان کی نظروں میں آنے
 سے میں نے پہلو تھپی کی اور ادھر ادھر گھومتا رہا۔ میرا
 دل گھبرا رہا تھا۔ جانے کیوں، جیسے میں کچھ بھول رہا
 ہوں، مجھ سے کوئی چوک ہو رہی ہو، کچھ ہونے والا
 ہے جیسے۔ دھوپ کے آثار رہ گئے تھے کہ میں کمرے
 میں واپس آ گیا اور یہ دیکھ کے مجھے اپنی آنکھوں پر
 یقین نہیں آیا۔ ڈاکٹر رائے اور ایک نوجوان ڈاکٹر
 ٹھٹھل کے بستر کے گرد موجود تھے اور ٹھٹھل بیٹھا ہوا
 تھا۔ بستر کے سرخانے، تکیوں سے ٹیک لگائے،
 آنکھیں کھلی ہوئی تھیں، سیورین تجھے سے اسے کوئی
 مشروب پلا رہی تھی۔ میں جھپٹتا ہوا ان کے پاس
 پہنچا۔ ٹھٹھل نے نگاہیں گھما کے ایک ٹاپے کے لیے
 تجھے دیکھا اور نقاہت سے نظریں جھکا لیں۔ میرے
 جی میں آیا، ڈاکٹر رائے کے ہاتھ چوم لوں، کس
 طرح اس سے ممنونیت کا اظہار کروں۔ ڈاکٹر رائے
 ٹھٹھل کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے تھا اور تھمتانی
 آواز میں اس کی استقامت کی داد دے رہا تھا۔ معاً
 اسے خیال آیا اور اس نے ہندوستانی میں کہا۔ ”تم
 ایک اچھا لڑیا (جنگ باز) ہے، بہت اچھے، بہت
 اچھے۔ اپنے بھائی کو دیکھا؟ اسے اب بھی شبہ
 ہے۔“ آخری جملہ اس نے پھر انگریزی میں کہا۔

ٹھٹھل کو جواب دہی کا پارا نہیں تھا لیکن اس کا
 چہرہ میرے سامنے تھا۔ چہرہ تار ہا تھا کہ وہ سب کچھ
 سن رہا اور دیکھ رہا ہے۔ نرس سیورین بہت توجہ اور
 نفاست سے اسے مشروب پلا رہی تھی۔
 ”کیا حال ہے اب؟“ میری آواز ساتھ نہیں
 دے رہی تھی۔ ٹھٹھل نے سن لیا تھا، آنکھوں آنکھوں
 سے اطمینان کی تلقین کی۔ ”ٹھٹھل تو ہوم؟“ میں نے
 ہذیبانی انداز میں پوچھا۔

ٹھٹھل نے ڈاکٹر رائے کو اشارہ کیا تھا یا ڈاکٹر
 ٹھٹھل کو کسی اضطراب سے دوچار کرنا نہیں چاہتا تھا،
 میرا بازو بچڑ کے وہ مجھے اس کے بستر سے دور لے

آیا۔ ڈاکٹر کی ناراضی کے خیال سے میں نے بہ جبر
تعمیل کی۔

ڈاکٹر رائے دروازے کے پاس آ کے رک گیا
اور اس نے پلٹ کے سیورین کو ہدایت کی کہ وہ
شعل کو دوبارہ لٹا دے۔

سیورین نے پیٹا گھما کے بستر کا سر حانا نیچے
کر دیا۔

ڈاکٹر رائے پھر میری طرف متوجہ ہوا اور اچکتی
آواز میں بولا۔ ”کہاں تھے تم اتنی دیر سے؟“

”نہیں نہیں، یہیں اسپتال میں۔“ میں نے
ہکلاتے ہوئے کہا۔ ”ایسے ہی اسپتال کا ایک چکر
لگے آ گیا۔ کیا حال ہے اب ان کا ڈاکٹر
صاحب؟“

”تم نہیں دیکھ رہے؟“ وہ مسکرا کر بولا۔
”مجھے تو..... مجھے تو.....“ میں نے بے ربطی سے
کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب آپ فرشتہ آدمی ہیں۔ لوگ سچ
کہتے ہیں کہ آپ کے ہاتھ میں.....“

”تم فضول باتیں بہت کرتے ہو۔“ وہ میری
بات کاٹ کے بولا۔
”آپ کو معلوم نہیں، میں..... میں کس
قدر.....“

اس نے پھر مجھے کچھ کہنے نہیں دیا۔ دیکھ رہا ہوں
تمہیں اچھی طرح اچھے لڑکے۔“

اس نے عادت کے مطابق میری کمر جھکی۔
”رات کو آؤں گا پھر..... اور سنو! نہیں پہلے سے بہتر
دیکھنا چاہتا ہوں ورنہ تمہیں بھی انجکشن لگانا پڑے
گا۔“

”ڈاکٹر صاحب، ڈاکٹر صاحب! آپ کچھ دیر
بٹھیں نا۔“ میں نے وارنٹنگی سے کہا۔

”نہیں، مجھے جانا ہے، اسپتال میں سب سبے
ہوئے ہیں، مجھے معمول سے زیادہ وقت دینا پڑ رہا
ہے اور اٹھوٹی! اس نوجوان کے گھر بھی جانا ہے۔ سنا
ہے، اس کی بیوی ٹھیک نہیں ہے، وہ حاملہ ہے،

دیکھتے ہیں، اسے شاید اسپتال میں داخل کرنا
پڑے۔ بے چارہ اٹھوٹی۔“ ڈاکٹر رائے افسردگی
سے بولا۔ ”تم نہیں جانتے، وہ کتنا پیارا لڑکا تھا۔“

مجھ سے سر اٹھایا نہیں گیا۔ ڈاکٹر رائے اپنے
نوجوان ساتھی ڈاکٹر کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔

اس کے جاتے ہی سیورین کسی موج کی طرح
میری طرف لپٹی۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں،
شگفتہ آواز میں مبارک باد دینے لگی۔ مجھے نہ جانے
کیا ہوا، اپنا اختیار ہی نہیں رہا۔ میں نے بڑھ کے
ہاتھ پھیلائے اور اسے گلے سے لگایا۔ دوسرے ہی
لمحے سیورین کی کسمپاس سے مجھے احساس ہوا۔
میرے بازو اٹھنے لگے اور میں فوراً اس سے جدا
ہو کے پیچھے ہٹ گیا۔

سیورین کے چہرے پر پانک آگ سی بھڑک
اٹھی تھی اور اس کا دھان پان سراپا لہرا گیا تھا۔ مجھے
بڑی نفرت ہوئی اور سلیقے سے معافی بھی نہ مانگی
جاسکی۔

وہ ایک اعلا طرف لڑکی تھی، مسکرا کر رہ گئی اور
مجھے مدامت سے بچانے کے لیے کہنے لگی۔ ”کیا
خیال ہے، گر باگرم کافی پی جائے۔“

میں نے کسی پائل کی طرح بے تابانہ سر ہلا کے
اتر کر کیا۔

نرس ایسی وقت پر آ گئی تھی۔ سیورین چلی گئی،
ایسی کی آمد کے خاصی دیر بعد شعل کے دن بھر کے
احوال، ڈاکٹروں کی آمد اور ہدایات، دواؤں کی
تبدیلی سے آگاہ کرنے کے بعد۔ چلتے وقت اس
نے مجھ شرم سار کو خدا حافظ کہا اور اپنا خیال رکھنے کی
رہی نصیحت بھی کی۔ میں خالی بیٹھا تھا، اسے صدر
دروازے تک پہنچانے کا خیال آیا تھا لیکن میرے
قدم کسی نے روک لیے۔

”اٹھ بچے، رات پوری طرح کھل چکی تھی۔ ایسی
صحت پٹ اپنے کاموں سے صحت کے میرے پاس
آ کے بیٹھ گئی اور تعمیل آواز میں بولی۔“ کیا حال ہے

”اب؟“

میرا حال کیا، میں بالکل ٹھیک ہوں مجھے کیا ہوا
ہے۔“ میں نے شعل کی طرف ہاتھ اٹھا کے
کہا۔ ”حال تو ان صاحب کا دیکھو، ان سے
پوچھو۔“

”تمہارا حال اس سے بندھا ہوا ہے۔“ وہ
چمک کے بولی۔ ”تم دونوں ہم زاد ہونا۔“

”تو پھر پوچھتی کیوں ہو۔“ میں نے مصنوعی
ترشی سے کہا۔

”میں نے سارا کچھ دیکھ لیا اور سیورین نے
مجھے بتایا ہے، سب ٹھیک چل رہا ہے۔“ ایسی مختاط
انداز میں باتیں کرتی تھی، کہنے لگی۔ ”اب اور
بہتری کی امید کی جاسکتی ہے۔“

”شکر ہے، تم بھی پر امید ہو۔“ میں نے مسکرا
کے کہا۔

”تم نے ایسا کیوں کہا۔“ اس کی تیوری پر بل
آگئے۔ تم سے میں نے کہا تھا، میں ہمیشہ پر امید
رہتی ہوں۔“

”مگر اظہار میں خاصی سنجوں ہو۔“ میں نے
ازراہ لطف کہا۔

”اوہ..... اوہ، تم شرارتی بیچے۔ اب تم کسی
بدلی بدلی باتیں کر رہے ہو۔“ وہ میرے شانے پر
آہستہ سے مکا مارتے ہوئے بولی اور اچانک سنجیدہ
ہو گئی، کہنے لگی۔ ”معلوم ہے، دن بھر میں پریشان
رہی ہوں۔ رات کا واقعہ کیسا ہولناک تھا۔ دن بھر
تمہارا خیال رہا، پھر تم کسی مصیبت میں نہ گھر جاؤ۔
آتے ہی میں نے سیورین سے خبریت دریافت
کی۔ اس نے ایسا ویسا کچھ نہیں کہا تو سکون آیا۔ تم
تازہ پھر کوئی ادھر آیا تو نہیں۔“

”ابھی تک تو نہیں، اسپتال میں پولیس بیٹھی
ہوئی ہے اور خاک چھان رہی ہے۔“ میں نے تندگی
سے کہا۔

”تمہارے پاس تو نہیں آئے وہ؟“ ایسی نے

فکر مندی سے سکرار کی۔
”نہیں آئے تو آجائیں گے۔ اس طرف، ان
خاص کمروں کی طرف رخ کرتے ہوئے ان کے
قدم اکڑتے ہوں گے۔“

”تم نے سیورین کو تو کچھ نہیں بتایا؟“

”اسے کیوں پریشان کرنا، وہ تو تمہاری
دخست دور کرنے کے لیے تمہیں سارا ماجرا بتانا
پڑا۔“

”تم نے اچھا کیا ورنہ کیسے کیسے وسوسوں، وہم
وگمان میں گھری رہتی۔ ایسی گوجھر جھری آگئی۔
”دن بھر سو جی رہی، اگر مجھ سے غلطی ہو جانی، دروازہ
کھول دیجی میں؟“

”نہیں کھولتیں تم۔“

”اتنے یقین سے تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟“

”چوں کہ میں جاگ رہا تھا۔“

”اور اگر دروازہ کھلا ہوتا؟“

”وہ ایسے اندر نہیں آجاتے، پہلے پوچھتے
ضرور۔ ان کی نیت بھرمانہ تھی۔ ایسی صورت میں
پھونک پھونک کے قدم اٹھایا جاتا ہے۔“

”لیکن..... لیکن.....“ ایسی کی آواز پر خوف
غالب تھا۔ ”بس خداوند نے کرم کیا، میں تو یہی کہتی
ہوں۔“ اس نے سینے پر کراس بنایا۔

”چھوڑو وہی اب، کچھ مت سوچو۔“ میں نے
بے نیازی سے کہا۔ ”آگے کی طرف دیکھو۔“

”آگے کی طرف! ایسی کا چہرہ اور گیسپر
ہو گیا۔ آگے کا ہی تو سوچ سوچ کے دل ہولنا
ہے۔“

”اور کیا اختیار ہے ہمارا آگے پر؟“

”ظاہر ہے، نہیں ہے۔“ ایسی اظہار ہی انداز
میں بولی۔ ”تو فکر کا سے کی، ہم اپنی طرف سے
احتیاط کی پوری کوشش کریں گے۔ یہی کر سکتے
ہیں۔“

”تم بہادر بیچے ہو۔“

”بہادر وہاں در گیا۔ ہتھیلی پر جان تو یوں بھی ہر ایک کی رہتی ہے، میری تمہاری، سبھی کی۔ تمہیں یقین سے کہ کل تم موجود ہوگی؟“ اس کی آنکھیں بجھ گئیں۔

”تو پھر کیا.....“ میں نے بے زاری سے کہا۔ وہ چپ ہو گئی اور دیر تک چپ رہی، پھر اس نے خود کو متعین کیا کہ سردست تو زندگی حاوی تھی۔ اس کی آنکھوں میں چمک بجال ہوئی اور وہ پختہ کار عورتوں کی طرح تر پھی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”تو تم نے سیورین پر کیا جادو کر دیا؟“ ”کیسا جادو؟“ میں نے تعجب کا اظہار کیا۔ ”خبر ہے، وہ کیا کہہ کے گئی ہے۔ کہہ رہی تھی، یہاں دوسری بیٹیں ہیں۔ حکم دے کے گئی ہیں کہ مجھے دونوں کا خیال رکھنا ہے۔ دونوں پر نگاہ رکھنی ہے، اور بتاؤں کیا کہہ رہی تھی وہ.....! ایسی کہتے کہتے رک گئی۔“

”کیا کہہ رہی تھی؟ میری شکایت کر رہی ہوگی، مجھ سے بھول ہو گئی۔“ میں نے پشیمانی سے کہا۔ ”کیسی بھول؟“ اس نے چونک کے پوچھا۔ میں کیا کہتا۔ اس کا مطلب تھا کہ سیورین نے اسے کچھ نہیں بتایا۔ میں چپ رہا کہ خاموشی ہی سب سے موثر جواب تھی۔

”کیا بتاؤں، کہہ رہی تھی کہ تم بہت الگ لڑکے ہو، بہت پیارے اور دل کے بڑے۔ وہ کسی کے بارے میں ایسی رائے کم دیتی ہے۔ کافی عرصے سے اسے دیکھ رہی ہوں۔ بہت سنبھلی ہوئی رہتی ہے وہ۔“

”وہ ایک مہربان لڑکی ہے..... سمجھ دار، برا اعتبار سے اچھی۔“

”اور میں! میں بری لڑکی ہوں؟“ وہ ہنس کے بولی۔ ”تم.....!“ مجھے بھی ہنسی آ گئی۔ ”تم ایک بہت پیاری بچی ہو، گڑیا جیسی۔“

اسی وقت دروازے پر اکبر علی خاں نمودار ہوئے۔ کسی لمحے بھی میں ان کی آمد کی توقع کر رہا تھا۔ آتے ہی انہوں نے مجھے نعرہ بلند کیا۔ ”مجھے یقین ہے، کچھ اچھی خبریں سننے کو ملیں گی۔“

میں صونے سے اٹھ گیا اور لپک کے ان کے پاس جا کے میں نے ان کے ہاتھ جکڑ لیے۔ اور جلدی جلدی ساری روداد سنائی کہ ابھی شام کو ڈاکٹر آیا تھا تو اتنے دنوں میں پہلی بار متصل اٹھ کے بیٹھ گیا تھا۔ اس نے کچھ مشروب وغیرہ بھی نوش کیا تھا۔ یہ کہتے ہوئے میری آواز ڈگمگائی۔ اکبر علی خاں نے مجھے بازوؤں میں بھر لیا اور میرا حوصلہ فزوں کرنے کے لیے طرح طرح کے لفظ وضع کرتے رہے۔ اکبر علی خاں کے ساتھ ان کا ملازم لڑکا بھی نفن اٹھائے ساتھ آیا تھا۔

”آنے میں دیر یوں ہوئی کہ امی جان کی طبیعت شام کو کچھ بہتر ہو گئی۔“ اکبر علی خاں کی آواز سے سرت ہلک رہی تھی۔

”یہ تو بڑی اچھی خبر سنائی آپ نے۔“ میں نے خوشی دلی سے کہا۔

”بس، بٹھالیا پاس اپنے۔ میں بھی منتظر تھا کہ کسی طرح ان کی طبیعت کچھ بہتر ہو تو ایک معاملے میں ان کا عندیہ معلوم کروں۔“

”کیسا عندیہ؟“ میں نے تجسس سے پوچھا۔ ”ایسی کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔“ بتاؤں گا، میرا خیال ہے، کھانا گرم سے کیوں نہ پہلے نفن کشائی کی جائے..... اور آپ اطمینان رکھیں، آج زیادہ کھانا نہیں ہے۔ نزہت کہہ رہی تھیں، سارا تو واپس آ جاتا ہے۔“

”آپ یہ زحمت کیوں کرتے ہیں۔“

”وہ صاحب، آپ نے پھر وہی غیر بہت والی بات کر دی۔ ایسا مت کہیے، دل بوجھل ہو جاتا ہے۔“

میں نے معافی چاہی اور عذر کیا کہ گھر میں

والدہ کی بیماری کی حالت میں یہ تکلفات مناسب نہیں لگتے۔ یہاں اسپتال میں کھانے پینے کے اچھے انتظامات ہیں۔

”ہوا کر بس لیکن گھر موجود ہوتے ہوئے آپ باہر کا کھانا کھائیں خواہ کتنا ہی اچھا ہو۔ کم از کم مجھے گوارا نہیں ہے۔“

میرے پاس سر جھکانے کے سوا کیا رہ جاتا تھا۔ ”دو پہر آپ نے سادہ بیٹھے چاولوں سے رغبت کا ذکر کیا تھا۔ میں نے نزہت سے کہا۔ ان سے بس کہنے کی دیر ہوئی ہے..... شاید آپ کو پسند آئیں۔“ سبھی سے غلطی ہوئی دو پہر کسی وقت ایسے ہی بیٹھے چاولوں کی بات میرے منہ سے نکل گئی تھی۔

”آپ جائیں، نزہت اختراعات کی ماہر ہیں، سادہ چاولوں میں زعفران کی آمیزش کر دی ہے۔ شکر پسند ہو تو شکر کے ساتھ، ورنہ شہد بھی ہے۔ دودھ اور بالائی تو ہے ہی ایک چھچھو لیا تھا میں نے۔ واقعی، شہد اور بالائی کے ساتھ ذائقہ ہی کچھ اور نکھر آیا۔“

”پھر تو خاصے کی چیز ہوگی لیکن ذائقہ رائے نے کہا تھا، رات کو بھی آئیں گے۔ ان کے آنے کے بعد ہی اگر.....“

”کوئی مضائقہ نہیں۔“ وہ کشادہ دلی سے بولے۔ ”اصل میں لڑکا، رات کو اپنے گھر واپس چلا جاتا ہے، اسے واپس بھیج دیتے ہیں۔ یہ نفن میں لے جاؤں گا۔“

”آپ کیوں لے جائیں گے، نفن صبح بھی واپس جا سکتا ہے۔“ میں نے کہا۔

ایسی متصل کے بستر کے نزدیک چیزوں کی درستی میں مصروف ہو گئی تھی۔ اس نے کچھ دیر کے لیے ام سے باہر جانے کی درخواست کی۔ یہ معمول کی بات تھی۔ میں اور اکبر علی خاں باہر آ گئے۔ ایسی نے کمرہ بند کر کے دروازے پر پردہ کھینچ دیا۔ ہم دونوں راہ داری میں چلتے رہے اور اکبر علی خاں شہر کے کشیدہ

حالات کے بارے میں بتانے لگے۔ ”شہر پہلے جیسا نہیں رہا ہے۔ جانے کیوں لوگ سب سے سب سے نظر آتے ہیں یا یہ میرا گمان ہے۔“ انہوں نے ہماری آواز میں کہا۔ ”میں ہی شاید کچھ زیادہ محسوس کر رہا ہوں، شاید اس وجہ سے کہ شہر میں جگہ جگہ پولیس کی ٹولیاں گھوم رہی ہیں۔ بازار بھی آج جلد بند ہو گئے۔ قسم قسم کی چھ میکانیاں شہر میں گشت کر رہی ہیں۔ شہر میں عموماً ایسا کچھ ہوتا نہیں، نفل و خون کے واقعات بے شک کبھی کبھار ہو جاتے ہیں لیکن اس بار لوگ کچھ ہراساں سے، حیرت زدہ سے نظر آتے ہیں۔ انتھونی کی موت کا بڑا شہرہ ہے۔ شہر میں عیسائیوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے لیکن یہ نوجوان انتھونی کچھ زیادہ ہی مقبول تھا۔ کچھ اس کی مقبولیت، کچھ اس کی جاں بازی، اس کی دردناک موت کی نوعیت سے لوگوں کو بڑی ہم دردی محسوس ہوئی۔ سنا ہے، اس کے جنازے میں بھی شریک تھے، کیا ہندو، عیسائی اور کیا مسلمان۔ انہوں کا تو آپ جانتے ہی ہیں، پر لگے ہوتے ہیں اور سر سبز نہیں ہوتے۔ ہندوستان میں افواہ طرازی سب سے مرغوب مشغلہ ہے۔ ناواقفیت، جہالت اور افواہ کا شاید کوئی گہرا تعلق ہے۔“

میں سنتا رہا۔ جب تک ایسی نے باہر آ کے ہمیں اجازت نہ دی، ہم راہ داری میں گھومتے رہے۔ کمرے میں آ کے صونے پر بیٹھے ہی تھے کہ باہر نفل چل ہوئی، ہم دونوں کھڑے ہو گئے۔ ایسی بھی سیدھی ہو گئی۔ وہ ڈاکٹر رائے ہی تھے۔ اس مرتبہ اس کے ساتھ ادھیڑ عمر ڈاکٹر گو کھلے بھی تھا۔ اسپتال میں پہلی رات میری اس سے اچھی شناسائی ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر رائے نے پرتاک انداز میں اکبر علی خاں سے مصافحہ کیا۔ جواباً اکبر علی خاں نے میری جانب سے متصل پر اس کی خاص توجہ کا شکر یہ ادا کیا۔ ڈاکٹر رائے ہنس کے بولا، ”الٹا وہ اکبر علی خاں کا شکر گزار ہے کہ اس اجنبی شہر میں ان کا ساتھ میرے لیے

استقامت کا باعث بنا رہا۔ دونوں میں چند لمحے نوک جھوک اور خوش گپیاں ہوتی رہیں۔ ڈاکٹر رائے نے اکبر علی خاں سے فراغت میں ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اس کی دعوت ایسی رکھی نہیں تھی۔

ڈاکٹر رائے نے نھل کا شانہ جھنجھوڑ کے اسے بیدار کیا۔ نھل کسی قدر اکراہ کے بعد گوگلے اور ایچی کے سہارے اٹھ کے بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر رائے نے اس کا ہاتھ تمام لیا اور گرم جوشی سے حال دریافت کیا تو نھل نے سر کی ہلکی جھنجھ سے جواب دیا۔ اس نے بد بداتے ہوئے کچھ کہا بھی۔ یہ دیکھ کے میں اور اکبر علی خاں اس کے بستر کے پاس پہنچ گئے۔ ڈاکٹر کے خیال سے ہم نے فاصلہ رکھا۔ میں نھل سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن اس بار ڈاکٹر گوگلے آڑے آ گیا۔ نھل نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے آنکھیں بند کر کے اس نے مجھے مبروضہ کی تائید کی ہے۔

ڈاکٹر رائے کے اشارے کے لیے تیار کھڑی امی نے نھل کا سینہ دو مال سے ڈھانپ دیا اور بستر کے پہلو میں رکھی گھلی الماری سے پیالہ اٹھا کے پیچھے بھر بھر کے اسے کوئی چیز پلانے لگی۔ مجھے تو گوگلے نے وہاں سے ہٹا دیا۔ اکبر علی خاں نے بھی گوگلے کا ہاتھ دیا، میری کمر سہلاتے ہوئے وہ مجھے نھل کے بستر سے دور لے آئے۔

سب توازن کی بات ہے۔ ایک ذرا توازن منتشر ہو جائے تو آدمی کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔ آدمی بچہ ہو جاتا ہے، آدمی بوڑھا ہو جاتا ہے، آدمی معذور ہو جاتا ہے، آدھا آدمی، پوتا آدمی، دیکھنے کا آدمی۔ آدمی سے اور آدمی نہیں بچتی۔ آدمی کا اپنا اختیار نہ رہے تو پھر آدمی ہی کیا ہے۔ بیماری سے بڑی مفاہمت شاید کوئی نہیں ہے۔ کہتے ہیں، سب سے بڑی ذلت غربت ہے لیکن یہ بیماری بھی کچھ کم ذلت نہیں۔ اور ایسی بیماری کہ آدمی بے دست و پا ہو کے

رہ جائے۔ آدمی کی اس سے بڑی توہین کیا ہو سکتی ہے۔ نھل کو کیا محسوس ہو رہا ہوگا، یہ کچھ وہی جانتا ہوگا۔

”آج رات گہری نیند لینے کا ہے، سمجھا کچھ؟“ میرے کانوں میں ڈاکٹر رائے کی آواز آئی۔ وہ حاکمانہ انداز میں نھل سے مخاطب تھا۔ کہہ رہا تھا کہ کل سے دوایاں کچھ بدل دی جائیں گی اور کچھ کم بھی کر دی جائیں گی۔ اب نھل کو آہستہ آہستہ غذا کی طرف لوٹنا ہے کیوں کہ غذا سے بڑی توانائی کوئی نہیں ہوتی۔ زیادہ سوچنا نہیں، وہ خاطر جمع رکھے کہ اس کا محبوب بھائی ہر وقت اس کے پاس ہے۔ یہ شہر کا بہترین اسپتال ہے۔ اسپتال کی تجربہ کار زبیں اس کی خدمت پر مامور ہیں اور ماہر ڈاکٹر بھی دور نہیں ہیں۔ ڈاکٹر رائے نے مسکراتے ہوئے کہا کہ نھل کی بیماری کے دوران دنیا میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا اور اس کی صحت پائی تک وہ اپنے نور سے ہٹ نہیں جائے گی۔ ادھر بے کام آنے والے کل پورے ہو جائیں گے۔ زندگی کے سارے معاملات تن رزنی سے مشروط ہیں۔ ڈاکٹر رائے نے وہی کچھ کہا جو کل رات ہم، میں اور اکبر علی خاں پاتیں کر رہے تھے کہ زندگی سے موت کا فاصلہ بہت قریب ہوتا ہے۔ موت ہر لمحے وار کرتی رہتی ہے اور یہ کیا تم ہے کہ نھل کی طرف بڑھ رہا ہے۔

نھل نے منہ پھیر لیا تو امی نے بھی ہاتھ روک لیا اس دوران ڈاکٹر رائے مسلسل نھل سے مخاطب رہا اور ایسے ایسے کلمات تراش رہا جو بظاہر دو آذان سے زیادہ جان فرماتے۔ اس کی ہدایت پر امی نے نھل کے بازو میں سوئی گھونپ دی اور ڈاکٹر رائے اس وقت تک ٹھہرا رہا جب تک امی نے نھل کا... رہانا نیچے نہیں کر دیا اور نھل کی آنکھیں منڈبانے نہ لگیں۔ پھر وہ ایک لمحے بھی وہاں نہیں ٹھہرا۔ اکبر علی خاں نے اذرا و متنع اسے کھانے میں شرکت کی دعوت دی۔ ڈاکٹر نے شکر یہ ادا کر کے معذرت

چاہی کہ اسے ابھی آں جہانی انھونی کی بیوی شیری کو دیکھنے جانا ہے۔ اس کی حالت نہایت شکستہ ہے۔

ڈاکٹروں کی زندگی بھی کیا زندگی ہوتی ہے۔ انہوں نے سیمانی کا جیسے ٹھیک لیا ہوتا ہے۔ آندھی ہو یا طوفان، مریض دہانیاں دیتے ہیں، فرض اور انسانیت کا واسطہ دیتے ہیں، ڈاکٹروں کو آواز دینا ہے، ڈاکٹر بھی دوسرے جیسے پیشہ ور ہوتے ہیں مگر سر کی پیشے میں ایسا جبر نہیں ہوتا یا ایسی مجبوری نہیں ہوتی یا ایسا استحقاق جتایا نہیں جاتا۔

ڈاکٹر رائے کے جاتے ہی اکبر علی خاں نے نھن کھول دیا۔ امی نے کسی وارڈ بوائے کو بلا کے رکھیا اور غیرہ میز پر رکھوانے کا اہتمام کیا۔ کھانا ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ وارڈ بوائے کھانا گرم کر لایا۔ میں نے اسے کچھ روئے کی بھیڑ کی تو اس نے صاف انکار کر دیا مگر امی کی سفارش پر آمادہ ہو گیا۔ پھر تو اس کا انداز ہی بدل گیا۔ پیسے کی کیا کرامت ہوتی ہے۔ آدمی موم بن جاتا ہے، آدمی بجلی بن جاتا ہے، آدمی دیہرا ہو جاتا ہے۔ امی گھر سے کھانا کھا کے آئی تھی۔ اکبر علی خاں کے اصرار پر ساتھ بیٹھ گئی اور دوپہر جس طرح سیورین برجرت طاری ہوئی تھی، امی بھی چند لمحوں کے بعد تکلف کی نھل نہ ہو سکی۔

اکبر علی خاں کا ملازم لڑکا کب کا چاچکا تھا۔ دس بج چکے تھے۔ ان کے یہ قول شہر کے حالات کشیدہ تھے، میں نے ان سے کہا بھی کہ اب وہ گھر چلے جائیں، رات بہت ہو گئی ہے، کچھ وقت راستے میں گئے گا لیکن وہ نہیں مانے، کہنے لگے۔ ”زہت سے کہہ کے چلا تھا، دیر ہو سکتی ہے۔“

امی نے ان کے لیے کافی منگوالی اور باہر سبزہ زار میں کرسیاں لگوا دیں۔ سبزہ زار میں خوش گووار کھلی تھی۔ ہر طرف سکوت چھایا ہوا تھا۔ رات کی رانی کی مہک سبزہ زار میں گھٹی ہوئی تھی۔ اکبر علی خاں گہری گہری سانسیں لے کر تازہ خوشبودار ہوا سینے میں بھرنے لگے۔ امی نے کافی بنائی۔ کافی بنا

کے وہ کمرے میں چلی گئی تو اکبر علی خاں کسمائے ہوئے بولے۔ ”اب آپ نے کیا سوچا ہے۔ آگے سفر کریں گے یا...“ وہ رک گئے اور میری شکل دیکھنے لگے۔

”ابھی کچھ طے نہیں کیا لیکن میرا خیال ہے گھر واپس چلے جانا ہی بہتر ہوگا۔ آگے سفر کی بات بعد میں دیکھی جائے گی۔“

”ہاں مناسب تو یہی معلوم ہوتا ہے۔“ انہوں نے تائید کی۔ ”لیکن میری بات مانیں تو کچھ عرض کروں۔“

”ضرور، ضرور۔“ میں نے کہا۔

”بھائی صاحب کی طبیعت بحال ہو جائے تو سفر کرنے کے بجائے کیوں نہ کچھ دنوں کے لیے غریب خانے پر قیام کریں۔ یہ میری خواہش بھی ہے اور میں سمجھتا ہوں، کوئی حرج بھی نہیں ہے۔ آپ کو گھر جیسا آرام ملے گا، ظاہر ہے، احتیاطاً کچھ عرصے اسپتال سے قریب ہی رہنا چاہیے۔ گھر میں آپ کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔“

”آپ کی محبت اور مہربانی۔“ میں نے بھگ کے کہا۔ ”دیکھتے ہیں بھائی صاحب کی مرضی کیا ہے۔“

”ہاں، ہاں، بے شک، بے شک۔“

”آج رات یا کل صبح نکلتے سے ضرور کوئی آجائے گا۔ تار سے وہ کھٹک تو گئے ہوں گے لیکن شاید نھل بھائی یا میری طبیعت کے بارے میں ان کے ذہن میں کچھ نہ آئے۔“

”یہ کون لوگ ہیں؟ آپ کے عزیز یا دوست؟“

”کیا کہوں، اس سوال کا جواب مشکل ہے۔“ میں نے کسمائے کہا۔ ”وہ عزیزوں اور دوستوں سے نہیں بڑھ کے ہیں۔“

”کیا مطلب؟“

”کیا بتاؤں آپ کو۔“

”کچھ تو... اگر مناسب ہو۔“

”پھر بھی...“ میں نے بے چارگی سے کہا۔

ان کی آنکھوں میں حیرت ہو پڑا ہولی اور انہوں نے حجت نہیں کی، کہنے لگے۔
”بہر حال...“

”آپ کیا کہنا چاہتے تھے۔“ میں نے ان کا دھیان بنانے کے لیے کہا۔ ”آتے وقت آپ نے کہا تھا، آپ بعد میں کچھ بتائیں گے۔“ خیر تو ہے؟
”ہاں...“ ان کا لہجہ بدل گیا، اداسی سے بولے۔ ”آپ سے ایک ذاتی کچھ گھر یلو قسم کے معاملے میں بات کرنا تھی۔ کچھ عجیب سی شش کش ہے۔“

”کیا بات ہے؟ مجھے بتائیے۔“

”دو ایک دن کی ملاقات میں جانے کیا کر شدہ ہوا۔ سچ تو یہ ہے، مجھے آپ سے کوئی غیرت محسوس نہیں ہوتی۔ اتفاق سے کل ایک مسئلہ پیدا ہو گیا۔ بات تو دونوں سے چل رہی تھی لیکن کل ان کا تقاضا آ گیا۔“ وہ چپ ہو گئے جیسے کھوسے گئے ہوں۔
”کیا تقاضا؟“ میں نے بے تالی سے پوچھا۔

ان کا چہرہ بھاری ہو گیا۔ آواز بھی۔ انہوں نے بتایا کہ بھوپال کے ایک صاحب حیثیت اور با اثر نواب خاصے عرصے سے پٹے میں مقیم تھے۔ کسی تقریب میں نواب کے خاندان والوں نے ان کی بڑی بیٹی سلطوت کو دکھایا تھا۔ نواب نے اپنے بیٹے کا رشتہ مانگ لیا۔ ادھر حیدرآباد میں مقیم ان کے بڑے بھائی بھی اپنی بیٹی کو بہو بنانے کی خواہش کا اظہار کر چکے ہیں۔ بڑے بھائی کے بیٹے کو انہوں نے ایک زمانے سے نہیں دیکھا ہے۔ برس گزرے، وہ حیدرآباد گئے تو ہینیا تعلیمی سلسلے میں علی گڑھ تھا۔ کہنے لگے کہ انہیں ہینیا کے مزاج اور عادت اطوار کے متعلق کوئی علم نہیں ہے۔ بڑے بھائی بھی اب غیروں کی طرح ہیں۔ وقت گزر جاتا ہے، ملاقات نہیں ہو پاتی۔ وہ ادھر آتے نہیں اور اکبر علی خاں کا

بھی جانا نہیں ہوتا۔ ان کی والدہ کچھ وقت کے لیے بڑے بیٹے کے پاس حیدرآباد گئی تھیں۔ جی نہیں لگا تو جلد ہی واپس پٹے آئیں۔

وہ اپنے گھر کے اتنے ذاتی معاملے پر مجھ تازہ شناسا سے بات کر رہے تھے۔ مجھے سوچ سمجھ کے کوئی ذمہ دارانہ مشورہ دینا چاہیے تھا۔ میں نے دہلی آواز میں پوچھا۔ ”تو آپ کے خیال میں کہیں اور رشتہ منظور کر لینے سے بھائی صاحب ناراض ہو سکتے ہیں؟“

”یہ ممکن ہے، حالاں کہ جتنیے کا حال احوال دیکھے بھالے بغیر، چاہے وہ کتابی اپنا خون کیوں نہ ہو، مجھے رشتہ کسی طور منظور نہیں ہے۔ اور یہ۔۔۔ بھائی صاحب کی خواہش ہے، ضروری نہیں کہ ان کے فرزند بھی آمادہ ہوں۔“
”تو اس میں ایسی الجھن کیا ہے۔“ میں نے شائستگی سے کہا۔ ”آپ پہلے بڑے بھائی صاحب کو ترجیح دیجیے کیوں کہ بہر حال وہ آپ کے بھائی ہیں۔ حیدرآباد جا کے جتنیے کے طور اطوار سے تسلی کر لیجئے۔ شفیق نہ ہو تو پھر نواب صاحب کے رشتے پر غور کیجئے۔“

”یہ اتنا آسان نہیں ہے میاں!“ وہ مایوسی سے بولے۔ ”میں نے آپ کو پوری بات ابھی کہاں بتائی ہے۔ صرف اتنا تو نہیں ہے، دو جگہ سے لڑکی کے رشتے آئے اور کسی ایک کو منظور کر لیا یا مسترد کر دیا، مسئلہ تو اپنے گھر کا بھی ہے۔“

”اپنے گھر کا؟“ میں نے چونک کے پوچھا۔
”بھائی! فریق تو ہم دونوں ہیں۔ ہمیں خود کو بھی تو دیکھنا ہے۔ اپنے گھر، گھر کے مزاج، اپنی بیٹی کی پسند ناپسند، رحمان طبع وغیرہ کو۔ میری بیٹی سلطوت عام لڑکیوں سے الگ ایک لڑکی ہے بلکہ ہمارا سارا گھرنی، ہزاروں لاکھوں، بہت سوں سے مختلف گھر ہے۔ اور یہ سلطوت، یہ تو بڑی ذہین اور حساس بچی ہے۔ معلوم ہے، ہمیشہ اول آتی رہتی

ہے۔ اس سے بات کر کے دیکھو، لگتا ہے، کوئی بہرہ بھرے ہوئے ہے۔ بے کچھ نظر کچھ اور آتی ہے۔ ایسی بچی عمر میں اتنی گھری باتیں... اور بتاؤں آپ کو، وہ بڑی سہیلی ہے۔ میں نے اس کے ہاں سر کی ایسی فراوانی، قوت اور لگن دیکھی ہے کہ خدا کی پناہ... اس کا ذوق و شوق دیکھ کے موسیقی کی باقاعدہ تعلیم کے لیے ایک استاد کا بندوبست کر دیا تھا۔ کمر بند کر کے، آس پاس میں سرکار ہر رسانہ ہو سکے، ایک سنگیت سمرات اسے تربیت دیتا رہا مگر روز اس کے گھر آنے جانے سے محلے والے کھٹک گئے۔ انہوں نے جستجو... شروع کر دی۔ یہ ملازم وغیرہ بھی اچھے خاصے نہایت گو ہوتے ہیں۔ خبر پھیل گئی کہ اکبر علی خاں کی بیٹی موسیقی کی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ ایک ہندو پنڈت روزانہ آتا ہے۔ بس صاحب، لاکھ عذر پیش کئے، ایک ہنگامہ ہو گیا۔ استاد کا سلسلہ فوراً بند کر دیا گیا۔ بتاؤں، موسیقی کا شوق کیا ہوا، زندگی اجیرن ہو گئی۔ کیا موسیقی سے رغبت ایسی بری بات ہے؟“

”جو برا سمجھتے ہیں، ان کے لیے تو برا ہی ہوتا ہے۔“ میں نے عقاب لہجے میں کہا۔
”آپ نے بالکل سچ کہا۔ یہی بات تو نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ رہنا تو ہمیں اپنے محلے اور انہی لوگوں کے درمیان تھا۔ بہر حال وقت گزرنے کے ساتھ معاملہ دب گیا۔ جیسے دائمی یہ کوئی غیر معمولی مسئلہ تھا۔ آدمی کو یہاں انفرادی آزادی نہیں ہے۔ ہم اپنی پسند، اپنی مرضی کی زندگی نہیں گزار سکتے۔“

”شاید کہیں بھی نہیں۔“ میں نے زیر لہجی سے کہا۔
”آپ ٹھیک کہتے ہیں۔“ وہ بے قرار سے ہو گئے۔
”سے فک، کہیں بھی نہیں لیکن اتنا اور ایسا بھی نہیں ہوتا۔ ولایت میں کچھ وقت گزارنے کا موقع ملا ہے۔ وہاں بڑی انفرادی آزادی ہے لیکن مادر پدر

نہیں۔ وہاں بھی اپنی روایتیں ہیں اور گورا تو بڑا روایت پرست، قدامت پسند ہوتا ہے لیکن یہ روایتیں آدمی کو اتنا مجبور نہیں کرتیں، اپنی فکر، اپنی رائے، اپنی طرز کی زندگی کی رعایت۔ وہاں ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایسی توجہ نہیں دی جاتی۔ وہ لوگ کام کرتے ہیں اور اسی وجہ سے ایک دنیا پر ان کی غم رانی ہے۔“

”پھر آپ نے کیا سوچا ہے؟“ میں نے انہیں ٹوکا۔ وہ باتوں باتوں میں بہت دور نکل گئے تھے۔
”معاف کرنا میاں! اتنی باتیں بھری ہوئی ہیں دماغ میں، کچھ خیال ہی نہیں رہا۔ آئی ایم ساری۔“ وہ پشیمانی سے بولے۔ ”آپ نے اچھا کیا، مجھے ٹوک دیا۔ میں کہہ رہا تھا، ابھی تو سلطوت تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ یہ رشتے وغیرہ کی بات تعلیم مکمل ہو جانے کے بعد ہی مناسب ہوگی۔ لیکن ایک مسئلہ اور بھی ہے۔“ وہ بڑھمردگی سے بولے۔
کوئی سوال کرنے کے بجائے میں خاموش رہا۔

کچھ وقت کے بعد وہ خود ہی بولے۔ ”اصل میں خوش شکل بچیوں کے رشتے، آپ جانتے ہیں، ان کے رشتوں کی کمی نہیں مگر ہمارے گھر کے معاملے میں ایسی صورت حال نہیں ہے۔“

”مگر کیوں؟“ میں نے پوچھا۔
”دیکھیے کچھ عجیب معاملہ ہے میں نے آپ سے کہا نا کہ ہمارا گھر اپنی خاص بودوباش بلکہ اپنی فکر، سوچنے کے انداز سے اجنبی ہو گیا ہے۔ خاندان برادری والے ہم سے ملنے میں کتراتے ہیں۔ کچھ آزاد خیال سمجھتے ہیں، کچھ کو ہمارے طور طریقے پسند نہیں، میری اور نرہت کی تعلیم، ولایت میں ہمارا قیام، بے پردگی وغیرہ۔ بہت سی ایسی باتیں ہیں جو ان کے درمیان رہتے ہوئے بھی ہم ان سے دور ہو گئے ہیں۔ بس ایک رسمی سائنعلق رہ گیا ہے۔ اور بات یہ ہے، ہمیں بھی یہ لوگ پسند نہیں۔ ایک تو ان

کی طرف سے کوئی رشتہ آنے سے رہا، دوسرے ہم خود بھی نہیں چاہتے کہ ان کی طرف سے ایسا سلسلہ جنمائی ہو۔ ایسے لوگوں میں بی بی بیانی جائے؟ ان گھروں میں تو بچی گھٹ کے رو جائے گی۔ سلطوت کا اپنا ایک وجود ہے، شادی، مرد کی حکمرانی نہیں ہونی چاہیے۔ یہ کیا ہے۔ شادی کے بعد ایک عورت پر مرد کا تسلط ہو جائے۔ نکاح کے دو پولوں سے عورت کا ثابت و سالم وجود کسی ایک مرد کی قلم رو میں شامل ہو جائے یا اس کے زیر نگیں ہو جائے۔ نہیں صاحب، ہمیں قبول نہیں۔ اگر برعلیٰ خاں کی آواز تھمتا گئی، کہنے لگے۔ ”یہ تو آپس میں محبت باٹنے، دکھ سکھ میں ساتھ رہنے، ایک دوسرے کا خیال رکھنے، ایک کو دوسرے کی جائز خواہشوں، رضیتوں کو آواز دینے کا تعلق ہے۔ تم از کم میں تو یہی سمجھتا ہوں۔ شادی کی تالی ایک ہاتھ سے نہیں جینی چاہیے۔“

”مگر کوئی بھی گھر ہو، بالکل آپ جیسا تو نہیں ہوگا۔ دوسرا گھر تو دوسرا ہی ہوتا ہے۔ لڑکیوں کو سننے گھر سے مفاہمت تو کرنی پڑتی ہے۔“ میں نے ہنسی بکپکپاتے ہوئے کہا۔

”صرف لڑکی ہی کیوں؟ لڑکے اور اس کے گھر والوں کو بھی گھر میں نو وارد لڑکی کے مزاج اور مرضی کا لحاظ رکھنا چاہیے۔“ ان کے لہجے میں تڑپ آگئی پھر اداسی سے بولے۔ ”اصل میں کچھ غلطی ہماری بھی ہے۔ جہاں سارے پڑھے لکھے ہوں، وہاں ایک جاہل، بے گانہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جہاں سارے جاہل ہوں، وہاں ایک پڑھا لکھا بچو بے بن جاتا ہے۔ سارے امیر ہوں تو ایک غریب خود کو کیسا ناخوار و نا بکار محسوس کرتا ہے۔ سارے غریب ہوں تو ایک امیر اپنے لوگوں سے کٹ جاتا ہے۔ عجب گورکھ دھندا سا ہے۔ شاید ہم اپنے خاندان برادری والوں سے آگے نکل گئے ہیں یا پیچھے رہ گئے ہیں۔ سوچا ہی نہیں کہ گھر میں پچیاں بھی ہیں اور بڑی بھی ہو رہی ہیں اور انہیں مستقل

ہمارے ساتھ نہیں رہنا۔ ایک گھر میں لڑکے، لڑکیوں اور خود اپنے لیے الگ الگ روش تو ممکن نہیں ہو سکتی تھی۔“

”پھر آپ کو اپنی طرح، اپنے ماحول اور لوگوں، میرا مطلب ہے، ایسی جگہ رہنا چاہیے جہاں آپ کے ہم ذوق رہتے ہوں اور اس مفاہمت کا احساس نہ ہو۔“ میں نے نرمی سے کہا۔

”بے شک، یہی ایک حل تھا اور ہے۔“ انہوں نے کسی قدر جو شیلے انداز میں کہا۔ ”ہم ولایت میں بھی رہ سکتے تھے لیکن گوروں کا رہن سہن ہمیں گوارا نہ ہوا۔ ہم میاں بیوی کو مشرق ہی پسند ہے لیکن جس مخصوص قسم کے مشرقی ماحول میں ہم نے آنکھ کھولی ہے، یہ لوگ تو..... میں کہوں گا، انہوں نے مشرق کو جانا ہی نہیں، سمجھا ہی نہیں۔ مشرق میں تو بہت رنگ ہیں۔ انہوں نے ہماری کشادہ نظری کو ہمیشہ شک کی نظر سے دیکھا۔ سمجھ رہے ہیں آپ.....؟“ وہ اٹھے اچھے لہجے میں بولے۔

”بی. جی۔“ میں نے کئی بار سر ہلایا۔

”اسی لیے آپ کے سامنے زبان کھولی ہے۔“

”میرا خیال ہے، اگر آپ اجازت دیں تو مجھ کہوں۔“

”ہاں ہاں، کیسی بات کر رہے ہیں آپ۔“

”آپ کو سکونت ترک کر کے جہاں چھوڑ دے کسی شہر میں بس جانا چاہیے۔ وہاں شاید آپ کو اتنا گھٹن کا احساس نہ ہو۔ یہ تجربے کوئی نئی بات نہیں، مسلسل ہوتی رہتی ہیں، کچھ تو ضرور اور کچھ الٹی مرضی سے بھی۔ عموماً صاحب حیثیت اپنی پسند کے گھر، محلے اور شہر منتخب کر لیتے ہیں۔ میرا بہت سے شہروں میں آنا جانا ہوا ہے اور میں نے دیکھا ہے بڑے شہروں کے تنگ مکانوں کے باوجود لوگ کھلے کھلے رہتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کی تا کا جھاگ نہیں کرتے، غالباً اس لیے بھی کہ انہیں فرصت تو نہیں ملتی۔ لیکن ایک اور بات بھی ہے۔ محلوں اور

شہروں سے اتنا نہیں، جتنا ان لوگوں سے فرق پڑتا ہے، جن کے درمیان آپ رہتے ہیں اور یہ لوگ ہر جگہ مل جاتے ہیں۔ کبھی قسمت سے، کبھی تلاش کر کے۔“

”آپ تو میری زبان بول رہے ہیں میاں۔“ وہ مسکرا کے بولے۔ ”اسی لیے تو میں کہتا ہوں، میرا کوئی ہم نفس، ہم زباں، کوئی پھڑکا ہوا مل گیا ہے۔ یقیناً میاں! ہم کہیں بھی رہ سکتے تھے۔ سال میں دو ایک ماہ یہاں سے اکتا کے، کچھ منہ کا حزاہ بدلنے کے لیے بھی، ہم ادھر ادھر چلے جاتے ہیں۔ لیکن کئی باتیں ہیں جو لوٹ کے یہاں آنا پڑتا ہے۔ یہ میرا آبائی شہر ہے۔ ایک خاص لگاؤ ہونا چاہیے مجھے اس شہر سے، پھر والدہ صاحبہ کا دل کہیں نہیں لگتا۔ یہاں انہوں نے ساری زندگی گزار دی ہے۔ سچے یہاں پڑھ رہے ہیں۔ ابھی کچھ دنوں پہلے تک میں بھی نہیں وکالت کر رہا تھا۔ وکالت پڑھاتا تو اب بھی ہوں۔ زہمت بھی یہیں پڑھاتی ہیں۔ بھائی صاحب تو حیدرآباد جا کے ہر چیز سے بری الذمہ ہو گئے۔ آبائی زمینیں، جائیداد، اور وہ بھی اچھی خاصی۔ سب کچھ یہیں ہے۔ ان کا انتقام، پھر..... کیا تاؤں آپ کو۔ ابا جان مرحوم کے زمانے سے بہت سے گھرانے ہمارے گھر سے وابستہ ہیں۔ یہ غریب لوگ، زمینوں پر کام کرنے والے اور ہمارے مکانوں میں رہنے والے۔ ان کی شادی بیاہ، تعلیم، خوشی اور غم، یوں سمجھئے، دادا پر دادا کے وقت سے ان کی نگہ بانی ہمارا کام ہے۔ گاؤں میں بچوں کی تعلیم کے لیے ہم نے اسکول بھی کھولا ہے۔ زہمت ہر چند کہ میں دن بعد وہاں جاتی ہیں۔ کسی کہانی ہے میاں..... کبھی اور گرد کے لوگوں کے ملاپوں سے تنگ آجاتے ہیں تو باہر نکلنے کی سوچتے ہیں اور یہ زنجیریں..... زنجیریں ہی ہیں میاں، یہ..... یہ کوئی فیصلہ..... کسی فیصلہ کرنے ہی نہیں دیتیں۔“

”میں کیا رائے زنی کرتا، چپ رہا۔“

”چھوڑیے ان باتوں کو۔“ وہ مایوسی سے بولے۔ ”سردست تو مسئلہ نواب صاحب کا ہے، انہیں کیا جواب دیا جائے۔ ان کا گھرانہ شہر میں بڑا باعزت گھرانہ ہے۔ یہ ظاہراً نکار کی کوئی وجہ نہیں۔ میں نے ساری روداد آپ کو اس لیے سنائی کہ نواب کے گھر میں دنیا کی ہر آسائش میسر ہوگی لیکن سلطوت کی شخصی بالیدگی کہیں مرجھانہ جائے۔ وہ تو رنگوں سے بھینتی ہے، سروں سے، کتابوں سے کھینتی ہے۔ وہ تو بہت خواب دیکھتی ہے اور وہ تو سب سے آگے نکل جانے کی جستجو میں رہتی ہے، اور اسے دولت وغیرہ کی کوئی حس و ہوس نہیں۔ اپنی اولاد کی بات نہیں کہ ہر ایک کو اپنی اولاد عزیز ہوتی ہے۔ میں تو حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ وہ تو ایک مثال ہے۔ نواب صاحب کے محل دو محلوں میں کہیں..... یہ نواب لوگ بڑے روایتی ہوتے ہیں۔ دولت مندی سے مراد روشن کاری نہیں ہے۔ جس طرح روشن کاری سے مراد آوارگی نہیں ہے۔ وہاں جا کے قریب سے ان کے طور طریقے دیکھے بغیر ہاں، کیسے کی جا سکتی ہے اور سلطوت کو بھی تو اپنے ہونے والے زندگی بھر کے ریش کو برکھنے کا موقع ملنا چاہیے۔ پرکھنے کا نہیں تو کم از کم دیکھنے، اندازہ لگانے کا۔ میری باتیں آپ کو عجیب لگ رہی ہوں گی لیکن کیا ان میں معقولیت نہیں ہے؟ بتائیے۔“

”نہیں بالکل نہیں، پر یہاں ایسا کہاں ہوتا ہے۔“

”نہیں ہوتا، ہونا چاہیے۔ نواب زادے کو بھی آنکھوں پر پٹی باندھ کے ایک ایسی لڑکی سے زندگی بھر کے رشتے کے لیے آمادہ نہیں ہونا چاہیے جسے اس نے کبھی دیکھا اور تھوڑا بہت سہی، جانا بوجھانہ ہو۔ کہتے ہیں، شادی دو خاندانوں کے درمیان ہوتی ہے لیکن اصل فریق تو دو افراد ہوتے ہیں۔ ان افراد کی نہ بنے تو خاندان والے کیا کر سکتے ہیں۔ یہی ہوتا ہے؟“

”ہاں، ہوتا ہے یہی کچھ۔“ میں نے کہا۔ ”مگر
 شناختیں تو مشکل ہی سے ملیں گی۔ شادی سے پہلے کی
 پسندیدگی بعد کو ناپسندیدگی میں بھی تو بدل سکتی ہے۔“
 ”کوئی شناخت نہیں، بے شک کوئی نہیں۔“ اکبر
 علی خاں نجی سے بولے۔ ”دوستوں کے درمیان
 کاروباری معاہدے میں مل آجاتا ہے۔ شادی کے
 معاہدے میں بھی تمام تر اطمینان کے باوجود
 کشیدگیاں اور کدورتیں ہو جاتی ہیں۔ پھر تو انجام
 علیحدگی کی صورت برآمد ہوتا ہے یا ساری زندگی کے
 عذاب کی شکل میں لیکن یہ ملال تو نہیں رہتا کہ
 فریقین نے ایک دوسرے کو سمجھا بوجھا، دیکھا بھالا
 نہیں تھا۔ شادی جوے کا کھیل نہیں ہے۔“
 ”اس صورت میں تو یہی بہتر معلوم ہوتا ہے کہ
 آپ نواب صاحب کو انکار کر دیں۔“ میں نے
 آہستگی سے کہا۔

”یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ آپ ہوتے تو ضرور
 کہہ دیتے۔ آپ ایک جرأت مند آدمی ہیں، آپ وہ
 آدمی ہیں جو میں نے ہونا چاہا تھا اور میں ہونا چاہتا
 ہوں۔ آپ نے استاد میدا کے ٹھکانے پر جانے کا
 فیصلہ چنگی بجانے کے دورانیے میں کر لیا تھا۔ نواب
 صاحب سے مروت کا ایک سلسلہ برسوں سے قائم
 ہے۔ ان کے گھر سے رشتہ آئے اور منع ہو جائے۔
 یہ ان کے لیے بڑی سبکی کی بات ہے۔ جس طرح
 سچی کہوں، محسوس کر لیں گے۔ وہ ایک بااثر آدمی
 ہیں۔ بااثر آدمی کے دل میں کینہ جلدی بیٹھتا
 ہے..... اور سوچتا ہوں، اس شہر سے تو پھر سطوت
 کے رشتے آنے سے رہے۔ نزہت کے ستار بجانے
 کا شوق، ان کی اعلیٰ تعلیم، لڑکوں لڑکیوں کے مشترکہ
 کالج میں درس و تدریس۔ میری ان کی شادی کی
 بھی ایک داستان ہے۔ یہاں سبھی واقف ہیں۔ وہ
 یہاں کی نہیں ہیں۔ شادی کے بہت دنوں کے بعد تو
 آس پاس کے لوگوں نے ان سے بات چیت شروع
 کی تھی۔“

”انکار کی صورت میں کیا آپ کو نواب صاحب
 کی جانب سے کسی نقصان کا اندیشہ ہے؟“
 ”سب سے بڑا نقصان تو تعلق خاطر کا ہے
 میاں۔“

”کچھ تو آپ کو جھگڑنا ہی ہوگا۔ عذر تو بہت سے
 کیے جاسکتے ہیں اور کیا غلط ہوں گے۔ کہہ دیجیے کہ
 آپ کو کچھ وقت چاہیے۔ آپ کے بڑے بھائی نے
 بھی خواہش ظاہر کی تھی۔ پہلے ان کی جانب سے
 بات صاف ہو جائے۔ ادھر کی تعلیم کا بھی عذر کیا
 جاسکتا ہے کہ سطوت بی بی پہلے تعلیم مکمل کرنا چاہتی
 ہیں۔“

”نواب صاحب ایک جہاں دیدہ آدمی ہیں،
 سمجھ جائیں گے۔“

”سمجھا کریں۔ وہ کوئی بادشاہ سلامت ہیں
 کیا۔ ناآبادگی میں ایسے ہی عذر کیے جاتے ہیں۔
 انہیں تسلیم کرنا چاہیے۔ نواب زادے کے لیے
 لڑکیوں کی کیا کمی ہوگی۔ آپ کو اختیار ہے۔ ہر باپ
 کو اختیار ہے کہ وہ جہاں چاہے، اپنی بیٹی کے بہتر
 مستقبل کا فیصلہ کرے۔ رہی پٹنا شہر میں آپ کے
 خاندان برادری والوں کی طرف سے رشتے آنے
 کی ناامیدی، تو کیا ہوگا۔ سطوت پڑھتی رہیں،
 پڑھتی رہیں۔ اس دوران کوئی نہ کوئی انہیں خود بھی
 پسند آسکتا ہے..... مگر پھر آپ کو کوئی اعتراض نہ
 ہوگا؟“

”بالکل نہیں جناب، قطعاً نہیں۔ ہم سنجیدگی اور
 کشادہ دلی سے غور کریں گے۔ ہمیں خاندان
 ذات برادری سے کوئی واسطہ نہیں۔ ہمیں تو سطوت
 کے پسند کے ہوئے فرد سے غرض ہوگی کہ وہ کیسا ہے
 اور سطوت کی پسند ایسی ویسی نہیں ہوگی۔“

”اور کیا شادی ایسی ہی ضروری ہے؟“ میری
 زبان بہک گئی۔

اکبر علی خاں چونک پڑے اور کچھ توقف کے
 بعد بولے۔ ”ہاں میاں، یہ بھی غور طلب بات ہے۔“

یہ شادی وادی کا رواج تو ابھی ابھی کا ہے۔ زندگی تو گروڑوں سال کی ہے۔ ہماری تو دس ہزار سال پہلے کی آہی، وہم و قیاس، آثار و قرائن کی بنیاد پر ہے۔

”مگر شادی غالباً یوں ضروری ہے کہ اس زمانے کا دستور ہے۔ ہر زمانے کا اپنا ایک دستور ہوتا ہے۔ اور وہی بات ہے، آدی نہ ماضی میں رہ سکتا ہے نہ مستقبل میں۔ وہ تو محض اپنے حال میں رہتا ہے۔ ہر موجود زمانہ اس کا حاکم ہوتا ہے۔ اس کے قواعد، قوانین، ضابطوں اور مطالبوں کی تعمیل کرنی پڑتی ہے۔ ہر موجود زمانے کے اپنے لہجے، زبان، لباس اور اپنا ایک رہن کہن ہوتا ہے۔ ہر موجود زمانے کی اپنی ایک منطق ہوتی ہے یا یوں کہیے کہ جو کچھ جس عہد میں ہے، وہی منطق ہے۔“

آپ نے خود ہی سوال اٹھایا اور خود ہی جواب دے دیا مہیاں۔ ”وہ شگفتگی سے بولے۔“ یہ لکھنی آدی کو بھڑکانے کی اور لکھنی راستہ دکھاتی ہے۔ بہر حال آپ کا مشورہ صائب ہے۔ مجھے بوجہ یہ دونوں رشتے منظور نہیں ہیں تو کوئی عذر تو پیش کرنا ہی ہوگا۔ آپ سے بات کر کے میرا سینہ ہلکا ہوا اور مجھے حوصلہ ملا۔“

انہوں نے کافی کے چند ہی گھونٹ لیے تھے اور اپنی باتوں میں گم ہو گئے تھے۔ کافی ٹھنڈی ہوئی۔ بہت دیر بعد ایسی نے سبزہ زار کا رخ کیا تو اس نے ہم دونوں کو دوبارہ گرم کافی بنا کے دی۔ مجھے کافی ایسی مرغوب نہیں تھی لیکن اکبر علی خاں کے سامنے منع نہ کیا جا سکا۔ شبنم اب محسوس ہونے لگی تھی۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ در راہ داری میں وقفے وقفے سے قدموں کی آہٹ گونجنی اور خاموشی میں ڈوب جاتی۔ میرا کچھ کہنا مناسب نہیں تھا۔ اکبر علی خاں کو گھر واپسی کا کچھ خیال ہی نہیں تھا۔ کافی ختم کرنے کے بعد جیب سے انہوں نے کڑھا ہوا ریشمی کپڑے کا بناؤ نکالا۔ ”بن دھینے سے شوق کریں گے؟ پان

مجھے اچھا لگتا ہے لیکن نزہت کو پسند نہیں۔ اور انہیں نہیں تو مجھے بھی۔“ انہوں نے ہوا میرے آگے کر دیا۔ ”یہاں تو اسے بن دھینا کہا جاتا ہے، کئی چروں کا مرکب ہے، منہ میں خوشبو بکھر جاتی ہے۔ معلوم نہیں، آپ اسے کیا کہتے ہیں؟“

میں نے ایک دو چنگیاں لیں۔ عموماً شادی کی تقریبات میں جو مہمان یاں نہیں کھاتے، انہیں یہ مسالا پیش کیا جاتا ہے۔ واقعی خوش ذائقہ تھا۔

”کیسا لگا؟“ انہوں نے اشتیاق سے پوچھا۔

”دل چسپ ہے۔“

”دل چسپ کی خوب کہی۔ وہ ہنس پڑے۔“ یہ نزہت میری بیوی کے علاوہ، میری گھراں بھی ہیں۔ ایسا خیال رکھتی ہیں کہ خود پر میرا اعتماد متزلزل ہو گیا ہے۔ ہر وقت انہیں یہ خدشہ رہتا ہے کہ مجھ سے کوئی چوک ہو جائے گی، اور ہونی بھی ہے۔

”آپ بھی کیا کم ان کا خیال رکھتے ہوں گے۔“

”بھئی سچی بات یہ ہے، بڑے جتن کر کے انہیں حاصل کیا ہے۔ مشکل سے حاصل کی ہوئی چیز کی قدر بھی بہت ہوتی ہے، پھر نزہت تو ہیں ہی قابل قدر، قابل ستائش۔ ان کا بھی یہی حال ہے۔ میرے لیے انہوں نے بڑی دیواریں پھلائی ہیں انہیں لگتا ہے کہ میرے بغیر وہ، اور ان کے بغیر میں، ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے بغیر نامکمل ہیں۔“

”ایسا کم ہوتا ہے۔“ میں نے تعجب سے کہا۔ ”اس لحاظ سے آپ بہت خوش قسمت ہیں کہ آپ کو اپنا کوئی مطلوب مل گیا۔ کسی کو اس کا اپنا مطلوب مل جائے تو دنیا مل جاتی ہے۔“

”میں واقعی خود کو خوش قسمت تصور کرتا ہوں۔“

”خدا کرے، آپ دونوں میں یہی یک نکتہ رہے۔“ مجھے شاید یہی کہنا چاہیے تھا۔

”ہاں۔“ ان کا لہجہ حسرتی سا ہو گیا۔ ”بس دعا کریں، ایسے ہی سارا کچھ بنا رہے۔“

”انہوں نے دتی گھڑی دیکھی اور انگڑائی سی لے کے بولے۔“ میرا خیال ہے، مجھے اب چلنا چاہیے، آج میں سوچ کے آیا تھا کہ دیر تک آپ کے پاس بیٹھوں گا مگر کچھ پوچھتی تو جی بھرا نہیں۔“

”تو بیٹھی نا کچھ دیر اور۔“ میں نے بظاہر نکلتا کہا، خود میرا جی بھی ان کی باتوں میں لگ رہا تھا۔ ان کے چلے جانے کے بعد تو مجھے اپنے ساتھ ہی رہنا تھا اور جانے کیوں میں اپنا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”آپ تو اپنے بارے میں کچھ بتاتے نہیں۔ میں ہی فضول گوئیاں کرتا رہتا ہوں۔“ ان کے دکھائی لہجے میں ناز برداری بھی شامل تھی۔

”کیا جاننا چاہتے ہیں آپ؟“

”بہت سے سوال دماغ میں اٹھتے ہیں۔“

”مثلاً کیا کیا؟“

”یہی کہ میاں۔ اب ایسی بھی آپ کی عمر نہیں ہے۔ ماشاء اللہ نو جوان ہیں مگر ایک عجیب پیش ی، ایک تلاطم سا کچھ میں نے آپ کے چہرے پر محسوس کیا ہے۔“

”میں..... میں کیا کہہ سکتا ہوں اس خامی پر۔“

”نہیں جناب، یوں نہیں، ایسے مت نالغے۔ یہ اضطراب بے سبب تو نہیں ہوگا۔ ہو سکے تو کچھ بتائیے، اور اگر ناگواری کا باعث ہو تو بھڑا بالکل نہیں۔ آپ سے میرا تعلق آپ کے بارے میں میری واقفیت سے بندھا ہوا نہیں ہے۔“

”یہ تو آپ کی بڑائی ہے۔“

”بڑائی کیا۔“ وہ بے بسی کے سے انداز میں بولے۔ ”کوئی اچھا لگ جائے، پھر اور کیا رہ جاتا ہے۔ اچھا لگنے نہ لگنے کا معاملہ تو دل کا ہے، دماغ کا نہیں۔ اور کچھ جاننے کا اشتیاق تو فطری ہے لیکن لازم نہیں، کم از کم میرے لیے۔“

”کیا بتاؤں؟“ میں نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔

”کچھ نہ بتائیں۔“ انہوں نے سر جھٹک کے کہا۔ ”جانے دیجیے۔“

”بتانے کو کچھ اچھا نہیں ہے۔“

”برا بھی نہیں ہوگا۔“

”شاید ایسی کو حسن ظن کہتے ہیں۔“

”نہیں، یقین ہے، برا کچھ نہیں، مختلف ضرور ہوگا۔ کچھ الگ ہوگا صاحب۔“ ان کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ ”میں تو کہوں گا، میں نے آپ جیسا نو جوان نہیں دیکھا..... اور ایسا نہیں کہ دنیا نہیں دیکھی، دنیا کو بھی اچھا خاصا دیکھا، بڑھا اور سنا ہے۔ دکالت میں تو آئے دن حیران کن واقعات سامنے آتے رہتے ہیں۔ لیکن.....“

میں چپ رہا اور سوچتا رہا، انہیں کیا بتاؤں، کیا نہیں۔

”یہ آپ کے سفر کا مشغلہ ہے جواز تو نہیں ہونا چاہیے۔“ میری خاموشی پر انہوں نے جیسے مجھے تکا پھوپھا۔

”سیر و تفریح بھی تو ایک جواز ہوتی ہے۔“

”تو کیا بس یہی.....؟ نہیں صاحب نہیں۔“

”کسی کی تلاش ہے۔“ میں نے سانس بھر کے کہا۔

”تلاش؟“ ان کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔

”ایک صاحب کی..... ان کا نام مولوی محمد شفیق ہے۔“

”مولوی محمد شفیق؟“ انہوں نے تجسس سے دہرایا۔ ”کس وجہ سے؟“

”ان کے پاس ایک امانت ہے۔“

”امانت..... اردے پیسے کی تو نہیں ہوگی۔“

ان کے دھوکے پر مجھے حیرت ہوئی۔ میں نے سر ہلا کے تائید کی۔

”کب سے..... وہ کھوئے ہوئے ہیں۔؟“

”دس سال سے اوپر ہو گئے۔“ میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

سیسنس ڈائجسٹ کا مقبول عام سلسلہ

تحریر: حفیظ اقبال

راوی: عارف چوہدری

قیمت فی حصہ: 60 روپے

ڈاک خرچ فی حصہ: 23 روپے

4 جلدوں میں مکمل

چہرہ کارہ

لیک ناگروہ گناہ کار شخص کے گناہوں کی روداد وہ
مخبروں سے چنے کیلئے جرم کی دلدل میں پھنس گیا تھا

مکمل سیریز منگوانے پر
خصوصی قیمت 250 روپے

ترقی اور کامیابی کے جنون

میں تاریک راہوں میں

مارے جانے والوں

کی غیر متناہک داستان

قارئین کے لیے حصار برکتیں

شکل میں شائع کی جا رہی ہیں

راوی کی لطیف اور مہربان لہروں سے
لوریوں سن کر پر دان چڑھنے والے
عارف چوہدری کی ہنگامہ خیز زندگی کا
فسانہ عجیب تقدیر سے حادث کی
گود میں ڈال کر بھول گئی تھی

کتاب کی قیمت بذریعہ پیشگی ڈرافٹ، مئی آرڈر یا کراسڈ چیک ارسال فرمائیں

کتابیات پبلی کیشنز

پوسٹ بکس 23 کراچی 74200

فون: 5802551-5895313-5802551

kitabiat1970@yahoo.com

رابطے کے لئے: C-63 فیز 111 سیکشن ڈی ایچ اے مین کورنگی روڈ کراچی 75500

کے لیے مجھ تک پہنچنا مشکل نہیں تھا۔ میں نے کئی جگہ
اپنا پتا چھوڑا ہے۔ گلگت جیل سے ٹھہل بھائی تک اور
وہاں سے مجھ تک..... وہ آسانی سے مجھ تک پہنچ سکتے
تھے مگر وہ یہ چاہتے ہی نہیں ہیں۔ شاید وہ سمجھتے ہیں
کہ میں سزا یافتہ..... میں اب اس کے اٹنی نہیں
رہا..... اور اب وہی اس کے سب کچھ
ہیں..... بہر حال کسی دن ہم ان تک پہنچ ہی جائیں
گے یا خود ہی ٹھک کے وہ ہیرا رخ کریں گے۔
جیل سیر میں مجھے معلوم ہوا کہ انہوں نے اس کا نام
بدل کے نرجس بانو رکھ دیا ہے اور اس کی تعلیم
و تربیت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ وہ تہما زندگی
گزارتے رہے تھے۔ ظاہر ہے، اتنے عرصے سے
اپنی جھاڈوں، اپنی پناہ میں رکھنے کے بعد اس سے
جدائی کا تصور ہی ان کے لیے عذاب ہوگا۔ کون
انہیں بتائے کہ مجھ سے اس کا ملنا، اپنی بیٹی سے ان
کی دوری نہیں ہے۔ ان کا تو بڑا احسان ہے کہ وہ
اتنے عرصے تک اس کی پاس بانی کرتے رہے۔ وہ
اس وقت اس کے سر پر ہاتھ نہ رکھتے تو اس کا کیا
حال ہوتا۔ وہ تو شاید زندہ نہ رہتی، پھر میں بھی کہاں
جاتا۔ مولوی صاحب اچھی طرح یہ بات جانتے
ہیں۔ ان کی نگرانی اور ایثار اپنی جگہ، وہ تو میرے
آسرے پر زندہ رہی ہے۔ وہ مسلسل میری تلاش
کے بہانے بناتے رہے ہوں گے لیکن کب
تک..... ایک دن..... انہیں سمجھنا چاہیے، ایک دن
اس کی امید ٹوٹ بھی سکتی ہے۔ جس دن ایسا ہوا،
تب تب..... میری آواز حلق میں پھنس گئی اور میں
نے اپنا منہ چھپا لیا۔

”نانا..... نامیاں“ اکبر علی خاں کر سی سے
انھ کے بے تابانہ میرے پاس آگئے اور انہوں نے
میرا چہرہ اپنے ہاتھوں میں بھر پالیا۔ ”میرے
بیارے، میری جان! آپ تو، آپ تو بہت باہمت
نو جوان ہیں۔ یہ کیا، یہ کیا..... نہیں میاں، بالکل
نہیں یہ آنسو آپ کو زیب نہیں دیتے۔“

”اور..... اور دس سال سے آپ انہیں
ڈھونڈ رہے ہیں؟“
”نہیں..... کوئی تین چار سال سے۔ سات
سال میں نے جیل میں گزارے تھے۔ اس لیے
انہیں تلاش نہیں کر سکتا تھا۔“
”جیل میں؟“ ان کی آنکھیں پھیل گئیں۔
”کیا، کیا کہہ رہے ہیں میاں آپ.....؟ کس جرم
میں؟ سات سال کا مطلب ہے کوئی بڑا جرم.....؟“
ان کی آواز ہل گئی۔
”دہرے نل کے جرم میں۔“ میں نے سر جھکا
لیا۔

ان کا جسم بل کھا گیا۔ ”آپ مذاق کر رہے
ہیں۔“
میں نے قتل کی وجہ اور سزا کاٹنے کے بارے
میں مختصر انہیں بتانا شروع کیا تو ان کے چہرے کا
رنگ بدلتا رہا اور وہ گنگ بیٹھے رہے۔ میں نے
تفصیل سے اجتناب کیا تھا لیکن ان کی حالت غیر
ہو گئی تھی۔
دیر تک وہ گم سم مجھے دیکھا کے۔ ”آپ کا تعلق
کیا شہر سے ہے؟“ انہوں نے مضطرب آواز میں
پوچھا۔
”کبھی تھا۔ اب تو کئی شہروں سے ہے۔ اور گھر
میں رہنے کا موقع تو کم ہی ملتا ہے۔ بس گھومتے
رہتے ہیں، شہروں شہروں، گلی گلی..... اور مولوی
صاحب کے نام کی صدا میں لگتے پھرتے ہیں۔“
میری آواز بیٹھنے لگی۔
”اوہ، اوہ۔“ انہوں نے جھرجھری لی۔

”اور..... اور ان کا کوئی نام و نشان نہیں ملا؟“
”کئی جگہ، مراد آباد، جیل سیر، حیدرآباد،
ریاست رام پور کے قصبے گھریا سادات..... بس آنکھ
پجولی سی ہوتی رہی۔ جہاں جہاں بھی ہم پہنچے اس
جگہ سے وہ جا چکے تھے۔ حیدرآباد میں یہ اندازہ ہوا
کہ وہ مجھ سے ملنا ہی نہیں چاہتے۔ ملنا چاہتے تو ان

ان کی تسلی دلا سے میری آنکھیں اور دھندلانے لگیں۔

انہوں نے راہ داری میں ابھی کی موجودی کا احساس دلانے کے لیے مجھے کہنی ماری۔ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا۔ مجھے خود پر قابو ہی نہیں رہا۔

”کچھ نہیں، کوئی بات نہیں۔“ وہ میری کمر ٹھوکتے ہوئے بولے۔ ”دیکھنا، ایک دن بہت جلد..... انشا اللہ جلد ہی آپ کی مراد برآئے گی۔

آپ کی لگن سچی ہے، آپ کا ایک عزم ہے تو..... یہ عزم رازیاں نہیں جائے گا میاں۔“

”مگر یہ سفر میں، جگہ جگہ، بار بار یہ رکاوٹیں جو آجاتی ہیں۔ ہم کسی سے سروکار نہیں رکھنا چاہتے مگر اچانک دیواریں کھڑی ہو جاتی ہیں۔ جیسے یہاں، بتائیے میرا کیا قصور تھا..... کیا کیا بتاؤں آپ کو..... کہاں کیسے کیسے حادثوں، ان ہونیوں سے واسطہ پڑا ہے۔“

”کچھ نہ بتائیے اب..... پھر سہی، کل سہی۔ بندھا مجھے اندازہ نہیں تھا، یہ ذکر آپ کے لیے کتنا تکلیف دہ ہو سکتا ہے۔ یہ سارا کچھ سن کے میری

حالت اضطراری ہے۔ آپ پر کیا گزرتی رہی ہوگی۔ اب میری سمجھ میں بہت کچھ آچکا ہے۔ خدا آپ کو

سکون دے۔ میرا قیاس غلط نہیں تھا۔ آپ کی آنکھوں اور چہرے پر یہ غبار خالی از علت نہیں ہوگا۔

لیکن اتنا کچھ..... میرے سان و گلماں میں نہ تھا۔ کاش میرے پاس کوئی مدد دا ہوتا، میں کچھ کر سکتا

مگر..... مگر ہاں، یہ ممکن ہے کہ اب میں بھی آپ کے ساتھ چلوں جیسے بھائی صاحب آپ کے ساتھ

رہتے ہیں۔ میں بھی جگہ جگہ، شہر شہر، گلی گلی انہیں تلاش کروں گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ ایک سمت

جائیں، میں دوسری..... نہ بہت کو میں یہ سارا کچھ بتاؤں گا تو وہ بھی مجھے نہیں روکیں گی بلکہ حوصلہ

افزائی کریں گی۔“

میں بھری ہوئی آنکھوں سے انہیں دیکھتا رہا۔

ابھی نے آ کے بتایا کہ ایک نچ چکا ہے۔ اس کا اشارہ واضح تھا۔ اکبر علی خاں نے دہنی گھڑی دیکھی

اور اضطراری لہجے میں بولے۔ ”مجھے اب چلنا چاہیے۔ جانے کونجی تو نہیں چاہتا۔ دیر کا کہہ کے آیا

تھا، نہ آنے کا کہہ کے آتا تو بات دوسری ہوتی۔ خاصی رات ہوئی ہے۔ کل صبح جلد ہی آ جاؤں گا۔

صبح تک کلکتے سے بھی کوئی نہ کوئی آ جائے گا۔ بھائی صاحب بھی، اللہ کا شکر ہے، ٹھیک ہو رہے ہیں۔

اب تشویش کی کوئی بات نہیں۔ کل آپ کو کچھ فراغت ہو جائے گی، پھر بیٹھیں گے اور سوچیں گے۔

میں اچھا منتظم بھی ہوں۔ دیکھیے کیا کچھ کیا جا سکتا ہے۔ ان کے ساتھ میں بھی کھڑا ہو گیا۔ وہ مجھے سکون کی تلقین کر رہے تھے لیکن خود ان پر بھان

سپاٹاری تھا۔ حرکات و سکنات میں بڑی بے فراری تھی۔ وہ صبح کر رہے تھے لیکن صدر دروازے تک

مجھے ان کے ساتھ جانا چاہیے تھا۔ راستے میں ان کی دل جوئی کے لیے میں نے کہا۔ ”آپ یہاں،

گرد و پیش کے ماحول کے بارے میں شکوہ کر رہے تھے، اس وقت میں کہتے کہتے رہ گیا، چند دنوں کے

لپے سہی، آپ بھابھی صاحبہ اور بچے فیض آباد آئیں۔ وہاں ہماری حویلی میں شاید وہ لوگ مل

جائیں جن کی آپ کو تلاش ہے۔ وہاں آپ کا دل ضرور گئے گا۔“

میری کوشش کامیاب ہوئی، انہوں نے جو شیعہ انداز میں ہامی بھری۔

میں نے کہا۔ ”وہاں ایک گھر ہے، بہت سے گھروں سے الگ۔ یوں سمجھیے کہ خود بہ خود ایسا کچھ

بس گیا یا ہو گیا ہے۔ وہاں ایک زریں ہے۔ میں کہتا رہتا ہوں کہ پھولوں کے نمبر سے اس کا قسم بنا ہے

اور نس نس میں اس کی شہد سنا یا ہوا ہے۔ اور وہاں ایک زریں ہی نہیں، چھوٹا بھائی جہاں کیر بھی

ہے، خانم ہیں اور نیساں ہے۔ دونوں بہت اچھا مگلی ہیں۔ اور سلمیٰ ہے، زہرہ ہے، اور فروزاں،

یا سمین ہیں۔ سب کی اپنی ایک داستان ہے۔“

”کیا نام لیا آپ نے؟ آخری نام؟“ وہ چلتے چلتے رک گئے۔

مجھے یاد آیا، فروزاں اور یا سمین کے باپ پٹنے ہی سے آسن سول گئے تھے اور درس و تدریس ہی سے وابستہ تھے۔ ”شاید آپ جانتے ہوں۔ وہ پہلے

اسی شہر میں رہتی تھیں۔ ان کے باپ یہاں پروفیسر تھے۔“

”ہاں ہاں میاں۔ آپ جمال الدین سیفی کی بیٹیوں کی بات تو نہیں کر رہے۔ ان کے والد ایک

جدید عالم تھے، فارسی اور شرعی علوم کے ماہر۔ ان کے گھر تو ہمارا خوب آنا جانا تھا۔ ان کی دو بیاری،

بہت پیاری بچیوں سے اپنی بچیوں کا بڑا میل ملاپ تھا مگر وہ آپ کے ہاں، فیض آباد میں.....“ وہ جزیب

ہونے لگے۔

”ہم انہیں آسن سول سے فیض آباد لے آئے ہیں، بہت لمبا قصہ ہے۔ آپ کو دیر ہو رہی ہے، کل

تاؤں گا۔“

پروفیسر صاحب کا تو آسن سول میں انتقال ہو گیا تھا۔ ان کے دوست سید محمود علی انہیں آسن

سول لے گئے تھے۔ دونوں میں گہری دوستی تھی میں بھی ایک دو روز کے لیے سید صاحب کے مہمان

خانے میں مہمان رہا ہوں، کیا مہمان خانہ ہے۔ بہت متواضع آدمی ہیں وہ، بڑے مرنجاس مرنج۔“

”اسی نے اپنے دوست فروزاں اور یا سمین کے باپ کو ختم کر دیا تھا۔ اس کے بعد اس نے ان کی

ہاں خانم فرخ سے شادی کر لی اور اسے بھی ختم کر دیا۔“

وہ اچھل سے گئے اور ان کی آواز میں تندی آگئی۔ ”کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ مجھے پوری بات

تلا ہے۔“

کچھ بتائے بغیر چارہ نہیں تھا۔ میں نے تو ان کی دھند دور کرنے کے لیے حویلی کا ذکر چھیڑا تھا۔ کیا

معلوم تھا کہ وہ فروزاں اور یا سمین سے واقف ہوں گے۔ میں نے سرسری طور پر آسن سول میں پیش

آنے والا انوال بتا کے انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ اس اختصار سے وہ اور بے چین

ہو گئے۔ میں نے کہا۔ ”اب کوئی بات نہیں جو ہونا تھا، ہو چکا ہے۔ پہلے فروزاں اور یا سمین کو سید محمود

علی کے چنگل، اس کے زعماں سے نکالنا ضروری تھا۔ اس لیے اسے کچھ مہلت مل گئی۔ اس کا حساب

باقی ہے اور ہمیں دوبارہ جانا ہے۔ پروفیسر کے اثاثوں کا حساب لینا ہے کہ وہ فروزاں اور یا سمین کا

حق ہے۔ عدالتی کارروائی کی ضرورت بڑی تو فروزاں، یا سمین اور نصیر بابا کے علاوہ کچھ اور

شہادتیں حاصل کرنا ہیں۔ سید محمود علی کو اس کے انجام تک نہیں پہنچایا تو فروزاں اور یا سمین سے تا

انصافی ہوگی۔ اب وہ ہماری ذمے داری ہیں۔“

دیکھنے، سننے، بولنے اور سوچنے کی ایک استطاعت ہوتی ہے۔ آدمی اتنی حیرتمن ہی

برداشت کر سکتا ہے جتنی اس کی سمائی ہے۔ فروزاں اور یا سمین کا واقعہ مستزاد تھا۔ اکبر علی خاں شدید کش

مکش سے دوچار نظر آتے تھے۔ اب انہیں سوال کرنے کا بھی یارا نہیں تھا۔ انہیں مجھ پر یقین تھا کہ

میں ان سے کچھ غلط نہیں کہوں گا۔ مجھ پر ان کا یہ یقین ان کے لیے مزید رنج اور اضطراب کا باعث

ہونا چاہیے تھا۔ کسی جھوٹ اور مبالغے کا شائبہ ہو تو آدمی اتنا حیران و پریشان نہیں ہوتا۔

میری گزارش پر کہ ہم دوبارہ بھی ملیں گے اور کل صبح ہی، انہوں نے صدر دروازے کا رخ کیا

اور پھر کچھ نہیں کہا۔ ان کی خاموشی کا تلاطم اور شور میری آنکھیں دیکھ رہی اور میرے کان سن رہے

تھے۔

سچ وردی پوش دربان موٹھے پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ دور سے اس نے ہماری آہٹیں سن لیں۔ سٹ پٹاتا اٹھ کھڑا ہوا، سیلوٹ کے انداز میں سلام کیا اور دروازہ کھول دیا۔ دروازے کے باہر پولیس کا پہرا تھا۔ بائیں طرف بیچوں پر چار دیواری سے کمر نکائے اونٹھے اونٹھے بیٹھے ہوئے چند سپاہی بھی مستعد ہو گئے۔ ہر طرف ہوکا عالم تھا۔ ارد گرد کی عمارتیں بھی جیسے سو رہی ہوں، کچھ فاصلے پر دو تانگے موجود تھے۔ ایک کوم میں نے آواز دی تو دوسرا بھی بیدار ہو گیا۔ آس پاس چھائے سکوت سے مجھے گھبراہٹ ہوئی اور میں نے اکبر علی خاں سے کہا کہ میں بھی ان کے ساتھ چلتا ہوں۔ انہیں گھر پہنچانے کے اسی تانگے میں واپس آ جاؤں گا۔ انہوں نے انکار کر دیا، احماد سے بولے۔ ”یہ میرا شہر ہے میاں۔“ مجھ سے گلے ل کے تانگے میں بیٹھا جاتے تھے کہ رک گئے اور میرا ہاتھ تمام کر مجھے ایک قدم دور لے گئے اور سرگوشی میں کہنے لگے۔ ”ایک بات کہنی تھی آپ سے، بس یوں ہی۔ صبح تک گھلتے سے تو کوئی آہی جائے گا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ میدا کے ٹھکانے پر جانے کا خیال ہی چھوڑ دیں۔ میری درخواست ہے۔“

”مگر میرا چاقو اس کے پاس ہے۔ اسے واپس لینا ہے۔ یہ اڈوں کی روایت ہے وہ لوگ کیا سمجھیں گے۔“ میری آواز بیٹھ گئی۔

”کوئی اور صورت نکال لیجیے۔ مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔ سوچ لیجیے۔“

”کہیں آپ کو میری ناکامی کا اندیشہ تو نہیں..... بے شک یہ بھی ہو سکتا ہے لیکن جانا تو ہے، جانا تو چاہیے..... اور ایسا کچھ نہیں ہوگا، آپ اطمینان رکھیں۔“

”ہوئیے تو نظر ثانی کیجیے، میری التجا ہے۔“

”آپ کسی بات کر رہے ہیں۔“

”ٹھیک ہے، صبح بات ہوگی۔ کسی دوسری

صورت پر غور کریں گے۔ انہوں نے میرے گلے تھکے اور تانگے میں بیٹھ گئے۔ سناٹے میں تانگے کی آواز دیر تک گونجتی رہی۔ جب تک تانگہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گیا، میں وہیں کھڑا رہا۔

ایسی جاگ رہی تھی اور میرا انتظار کر رہی تھی۔ کمرے میں میرے داخل ہوتے ہی ناراض ہونے لگی۔ ”اب تم بھی کچھ دیر آرام کرو، میں دیکھ رہی ہوں، تم اپنے آپ سے بہت زیادتی کر رہے ہو۔ نو جوانی کو اتنا زیر بار نہیں کرتے میرے پیارے بچے۔“

صوفے پر بیٹھ کے میں نے پیر پھیلا دیے اور میرا جسم بھر سا گیا۔ ایسی بھی میرے پاس بیٹھ گئی اور اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ”سر میں درد تو نہیں؟“ اس کی آواز سے شفقت چھلک رہی تھی۔

”نہیں، بس کچھ تھکن سی ہو رہی ہے۔“ میں نے کہا۔

”وہ تو ہوگی نا۔ گوشت پوست ہی کے بنے ہو۔ تم ایسے نہیں آرام کرو گے۔ میں تمہیں نیند کی گولیاں دیتی ہوں، تمہیں ایک گہری نیند کی ضرورت ہے۔“

جبری آرام، آرام تو نہیں ہوا۔ میں نے بس کہہ۔

جو بچے کہنا نہیں مانتے، انہیں اسی طرح قابو میں کیا جاتا ہے۔ اب سیدھی طرح اٹھ کے اپنے بستر پر جاؤ..... چلو اٹھو۔“ اس نے میرا ہاتھ پلا کے مجھے اٹھا دیا اور بستر تک لے آئی۔ میں بستر پر دراز ہوا تو اس نے میرے پیر چادر سے ڈھانپ دیے اور سرھانے بیٹھ کے میری پٹی پٹی اور بال سہلانے لگی۔ مجھے امی کی یاد آئی۔ ”تمھی بستر پر لینا میں مہبت اور دیواریں تکتا رہتا تھا۔ رات کو میری کھلی آنکھیں دیکھ کے امی بھی کچھ اسی طرح میرے سرھانے آ کے سرد پانی اور ڈائٹ ڈپٹ کرتی رہتی تھیں۔ اسی میں مجھے نیند آ جاتی تھی۔ آج بھی یہی

ہوا۔ مجھے خبر ہی نہیں ہوئی، کب آنکھ لگی اور کب ایسی سرہانے سے آئی۔

صبح ہونے میں چند گھنٹے رہ گئے تھے۔ نیند کا دورانیہ زندگی میں کیوں شمار کیا جاتا ہے۔ نیند تو نصف موت ہے۔ صبح کمرے میں وارڈ بوائے کی کھٹ پٹ سے میری آنکھ کھلی۔ منہ ہاتھ دھو کے میں باہر آیا تو امی نے ناشتہ تیار رکھا تھا۔ اٹھ کر صبح رہے تھے۔ ابھی تک جامو، جھرو اور زور میں سے کوئی نہیں آیا تھا۔ شاید انہیں وقت پر تار نہیں مل سکا ہو۔ بہر حال صبح شعل کی حالت کچھ اور بہتر نظر آ رہی تھی۔ میری آواز پر اس نے آنکھیں کھولیں اور اس کے ہونٹوں میں جنبش ہوئی۔ میں نے دانستہ اس سے کوئی سوال نہیں کیا۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر رائے کو آنا ہی تھا۔ میں نے شعل کو بتانا چاہا تھا کہ گلتے تاروں سے دیا ہے، وہاں سے کوئی نہ کوئی آنے والا ہی ہوگا لیکن اس کے دماغ پر زور پڑنے کے خیال سے میں رک گیا۔

ڈاکٹر رائے ٹھیک دس بجے آیا۔ اس کے ساتھ دو نو جوان ڈاکٹر بھی تھے۔ جانے کیوں اس نے کچھ دیر کے لیے مجھے کمرے سے باہر چلے جانے کی ہدایت کی۔ کسی ایک سوال کا عمل نہیں تھا، میں خاموشی سے باہر آ گیا اور میرے نکلنے کے بعد امی نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔

میں راہ داری کے ساتھ مجھے سبزہ زار پر آ کے بیٹھ گیا۔ اکبر علی خاں کی وقت بھی آ سکتے تھے۔ رات انہوں نے کہا تھا کہ ساتھ ہی ناشتہ کریں گے۔ ڈاکٹر رائے کو کمرے میں نصیر سے پندرہ منٹ ہوئے ہوں گے۔ آدھارہ داری کے کونے پر اکبر علی خاں کا ملازم لڑکا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ خالی تھے اور وہ خاصا بدحواس نظر آ رہا تھا۔ میرا ہاتھ لٹکا اور میں فوراً کرسی سے اٹھ گیا۔ لڑکا کمرے میں داخل ہوا چاہتا تھا کہ دروازہ بند دیکھ کے منتشر ہوا۔ میں نے اسے آواز دی تو وہ بھاگا بھاگا میرے پاس آیا اور اس نے ٹوٹی

بھولی آواز میں بتایا۔ ”بڑے صاحب کا خون ہو گیا۔“ یہ کہتے ہی وہ روٹنے اور بکھلنے لگا۔

مجھے اپنے ہوش دھواس پر شبہ ہوا، لیکن لڑکے نے وہی کہا تھا جو میں نے سنا تھا اور وہ وہی لڑکا تھا جو اکبر علی خاں کے ساتھ آتا رہا تھا۔

”بڑے صاحب کا خون ہو گیا صاحب!“ وہ بلک رہا تھا اور میری ٹانگوں سے لپٹ کے اس نے دوایلا شروع کر دیا تھا۔

”کیا..... کیا.....؟“ میں نے پھٹی ہوئی آواز میں کہا، ”کیا بک رہے ہو؟ کون بڑے صاحب؟“

اس سے پہلے کہ میں اسے تھوکر مار کے خود سے دور کرتا، اپنے پیروں سے اٹھا کے اسے لٹا نچے مارتا، اس نے ہڈ پانی انداز میں بتایا کہ صبح نماز کے وقت مسجد جانے کے لیے لوگ باہر نکلے تو انہوں نے مسجد اور اکبر علی خاں کے گھر کے نزدیک ہانیچے کی باڑ میں ان کی لاش دیکھی، خون میں لت پت..... لڑکے کی زبان اکڑ گئی اور وہ میرے قدموں پر سر پھینکے لگا۔

وہ جانے کیا کہتا رہا، میں گنگ کھڑا اسے دیکھا کیا۔

”آپ چلو صاحب ابھی بیگم صاحب کی حالت بہت خراب ہے۔“ اس نے گھٹکھٹا کر کہا۔

میں اس سے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ میری رنگوں میں خون جم گیا تھا اور آنکھوں پر اندھیرا چھانے لگا تھا۔

اسی لمحے نرس امی کمرے کے دروازے سے مجھے پکارتی ہوئی باہر نکلی اور میرے پاس آ کے ٹھٹک گئی۔ اس کی آمد پر لڑکے نے میری ٹانگیں چھوڑ دیں اور مجھ سے دور ہو گیا۔ اس کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔

”کیا..... کیا بات ہے؟“ امی نے بڑبڑا کے پوچھا۔

میں اسے کیا بتاتا۔ میری خاموشی پر وہ لڑکے کا

کندھا چھوڑنے لگی۔ ”کیا ہے؟ کیا بات ہے؟ تم روتا کیوں ہے؟“

لڑکے نے پہلے بری طرف دیکھا پھر سسکتی آواز میں ایکی کی ساعت کو آزمائش سے دوچار کیا۔ ”کا..... کا بولتا ہے؟“ ایکی سر اسٹیکسی سے بولی۔ ”ایسا کیسے؟ نہیں، نہیں۔“

لڑکا سر جھکائے روتا رہا۔ ایکی نے مجھے ٹوکا دیا اور تصدیق چاہی۔ بری جانب دیکھ کے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ ایک جہاں دیدہ عورت تھی۔ عمر رسیدگی سے برداشت مشروط ہے۔ اس نے لڑکے کی کمر چپکی، اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور آدھی انگریزی، آدھی ہندوستانی میں تسلی دلا سے دینے لگی۔ اس نے لڑکے کو گھر واپس جانے کی ہدایت کی۔ لڑکے نے مجھ سے کچھ پوچھنا چاہا۔

”تم ابھی ایدر سے جاؤ۔“ ایکی نے حکمے انداز میں کہا، ”جاؤ ابھی۔“

لڑکا کچھ دیر شاید میرے کچھ کہنے کے انتظار میں کھڑا رہا۔ میرا دماغ ہی کام نہیں کر رہا تھا۔ میں اس کے ساتھ چل بڑا کر ایکی نے میرا ہاتھ جکڑ کے مجھے روک لیا اور لڑکے کو چلے جانے کا اشارہ کیا۔

”اے کو سنجا لو۔“ خود اس کی آواز کھری ہوئی تھی۔ ”ایسا کیسے ہو گیا، ابھی رات کو تو وہ..... نہیں نہیں۔“ وہ سر جھکنے لگی۔ ”ایسا کیسے۔“

میں پھر ان آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا۔

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔“ اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کے بے رطبی سے انگریزی میں کہا۔ ”ڈاکٹر رائے تمہیں اندر بلا رہے ہیں۔ تمہارے بھائی کی حالت اس وقت خاصی بڑے۔ اس نے ڈاکٹر سے کچھ باتیں کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ تم ابھی اندر چلو مگر..... مگر تمہارا اس وقت اندر جانا..... میں ڈاکٹر سے کیا کہوں؟“ وہ بری طرح بدحواس نظر آ رہی تھی۔ ”ٹھیک ہے، میں اندر جا کے دیکھتی ہوں۔ نہیں جانا مت..... نہیں بھی نہیں۔“

مجھے۔“

مجھے تنہا چھوڑ دے وہ تقریباً بھاگتی ہوئی کمرے کی طرف گئی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہوتے اس نے کئی بار مجھے مڑ کے دیکھا۔ مجھ سے اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔ میں نے وہیں، اہ داری کے چپوڑے پر بیٹھنا چاہا لیکن دوسرے لمبے دو تین ڈاکٹروں کے ساتھ ڈاکٹر رائے کمرے کے دروازے پر نمودار ہوا اور میری جانب لپکتا ہوا آیا۔ ”کیا..... کیا کہتی ہے یہ ایکی؟“ اس نے وحشت آمیز لہجے میں کہا اور ایک سانس میں جانے کیا کچھ کہتا اور پوچھتا رہا۔

میں نے کچھ سنا، کچھ نہیں اور کوئی جواب نہ دے سکا۔

”تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“ اس نے چھپتی آواز میں پوچھا۔

ایکی بھی کمرے سے آگئی تھی۔ اسکی ذلیل انداز پر ڈاکٹر رائے نے پھر مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا۔ ایکی ہی اس سے کچھ کھس پھس کرنی رہی۔ کچھ لمحوں تک ڈاکٹر خاموش رہا پھر میرا بازو تھام کے مجھے کمرے میں لے جانا چاہتا تھا کہ لوٹ پڑا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کے اپنے سماجی ڈاکٹروں کو آگے چلے جانے کی تاکید کی اور تیز قدموں سے راہ داری میں چلتا ہوا کچھ دیر بعد ایک کمرے میں داخل ہو گیا۔ یہ ایک مختصر اور صاف ستھرا کمرہ تھا۔ وہاں موجود نرس اور ڈاکٹر کھڑے ہو گئے۔ ڈاکٹر رائے کے چور سے انہوں نے اس کا عندیہ سمجھ لیا اور سٹ پٹانے ہوئے باہر نکل گئے۔ میز کے اطراف رہی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر مجھے بٹھا کے ڈاکٹر رائے میرے برابر کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ”مجھے معلوم ہے، یہ سن کے تم پر کیا گزر رہی ہوگی۔“ وہ اضطرابی لہجے میں بولا۔ ”لیکن یہ ایسا وقت نہیں جو تم اس طرح ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہو۔ مجھے بتاؤ یہ سب کیوں اور کیسے ہوا؟“

”کیا بتاؤں ڈاکٹر صاحب!“ میں نے ٹوٹی پھوٹی آواز میں کہا۔ ”مجھے کچھ نہیں معلوم۔“

”مجھ سے ذرا ہوش میں آ کے بات کرو۔“ ڈاکٹر رائے کا لہجہ ترش ہو گیا۔ ”رات کو کتنے بیچ تک وکیل صاحب تمہارے ساتھ تھے؟“

”وہ ایک بیچ کے بعد یہاں سے اٹھے تھے۔“

”ایک بیچ کے بعد؟“ وہ جزبز ہو کے بولا۔

”نرس ایچی نے آ کے ہمیں ٹوکا تھا کہ ایک بیچ چکا ہے۔ وہ فوراً اٹھ گئے، لیکن اس کے بعد بھی وہ کوئی مین پیچیس منٹ بعد اسپتال سے رخصت ہوئے تھے۔ اس دوران صدر دروازے کے راستے میں وہ رک رک کر باتیں کرتے رہے۔ یہاں سے جانے کو ان کا جی نہیں چاہتا تھا۔ مگر گھر کہہ کے نہیں آئے تھے وہ۔ صدر دروازے پر میں نے ان سے کہا بھی میں ساتھ چلتا ہوں، اسی تانے سے واپس آ جاؤں گا۔ انہوں نے انکار کر دیا۔ کہنے لگے، یہ میرا شہر ہے مہاں، بہت اعتماد تھا، انہیں اپنے.....“

”پھر تم اپنے کمرے میں واپس آ گئے؟“

”جی ہاں، رات بہت ہو گئی تھی۔ کچھ دیر میں جاگتا رہا، پھر نیندا آ گئی۔“

ڈاکٹر چند لمبے چپ رہا، پھر بولا، ”انہوں نے کسی کا کیا بگاڑا تھا۔ وہ اس شہر کے مشہور وکیل تھے، سبک کے رہنے والے، بہت خاندانی آدمی۔ کون ان کا دشمن ہو سکتا ہے؟“

میرے سینے میں آگ سی بھڑکی۔ میں نے کچھ کہا جا با اور مشکل سے اپنی زبان بند رکھی۔

”تمہاری ان سے اس شہر میں آنے کے بعد غلط بات ہوئی تھی؟ ڈاکٹر کے تند و تیز لہجے سے مجھے اور کس ہونے لگی۔ ”اس سے پہلے تم انہیں نہیں جانتے تھے؟“

”دو دن ہی۔“ میں نے مختصر کہا۔ ”بس دو دن سے۔“

”رات وہ تم سے کیا باتیں کرتے رہے؟“

”یہی اے گھر بیوی بچوں کی۔“

”اور تم کہتے ہو، تمہاری جان پہچان کو دو ہی دن ہوئے تھے۔“ ڈاکٹر کی آواز میں تلخی نمایاں تھی۔

”لیکن اس مختصر مدت میں وہ مجھے بہت قریب سمجھنے لگے تھے۔ وہ بہت اچھے، بڑے صاف دل آدمی تھے میں نے ایسے لوگ بہت کم دیکھے ہیں۔ لگتا تھا، جیسے ہم برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔“ میرا جی اٹھنے لگا اور آنکھوں سے آنسو پھوٹ پڑے۔

”نا، نا اس طرح نہیں۔“ وہ تنہی آواز میں بولا۔ ”تمہیں اندازہ ہے، پولیس کسی بھی وقت یہاں آ کے تم سے تعقیب کرے گی۔ ممکن ہے، راستے میں ہو۔ برہنہ ہوگا کہ اس کے آنے سے پہلے مجھے صاف صاف بتاؤ۔ مجھے شبہ ہے، تم نے مجھ سے کچھ چھپایا ہے اور اب بھی یہی کر رہے ہو۔ اصل بات سے واقف ہو کے شاید میں تمہارے کسی کام آسکوں۔“

میں سر جھکائے بیٹھا اپنے آپ کو نوچتا رہا۔

”تمہارا کسی پر شبہ ہونو بتاؤ۔ تم سے رات انہوں نے اتنی باتیں کی تھیں۔ کسی کی طرف انہوں نے کوئی اشارہ کیا، کوئی ایسی بات؟“ ڈاکٹر کی پیشانی پر شکنیں پھیل گئیں۔

میں اسے کیا بتاتا، کیا نہیں۔ خاموشی کا اب کوئی عمل بھی نہیں تھا۔ جلد، یا بد پر، اب تو سب کچھ عیاں ہو جاتا تھا۔ میں نے کھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ ”سب کچھ میری وجہ سے ہوا ہے۔“

”کیا؟“ ڈاکٹر رائے اچھل پڑا۔ ”کیا کہتے ہو، تمہاری وجہ سے؟“

”میرا منہ سب سے چھپ گیا تھا۔“

”کیا فضول باتیں کر رہے ہو۔“

”ایک جگہ اور ایک آدمی کی بات نہیں ڈاکٹر صاحب! پہلے بھی کتنی بار ایسا ہو چکا ہے۔ یہاں بھی

یہی ہوں۔

”تم اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہو شاید۔“
ڈاکٹر رائے کا چہرہ گڑبگڑ گیا۔

”یہی کچھ ہے ڈاکٹر صاحب! نہ ہم یہاں آتے، نہ انتھونی اپنی جان سے جاتا، نہ اکبر علی خاں اور..... اور نہ کوئی اور.....“

”انتھونی! انتھونی کا اس سے کیا تعلق ہے؟“
ڈاکٹر رائے پھر کے بولا۔

”آپ نہیں سمجھیں گے۔“ میں نے ڈوبتی آواز میں کہا۔ ”میں آپ کو کیا بتاؤں، ہم بہت برے لوگ ہیں ڈاکٹر صاحب۔“

ڈاکٹر نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور جبری ملاحظہ کرتے ہوئے بولا۔ ”مجھے کھل کے بتاؤ دوست! میں واقعی کچھ سمجھنا چاہتا ہوں۔ میں نہیں سمجھتا تم کوئی برے آدمی ہو، تم یا تمہارا بھائی.....“

”آپ ایک دوسرے، ایک مثبت آدمی ہیں، بہتر ہوگا، آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ آپ بہت الجھ جائیں گے۔ یہاں بہت سے لوگوں کو آپ کی ضرورت ہے۔ ایسی باتیں ہمارے لیے نئی نہیں ہیں۔ ہم بھٹکتے رہتے ہیں، لیکن آپ.....“

ڈاکٹر جھپکتی نگاہوں سے تادیر مجھے دیکھتا رہا۔ ”تم کون ہو؟“

درستی کے باوجود اس کے لہجے سے ہیبت عیاں تھی۔ کچھ توقف کے بعد وہ بے اعتنائی سے بولا۔ ”ٹھیک ہے۔ مجھے کچھ بتانا چاہتے ہو تو کہو، ورنہ مجھے اور بہت سے کام ہیں۔ میرا کوئی زیاں نہیں کہ میں تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ دوں۔ تم یہاں اس اسپتال میں ہو اور کسی طور اس انسوس ناک واقعے کا تعلق اسپتال سے بھی نکل آتا ہے اور اسپتال کا اپنا ایک نام اور اپنی ایک عزت ہے۔ مجھے تم پہلی نظر میں بہت سے نوجوانوں سے ایک مختلف نوجوان نظر آئے تھے، اس لیے.....“ وہ کہتے کہتے رک گیا اور پہلو بد لئے لگا۔

”ایسی باتیں نہ کیجیے ڈاکٹر صاحب!“ میں نے عاجزی سے کہا۔ ”آپ نے مجھ ایک اجنبی کو بہت عزیز رکھا ہے بہت اچھا سلوک کیا ہے مجھ سے، لیکن میری بد قسمتی ہے، عزت مجھے راس نہیں آتی۔ میں آپ کو بتاتا ہوں۔ کچھ بھی غلط نہیں تھا۔ بہت سیدھی سی بات ہے۔ اپنے بھائی کے علاج کے لیے مجھے یہاں آنا پڑا تھا۔ بھائی کی کیا حالت تھی اور آپ کیا ہے، یہ آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ ہم تو کہیں اور جا رہے تھے۔ بس یہاں آ کے مجھ سے ایک چھوٹی سی غلطی ہو گئی۔ غلطی تھی بھی، یا نہیں۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ ایک ذرا سی بات اتنی دور تک جاسکتی ہے، پھر ایک کے بعد ان ہونی، ناگہانی سے واسطہ پڑتا رہے گا۔ میں آپ کو کیا کیا اور کس حد تک بتاتا کہ پرسوں آدھی رات کے بعد آنے والے لوگ کسی اور کی نہیں، میری جستجو..... میں آئے تھے۔ نرس ایلی نے احتیاط کی، جانے کیا سوچ کے اس نے منع کر دیا کہ میں کمرے میں موجود نہیں ہوں۔ انہیں حجت کرنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ ادھر سے اسپتال کے عملے نے شور مچا دیا۔ ان کے تعاقب سے وہ درندے بوکھلا گئے اور بھاگ کھڑے ہوئے، مگر صدر دروازے پر انتھونی ان کے آڑے آ گیا اور اپنی جان دے بیٹھا۔ وہ لوگ تو مجھے ختم کرنے آئے تھے۔“

میں کل صبح بھی آپ کو اصل بات بتا سکتا تھا کہ انتھونی کیوں مارا گیا۔ وہ غریب تو ایک طرح سے چارابن گیا..... اور اس نوجوان سے زندگی چھیننے والے ہی نہیں، اس سے پہلے، آپ کو یاد ہوگا، کمرے میں آپ کی موجودگی کے درمیان جو دو پولیس افسر آئے تھے، وہ بھی اس سلسلے کی کڑی تھے۔ پردہ پوشی بے مصلحت نہیں تھی ڈاکٹر صاحب! آپ میرے بھائی کا علاج جس تن دہی سے کر رہے ہیں، آپ نے میری سرج بائیں جس عمل اور ناز سے برداشت کیں، میرا تو رداں رداں آپ کا احسان

مند ہے۔۔۔۔۔ میری جگہ آپ ہوتے تو شاید یہی کچھ کرتے۔ میرے اور بھائی کے بارے میں آپ کے کسی ناخوش گوار تاثر سے بھائی کا علاج متاثر ہونے کا اندیشہ ہے جا تو نہیں تھا۔ بھائی بیمار سے اور آپ ڈاکٹر ہیں۔ کسی اور جانب آپ کی توجہ بٹھک جانے، ان ناگفتی سے آپ کو دور رکھئے، خواہ خواہ آپ کے منتشر اور پریشان ہو جانے کے خیال سے میں نے زبان بند رکھی۔ ایسی کو میں نے سارا کچھ بتا دیا تھا اور بہت کچھ زک سیوریوں کو بھی۔ میری التجا پر وہ خاموش رہیں۔

”تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہیں۔“ ڈاکٹر رائے ایچ کے بولا۔ اس کے چہرے پر وحشت چھائی تھی۔

”آجائے گا اب سبھی کچھ۔“ میں نے ناتوانی سے کہا۔ ”مجھے آپ سے کچھ نہیں چھپانا۔ روے کا اب کچھ حاصل نہیں۔ آپ جو چاہیں، فیصلہ کریں۔ جو ہو چکا ہے، اس سے بدتر کیا ہو سکتا ہے۔“

”میں، میں جانا چاہتا ہوں۔“ ڈاکٹر حتی لہجے میں بولا۔

میں نے اسے نٹھل کو اسپتال میں داخل کرنے کے بعد دوسری صبح لباس تبدیل کرنے لیے ہوٹل جانے اور ڈاک خانے جا کے گھر تار دینے، بنوا چھن جانے پر چور کا پھینچا کرنے اور وہاں پیش آنے والے حادثے کے متعلق بتایا۔ میں نے کہا، ”مجھے جلد از جلد اسپتال واپس پہنچانا چاہیے تھا۔ لیکن ادھر پولیس نے تعاقب شروع کر دیا تھا۔ میری کوئی غلطی نہیں تھی، لیکن سامنے آجانے کے بعد پولیس کے طریق کار، رسمی کارروائیوں، تفتیشی مراحل سے گزرنے میں وقت لگ سکتا تھا۔ شہر میں میرا کوئی شناسا نہیں تھا۔ ایک ہجوم تانگے کے پیچھے تھا، پولیس کے علاوہ، عام لوگ بھی۔ ایک جگہ بڑک کے موٹر پر تانگا ہجوم سے اوجھل ہوا تھا کہ تانگے سے کود کے میں قریب کی ایک گلی میں داخل ہو گیا۔ راستے

معلوم نہیں تھے، گلیوں گلیوں بھٹکتا رہا، پھر ایک جگہ ہجوم کا شور سن کے اور کوئی چارہ نہ دیکھ کے میں نے ایک مکان کے دروازے پر دستک دی۔ جواب میں آنے والے شخص کو اپنی مشکل بتانے اور کچھ دیر کے لیے پناہ کی بھیک مانگنے کا نتیجہ بہ ترنٹنے کی توقع نہیں تھی۔ اپنی صفائیوں اور صراحتوں کے لیے وقت بالکل نہیں تھا۔ گلی کا کوئی راہ گیر مجھے ایک مکان کے دروازے پر کھڑا، مکان کے مکین سے حجت کرتے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔ پولیس والوں کو تانگے والے نے یقیناً بتا دیا ہوگا کہ میں کس جگہ، کس طرف کی گلیوں میں گم ہوا ہوں گا جو ان کا رخ اس طرف ہو گیا تھا۔

دستک کے جواب میں دروازے پر نمودار ہونے والے شخص کو مجھے چاقو کی زد پر لیتا پڑا۔ اسے گھر میں دھکیلتے ہوئے میں نے دروازے کی کنڈی لگا دی۔ وہ صاحب اکبر علی خاں تھے۔“

”اکبر علی خاں اوکیل صاحب؟“ ڈاکٹر رائے حیرانی سے بولا۔

”وہ بیوی بچوں کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔ سبھی کا جو حال ہوتا تھا، وہ ہوا۔ کینوں کی بودوباش، طور اظہار اور اپنے لیے اس گھر کی صورت حال سے مطمئن ہونے میں نے اس طرح ان کے گھر میں گھسنے پر معذرت چاہی۔ اپنی آمد کا مقصد بتایا اور کچھ دیر پہلے ڈاک خانے والی گلی میں پیش آنے والا واقعہ سنایا۔ میں نے گھر کی کسی چیز کو ہاتھ لگا تھا، نہ کسی کو زک پہنچائی تھی۔ پناہ کے سوا میرا کوئی اور مطالبہ بھی نہیں تھا۔ اوکیل صاحب نے میری روداد توجہ سے سنی۔ وہ دنیا دیکھے ہوئے ایک سچے اور کھرے آدمی تھے۔ انہیں مجھ پر یقین آ گیا۔ میں نے بھی پھر ان پر اعتبار کر کے چاقو جیب میں رکھ لیا اور بیوی بچوں کو بیشک سے گھر کے اندر جانے کی اجازت دے دی۔“

”تم سچ بول رہے ہو؟“

”میرے پاس یہی کچھ ہے کہنے کے لیے۔“ میں نے کشیدہ لہجے میں کہا۔

”تم ہمیشہ چاقو پاس رکھتے ہو؟“

میں نے سر جھکانے پر اکتفا کی۔

”مگر کیوں؟ کس لیے؟“

”ہمیں ایسے واقعات سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔“ میں نے آہستگی سے کہا۔

ڈاکٹر کی پھیلی آنکھیں مجھ پر مرکوز ہو گئیں۔

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔“ وہ گہری سانس بھر کے بولا۔ ”تو تم نے اکبر علی خاں صاحب کو قائل کر لیا۔“

میں نے اسے بتایا، یہ اتفاق تھا، یا یوں کہیے، میری خوش قسمتی تھی کہ میں نے اکبر علی خاں جیسے صاحب دل کے مکان پر دستک دی۔ انہوں نے مجھ سے ہم ردی کا اظہار کیا اور مجھے اس عذاب سے نجات دلانے کے لیے طرح طرح کی تدبیروں پر غور کرتے رہے۔ ڈاک خانے کی گلی میں جس آدمی کی پہلی میں چاقو پیوست ہو گیا تھا اور جس بد جواس آدمی نے ناچنگی اور نادانستگی میں اپنے ہی ساتھی کو زخمی کر دیا تھا وہ تیسرا بھی، جس نے میری جیب سے ہوا چرایا تھا، تینوں شہر کے نامی گرامی استاد میڈا کے آدمی تھے۔ ان میں سے کسی ایک کی زبانی مجھے میڈا استاد سے ان کی وابستگی کا علم ہو چکا تھا۔

ڈاکٹر کچھ بولنا چاہتا تھا، لیکن خاموش رہا۔ میں نے کہا کہ ہر جگہ، شہر کے دادا، یا استاد کے اڈے کی ہیبت چھائی رہتی ہے۔ پولیس بھی کسی سنگین واردات میں دادا اور اس کے ساتھیوں پر ہاتھ ڈالتے ہوئے دس مرتبہ سوچتی ہے۔ ظاہر ہے، میڈا استاد کے آدمیوں کے اشارے پر پولیس حرکت میں آتی تھی۔ میڈا کا ایک ساتھی زخمی ہو گیا تھا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ زندہ بھی رہ گئے یا نہیں۔ میں تو فوراً گلی سے چلا آیا تھا۔ اس تمام واقعے کے گواہ گلی کے مکین اور راہ گیر تھے، لیکن یہ میڈا استاد کے

اڈے کا معاملہ تھا۔ گلی کے لوگ اور راہ گیر اس کے زور و اثر سے واقف تھے۔ طاقت سب سے بڑا بچ ہوئی ہے۔ اڈے کے ساتھیوں اور عام لوگوں کی نظروں میں اپنی ساکھ برقرار رکھنے کے لیے استاد میڈا کو فوراً سرگرم ہو جانا چاہیے تھا۔ پولیس اور شہر میں پھرے ہوئے میڈا کے ساتھیوں سے اپنے آپ کو چھپاتے ہوئے اسپتال پہنچنا ممکن نہیں رہا تھا۔

اکبر علی خاں نے معاملہ دب جانے تک مجھے اپنے گھر میں روپوش ہونے کا مشورہ دیا اور مہربانی کی انتہا کر دی۔ انہوں نے کہا کہ میری عدم موجودی میں وہ اسپتال جا کے نٹھل کی خبر گیری، نگرانی کرتے رہیں گے۔ اس دوران، بدتر ہوگا کہ میں تار دے کے اپنے عزیزوں اور دوستوں میں سے کسی کو یہاں بلا لوں، مگر ان کا کوئی مشورہ صائب نہیں لگتا تھا۔ مجھے یاد تھا ڈاک خانے والی گلی میں، میں نے میڈا کے بد ماخ ساتھیوں سے اسپتال کا ذکر کیا تھا۔ تانگے والا بھی مجھے اسپتال سے ہوٹل، پھر ڈاک خانے لے گیا تھا اور وہاں ہی میں بھی اس کا رخ اسپتال ہی کی طرف تھا۔ ان شواہد اور اسپتال سے میرے غیاب اور اکبر علی خاں کی موجودی سے وہ ساری صورت حال بھانپ لیتے اور یوں اپنے گھر میں مجھے پناہ دینے کی فیاضی اکبر علی خاں کو بڑی مہنگی پڑ سکتی تھی۔ نٹھل کو اس حالت میں تنہا چھوڑا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ میں نے ڈاکٹر سے کہا کہ مریض کو چھوڑ کے تیار دار کے غائب ہو جانے پر سب سے زیادہ وحشت اسی کو ہوتی، اس کے دماغ میں جانے کیسے کیسے وہ نمونپاتے، اسپتال کے عملے میں بھی چہ میگوئیاں ہونے لگتیں، ویسے بھی مجھے یقین تھا میں اسپتال پہنچنے میں کامیاب بھی ہو جاؤں تو جلد یا بدیر میڈا اور اس کے حاشیہ بردار سرا پکڑتے ہوئے میرے سر پر آدھکیں گے۔ میں نے اکبر علی خاں کے سارے مشورے مسترد کر لیے اور

مید استاد سے بذات خود ملنے کا ارادہ کیا۔ اکبر علی خاں نے مجھے بہت سمجھایا بھائی۔ میدا جیسے خطرناک آدمی ہے دور رہنے کی تلقین کی، لیکن پھر اور کیا صورت تھی۔ میرے ارادے میں کوئی لگ نہ دیکھ کہ انہوں نے خود بھی میرے ساتھ چلنے کی جرأت لی۔ میں انہیں اس معاملے سے الگ ہی رکھنا چاہتا تھا۔ وہ نہیں مانے اور ہم دونوں میدا کے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔

”میدا کے ٹھکانے پر؟“ ڈاکٹر رائے اچھل پڑا۔ ”یہ جاننے ہونے کے میدا کون آدمی ہے۔“

”پھر میں کیا کرتا۔ یہی ایک آخری راستہ رہ جاتا تھا۔ میں خود اس کے پاس پہنچ جاؤں اور اسے صحیح بتاؤں کہ میں نے اس کا کوئی آدمی زخمی نہیں کیا ہے۔ میں ایسے وقت جب میرا بھائی زندگی کے لیے بھروسہ کر رہا ہے، کس طرح کسی عناد و فساد کا خطرہ سول لے سکتا تھا۔ میرا خیال تھا وہ اڈے کے طور طریقوں میں کھرا ہے جیسا کہ اڈوں کی چوکی پر بیٹھنے والے لہجے تر دادا، استاد لوگ ہوتے ہیں تو وہ میری بات سنے گا۔ میں میں اس سے کہوں گا کہ گئی کے لوگوں سے تصدیق کیے بغیر اسے کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔ میرا ہوا چھینا گیا تھا۔ چوروں کا تعاقب کر کے اور اسے زیر کر کے میں نے بڑا حاصل کر لیا کیا غلط کیا تھا۔ پھر اس کے دو ساتھی اپنے چور ساتھی کا انجام دیکھنے کے باوجود زیادتی پر کیوں اتر گئے۔ انہیں جانتا چاہیے تھا کہ کوئی آدمی، چور کو قابو کر سکتا ہے تو ان کے لیے بھی بھاری پڑ سکتا ہے۔ وہ چند ہاتھ کے بھی نہیں تھے۔ بات بڑھ جانے کے خیال سے میں نے ہاتھ باندھے رکھے، اپنا چاقو بھی نہیں نکالا۔ وہ دونوں جانے کس شمار میں تھے، اپنے ساتھی کی ہزیمت سے ہوش و حواس کھو بیٹھے تھے۔ رنے مارنے پر تل پڑے۔ رفع شر کے لیے میں نے اپنا ہوا بھی ان کی نذر کرنا چاہا۔ گئی کے لوگوں کو میدا کی ہیبت دہشت سے امان ملے تو ضرور بیچ

بولیں گے۔ میں نے سوچا، میدا سے کہوں گا کہ میری اس کی کوئی عداوت نہیں ہے۔ مجھے تو اپنے بھائی کی وجہ سے اس شہر میں رکنا پڑا۔ حقیقت اس سے کچھ دور نہیں ہے۔ اسے پٹنا میڈیکل کالج کے اسپتال تک جانے کی زحمت کرنا پڑے گی لیکن میدا کے سامنے جا کے میں نے یہ کچھ نہیں کہا۔ ایک نظر میں اندازہ ہو گیا تھا کہ اسے بہت عرصے سے چاقو اٹھانے کی ضرورت نہیں پڑی ہے۔ جسم پر چربی کی ہلکی سی تہہ جم چکی تھی۔ آدمی کے جسم پر اچھی چربی لوہے سے چھپنے والے رنگ کے مانند ہوتی ہے۔ میں نے استاد میدا سے کہا، میں اڈے کی چوکی کا دعوے دار بن کے آیا ہوں۔ اڈوں کی جو ریت ہے، وہ چوکی سے خود اتر جائے یا پھر چاقو نکال کے تمام ساتھیوں کے سامنے دعوے دار سے زور کرے اور چوکی پر موجود رہنے کا حق ثابت کرے۔“

”تم نے اس کے ٹھکانے پر جا کے اسے چاقو آزمائی کی دعوت دی؟“ ڈاکٹر رائے بیجانی آواز میں بولا، ”تم..... تم۔“ وہ ہلکانے لگا اور اس نے پوچھا، ”کس اعتماد میں.....؟“

”کہ میں اسے زیر کر لوں گا۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔

”یعنی تم اسے زیر کر سکتے تھے؟“

”کسی قدر امکان مغلوب ہو جانے کا بھی تھا۔“

”تو، تو کیا ہوتا؟“ ڈاکٹر رائے تلخی سے پوچھا۔

”میں زیر ہو جاتا۔ یوں بھی تو اس کے شکنجے میں تھا۔“

”تمہیں اپنی چاقو بازی پر اتنا اعتماد کس وجہ سے ہے؟“

”صرف چاقو نہیں، اور بھی ایسی کئی چیزوں کی مجھے تربیت دی گئی ہے۔“

”تربیت دی گئی ہے؟“

”ہاں۔“ میں نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اقرار کیا۔ ”میری زندگی میں کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ مجھے یہ سب کچھ سیکھنا پڑا۔“

”تم تو ایک پڑھے لکھے نوجوان معلوم ہوتے ہو۔“

”یہ بھی ایک تعلیم ہے، اپنے آپ کو خطروں سے نمٹنے کے لیے تیار رکھنا۔ یہ بھی تو زندگی کا ایک حصہ ہے۔“

اس کے ہونٹ سکر گئے اور اس نے سر ہلا کے تذبذب سے تائید کی ”تو میدا چوکی سے اتر آیا؟“

”اتنا آسان نہیں تھا اس کے لیے۔ وہ جانے کب سے اڈے کی چوکی پر بیٹھا ہوا تھا۔“ میں نے ڈاکٹر رائے کو ساری تفصیل بتائی کہ اپنے ٹھکانے پر ایک اچھلی کی اس طرح اچانک آمد اور مبارزت کے لیے مسلسل اصرار سے اسے چونکا اور محتاط ہو جانا چاہیے تھا۔ ڈاک خانے والی گلی کا واقعہ بھی پیش نظر ہوگا۔ اڈے پر اس کے تقریباً سارے ساتھی موجود تھے۔ اس کا تو سب کچھ داؤ پر لگ چکا تھا، منصب، عزت، دبدبہ۔ اس نے میرا مذاق اڑانے، بھینٹیاں کسنے اور زور آزمائی کے نتیجے میں ذلت و رسوائی سے دوچار ہو جانے، طرح طرح سے میرا عزم شکستہ کرنے اور خبردار کرنے کی کوشش کی۔ اس دوران اکبر علی خاں نے دخل اندازی کی اور جتنے موثر انداز میں میری بے رومی کر سکتے تھے، انہوں نے اپنا ہنر آزمایا۔ انہیں احساس تھا، یہ عدالت نہیں ہے۔ وہ ایک مختلف جگہ پر اور مختلف لوگوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ انہیں نت نئی دلیلیں تراشنے اور بیان میں سوز و گداز پیدا کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ دلیل و بیان صداقت پر مبنی ہوں تو ان کی توانائی ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ ان کا انداز غیر جانب دارانہ، ناپتا اور جو کچھ میں نے ان سے کہا تھا اور انہوں نے یقین کر لیا تھا، جیسے اسی کے مطابق تھا۔ جو کچھ اڈے پر جا کے میں استاد میدا کو باور کرا چاہتا

تھا اور میدا کو دیکھ کے میں نے ارادہ بدل دیا تھا، وہ کام نہایت خوش وقتی سے اکبر علی خاں نے انجام دے دیا تھا۔

اڈے کے لوگوں کے ہجوم میں میدا کو اپنی بات بنی رہنے کی بے چینی شدید ہوگی۔ اکبر علی خاں کے بیان نے اسے کئی جواز فراہم کر دیے تھے، مجھ سے کشادہ دلی کا سلوک کرنے اور سر دست یہ نازک مرحلہ حسن و خوبی سے ٹل جانے کے جواز۔ میدا کے پہلو نشیں عمر رسیدہ شخص نے یہ موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اس آزمودہ کار نے دریا دلی کے اظہار میں پہل کی اور درمیان کی راہ نکالی اور میدا کو بظاہر بادل ناخواستہ ایک فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ میدا نے اپنے ساتھیوں کی دل جمعی کے لیے چاقو نکال لیا تھا اور چوکی سے اترنا چاہتا تھا کہ بزرگ ساتھی نے اس کا ہاتھ پکڑ کے چاقو اپنی تحویل میں لے لیا اور کوئی لمحہ گنوائے بغیر نشانہ لے کے میری طرف اچھال دیا۔ میں نے اسے اچک لیا۔ میں انکار کر سکتا تھا، لیکن میں نے وقت کی یہ رعایت غنیمت جانی کہ مجھے میدا کے اڈے چوکی سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ مجھے تو اسپتال پہنچنے کا راستہ صاف کرنا تھا۔ جواب میں میں نے بھی اپنا چاقو بوڑھے آدمی کی طرف اچھال دیا جو اس نے مہارت سے گرفت میں لے لیا۔

”اس کا کیا مطلب ہوا؟“ ڈاکٹر نے بے چینی سے پوچھا۔

میں نے اس کنائے کا مطلب اسے سمجھایا کہ سر دست مبارزت ملتوی کی جاتی ہے۔ ایک دوسرے کے چاقو ایک دوسرے کے پاس اس وقت تک امانت رہیں گے جب تک میں اپنا چاقو واپس لینے نہ آ جاؤں۔ بزرگ نے میدا کی طرف سے اعلان کیا کہ میدا مبارزت کے لیے آمادہ ہے، لیکن ایسے وقت میں جب اس کی ہم سری کا دعوہ کرنے والا، اڈے کی چوکی کا طلب گار اپنے بھائی کی

علاقت کی وجہ سے پریشان اور منتشر ہے، معرکہ آرائی مناسب معلوم نہیں ہوئی۔ میدا اپنے مقابل کو ذہنی پراگندگی سے چمکارا پانے کی مہلت دیتا ہے کہ اس پر مخالف کی معطر بانہ حالت سے فائدہ اٹھانے کا الزام نہ آنے پائے۔ یہ میدا کے اپنے اطمینان کا معاملہ بھی ہے کہ کسی ایک سو مخالف سے پیچہ آزمائی کر کے ناکامی اور کام یابی، دونوں صورتوں میں اسے خود سے کوئی شکایت اور اپنے ساتھیوں کے سامنے ندامت نہیں ہوگی۔ سن رسیدہ آدمی نے مجھے یہ جتنا ضروری سمجھا کہ یہ مہلت میدا کی اعلاظرفی پر محمول کی جائے۔ میدا مبارزت کے لیے میری جلد از جلد واپسی کا منتظر رہے گا۔

اس التوا میں کئی پہلو مضمحل تھے۔ چونکہ چھن چلنے کا خطرہ میدا کے سر سے مل گیا تھا۔ اڈے کے آدمیوں کی نظروں میں بڑی حد تک اس کا وقار بحال رہا تھا۔ اس مہلت میں میری طرف سے چونکہ کے مطالبے سے دست برداری اور نظر ثانی کا ایک امکان موجود تھا کہ بھائی کی صحت یابی کے بعد میری جانب سے نرمی و نرم دلی کی توقع بجا طور پر کی جاسکتی تھی۔ میدا کو چونکہ بچانے کی تدبیروں پر غور کرنے کا وقت مل گیا تھا۔ اس عرصے میں میرا قصہ تمام کر دینے کی ایک کوشش بھی کی جاسکتی تھی۔ اس مہلت کی بڑی اہمیت تھی۔ فیصلے پر میں نے کوئی جت نہیں کی۔ چا تو اڈوں کے تبادلے سے میری مراد میرا اثر ہی تھی۔ ہم دونوں، میں اور اکبر علی خاں پھر وہاں سے چلے آئے اور راستے میں کوئی دیوار نہ بنا۔

ڈاکٹر رائے چند لمحے چپ رہا پھر بھاری آواز میں بولا، "اگر یہ صورت نہ ہوتی؟ میدا اور تمہارے درمیان ہونے والی زور آزمائی میں تم کامیاب ہو جاتے تو اڈے کے آدمی تمہیں بہ خوشی اپنا استاد قبول کر لیتے؟"

میں نے کہا، "بہ خوشی تو شاید نہیں، لیکن اڈوں میں اسی سوال کی توقع تھی۔" میں نے کسی تامل کے بغیر جواب دیا۔ "میرا اڈوں پاؤں سے تھوڑا بہت تعلق رہا ہے۔"

ڈاکٹر نے ایک لمبی سانس کھینچی۔ "تو کامیاب ہو جانے کے بعد تم میدا کے اڈے کے مالک بن جاتے۔" اس نے ٹکرائی۔

"میں نے آپ کو بتایا ہے۔ میدا کو دیکھ کے میں اسی نتیجے پر پہنچا تھا۔ میرا یہی خیال تھا کہ اس پر قابو پایا جاسکتا ہے۔"

"نہیں۔" اس نے کسماتی آواز میں کہا، "میں جانا چاہتا ہوں۔ اڈے کے چونکہ پر تم بیٹھنا نہیں چاہتے تھے، پھر تمہاری کام یابی کے بعد اڈے کی سربراہی کی کیا صورت ہوئی؟"

"میں اپنی جگہ کسی کو بھی عارضی طور پر نام زد کر سکتا تھا۔ اس عمر آدمی کو بھی، جو میدا کا مربی معلوم ہوتا تھا، لیکن وہ اڈے کا سربراہ نہیں ہوتا۔ کسی نئے دعوے دار کے اٹھنے کے..... موع پر بھی کو اس سے مبارزت کرنی پڑتی۔ اڈے کے عبوری سربراہ کو نہیں۔"

"میرے لیے یہ سارا کچھ حیران کن ہے۔" ڈاکٹر رائے آنکھیں چڑھا کے بولا، "یہ تو ایک دوسری دنیا ہے۔"

"میں اسی لیے آپ کو کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا۔" ڈاکٹر نے جھرجھری کی۔ "تم نے کتنا بڑا خطرہ مول لیا تھا۔ اگر میدا استاد تیار ہو جاتا اور تم....."

میں نے اس کے اندیشے کی تردید کی۔ "چاقو آزمائی کے لیے بل کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ حاضر دماغی، نگاہ کی برکتی، مقابل کو حیلوں سے تذبذب کر دینے کی مشاقی اور بہت سی باتیں..... میدا کو مجھ اجنبی کے زور اور مہارت کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو یہی ترد کرتا۔ اپنے تین آدمیوں کا انجام دیکھنے اور اڈے پر میرے اس طرح آدھمکنے کے بعد ذہنی طور پر زچ ہو جانا، سوا اس کے لیے یہی مناسب تھا کہ مجھے مہلت دینے کی فیاضی کے بہانے اسے کچھ مہلت مل جائے۔"

"تم نے پہلے بھی میدا جیسے کسی استاد سے چاقو آزمائی کی ہے؟"

مجھے جھجک ہوئی، ایک لٹلے کے توقف کے بعد

میں اقرار کر لیا۔ "واقعی؟" وہ حیرت سے بولا۔ "اور انجام؟"

"انجام بہتر ہونے کی توقع نہ ہوتی تو اپنے مخالف کو دعوت نہیں دینی چاہیے۔"

"تو..... تو..... تم کبھی کسی اڈے پاڑے کی چونکہ پر بیٹھے رہے ہو؟"

"نہیں....." میں نے آہستگی سے کہا۔ "چند روز..... ایک بار کچھ زیادہ..... اپنا آدمی مقرر کر کے میں ہر جگہ سے چل دیا۔" ڈاکٹر کے کوئی اور سوال کرنے سے پہلے میں نے صراحت کی۔ "کئی اڈے حاصل کیے اور اپنی مرضی سے نہیں۔ کسی جگہ اڈے کے استاد نے کوئی رکاوٹ کھڑی کی یا اس نے کسی مظلوم شناسا، کسی دوست سے زیادتی کی، ظلم روار کھاتب....."

"اور اڈا حاصل کرنے کے بعد تم وہاں سے چلے آئے؟"

"جی ہاں۔ اس لیے کہ میرا کام اڈا گیری نہیں ہے۔"

"کتنے اڈوں کے استادوں سے تم نے زور آزمائی کی؟" ڈاکٹر رائے کی بے قراری بڑھتی جا رہی تھی۔

"کئی یا نہیں ڈاکٹر صاحب۔"

"یعنی بہت سے.....؟"

"بہت زیادہ تو نہیں۔"

"اور بھی میں تم سرخ رو ہوں؟"

میں خاموش رہا۔ خاموشی ہی میرا جواب تھی۔

ڈاکٹر رائے کا منہ کھلا ہوا تھا اور اس کی پلکیں پت پت رہی تھیں۔ "تمہارا بھائی بھی ان فنون میں کوئی درک رکھتا ہوگا؟" اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔

"جی ہاں۔" میں نے مختصر آ کہا۔

"تم سے زیادہ؟"

"میں کیا۔ وہ تو دوسرے آدمی ہیں۔ میں ان کے لیے کیا کہوں۔ آپ نے تو انہیں صرف اس

حالت میں دیکھا ہے۔ میں نے ایسی بے چارگی، ایسی غفلت میں انہیں سمجھی نہیں دیکھا۔ وہ تو سوتے میں بھی جاگتے رہتے تھے۔ دیوار پار کا انہیں نظر آجاتا ہے۔ دور دور کی آوازیں ان تک رسا ہو جاتی ہیں۔ ان کا سینہ تو کوئی سمندر ہے۔ ان کے بہت سے بازو ہیں..... وہ تو ایک سایہ ہیں بہت سوں کے لیے..... اور وہ تو کسی چٹان کے مانند ہیں۔ اس حال میں انہیں دکھ کے مجھ پر جو گزرتی ہے، وہ آپ نہیں جان سکتے۔ وہ، وہ ان سارے فنون میں طاق ہیں۔ میں نے سب کچھ انہی سے سیکھا، لیکن ان کی برداشت، ان کا حوصلہ، ان کا عزم..... میں تو کچھ نہیں ہوں ان کے آگے..... میں کیا.....“ میری آواز رندھنے لگی۔

ڈاکٹر آنکھیں میچے دیر تک چپ رہا، پھر یکا یک ہڑک کے بولا، ”تمہارا بھائی بھی کسی اڈے پاڑے کا راجا ہے؟“

”ہاں۔“ میں نے کسی اکراہ کے بغیر جواب دیا، ”لیکن اب تو بہت دنوں سے وہ میرے ساتھ مشکل سفر میں رہتے ہیں۔“

”سفر! سفر کیوں، کاروبار کے سبب سے؟“

”نہیں، کاروبار نہیں۔“

”پھر.....؟“ مجھ سے فوراً کوئی جواب نہ دیا جاسکا۔ مجھے متردد دکھ کے اس نے کہا، ”کوئی ایسی بات ہے جو مجھ سے نہیں کہنی چاہیے؟“

”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ کچھ اور مت سوچو۔ اس معاملے کا اڈے پاڑے سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ایک طویل روداد ہے اور بہت ذاتی ہے۔ اس کی تفصیل پھر سمجھی سہی۔ مختصر یہ کہ ہمیں اپنے کھوئے ہوئے کسی عزیز کی تلاش ہے۔ ہم ہر طرف اسے ڈھونڈ رہے ہیں، گلیوں گلیوں، شہروں شہروں۔“

”کھوئے ہوئے عزیز کی؟“ ڈاکٹر کے چہرے پر لکیریں نمایاں ہو گئیں۔ ”کون ہے وہ.....؟“

”ہے ایک، جو پھنڑ گیا ہے۔ کیا بتاؤں آپ کو۔“

”کب سے یہ تلاش جاری ہے؟“

”کئی برس ہو گئے، اب تو کوئی چار پانچ سال۔“ میں نے بھیجی ہوئی آواز میں کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب! میں بہت کچھ چھپا سکتا تھا، لیکن یقین کیجئے، میں نے کچھ نہیں چھپایا ہے۔ اس لیے کہ آئندہ پیش آنے والے واقعات سے آپ منتشر نہ ہو جائیں اور میرے بھائی کا علاج آپ کے کسی سکدر، برہمی اور محسوس سے متاثر نہ ہو جائے۔“

”ہشت۔“ ڈاکٹر رائے دھنکارنی آواز میں بولا، ”کیا فضول بات کر رہے ہو۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ میں نے اس سے کہا کہ ڈاکٹر کے سامنے اس کا مریض محض انسان ہوتا ہے۔ وہ چور ہو، یا ڈاکو، یا اڈے پاڑے کا آدمی، لیکن ڈاکٹر بھی انسان ہی ہے۔ انسان ناراض بھی ہوتا ہے، اسے غصہ بھی آتا ہے، دل میں گھر گہ پڑ جاتی ہے۔

میں نے صاف صاف کہا کہ میں اسے یہ سب بتانے کا پابند نہیں تھا۔ اس کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اسپتال مندر مسجد نہیں ہوتے۔ چھوٹا اچھوت، سمجھی کے لیے دروازے کھلے ہوتے ہیں، میں یہاں ایک مریض لے کے آیا تھا۔ مریض اور ڈاکٹر کا جو تعلق ہوتا ہے، اسے وہیں تک محدود رہنا چاہیے تھا۔ ڈاکٹر رائے نے میرا بڑا لحاظ کیا۔ پہلی رات معمول کے خلاف وہ میری درخواست پر تھل کود کیجئے آ گیا۔ اس نے بد تہذیبی اور گستاخی کی حد تک میری تندوتیز باتیں برداشت کر لی تھیں۔ اس نے اسپتال کے بہ ترین کمرے میں ہمیں منتقل کیا اور علاج پر ہر ممکن توجہ مرکوز رکھی۔ کئی اور ڈاکٹروں کو بھی مشاورت میں شریک کیا۔ اس کا یہی احسان اتنا بڑا ہے کہ میں تو اس کے سامنے سر بھی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ پہلے دن اسپتال سے باہر جانے کے بعد میں شام کو واپس آیا

تو اس مشفق اور نیک نفس آدمی کو یہ بتا کے میں کیوں پریشان کرتا کہ میں کسی دیوار میں عبور کر کے اسپتال پہنچ پایا ہوں۔ جس رات اٹھوئی بے موت مارا گیا، میں اسے کیسے بتاتا کہ وہ لوگ تو مجھے ختم کرنے کے درپے تھے، لیکن اکبر علی خاں کے سامنے کے بعد صورت بدل چکی ہے۔ پولیس آنے والی ہوگی۔ لاٹھی میں ڈاکٹر رائے کے ذہن میں میرے اور نیشنل کے متعلق کیسے کیسے وہم کیسی کیسی بدگمانیاں نمودار ہو سکتی تھیں۔

”بس بس، میں، میں سمجھتا ہوں۔“ ڈاکٹر رائے نے ہاتھ اٹھا کے مجھے روک دیا۔ ”تم ٹھیک کہتے ہو، لاٹھی میں مجھے جبرت بھی ہوئی، اذیت بھی۔ پولیس یقیناً یہاں پہنچتی ہوگی۔ تم نے کیا سوچا ہے پھر؟“

”میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ میرا تو دماغ ہی کام نہیں کر رہا ڈاکٹر صاحب! میں کیا کہہ پاؤں گا، کس طرف اشارہ کروں گا۔ شاید وہ مجھے ساتھ لے جائیں۔ تو ٹھیک ہے، لے جائیں، لیکن پھر یہاں بھائی کے پاس کون ہوگا۔ کوئی تو ہونا چاہیے ان کے ساتھ۔“

”وہ تو ہم لوگ دیکھ لیں گے۔“ ڈاکٹر بے پروائی سے بولا۔

”بھائی پوچھیں تو آپ کیا بتائیں گے؟“

”کچھ نہ کچھ تو کہنا ہوگا۔“

”وہ نہیں مانیں گے۔ آپ انہیں جانتے نہیں۔“

وہ بہت سمجھ بوجھ کے آدمی ہیں۔ بے گل ہو جائیں گے۔“

”دیکھ لیں گے؟“ ڈاکٹر اس کے سوا کہہ بھی کیا سکتا تھا۔

میں نے اسے بتایا کہ کل ہی اکبر علی خاں کے مشورے سے انہی کے ذریعے کھلتے تار دیا تھا، ایک نہیں، دو، اور جنٹ تار، یہاں کے مشکل حالات دیکھ کے اپنی دسرات کے لیے ایک دو آدمی بلائے تھے۔

اب تک کوئی کو آ جانا چاہیے تھا۔

”کون ہیں وہ؟“ ڈاکٹر نے چونک کے پوچھا۔

”انہیں بھائی کا خدمت گار سمجھیے۔“

”مجھے، کیا مطلب؟“ اس کے لہجے میں ترشی آگئی۔

”بھائی کے پروردہ ہیں وہ۔“

”ان کا تعلق بھی اڈے پاڑے سے ہے؟“

”جی ہاں۔“

”کھلتے سے آ رہے ہیں وہ۔ کھلتے ہی میں تمہارے بھائی کا اڈا ہے؟“

”بھی تھا اور ہاں، ہے بھی۔ اڈا تو انہی کے نام سے قائم ہے۔“ میں نے جھنجھی ہوئی آواز میں کہا، ”لیکن اب تو عرصے سے وہ وہاں نہیں بیٹھتے۔“

میں نے آپ کو بتایا تاکہ وہ عرصے سے میرے ساتھ سفر کرتے ہیں۔“

”یاد پڑتا ہے، تم نے شروع میں کہا تھا کہ تمہارا گھر فیض آباد میں ہے۔“

”میں نے غلط نہیں کہا تھا۔ ہم فیض آباد ہی سے آ رہے ہیں۔ وہاں سے بھی کسی کو بلایا جاسکتا تھا، لیکن گھر میں اطلاع دینے سے سبھی پریشان ہو جاتے۔“

”یہ آنے والے لوگ بھی چاقو باز ہوں گے؟“

”آپ کی اور میری طرح اڈے کا ہر آدمی، پہلے آدمی ہوتا ہے۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی میرا لہجہ غیر ارادی طور پر تن سا گیا۔

”ہاں، ہاں، پہلے آدمی، بعد کو چاقو باز۔“ ڈاکٹر رائے ناگواری سے بولا۔ ”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔“

اس کے بے در بے سوالوں سے میری رگیں اٹھنے لگی تھیں، لیکن اس کے ہر سوال کا جواب مجھ پر واجب تھا۔ کہیں ذرا سا اہمام رہ جانے کی صورت میں اس کے دل میں شک کی گرہ پڑھ سکتی تھی۔ وہ کتنا ہی تردید کرے۔ ہر ذہن آدمی کا وتیرہ شک ہوتا

ہے۔ وہ تو یوں بھی ایک نکتہ رس اور جزو ہیں شخص تھا۔ کوئی معمولی آدمی اتنا بڑا اور کامیاب ڈاکٹر نہیں ہو سکتا۔ میری دانست میں اب بہت کچھ آئندہ ہو چکا تھا۔ مجھے اور کسی معذرت خواہانہ لہجے کی بھی ضرورت نہیں تھی، لیکن اس کے ظفر کا خیال ہر لمحے ملحوظ رکھنا تھا۔ وہ بار بار کسی گہری سوچ میں ڈوب جاتا۔ اس دوران میں خود کو اس کے کسی ناروا سوال کے لیے آمادہ کرتا رہتا۔ کبھی بھی تو مجھے ایسا لگتا جیسے میں کسی متحکم کے سامنے بیٹھا ہوں، یا عدالت کے کسی جج کے رو بہ رو۔ اڈے کے کسی استاد سے زور آزمائی کرتے وقت شاید مجھے کسی اتنی کشاکش کا سامنا نہیں کرنا پڑا، جتنی ڈاکٹر رائے کی دھند دور کرنے کے اس مرحلے میں نازکی کا خیال رکھنا پڑ رہا تھا۔ ہر لمحے مجھے خود کو نوکنا پڑتا کہ وہ نیشنل کا معائنہ ہے اور نیشنل ابھی بستر پر ہے۔ ڈاکٹر رائے اس اسپتال کا انگریز ہے۔ اسپتال کے روایتی رسکون ماحول میں ہماری آمد کے بعد مسلسل کوئی نہ کوئی ان ہونی ہوئی رہی ہے۔ اسپتال میں آدھی رات کے بعد سب آدمیوں کی یلغار، اٹھوئی کی موت، پولیس کی آمد اور اب اکبر علی خاں کی ہلاکت کے بعد ڈاکٹر رائے میرے اور نیشنل کے لیے کوئی بھی انتہائی قدم اٹھانے کا فیصلہ کر سکتا ہے۔

”تم نے کہا ہے، پولیس تمہیں ساتھ بھی لے جا سکتی ہے، مگر کیوں؟“ اس نے تیز آواز میں پوچھا۔

”پولیس کا اپنا طریق کار ہوتا ہے۔ یہاں میں انہی ہوں اور بہت بے سہارا بھی۔ وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ پولیس کو اپنے اختیار سے سوا کرنے کی عادت ہوئی ہے۔ ادھر میدا کے اڈے سے آئے دن کے واسطے کی مروت میں مجھ سے پولیس کا رویہ معاندانہ بھی ہو سکتا ہے۔ پولیس کے جانے کتنے لوگ میدا کے اڈے کا نمک بھی کھائے ہوئے ہوں گے۔“

”اس پیچیدہ صورت حال سے نمٹنے کے لیے تم

نے بھی کچھ غور کیا ہوگا؟“ ڈاکٹر کی آواز اکھڑی ہوئی سی تھی۔

”کیا بتاؤں۔“ میں تھے بے ربطی سے کہا، ”شاید مجھے ایک وکیل کی ضرورت پڑے۔ وکیلوں کا یہی کام ہوتا ہے۔ آپ شہر کے کسی بہت بڑے وکیل کو ضرور جانتے ہوں گے۔ اطمینان رکھیے، کتنا ہی مہنگا وکیل ہو، میں اس کی فیس ادا کر سکتا ہوں اور واضح رہے، یہ اڈے پاڑے کا بیس نہیں ہے۔ روپے پیسے کی انہیں ایسی غلب نہیں ہوتی جتنی زور اور اپنی ساکھ کی۔“

”تم..... تم اڈے بازوں کی اکالت کر رہے ہو مجھ سے۔“ ڈاکٹر رائے جھلا کے بولا۔

”میں آپ کو حقیقت حال سے آگاہ کر رہا ہوں۔ آپ نے اتنی باتیں جانی ہیں تو یہ بات بھی آپ پر صاف ہو جائے۔“

وہ بڑبڑاتے ہوئے یکا یک کرسی سے اٹھ گیا۔

”ایک بات کہنی ہے آپ سے۔“ اس کے کمرے سے نکلنے سے پہلے میں نے رکی رکی آواز میں کہا۔

کرسی سے اٹھ کے اس نے اپنا لباس جھنکا، ٹکٹیں درست کیں اور کسی قدر بے اطمینانی سے بولا، ”بولو، کیا بات ہے؟“

”میں اکبر علی خاں کے گھر جانا چاہتا ہوں۔“ میں نے نظریں جھکا کے کہا۔

”کیا.....؟“ اس کا جسم اکڑ گیا۔ ”تم..... تم وہاں جانا چاہتے ہو؟“

”مجھے جانا چاہیے۔ دو تین دن میں سہی، ان سے جو ایک غیر معمولی ربط خاطر ہو گیا تھا تو مجھے وہاں جانا چاہیے۔“

”تم پاگل ہو گئے ہو کیا؟“ وہ درشتی سے بولا۔

”میرا دل وہاں سے وہ اپنی جان سے گئے۔ ان کا ایک آباد گھر تھا۔ میری وجہ سے اجڑ گیا۔ اس دن نہ میں ان کے گھر میں داخل ہوتا نہ اس گھر پر یہ بربادی

ہوئی سی تھی۔

”کیا بتاؤں۔“ میں تھے بے ربطی سے کہا، ”شاید مجھے ایک وکیل کی ضرورت پڑے۔ وکیلوں کا یہی کام ہوتا ہے۔ آپ شہر کے کسی بہت بڑے وکیل کو ضرور جانتے ہوں گے۔ اطمینان رکھیے، کتنا ہی مہنگا وکیل ہو، میں اس کی فیس ادا کر سکتا ہوں اور واضح رہے، یہ اڈے پاڑے کا بیس نہیں ہے۔ روپے پیسے کی انہیں ایسی غلب نہیں ہوتی جتنی زور اور اپنی ساکھ کی۔“

”تم..... تم اڈے بازوں کی اکالت کر رہے ہو مجھ سے۔“ ڈاکٹر رائے جھلا کے بولا۔

”میں آپ کو حقیقت حال سے آگاہ کر رہا ہوں۔ آپ نے اتنی باتیں جانی ہیں تو یہ بات بھی آپ پر صاف ہو جائے۔“

وہ بڑبڑاتے ہوئے یکا یک کرسی سے اٹھ گیا۔

”ایک بات کہنی ہے آپ سے۔“ اس کے کمرے سے نکلنے سے پہلے میں نے رکی رکی آواز میں کہا۔

کرسی سے اٹھ کے اس نے اپنا لباس جھنکا، ٹکٹیں درست کیں اور کسی قدر بے اطمینانی سے بولا، ”بولو، کیا بات ہے؟“

”میں اکبر علی خاں کے گھر جانا چاہتا ہوں۔“ میں نے نظریں جھکا کے کہا۔

”کیا.....؟“ اس کا جسم اکڑ گیا۔ ”تم..... تم وہاں جانا چاہتے ہو؟“

”مجھے جانا چاہیے۔ دو تین دن میں سہی، ان سے جو ایک غیر معمولی ربط خاطر ہو گیا تھا تو مجھے وہاں جانا چاہیے۔“

”تم پاگل ہو گئے ہو کیا؟“ وہ درشتی سے بولا۔

”میرا دل وہاں سے وہ اپنی جان سے گئے۔ ان کا ایک آباد گھر تھا۔ میری وجہ سے اجڑ گیا۔ اس دن نہ میں ان کے گھر میں داخل ہوتا نہ اس گھر پر یہ بربادی

ہوئی سی تھی۔

”کیا بتاؤں۔“ میں تھے بے ربطی سے کہا، ”شاید مجھے ایک وکیل کی ضرورت پڑے۔ وکیلوں کا یہی کام ہوتا ہے۔ آپ شہر کے کسی بہت بڑے وکیل کو ضرور جانتے ہوں گے۔ اطمینان رکھیے، کتنا ہی مہنگا وکیل ہو، میں اس کی فیس ادا کر سکتا ہوں اور واضح رہے، یہ اڈے پاڑے کا بیس نہیں ہے۔ روپے پیسے کی انہیں ایسی غلب نہیں ہوتی جتنی زور اور اپنی ساکھ کی۔“

”تم..... تم اڈے بازوں کی اکالت کر رہے ہو مجھ سے۔“ ڈاکٹر رائے جھلا کے بولا۔

”میں آپ کو حقیقت حال سے آگاہ کر رہا ہوں۔ آپ نے اتنی باتیں جانی ہیں تو یہ بات بھی آپ پر صاف ہو جائے۔“

آئی۔ میرے حال پر ترس کھا کے وہ مجھ سے اتنے قریب ہو گئے تھے۔ مجھے اپنا کوئی بہت ترسی عزیز، بھائی سمجھنے لگے تھے اور مجھے بھی یہی محسوس ہوتا تھا۔ کل رات اپنے گھر، بیوی بچوں کی نہایت ذاتی باتیں کر رہے تھے۔ ان کی بیوی کے لیے کسی نواب کے بیٹے کا رشتہ آیا تھا۔ وہ بہت کش مکش میں تھے۔ صاف انکار بھی نہیں کر پارے تھے۔ مجھ سے پوچھتے تھے کہ وہ کیا کریں، کس طرح نواب کو مطمئن کریں۔ وہ اپنی بیوی کے شیدائی تھے، بڑے احترام، بہت محبت سے وہ بیوی کا ذکر کرتے تھے۔ لگتا تھا، دونوں ایک جان ہیں۔ وہ تو خود سراپا احترام، مرتباً محبت تھے۔ میں نے اس گھر کی ایک جھلک ہی دیکھی تھی۔ کیسا مثالی گھر تھا۔ مثالی لوگ وہاں بستے تھے۔ "میری آواز میرے قابو میں نہیں رہی۔ آنکھوں میں جیسے آگ بھڑک اٹھی ہو اور سینہ جیسے ابھی پھٹ جائے گا۔ میں نے اپنا ہاتھ جکڑ لیا۔ میرا جی پاہا کہ دیوار سے سر پھوڑ لوں۔"

"اوہ نہیں..... نہیں۔" ڈاکٹر نے میرا بازو پکڑ لیا۔ "اپنے آپ کو سنبھالو۔" وہ میری کمر بھینکنے لگا۔ میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اس نے دوبارہ مجھے کرسی پر بٹھا دیا اور خود بھی بیٹھ گیا۔ "تم وہاں نہیں جا سکتے۔" اس نے حتی آواز میں کہا۔

"نہیں جاؤں گا تو میرے سینے..... میں خود کو کس طرح....." میری آواز آنسوؤں میں بہہ گئی۔

"یوں وہ واپس نہیں آجائیں گے۔"

"میں ان کے جنازے میں بھی شریک نہ ہوں؟" میں نے ہلکتی آواز میں کہا، "میں جانتا ہوں، ان کے بیوی بچوں کے سامنے کس طرح جا پاؤں گا، کس منہ سے ان کے سامنے جاؤں گا، لیکن مجھے....."

"تمہیں دیکھ کے ان کا غم اور بڑھ جائے گا۔"

ڈاکٹر آہ بھر کے بولا، "اکبر علی خاں مجھے بھی اچھے لگتے تھے۔ وہ ایک عمدہ آدمی تھے۔ ان سے مل کے

خوشی ہوئی تھی۔ سوچا تھا، ذرا تمہارے بھائی کے علاج سے فراغت ہو جائے تو ان سے نشستیں ہوں۔"

"بتائیے ڈاکٹر صاحب! ان کا کیا تصور تھا۔ انہوں نے کسی کو کیا ضرر پہنچایا تھا۔ انہوں نے کتنے نادر، کتنے بڑے آدمی کو مار دیا، کس بات پر..... اس بات پر کہ جرأت کر کے وہ میرے ساتھ میڈا کے اڈے پر گئے تھے اور میری دل بستگی کے لیے یہاں اسپتال میں صبح شام آنا انہوں نے معمول بنالیا تھا۔"

"میں بھی یہ سمجھنے سے قاصر ہوں۔" ڈاکٹر رائے افسردگی سے بولا، "وہ لوگ دیوانے ہو گئے تھے کیا۔ وکیل صاحب سے انہیں کیا غرض تھی۔ کیسے ظالم اور درندے لوگ ہیں یہ۔"

میں نے یہ اس سے نہیں کہا کہ اپنا حال کیا بناؤں۔ میرا خون بہت کھولتا ہے۔ اکبر علی خاں کا خیال آتا ہے تو جسم میں آگ سی لگنے لگتی ہے۔ ایک جڑک سی اٹھتی ہے کہ میڈا کے ٹھکانے پر جا کے اس کے اڈے کو آگ لگا دوں، اس کا جو بھی آدمی سامنے نظر آئے، اس کے سینے میں جا تو بھونک دوں۔

"تم کہتے ہو، اڈے کی کرسی پر بیٹھا آدمی جا تو اور بل ہی میں نہیں، برداشت، سوچو بوجھ میں بھی دوسروں سے لازماً برتر ہوتا ہے۔ یہ تو نہایت کم عقلی کی بات ہے۔ یہ تو اوجھل پن ہے، پرلے درجے کی ذلات ہے کہ تم نشانی پر نہ آ سکو تو انہوں نے ایک بے گناہ کو قتل کر دیا۔ میڈا کیا جتنا چاہتا ہے، تمہیں مشتعل کرنا، یا خوف زدہ کرنا؟ کیا وہ اتنا بھی نہیں سمجھتا کہ صاف صاف اس پر نگاہ جائے گی۔ اس طرح وہ کیا حاصل کرنا چاہتا ہے؟" ڈاکٹر رائے بھن بھناتی آواز میں بولا۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں، مگر شاید یہ میڈا نہیں ہے۔ اسے اتنا بے دماغ نہیں ہونا چاہیے۔"

"پھر..... پھر کون..... تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"میدانے آسانی سے مجھے اڈے سے جانے دیا تھا۔ یہ بات ان لوگوں کے لیے ناقابل برداشت ہوگی جو ڈاک خانے والی گلی میں زخمی ہو جانے اور بعد کو مرجانے والے دھونا می آدمی کے نہایت وفادار، جاں نثار ساتھی تھے۔ وہ میڈا کے اڈے سے منحرف آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ انہوں نے اڈے کے استاد کا اختیار اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ہو سکتا ہے، اسپتال میں آنے والے حملہ آور میڈا کے پیچھے ہوئے ہوں، لیکن یہ لوگ..... یہ تو کوئی دوسرے ہی لوگ ہو سکتے ہیں۔"

"کوئی بھی ہو۔" ڈاکٹر نہایت ہی لہجے میں بولا۔ "میری بات سنو! تم نے اتنا کچھ بتا کے مجھ پر اعتماد کیا اور میں نے اس پر یقین کیا ہے۔ تم اب اپنے آپ کو کوئی فیصلہ نہیں کرو گے۔ میرے مشورے اور قلم میں لائے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاؤ گے۔ سمجھے!"

"آدمی اپنے آپ کو بھی تو جواب دیتا ہے، ڈاکٹر صاحب! میں نے یاسیت سے کہا، "میرے وہاں نہ جانے سے اکبر علی خاں کے گھر والے کیا سوچیں گے، میرے متعلق کیا رائے قائم کریں گے۔"

"ان پر اکبر علی خاں کے سامنے سے بڑی قیامت اور کیا گزر سکتی ہے، اور ہاں..... تم..... تم اپنے آنے والے بھائیوں کو بھی منہ کر دو گے کہ وہ تمہاری طرف سے کوئی نادانی نہیں کریں گے۔" وہ کرسی سے دوبارہ اٹھ گیا اور چلتے چلتے رک گیا۔

"پھر اخیال ہے، تم سے کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ کتنا مستحقین واقعہ ہے۔ شہر کے ایک نہایت معزز، مشہور، ایک بڑے آدمی کا خون ہو گیا ہے۔ تمہاری ذرا سی نقلی، مشتعل حرکت سے بات سنی ہو سکتی ہے۔ اس معاملے کی تفتیش عام سطح پر نہیں ہوگی۔ دیکھو کی ہمداری، شہر کے معززین، اکبر علی خاں کا وسیع اور با اثر حلقہ احباب، سبھی تشریف خواہر کریں گے اور تمہارا

نام لازماً آئے گا۔"

اس نے مجھ سے پھر کوئی بات نہیں کی، کمرے سے نکل گیا۔ باہر راہ داری میں اس کمرے میں تعینات ڈاکٹر اور نرس اس کی واہی کے منتظر تھے۔ ڈاکٹر نے رسمی انداز میں ان سے معذرت کی اور ہتھیل کے کمرے تک میرے ساتھ آیا۔ سپورین بھی ذیوبی پر آگئی تھی اور ایسی ہی تک ہو چکی۔ دونوں سراسیمہ سی ہتھیل کے کمرے کے باہر ہماری جانب نظر میں مرکز کیے کھڑی تھیں۔ پچھلے آٹھ کمرے پنا گئیں۔ ڈاکٹر رائے نے قریب جا کے ایسی گواہی سے پاس بلایا اور سر گھٹانہ پکھ پکھ اتار کیں اور تیز قدموں سے چلتا جو راہ داری کے موڑ سے اوجھل ہو گیا۔

ڈاکٹر کے جاتے ہی دونوں لگی ہوئی میرے پاس آ گئیں۔

"یقیناً تم نے ان سے کوئی بات نہیں چھپائی ہوگی۔" ایسی دلوق سے بولی۔

میں نے سر ہلا کے تائیدی کی۔

"تم نے بہتر کیا۔ تمہیں یہی کرنا چاہیے تھا۔" وہ تائیدی لہجے میں بولی، "وہ ہیبت کلمے داغ کے آدمی ہیں۔"

میں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

"اب مجھے گھر جانا ہے میرے بے اسپورین آگئے۔ تم کہو تو رک جاؤں۔ میں تمہاری راہ تک رہی تھی۔" ایسی دل دوزی سے بولی۔ "گھر میں میرا جی نہیں لگے گا تمہاری فکر رہے گی۔"

"نہیں، تم جاؤ۔ میں ٹھیک رہوں گا۔ میں اس کمرے میں قید رہوں گا، تمہیں تمہیں جاؤں گا۔"

میری آواز بھک رہی تھی۔

"تمہارے لیے یہاں بہتر ہے۔ یہ دلت گزر جائے گا۔" ایسی مجھے دلا سے دینے لگی۔

"یہ کیا ہو گیا؟ میں نے آکے ایسی سے سنا تو یقین نہیں آیا۔ کیا واقعی وہ اتنا شان دار آدمی

ہمارے درمیان نہیں رہا؟“ سیورین نے دھڑکتی آواز میں پوچھا۔

میری خاموشی پر وہ بھی چپ ہو گئی۔ کمرے میں آکے بے اختیار میرے قدم ٹھٹھل کے بستر کی جانب اٹھے۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور سینے کے متوازن اتار چڑھاؤ سے لگتا تھا کہ وہ پریسکون نیند میں ہے، پھر بے پرہیزی تازگی پھیلی ہوئی تھی۔ میں دے قدموں اس کے پاس سے ہٹ آیا اور سونے پر آکے بیٹھ گیا اور میرا جسم ٹھہر سا گیا۔ چند لمحوں بعد سیورین بھی میرے نزدیک بیٹھ گئی۔ کمرے میں خاموشی طاری تھی۔ سیورین درتکت بت بنی رہی۔ میں نے بھی اس سے کوئی کلام نہیں کیا۔ میرے پاس کہنے کے لیے تھا بھی کیا۔ گزشتہ دو ایک دن میں وہ اکبر علی خاں سے خاصی مانوس ہو گئی تھی۔ کل اس نے ان کے گھر سے آئے ہوئے تو شے کا کھانا کھایا تھا اور کہتی تھی کہ اس نے آج تک اتنا نہیں اور لذیذ کھانا نہیں کھایا۔ اکبر علی خاں اس کی تعریف سے بہت خوش ہوئے تھے۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر خوش ہونے والے آدمی تھے۔ انہوں نے ٹھٹھل کی صحت پالی کے بعد سیورین کو گھر آنے کی دعوت دی تھی۔

کہتے ہیں، آدمی کا وقت آ گیا تھا، لیکن ایسے تو وقت نہیں آنا چاہیے تھا۔ کسی بیمار، معذور من رسیدہ کی موت کا کوئی جواز تو ہوتا ہے۔ آدمی جیکے سے یوں اچانک غائب ہو جائے تو کوئی کیا کہے۔ سیورین بھی کیا کہہ پاتی..... اور میں کون سا اکبر علی خاں کا رشتہ دار، ان کے خاندان کا آدمی تھا۔ اکبر علی خاں سے میری شناسائی سیورین سے ایک دن پہلے کی تھی، بل کہ ایک پہر پہلے کی۔ سیورین سے کچھ کہتے نہ بنا کہ لفظ تو کبھی بہت حقیر اور بے مایہ ہو جاتے ہیں۔ وہ کھسک کے مجھ سے اور قریب ہو گئی۔ اس نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کے مجھ سے غم گساری کا اظہار کرنا چاہا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں بھری ہوئی تھیں۔ سیورین

نے اپنے عالم اضطراب میں میرے ہاتھ پر زور دیا تو میری آنکھیں بھی اٹھ آئیں۔ آدمی کے پاس کچھ نہیں ہوتا تو آنسو ہی سہارا، آنسو ہی سپرین جاتے ہیں۔ ”کیا ہو گیا یہ.....“ وہ سکتے ہوئے جیسے اپنے آپ سے بولی۔

میں نے خود کو بہت روکا، لیکن سیورین کی سسکیوں نے مجھے بھی متلاطم کر دیا۔ میں بھڑکنے لگا۔ سببائی اس کا شعرا تھی۔ اس بے پناہ مشفق دہربان لڑکی نے میرا سر اپنے شانے پر رکھ لیا۔ میری تو ہچکیاں بندھ گئیں۔ کبھی اپنے کسی بہت عزیز و محترم، اپنے کسی ہم نفس و ہم دم کے چلے جانے پر حیران اور ہلکان ہو جاتے ہیں، لیکن اس آدمی کی ویرانی کا کون اندازہ کرے، اس آدمی کا دکھ کون جانے جو اپنے عزیز و محترم کے خون کا بار اپنی گردن پر محسوس کرتا ہو۔ سیورین کو کیا معلوم تھا کہ ہر لمحے یہی احساس میرا سینہ دو بوجھا، کھسوتا ہے۔ میری کچھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں، کہاں جا کے خود کو چھپاؤں۔ میں کیسا بد نصیب، بے بس آدمی ہوں۔ میرا سایہ ہی محسوس ہے۔ میں زندہ رہنے پر کیوں مصر ہوں۔

سیورین میرے بالوں میں انگلیاں پھیر کے مجھ سے یگانگت ظاہر کرنے لگی۔ آئینہ مقابل نہ ہونو بھی ہمہ وقت اپنی صورت آدمی کے سامنے رہتی ہے، میں اپنا چہرہ ہی دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ آدمی کا اپنا وجود بھی اس پر بہت بوجھ ہوتا ہے۔ سیورین، ایک نرم و نازک لڑکی، کسی ستون، کسی دیوار کے مانند مجھے سہارا دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ میرے سر پر اس کی میٹلائی انگلیاں مجھ سے اپنے دکھ کا اظہار کر رہی تھی۔ اس کا گداز آفریں پہلو اس کی بے قراری کا مظہر تھا کہ وہ میرے حال سے واقف ہے اور مجھے پناہ میں لینا چاہتی ہے۔ میری آنکھوں سے مسلسل آنسو جاری تھے۔ دل داری و دل دہی سے بھی تو آنسوؤں کی ٹہو ہوتی ہے۔

مجھے نہیں معلوم، کب وہ میرے پاس سے اٹھی، مجھے تو اپنی سادہ بدھ ہی نہیں رہی تھی۔ جانے کب اس نے میرے شانے پر ٹھوکا دیا تو میں نے دیکھا، وہ میرے سامنے کھڑی ہے، اس کے ہاتھ میں گلاس ہے اور رد مال۔ اس نے آنکھیں میچ کے گلاس اور رد مال میرے طرف بڑھائے تب مجھے اپنی توانائی اور فروماہی کی شدت سے احساس اور ندامت کا غلبہ ہوا۔

آنسوؤں کا بھی بڑا فشار ہوتا ہے۔ بہہ جائیں تو جسم ہلکا ہو جاتا ہے لیکن آنسو طانی نہیں کر پاتے۔ سیورین دوبارہ میرے پاس آکے بیٹھ گئی اور چپ رہی پھر جیسے خود کو جمع کرنے دھیمی آواز میں اس نے سوال کیا۔ یہ کاٹنا اس کے بدن میں چھ رہا ہوگا۔ کہنے لگی ”اب کیا ہوگا؟“

میں نے استفہامی نگاہوں سے اس کو دیکھا۔ ”کیا ہوگا؟“ پھر مجھے خیال آیا، وہ آنے والے وقت سے ہر اس سال ہے۔ میں نے بظاہر بے پروائی سے کہا ”جو ہوتا ہے..... وہ تو ہو کے رہے گا۔“

”تم ان سے زیادہ بات مت کرنا۔“ اس نے دہلی آواز میں مشورہ دیا۔

”کس سے؟“ میں نے تعجب سے پوچھا۔

”پولیس سے۔ ایسی کہہ رہی تھی، پولیس اسپتال آنے والی ہے۔ یہ پولیس والے بال کی کھال نکالتے ہیں اور کسی کا خیال نہیں کرتے۔ وہ تمہیں تنگ کر سکتے ہیں۔“

”وہ اپنی کارروائی تو کریں گے ہی۔ اتنے بڑے واقعے کے بعد کیا وہ گھر بیٹھے رہیں گے۔“

”مگر تمہارا تصور کیا ہے؟“

”اکبر علی خاں سے تعلق خاطر کا، ایسا نہ ہوتا تو وہ کیوں ختم ہو جاتے۔“

سیورین دزدیدہ نظروں سے مجھے دیکھا کی، پھر کئی بولی آواز میں بولی۔ ”مجھے تو بہت ڈر لگ رہا ہے۔“

میں نے اسے تسلی دینی چاہی۔

”خداوند! سب ٹھیک ہی ہو۔“ وہ سینے پر صلیب کا نشان بناتے ہوئے بولی۔ ”خداوند سچ کا ساتھ دیتا ہے۔“

وہ ابھی یہ کہہ ہی رہی تھی کہ کئی نے دروازے پر دستک دی۔ سیورین گھبرا کے اٹھ کھڑی ہوئی اور دروازے کی طرف لپٹی۔

اسپتال کا ایک ملازم پولیس کی آمد اور میری طبی کی اطلاع دینے آیا تھا۔ میں نے کچھ لیا تھا۔ سیورین نے سب سے سببہ انداز میں ہر کارے کا پیغام مجھے منتقل کیا۔ سونے سے اٹھ کے میں نے ایک نظر ٹھٹھل کے بستر کے پاس جا کے دیکھا۔ سیورین سے تشفی کے کلمات کہتا ہوا میں کمرے سے نکل جانا چاہتا تھا کہ اس نے مجھے روک لیا اور گل خانے کی طرف اشارہ کیا۔ میرا حال واقعی ٹھیک نہیں تھا، اس کا احساس مجھے ٹھٹھل خانے جا کے ہوا۔ منہ ہاتھ دھو کے اور بال درست کر کے میں باہر آیا تو سیورین مجھے رخصت کرنے کے لیے دروازے کے پاس کھڑی تھی۔ سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لیتے ہوئے اس نے میرے کرتے کا امان میچ کے تشنیں درست کیں۔ میچے کے تین چار ٹن لگا کے میری کھلی واسکت بند کی اور کبھی مسکراہٹ سے ہاتھ پھیلا کے مجھے کمرے سے جانے کی اجازت دی۔

باہر ملازم منتظر تھا۔ چند قدم کا فاصلہ طے کر کے وہ راہ داری میں دائیں مڑ گیا۔ راہ داری کے اختتام پر ہنرہ زار کا وسیع کھلا حصہ تھا اور مختلف امراض کے وارڈ شروع ہو جاتے تھے۔ ایک دو کی کڑیوں میں جگہ جگہ سپاہی موجود تھے۔ ان میں پیشتر زادہ لباس میں تھے۔ سادہ لباس میں بھی پولیس کا آدمی اپنے خاص انداز و اطوار، چھب ڈھب، بالوں وغیرہ سے آسانی سے پہچانا جاتا ہے۔ پوگیس سے جس کا واسطہ پڑتا رہا ہو، اس سے تو کسی بہروپ ہی میں چھپ سکتا ہے۔ متعدد مقامات پر تعینات سپاہی

دوا دھیز، ایک پختہ کار نو جوان۔ تینوں کے قامت میں تھوڑا بہت ہی فرق تھا۔ نسبتاً بڑی عمر کے شخص کے چہرے پر بردباری جھلک رہی تھی اور وہی ان کا بڑا افسر لگتا تھا۔ اس کی چھوٹی آنکھیں اندر دھنسی ہوئی اور چمکیاں تھیں۔ بھروسوں پر سفید بال غالب تھے۔

حالاں کہ دربان نے انہیں مطلع کر دیا تھا، لیکن میری آمد پر تینوں مضطرب سے گئے۔ میں نے سلام کے لیے ہاتھ اٹھایا اور ان سے اجازت لیے بغیر قریب کے سوئے پر بیٹھ گیا۔ چند لمحوں تک ان کی نظریں مجھ پر بھٹکتی رہیں، پھر ادھیز افسر نے اپنے بڑے افسر کی طرف اجازت طلب انداز سے دیکھتے ہوئے مجھ سے میرے نام کی توثیق چاہی۔ میں نے اقرار میں سر ہلادیا۔

”تم سے ہم کو انکوائری کرنا ہے۔“ ادھیز افسر نے ہندوستانی میں پہل کی۔ ”ٹھیک ٹھیک بتاؤ گے تو ہم دونوں کے واسطے ٹھیک ہوگا۔“ اس کے لہجے کی درستی قبل از وقت تھی۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔
”رات کو تم ادھر اسپتال ہی میں تھے جب وکیل اکبر علی خاں صاحب کا مرڈر ہوا۔ وکیل صاحب کتنے بجے تمہارے پاس سے نکلے تھے؟“
”ڈیڑھ دو بجے کے درمیان۔“ میں نے سچھی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

”تم نے ان کو تانگے پر چھوڑا اور لوٹ کے کمرے میں آگئے، ایسا ہی ہوا؟“
”جی ہاں۔“

”تانگے پر ان کو چھوڑنے اور واپس کمرے تلک آنے میں تم کو کتنا تاخیر لگا؟“
”راستے کا وقت۔“ میں نے سادگی سے کہا۔

”گھر جانے میں اتنی دیر کا ہے لگائی وکیل صاحب نے؟ یہاں کا کر رہے تھے او؟“ اس بار نو جوان افسر نے پھر سے لہجے میں پوچھا۔

ہمیں سامنے سے گزرتا دیکھ کے زیروز بر ہو جاتے، لیکن کسی نے اسپتال کی وردی میں ملیوں ملازم کی وجہ سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ ان کی مشکوک نظروں کے دھماکے میں ہم مرکزی عمارت میں داخل ہو گئے۔

عمارت کے بڑے دروازے پر بھی پانچ چھ پاپائی موجود تھے۔ انہوں نے جیسے مجھے پہچان لیا ہو اور میں ہی انہیں مطلوب ہوں۔ مجھے آتا دیکھ کے ان کے ڈھلکے ہوئے جسموں میں ایک ساتھ جیسے کسی نے سوئیاں چھو دی ہوں، سبھی نکل سے گئے۔

نگاہوں نگاہوں میں انہوں نے ایک دوسرے سے تصدیق چاہی، لیکن میرا ان کا سامنا لگائی تھا۔ میرا رہبر اسپتال کا ملازم عمارت کے بڑے دروازے سے چند قدم بعد دائیں جانب گئی ایسی جگہ میں آ گیا۔ سامنے دروازے پر سادہ لباس میں ایسا وہ شخص کا تعلق بھی یقیناً پولیس سے ہونا چاہیے تھا۔

ملازم نے مجھے اس کے سپرد کیا اور وہیں سے لوٹ گیا۔ مجھے باہر ٹھیرا کے دربانی خدمت پر مامور پولیس کے آدمی نے اندر جا کے میری آمد کی اطلاع دی ہوگی۔ جاتے جاتے اس نے دروازہ بند کرنے کی احتیاط بھی کی اور فوراً ہی واپس آ کے اس نے میرے لیے دروازہ کھول دیا۔

وہ اسپتال کے خاص ملاقاتیوں کا کمرہ معلوم ہوتا تھا، نہ اتنا بڑا، نہ ایسا چھوٹا، بڑے اسٹیشنوں کے درجہ اول مسافروں کی انتظار گاہ کے مانند سجا ہوا اور صاف ستھرا۔ دیواروں کے ساتھ لگے شاہانہ طرز کے سونوں کے بیچ شیشے کی چھوٹی میزیں، کمرے کی کشادہ وسطی جگہ پر کئی بڑی چوکور میز، چھت خاصی اونچی، دیواروں پر نیا نیا رنگ روغن، کھڑکیوں پر ہلکے نیلے رنگ کے ریشمی پردے، چھت سے سس روغن دان نصف کھلے ہوئے، چھت سے لٹکا ہوا پنکھا تیزی سے گھوم رہا تھا۔ دروازے کے عین مقابل

سونوں پر تازہ وردیوں میں تین پولیس افسر بیٹھے ہوئے تھے، تینوں کم و بیش گندی رنگت کے تھے،

”باتیں کر رہے تھے ہم، وقت کا کچھ خیال ہی نہیں رہا۔ جتنے وقت میں نے ان سے کہا بھی کہ رات بہت ہو چکی ہے میں ان کے ساتھ چلتا ہوں، اسی تانگے سے واپس آ جاؤں گا۔ انہوں نے ہنس کر منع کر دیا۔“

”کا..... کا باتیں کر رہے تھے او؟“

”یہی میری، اپنی، اپنے گھر کی..... دنیا بھر کی۔“

”کب سے تم ان کو جانو ہو؟“

”دو تین دن سے، یہاں آنے کے بعد سے۔“
”دو تین دن سے!“ اوجھڑا نسر جیرانی نے بولا۔

اس نے وہی سوال کیا جو ڈاکٹر رائے نے کیا تھا کہ اتنی جلد وہ کس طرح مجھ سے ٹھل ٹھل گئے کہ گھر کی باتوں میں شریک کرنے لگے۔ میں نے جواب میں وہی کہا جو ڈاکٹر سے کہا تھا کہ ایک دوسرے کے قریب آنے کے لیے کسی مدت کی شرط عائد نہیں ہوتی۔

”کدھر، کیسے تھری ان کی پہلی بار بھینت ہوئی؟“

”یہ ایک لمبی کہانی ہے۔“ میں نے کسی قدر بے رخی سے کہا۔ ”آپ کا وقت ضائع ہوگا۔ بس اتفاق سے میری ان کی ملاقات ہوئی۔“

”ہم کو بتاؤ، ہم اسی کارن ادھر آئے ہیں۔“
”بتانے میں کوئی ہرج نہیں لیکن آپ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پائیں گے، بل کے لٹھ سکتے ہیں، کسی نتیجے پر پہنچنا چاہتے ہیں تو ادھر ادھر مت بھٹکیے۔“
”تم ہم کو ایڈوائزنا ہی کرو تو اچھا ہے۔“

میں نے فوراً کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا۔ ٹھٹھل کہتا تھا، جواب میں تیزی ہر وقت مناسب نہیں ہوتی۔ اس کے بقول سامنے موجود زیادہ پولیس افسر ایک ساں مزاج کے نہیں ہوتے، چہروں کی طرح ان کی خصالتیں بھی مختلف ہوتی ہیں۔ ایک دوسرے سے

سبقت لے جانے کے لیے وہ اگلے سیدھے سوالات بھی کرنے لگتے ہیں۔ شک کی بنیاد پر وہ مفروضے قائم کرتے ہیں اور شک کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ کوئی شک ان کے دل میں بیٹھ جائے تو مشکل ہی سے نکلتا ہے۔ ظاہر ہے، ان میں نہایت ذہین، تعلیم یافتہ اور تجربے کا بھی ہو سکتے ہیں۔ وہ ہوش و حواس ٹھوڈے کی حد تک اپنے مخاطب کو لا جواب اور برہم کر سکتے ہیں، ہمیشہ دشمن کی طرح پیش آتے ہیں اور مشکل سے شکست قبول کرتے ہیں۔ بہت کچھ دلیل پر منحصر ہے، دلیل انہیں غصہ بھی دلاتی ہے، زنج بھی کرتی ہے، متاثر بھی۔ اپنی دلیلیں آہستہ آہستہ ان پر افشا کرتی جا سکتی ہیں۔ دلیلیں تو اتنا نہ ہوں، یا دلیل ہی نہ ہو تو جت جت نہیں کرنی چاہیے۔ چرب زبانی انہیں ناگوار گزرتی ہے۔ ان کے مناصب کی رعایت وہی بہ حراصل واجب ہے۔ اونچی آواز میں بات کرنے سے پہلے ان کے تیور کا تخمینہ کر لینا چاہیے۔

”ایک بات صاف سن لیجئے صاحب!“ میں نے تمام تر احتیاط سے نسبتاً سچی ہوئی آواز میں کہا، ”میرے پاس جو کچھ ہے، آپ سے کہے دیتا ہوں، ہو سکے تو اس پر دھیان دیجیے اور پہلے اس زاویے سے سوچیے۔ آپ حاکم ہیں۔ بعد کو آپ کی مرضی ہے، جس طرف، جس انداز سے چاہیں کھوج کیجیے۔“

تیوں کے چہرے تھمتانے لگے۔ نو جوان افسر زیادہ بے چین نظر آ رہا تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ بڑے افسر نے ہاتھ اٹھا کے اسے روکا اور طنز پر مسکراہٹ سے بولا۔ ”کا کہنا چاہو ہو تم؟“ اس کی آواز بھاری تھی اور منصب کی تکنت سے آسودہ۔

یہی ایک طور مجھے ٹھیک لگا کہ چٹنا شہر میں آنے کے بعد پیش آنے والے واقعات بے کم و کاست بیان کر دوں، لیکن اس سے پہلے انہیں کچھ باور کرا دینا بھی ضروری تھا۔ میں نے کہا، ”جو میں کہتا

ہوں۔ اچھا تو یہی ہوگئی الحال آپ اسی پر تکیہ یا اسی پر یقین کریں۔ بعد کو کسی وضاحت کے لیے سوال پیدا ہوتے ہیں تو میں آپ کے سامنے حاضر ہوں۔ آپ کے اطمینان کے لیے جتنا کچھ بھی جانتا اور سمجھتا ہوں، جواب دینے کی کوشش کروں گا لیکن میری بات ختم ہونے سے پہلے کوئی سوال مت کیجئے گا۔ یہ میری گزارش ہے۔ مجھے اس حقیقت کا اچھی طرح احساس ہے کہ آپ پولیس کے آدمی ہیں اور سٹیڈی کے ایک نکلین واقعے کی گفتیش کر رہے ہیں۔ بد قسمتی سے جس میں میرا ذکر، میرا نام بھی آتا ہے۔ مجھے معلوم ہے، میری حیثیت بھی آپ کی نظروں میں مشکوک قرار پاتی ہے اور میرے خیال میں اس کا کوئی جواز نہیں ہے۔ آپ کچھ جانتا چاہتے ہیں تو میں دہراتا ہوں۔ میں آپ سے امکان بھر تعاون کروں گا، یا یوں کہیے کہ آپ کی مدد کے لیے میں یہاں موجود ہوں۔ کسی کارنامے کے چکر میں پڑیں گے آپ تو شاید کچھ ہاتھ نہ آئے۔“

”تم..... تم ہماری مدد کرو گے۔“ نو جوان افسر کی زبان مجھے میں ڈگمگا گئی۔ ”تم ہم کو کوئی بہت چالو..... ریفرنشل ٹاپ مجرم لگو ہو۔“

”تو ٹھیک ہے..... میں خاموش ہو جاتا ہوں، پھر آپ بھی کیوں یہاں بیٹھے ہو۔“ میں نے دو ٹوک لہجے میں کہا، ”ایک بات دماغ میں رکھ لو صاحب! میں آپ کے ہر سوال کے جواب کا پابند نہیں ہوں۔ آپ مجھے مجرم سمجھتے ہیں تو بات ختم ہو جاتی ہے، پھر دیر کا ہے نا، مجھے یہاں سے سیدھے حالات لے جائیے۔ میں نے ڈاکٹر رائے سے درخواست کی ہے کہ وہ شہر کے کسی اچھے وکیل کا بندوبست کر دیں۔ پھر وہی آپ سے بات کرے گا۔“

تھوڑا بہت اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کچھ طے کر کے، کچھ ٹھان کے نہیں آئے ہیں۔ انہیں کسی کچھ پہنچنے، کوئی رائے قائم کرنے کا موقع ہی کہاں

ملا ہوگا۔ اکبر علی خاں کے ملازم کے بقول، صبح فجر کی نماز کے لیے مسجد جاتے جوتے نمازیوں نے ان کی خون آلود لاش جھازوں میں بڑی دیکھی تھی۔ اسی وقت سارے محلے میں کھیرام کچا گیا ہوگا۔ پولیس تک بات پہنچنے، پولیس کے آنے اور ابتدائی گفتیش میں کچھ وقت تو ضرور لگنا چاہیے۔ کچھ تنگ دود کے بعد انہیں معلوم ہو گیا ہوگا کہ اکبر علی خاں رات گئے اپنے کسی نئے دوست کے پاس سے گھر واپس آ رہے تھے۔ یہ نیا دوست کون تھا۔ اس کا سراغ بھی ان کے لیے معائنہ ہوگا۔ اسپتال آ کے انہوں نے صدر دروازے پر رات کی ڈیوٹی کے دربان اور اونگھتے ہوئے سپاہیوں سے بات کی ہوگی اور ممکن ہے انہوں نے اس تانگے والے کو بھی ڈھونڈ لیا ہو جو اکبر علی خاں کو اسپتال سے لے گیا تھا اور ہو سکتا ہے مجھ سے پہلے ڈاکٹر رائے سے بھی ان کی ملاقات ہو چکی ہو۔ انہی کم مدت میں ان کی معلومات خاصی خام اور نا تمام ہونی چاہئیں۔ یہ ساری صورت حال اور ان کی تذبذب و منتشر حالت دیکھ کے ہی میں نے اپنی آواز اور لہجے میں جرأت کی جسارت کی تھی اور مجھے احساس تھا کچھ متجاوز نہ ہو جائے۔ وہ کچھ جانتا جانتے ہیں تو مجھے بھی اپنی وکالت، اپنی نجات کی کوشش کرتے رہنا ہے۔

بستر پر پڑا بے حرکت، بے دست و پا جیسا ٹھٹھل بار بار میری نگاہوں کے سامنے آ جاتا تھا۔ اس شہر میں میری تنہائی اور اچھیتیت، سارے فاصلے مٹا کے ایک شخص قریب آیا تھا، اس سے بڑا سہارا ہو گیا تھا، وہ بھی چھن گیا۔

نو جوان افسر کے پہلو میں بیٹھے اوجھڑا پولیس افسر نے میری کچ بیانی، یادہ گھوٹی برہنوں کی۔ میں نے کوئی ایسی ناروا، نازیبا بات بھی نہیں کی تھی۔ جانے کیوں وہ مجھ تک اٹھا۔ شاید یہی بار اس کا مجھ ایسے کسی ملزم، یا مجرم سے سنا سنا ہوا تھا۔ اس نے بگڑے منہ سے پوچھا۔ ”تو..... تو..... تم کون ہو؟“

”میں آپ کو یہی بتانا چاہتا ہوں کہ میں کون ہوں اور مجھ افسی کو اس شہر میں آکے کین حالات سے واسطہ پڑا ہے۔“ میں نے جبری حمل سے کہا۔ ”لیکن لگتا ہے، آپ کی نظروں میں اپنی حیثیت جان کے ہی مجھے زبان کھولنی چاہیے۔ مجھے اپنی بات کہنے کا حق ہے تو کھلے دل سے اجازت دو۔ کہیں دینا چاہتے تو میں نے پہلے ہی صاف کہا ہے، آپ اپنی کارروائی کرو۔ میں جانتا ہوں، یہ حق مجھے کہاں سے مل سکتا ہے، آپ پر دنیا ختم نہیں ہو جاتی۔“

”ٹھیک ہے۔“ بڑے افسر نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا، ”تم بولو، کیا بولنا ہے؟“ مزید کسی جت کا عمل نہیں تھا۔ میں نے اپنی آواز دھکی رکھی۔ ”ہم آگے جا رہے تھے۔ اکبر پور اسٹیشن پر انجن خراب ہو گیا۔ ریل گاڑی کے جھکوں کی وجہ سے سوئے ہوئے بھائی کے سر پہ اندرونی چوٹ آگئی۔“

میں نے شروع سے آخر تک مختصر ساری روداد ان کے گوش گزار کر دی۔ درمیان میں کئی بار ادھیڑ اور نوجوان افسر نے مداخلت کرنی چاہی، لیکن بڑے افسر کی طرف دلچسپی کے تھملا کر رہ گئے۔ میں نے کوئی غلط بیانی نہیں کی تھی۔ صرف اکبر علی خاں کے گھر میں چاقو کے زور پر داخل ہونے کے واقعے سے اجتناب کیا تھا۔ میرے بیان میں یہ تدریج ان کی بڑھتی دلچسپی اور حیرت کا اظہار ان کی آنکھوں کی چمک اور چہروں کے بدلتے رنگوں سے ہوتا رہا تھا۔ اتنا کچھ جان کے ان کے ذہنوں میں اٹھتے ہوئے سوالات کا مجھے اندازہ تھا۔ انہیں بھی وہی صراحتیں مطلوب ہونی چاہیے تھیں جو کچھ دیر پہلے ڈاکٹر رائے کو ہوئی تھیں۔ گو میں خود ہی ان کی الجھنیں دور کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔

میرے چپ ہو جانے پر وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھا گئے، پھر ادھیڑ افسر نے اسی سوال کی

تکرار کی جو ڈاکٹر رائے نے کیا تھا کہ کیا میں ہمیشہ اپنی جیب میں چاقو رکھتا ہوں۔ ڈاکٹر رائے کی بات اور تھی، ان لوگوں کا تعلق پولیس سے تھا، میں نے محتاط لہجے میں کہا، ”کسی ان ہونے واقعے سے نمٹنے کے لیے چاقو جیب میں رکھنا ہماری ریت ہے۔“

”چاہے، برسوں سے کھولنے کی نوبت نہ آئے۔“ کے بعد دیگرے وہ طرح طرح کے سوالات کی نشتر زنی کرتے رہے، ڈاکٹر رائے سے کچھ زیادہ ہی۔ یہ دوسرا مرحلہ زیادہ اذیت ناک تھا۔ میں جواب دہی کا عذاب سہتا رہا کرتا تھا۔ اس وقت کی تنگی و کشادگی اب انہی پر منحصر تھی۔ بہت دیر ہو گئی تھی۔ میرے دست و بازو نونے سے لگے تھے۔ کبھی جی میں آتا تھا، انہیں جھڑک دوں کہ میری کیا خطا ہے۔ وہ میری بات کیوں نہیں سمجھ رہے۔ میں نے کیا تصور کیا ہے جو مجھے ان کے سامنے سر جھکانے مجرموں کے مانند بیٹھنا پڑ رہا ہے۔ ایک رکنا تو دوسرا شروع ہو جاتا تھا۔ ان کے سوالوں کا سلسلہ جاری تھا کہ سوئوں کے درمیان یعنی دروازہ کھلنے کی چرچا ہٹ ہوئی اور ڈاکٹر رائے نمودار ہوا۔ اسے دیکھ کے مجھے سکون ملا۔ وہ تینوں اٹھ کھڑے ہوئے، میں بھی کھڑا ہو گیا۔ ڈاکٹر رائے نے پر تکلف انداز میں ان سے بیٹھ جانے کی گزارش کی اور ظاہری شائستگی و شکستگی سے انگریزی میں بولا، ”میں تھک نہیں ہوا؟“

”نہیں، نہیں ڈاکٹر، کیا کہہ رہے ہیں آپ، خوش آمدید۔“ تینوں افسروں نے تپاک کا اظہار کیا۔

”کیسے صاحبان! آپ کے مسائل کچھ حل ہوئے؟“ ڈاکٹر نے پرامید لہجے میں پوچھا۔

”جی ڈاکٹر۔“ بڑے افسر نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ”ہم یہی کر رہے تھے، کچھ کھینچنے کی کوشش۔“

”یقیناً ساری بات سے آپ آگاہ ہو گئے ہوں

ہے۔“

”جی ڈاکٹر صاحب، ہم نے پوری توجہ سے ہر بات سنی ہے۔“

”یہ کیسی افسوس ناک اور حیرت ناک صورت حال ہے۔“ ڈاکٹر رائے نے ادا سی کہا۔

”جی ڈاکٹر صاحب؟“ بڑے افسر کی آواز بھاری ہوئی۔

”واقعی۔“

”کیا نتیجہ اخذ کیا آپ نے؟“ ڈاکٹر نے پھینکی مسکراہٹ سے پوچھا۔

”ابھی یقین سے تو کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“ بڑا افسر سنجیدگی سے بولا۔

”کیا مطلب؟“ ڈاکٹر رائے نے چونک کے پوچھا۔

”یہ ایک ایک طرفہ روداد ہے۔“ بڑے افسر کا لہجہ بظاہر معذرت خواہا لیکن تند و تیشی کا حامل تھا۔ کہنے لگا۔ ”اس نوجوان کا پس منظر صاف نہیں ہے۔ یہ ہر وقت چاقو جیب میں رکھتا ہے۔ اڈے پاڑوں سے بھی اس کی وابستگی رہی ہے۔ یہ ہتھ چھٹ ہے۔ بنا اچھن جانے پر یہ چور کے پیچھے پڑ گیا۔ ایک ذرا سے بنا چوری پر ایک آدمی کا خون ہو گیا۔ اس کا کہنا ہے اس نے اپنا چاقو نہیں نکالا تھا، ایک ساتھی نے نادانی، تا تجربے کاری میں اپنے ہی ساتھی کو خود زخمی کر دیا جو بعد کو مر گیا۔ یہ ایک اور معاملہ ہے، قتل کا معاملہ۔ دیکھنا ہے، اس بات میں کتنی صداقت ہے۔ اس نے مشہور زمانہ چاقو باز میدا جیسے بد معاش کے ٹھکانے پر جا کے اسے چاقو آزمائی کی دعوت دے ڈالی۔ کس اعتماد میں؟ اس اعتماد میں کہ یہ اسے زیر کر لے گا، ورنہ یہ آدمی ایسا بے وقوف نہیں معلوم ہوتا۔ یہ شہر کے مشہور روکیل کے گھر میں جبراً داخل ہو گیا۔ اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ دو راتیں قتل جو سب آدی اسپتال میں گھس آئے تھے۔ وہ کئی میں زخمی ہو جانے اور بعد میں دم توڑ دینے

والے نوجوان کے مشتعل ساتھی ہو سکتے ہیں اور وہ نہیں تو وہ میدان کے فرستادہ ہو سکتے ہیں۔ یہ ان کے ہاتھ نہ آسکا اور واپس بھاگتے ہوئے ان لوگوں کے راستے میں اسپتال کا پر جوش ملازم برکادٹ بن گیا۔ وہ بھی اپنی جان سے گیا۔ یہ دوسرا قتل ہے، پھر آج صبح سویرے تیسرا قتل، شہر کے ایک نام ور وکیل کا خون۔ شہر کی ساری پولیس حرکت میں آچکی ہے۔ دیر ہو گئی تو ضلع سے صوبے اور پھر مرکزی حکومت تک بات جاسکتی ہے۔ سنا ہے، وکیل صاحب کا بڑا بھائی نظام حیدر آباد کا مقرب خاص ہے، دربار میں کسی بڑے عہدے پر فائز ہے۔ نظام سرکار اور برطانوی حکومت کا تال میل کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ یہ انتہائی نازک معاملہ ہے اور پیچیدہ رخ اختیار کر سکتا ہے۔ ہمیں ہر ممکن قدم اٹھانا اور ہر حال میں محتاط رہنا ہے۔ سمجھ رہے ہیں آپ ڈاکٹر صاحب! بڑے افسر نے مایوسانہ، فکر مند انداز میں کہا۔

”جی ہاں، سمجھ رہا ہوں اور اچھی طرح جس طرح آپ سمجھا رہے ہیں اسی طرح۔“ ڈاکٹر رائے ہنسنے لہجے میں بولا۔

”انہی صورت میں یہی مناسب ہے کہ ہم اسے ساتھ لے جائیں۔“

”کیا.....؟“ ڈاکٹر رائے کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ”آپ ساتھ لے جائیں گے اسے۔ کیوں؟ کس لیے؟“

”مجھوری سے ڈاکٹر صاحب!“ بڑے افسر نے متانت سے کہا، ”ہمیں کچھ اور چاہنا ہو جھتا ہے۔“

”کیا اس سے حاصل کردہ معلومات میں کوئی کمی رہ گئی ہے؟“ ڈاکٹر اٹھڑی ہوئی آواز میں بولا، ”مجھے نہیں معلوم اس نے آپ کو کیا بتایا ہے لیکن جو کچھ میں جان پایا ہوں، یقیناً اس سے مختلف نہیں ہونا چاہیے۔“

”محترم ڈاکٹر!“ بڑے افسر نے موڈ بانہ کہا۔

”مجموعوں کا ہمیں وسیع تجربہ ہے۔ آپ کو کیا بتائیں کیسے کیسے بہروپے، تماشا باز سامنے آتے رہے ہیں۔ آپ جیسا ایک مقدس پیشے سے وابستہ شخص ان جرائم پیشہ لوگوں کی شعبدے کاروں کا تصور نہیں کر سکتا۔ ہمارے روز و شب انہی لوگوں میں گزرتے ہیں۔ ایک نمبر کے چھٹے ہوئے لوگ ہوتے ہیں یہ جناب!“

”لیکن اس کے بھائی کو اس کی رفاقت کی ضرورت ہے۔ یہ سراسر انسانی ہم دردی کی بات ہے۔“

”معاف کیجیے ڈاکٹر صاحب! آپ ہمارے لیے نہایت معزز محترم ہیں لیکن پولیس اور قانون کے اپنے کچھ مطالبے ہوتے ہیں۔ سیری ذرخواست ہے آپ سمجھنے کی کوشش کیجیے اس آدمی کی وجہ سے تین آدمیوں کا خون ہو چکا ہے اور یہ اس کا معترف ہے۔“

”کیا کہا آپ نے؟“ ڈاکٹر برصغلی سے بولا ”یعنی اس نے اعتراف کیا ہے کہ تینوں مل اس نے کیے ہیں۔“

”نہیں، میں نے یہ کب کہا جناب!“ بڑے افسر نے یہ نکتہ صراحت کی۔ ”میرا مطلب ہے یہی بناے فساد رہا ہے۔“

”کیسی بات کر رہے ہیں آپ۔“ ڈاکٹر رائے نے برہمی سے کہا۔ ”دیکھیے آئی جی صاحب! اس کا بھائی میرے زیر علاج ہے اور اس کی حالت سے میں واقف ہوں، آپ نہیں۔ یہاں اس کی ضرورت ہے۔ آپ کہتے ہیں یہ یہاں آکے تین افراد کی موت کا سبب بن گیا، سبب بنا اور قتل کر دینا اور قتل کے لیے آمادہ کرنا تین مختلف باتیں ہیں۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کل رات یہ اسپتال میں تھا۔ اکبر علی خاں کو رخصت کرنے کے کے بعد یہ اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔ کیا اس نے اسپتال میں گھس آنے والے حملہ آوروں کو آمادہ کیا تھا کہ میرے بجائے انھوں کو قتل کر دے؟“

کردو؟ تیسرے کے بارے میں اس نے آپ کو بتا دیا ہوگا کہ وہ اپنے ہی ایک اندھے ساتھی کا نشانہ بن گیا۔ ڈاک خانے والی گلی میں چور کا پیچھا کر کے یہ کون سے جرم کا مرتکب ہو رہا تھا؟ شہر میں ایک اچھی مسافر کو اپنی جمع پونجی چھین جانے پر کیا ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا چاہیے تھا۔ چور کا پیچھا کر کے اس نے اپنا ہونا حاصل کر لیا تھا کہ دو آدمی چاقو تانے دیوار بن گئے۔ ان میں سے ایک آدمی سے لفظ ہوئی، کیا یہ اپنے آپ کو اس کے سامنے پیش کر دیتا؟ پھر پولیس والے اس کے تعاقب میں دوڑ پڑے۔ پناہ کے لیے یہ ایک شریف الطبع وکیل کے گھر میں جبراً داخل ہو گیا۔ اس نے سارا واقعہ سن کے ہم دردی کا اظہار کیا اور کسی ناخوش گوار صورت سے اسے بچانے کے لیے اس کے ساتھ میڈا کے ٹھکانے پر جانے کی جرات کر لی۔ وکیل صاحب نے میڈا کو ہموار کرنے کی اپنی جیسی کوشش کی۔ جس خیال سے اس نوجوان نے میڈا کے ٹھکانے پر جانے کا ارادہ کیا تھا، وہ اڈے پاڑوں کی ریت کے عین مطابق تھا اور یقیناً یہ کسی اعتماد ہی میں وہاں گیا تھا۔ اس اعتماد میں کہ یہ میڈا کو چوکی سے اتار سکتا ہے۔ چاقو پر کوئی اور اتنی دست رس نہیں رکھ سکتا۔ کیا میڈا ہی حرف آخر ہے۔ اس کے پاس کون سا راستہ تھا پھر؟ میڈا نے اپنے گرگوں اور پولیس کے سپاہیوں سے مل کے اس کے لیے ہسپتال تک پہنچنے کا ہر راستہ بند کر دیا تھا۔ پھر یہ کیا کرتا؟ وکیل کے گھر چھپ جاتا، اپنے بیمار بھائی کو اسپتال میں تنہا چھوڑ کے؟“

ڈاکٹر نے لمبے لمبے بھر کے لیے توقف کیا تھا کہ ادھیڑ افسر زہرا آؤد مسکراہٹ سے بولا، ”آپ کو تو ڈاکٹر کے بجائے وکیل ہونا چاہیے تھا ڈاکٹر صاحب!“

ڈاکٹر نے اس کی جانب غور سے دیکھا، اس کے چہرے پر آگ سی جھڑکی۔ ادھر لفظی دروازے پر دستک ہوئی۔ ڈاکٹر نے ناراضی سے پوچھا۔ ”کون

ہے؟ اندر آ جاؤ۔“

جس دروازے سے ڈاکٹر داخل ہوا تھا، سفید وردیوں میں دو آدمی خوان پوشوں سے ڈھکے تخت اٹھائے اندر آئے۔ انہوں نے سلیقے سے وسطی میز پر تخت رکھ کے خوان پوش ہٹا دیے، ایک میں تمکین چیزیں، پیسٹریاں، کیک اور انگریزی بیکٹ وغیرہ تھے۔ دوسرے میں چائے کے برتن، کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ بڑے افسر نے جسے ڈاکٹر رائے نے آئی جی کے خطاب سے مخاطب کیا تھا، اس تکلف کے لیے چند رسمی جملے ادا کیے۔ ڈاکٹر رائے کے اشارے پر خدمت گاروں نے سونوں کی حاشیہ زین کمال کے ہمارے سامنے کر دی اور ان پر چمچوں کے ساتھ تشریاں رکھ دیں۔ ایک خدمت گار پہلے تخت آئی جی، پھر دوسرے افسروں اور ڈاکٹر رائے کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے میری طرف اگلی سے اشارہ کیا تو خدمت گار ڈاکٹر کو چھوڑ کے میرے پاس آ گیا۔ میں نے انکار کر دیا۔ ڈاکٹر نے ایک بیکٹ تشری میں رکھ کے گویا مہمانوں کے ساتھ شرکت کی وضع پوری کی۔ سب کو چائے پیش کر کے ملازم جلد ہی رخصت ہو گئے۔

”آپ کچھ کہہ رہے تھے۔“ خدمت گاروں کے جانے کے بعد ادھیڑ افسر نے خاموشی توڑنے کی کوشش کی۔

”مگر مجھے شبہ ہے کہ آپ سن بھی رہے ہیں۔ سنا ہے پولیس ایک کان سے سنتی دوسرے سے اڑا دیتی ہے۔“

”آپ پولیس سے بہت ناراض معلوم ہوتے ہیں۔“ آئی جی زیر لبی سے بولا ”پولیس میں بھی آدمی ہوتے ہیں جناب اور آدمی سبھی ایک جیسے نہیں ہوتے۔ پولیس میں بھی کالے اچلے لوگ ہوتے تھے۔ اب یہ معلوم نہیں.....“ وہ جھجک کے بولا، ”آپ ہمیں کیا سمجھتے ہیں؟“

”ایک خوش فہم کو بہتری ہی کی امید کرنی

چاہیے۔“ ڈاکٹر نے پر عزم لہجے میں کہا ”اور پھر یوں بھی کہ میں اپنی دانست میں کوئی غلط بات نہیں کر رہا۔ میں اس نوجوان کی سفارش نہیں کر رہا بل کہ حقائق بیان کر رہا ہوں۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں، یہ تو اپنے کو داد پر لگ کے میڈا کے ٹھکانے پر چلا گیا تھا۔ میڈا نے چاقو آزمائی سے کیوں پہلو تکی کی۔ وہ اتنا ہی زور آور ہے تو ایک اچھی کے سامنے سینتان کے آجاتا۔ اس نے درمیان کاراستہ اختیار کیا۔ کیوں؟“ ڈاکٹر نے تیز آواز میں آئی جی کو مخاطب کر کے پوچھا۔

تینوں افسر دم سادھے بیٹھے رہے۔ ”اب وہ میڈا کے آدمی تھے جو اسپتال میں اسے ختم کرنے آئے تھے یا اس شخص کے ہاتھی ساتھی جو ڈاک خانے والی گلی میں اپنے ہی ساتھی کی وحشت سے ہلاک ہو گیا۔ کیا یہ واقعہ اسی طرح پیش نہیں آ سکتا جس طرح اس نوجوان نے بیان کیا ہے؟ کہیں کوئی بے ربطی، کوئی ابہام نظر آتا ہے آپ کو؟ واقعات کی ترتیب میں کہیں کوئی جھول ہے؟“ ”یہ ظاہر کوئی نہیں، نہایت مکمل خاکہ۔“ آئی جی نے اچھتی آواز میں کہا۔

”آپ اسے خاکہ نہیں یا داستان۔ میں اسے تین چار دن سے دیکھ رہا ہوں۔ اس نے مجھ سے بدکلامی بھی کی ہے۔ یہ اپنے بھائی کے لیے جان پر ٹھیل سکتا ہے۔ اس کا ثبوت بھی دیا ہے اس نے۔ اس صورت حال میں یہ بھائی کو چھوڑ کے فرار بھی ہو سکتا تھا۔ یہ یہاں موجود ہے..... میں اس کے بھائی کا معالج ہوں اور ان دونوں سے میرا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ یہ ایک ہوش مند، جرأت مند اور بہت سے اپنے ہم عمروں سے مختلف ہے۔ اسے آگہی ہونی چاہیے کہ سر دست یہ کسی غلط بیانی کا مشتمل نہیں ہو سکتا۔ آپ لوگ اسی شہر میں ہیں کچھ بھی آپ سے دور نہیں ہے، نہ میڈا کا اڈا، نہ ڈاک خانے والی گلی، وہاں بہت سے راہ گیر اور اتھاسی

تھے۔ پہلے ان گوشوں کو نوں کو ذرا مثول کر دیکھیے۔“
 ”وہ تو پولیس ٹیم کر رہی ہے۔ صرف ہم
 تینوں افسران نہیں، چنانہ شہر کی ساری پولیس جلد
 از جلد نتائج حاصل کرنا چاہتی ہے۔ یہ مجھے کی
 کارکردگی اور عزت کا معاملہ ہے۔“ ادھیڑ افسرنے
 بڑی حد تک روکھے اندز میں کہا۔

”تو ٹھیک ہے، پہلے اپنے طور پر تفتیش کر لیجیے۔
 ضرورت پڑے تو ضرور یہاں آئیے۔ میں یقین
 دلاتا ہوں۔ یہ یہیں موجود ہے، کہیں نہیں جا رہا۔
 آپ جب چاہیں یہاں آ سکتے ہیں اور اس سے
 رابطہ کر سکتے ہیں۔ کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو میں
 خود اسے آپ کے حوالے کر دوں گا۔“

”لیکن ڈاکٹر صاحب مشکوک لوگوں کو ہمارے
 ہاں ایسی رعایتیں نہیں دی جاتیں۔ ہماری تفتیش کا
 اپنا ایک طریقہ کار ہے۔ مجرم کا کھرا کھوٹا ذرا جلدی
 سامنے نکل آتا ہے۔ ہمیں اس کے شہر فیض آباد کی
 پولیس سے بھی رابطہ کرنا ہے، اس کے تمام پس منظر
 اور دیگر حوالوں کی چھان بین کرنی ہے۔ پولیس کو
 اسے یوں کھلا چھوڑ دینے کا خطرہ مول لینا نہیں
 چاہیے، اور آپ بھی جناب! معاف کیجیے، ہماری
 مخلصانہ صلاح ہے، آپ بھی اس پر اتنا اعتماد نہ
 کیجیے۔ میدا کے ٹھکانے پر یہ بات الٹی ہو جاتی، یا یہ
 اسپتال آنے والے سر پھروں کے ہاتھ آجاتا تو بھی
 تو اس کا بھائی تباہ ہو جاتا۔“ ادھیڑ افسرنے کھردری
 آواز میں کہا۔

”لیکن ایسا نہیں ہوا۔“ ڈاکٹر پھر کے
 بولا، ”اس کا مطلب یہ نہیں ہوا کہ اب آپ اس کی
 خوش قسمتی غصب کر لیں۔“

”ذرا اس پہلو پر بھی غور کیجیے ڈاکٹر صاحب! یہ
 پولیس کی تحویل میں زیادہ محفوظ رہے گا۔ آپ دیکھ
 رہے ہیں، یہ ان کے ہاتھ نہ آیا تو انہوں نے اس
 کے مرئی و سن اکبر علی خاں کو ختم کر دیا۔ وہ دوبارہ
 کچھ اور منصوبہ بندی بھی کر سکتے ہیں۔ لگتا ہے وہ

چین سے بیٹھنے والے نہیں، بڑے خطرناک، متم
 مزاج لوگ معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے وجود سے
 ان کے جے جمائے ٹھکانے، ان کی بادشاہت پر
 ضرب پڑنے کا خدشہ ہے اور اگر وہ میدا کے آدمی
 نہیں اور آپ کے اندیشے کے مطابق وہ پاگل ڈاک
 خانے والی گلی میں مرنے والے کے سامنے بھی
 ہو سکتے ہیں تو وکیل صاحب کے خاتے کے بعد وہ
 مطمئن ہو گئے ہوں گے کیا؟ کیا انہوں نے اپنے
 ساتھی کی قیمت وصول کرنی؟ ہماری تفتیش اپنی جگہ،
 پولیس کی تحویل سے مراد اس کی حفاظت کی ضمانت
 چھی تو ہے۔ یہ کھلا رہا تو اور خون خرابے کا امکان
 ہے۔ جو لوگ اس کے دوست وکیل صاحب پر اپنا
 غضب آزما سکتے ہیں، ان سے کیا بعد سے کہ وہ اس
 اسپتال میں پڑے اس کے بیمار بھائی کو بھی.....“
 میری طرف دیکھ کے ادھیڑ افسر کی آواز بل کھانے
 لگی۔

”اب آپ نے ایک دوسری بات کہہ دی۔
 ایک بات طے کر لیجیے، آپ اسے محض شک کی بنیاد
 پر ساتھ لے جانا چاہتے ہیں، یا اس کی حفاظت کے
 لیے، یا دونوں کے لیے؟“ ڈاکٹر جھلائے لہجے میں
 بولا، ”میں نہیں سمجھتا شک کی کوئی معقول وجہ موجود
 ہے اور حفاظت تو آپ یہاں بھی کر سکتے ہیں۔
 اسپتال کی تاریخ میں چھٹی بار پولیس یہاں آ چکی
 ہے۔ کچھ اور نظریہ سمجھ دیجیے۔ یہاں اسپتال میں بھی
 آپ اس کی حفاظت بہ خوبی کر سکتے ہیں۔ تھوڑا بہت
 قانون مجھے بھی معلوم ہے۔ اپنی سلامتی کے لیے یہ
 قانوناً بھی آپ سے مدد طلب کر سکتا ہے اور رہی
 خانہ خرابی کی بات تو آپ شہر میں کس لیے ہیں آپ
 کا کیا کام ہے۔ شہر میں مین خونی وارداتیں ہو چکی ہیں
 اب بھی آپ.....“ ڈاکٹر کوئی شدید بات کہتے کہتے
 رہ گیا۔

چند لمبے توقف کے بعد اس نے نرمی سے کہا
 ”آپ اسے یہاں سے لے جانے ہی پر مجبور اور مرم

ہیں تو مجھے بتائیے میں آپ کا بارگاہ کرنے، آپ کی بریت کے لیے کس حاکم اعلیٰ سے بات کروں۔
تینوں افسر افسر اداری انداز میں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

”آپ کی اطلاع کے لیے.....“ ڈاکٹر نے روکھی آواز میں کہا، ”کچھ دیر پہلے میں نے ہیر سٹرپی اہل بھارگو سے بات کی ہے۔ وہ بہت مصروف ہیں لیکن میری گزارش رد نہ کر سکے، پورا معاملہ سن کے رضامند ہو گئے۔ انہوں نے ضمانت قتل از گرفتاری کا مشورہ دیا ہے۔ میں اس کی ضمانت لے سکتا ہوں، کوئی بھی ضمانت۔“

یہ ایک آئی جی اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں افسر اسے دیکھ کے ہڑبڑا گئے۔ ڈاکٹر رائے نے ان سے چند لمحوں کے لیے بیٹھ جانے کی درخواست کی۔ ڈاکٹر نے اتنی دیر میں پہلی بار مجھے مخاطب کیا۔ ”تم کچھ کہنا چاہتے ہو؟“

اس نے انگیر بڑی میں مجھ سے پوچھا تھا۔ اس دوران وہ چاروں مسلسل انگریزی میں بات کرتے رہے تھے۔ کوئی جواب دینے کا مطلب تھا کہ میں نے ڈاکٹر کی بات سمجھ لی ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے انگریزی میں بولنا پڑا۔ میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”نہیں ڈاکٹر صاحب! میں کیا کہوں اب۔ سبھی کچھ تو آپ نے کہہ دیا ہے۔ اڈے بازوں سے تعلق کی وجہ سے پولیس کا مجھے کسی قدر تجربہ ہے۔ ان کے لیے خانہ پر ہی بہت اہم ہوتی ہے لیکن میں انہیں یقین دلاتا ہوں، میں اس وقت تک یہیں رہوں گا جب تک بھائی یہاں زیر علاج ہے۔ اور شہر سے جاؤں گا تو پولیس کو بتا کے۔“

میرے انگریزی بولنے پر ان تینوں کے جسم کھینچ سے گئے تھے۔ انگریزی زبان کا بھی کیا کرشمہ ہے۔ آدی کچھ اور نظر آنے لگتا ہے۔ آدی معتبر ہو جاتا ہے۔ پولیس والے تو وہ تھے ہی، مولیٰ چڑی کے سہی، آدی تو بہر حال ہوتے ہیں۔ اس گمان

میں کہ میں کچھ اخذ نہیں کر پارہا ہوں، میرے بارے میں انہوں نے بڑی ناگواری اور حقارت سے بات کی تھی۔ یقیناً انہیں اب کچھ خیالت ہوتی چاہیے۔ خیالت کے بجائے ان کے چہروں سے حریت جھٹک رہی تھی۔

”میری آپ سے التجا ہے۔“ میں نے براہ راست آئی جی کو مخاطب کیا ”پولیس کا ایک اور کام بھی ہوتا ہے۔ جن کا نقصان ہوا ہے، ازالہ ممکن نہیں تو کم از کم ان کی دل دہی، دل جوئی کرنی چاہیے۔ میں نے اکبر علی خاں صاحب کا گھر دیکھا ہے۔ ان کے بچے زیادہ بڑے نہیں، بیوی کو اپنے شوہر سے بہت محبت تھی۔ ایک بوڑھی ماں بیمار ہے۔ ان کے گھر یہ تو قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ مجھ میں وہاں جانے کی ہمت نہیں تھی، کس منہ سے ان کا سامنا کر پاؤں گا لیکن میں وہاں جانا چاہتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اجازت نہیں دی۔“ میں نے عاجزی سے تکرار کی ”میں یہیں رہوں گا جناب! اس اسپتال میں، کہیں نہیں جاؤں گا میں۔ بھائی کے ٹھیک ہو جانے پر اس شہر میں مجھے ایک اور بھی کام ہے۔ میدا کے اڈے پر اپنا چاقو واپس لینے بھی جانا ہے۔“

تینوں متلاطم سے ہو گئے۔ نوجوان افسر نے بے کلی سے پوچھا، ”تو..... تو تم وہاں جاؤ گے؟“ ”جانا ہے۔ یہ میرا اس کا وعدہ ہے۔ وعدہ تو قرض جیسا ہوتا ہے۔ کم از کم میرے لیے تو ہے۔“ ”یقیناً تم اسے تم زیر کر کے اس کے ٹھکانے پر قبضہ جمانا چاہتے ہو؟“ نوجوان افسر کی آواز تھماتے لگی تھی۔

”میں آپ کو شاید بتا چکا ہوں مجھے آگے جانا ہے، لیکن قرض چکا ہے، بس چلنا تو میں آج ہی ادھر چلا جاتا لیکن ڈاکٹر صاحب نے مجھے یہاں ایک طرح سے قید ہو جانے کا حکم دیا ہے۔“ ”بازی الٹ بھی تو سکتی ہے۔“ نوجوان افسر

نے کہا۔

”بازیوں میں ایسا ہوتا رہتا ہے۔“ میں نے بے پروائی ظاہر کی۔

”دیکھا، دیکھا آپ نے ڈاکٹر صاحب! اس کے تیور دیکھے آپ نے؟“ ادھیڑ افسر تیزی سے بولا۔

”یہ سچ بول رہا ہے۔“ ڈاکٹر نے انھی آواز میں کہا۔

وہ تینوں اٹھ گئے۔ ڈاکٹر نے بھی پھر ان سے کوئی کلام نہیں کیا، چند رسمی الوداعی فقرے ادا کرنے ضروری سمجھے اور دروازے تک ان کا ساتھ دیا۔

ان کے جانے کے بعد کمرے میں ہم دونوں تنہا رہ گئے تھے۔ چند ثانیوں تک ڈاکٹر سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ جیسے سانس استوار کرنے کی کوشش کر رہا ہو یا بہت تھک گیا ہو اور ایک وقفہ سکون لازم ہو۔ میں اس کے نزدیک گم سم کھڑا رہا۔ میری عقل میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ میں اسے کیا کہوں۔ ہر لفظ مجھے بے باہر محسوس ہوتا تھا۔ کچھ کہنے کی کوشش میں میری آنکھیں پھر آئیں۔ میں اس کے ہاتھ جو مٹا، اس کے ہیر پکڑنا چاہتا تھا۔ وہ ایک دم کھڑا ہو گیا۔ ایک نظر میری جانب دیکھا اور کمرے کچھ کہنے سے پہلے اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے حکم دیا، ”تم ایک لفظ نہیں کہو گے۔ میں نے جو کچھ کہا اور کیا، اسی کو ٹھیک سمجھتا تھا۔ اب جاؤ اپنے کمرے میں اور بھائی کو دیکھو۔“

اس نے مجھے زبان کھولنے نہیں دی اور تیز قدموں سے کمرے سے نکل گیا۔ میں دیر تک بے حس و حرکت وہیں کھڑا رہا۔

کمرے کے باہر سیورین میری منتظر تھی، بے انتہا دسری جانب نیکی اور سین میرے سامنے آ کے راستہ روک کے کھڑی ہو گئی۔ ”کیا ہوا، چلے گئے“ ”سب ٹھیک تو رہا؟“ اس نے سوالوں کی بوچھاڑ

کر دی۔

میں نے آنکھیں موند کے اور ہاتھ اٹھا کے اسے اطمینان دلانے کی کوشش کی۔

”میرا دل بہت دھڑک رہا تھا۔“ وہ پھولی ہوئی سانسوں سے بولی، ”گنگا ہے، تم ایک طویل مدت بعد قید سے رہا ہو کے آ رہے ہو۔“

”مجھے بھی کچھ سہی لگتا ہے۔“ میں نے زہر خند سے کہا۔ ”مجھے پولیس سے بہت ڈر لگتا ہے۔“

”کس کو نہیں لگتا۔ پولیس کو کبھی شاید پولیس سے ڈر لگتا ہے۔“ میں نے کہا، ”کسی رکھو، سب ٹھیک ہی رہا۔“

”شکر ہے، میں دعا سہی کر رہی تھی۔ سوچتی تھی، تمہارا آخر کیا قصور ہے۔“ وہ لڈتی آواز میں بولی۔

میں نے اس سے نہیں کہا کہ میرا قصور تو میرا وجود ہے۔ اتنی کشاکش، اتنی آزمائشوں کے بعد بھی یہ وجود اپنے ہونے پر کیوں مصر ہے۔ ہم دونوں راہ داری کا مختصر فاصلہ عبور کر کے کمرے میں آگے اور میرے قدم سیدھے نھل کی طرف نکلے۔ وہ جاگ رہا تھا میری آہٹ سے آنکھیں کل گئیں۔ مجھے دیکھ کے لبوں میں جنبش ہوئی۔ اس نے کچھ کہا تھا جو میں نہ سن سکا۔ اس نے دہرایا بھی نہیں۔ سیورین پاس ہی کھڑی تھی۔ اس نے نھل کے خم پر ڈھکی دلائی جیسی چادر درست کی، سرہانے جا کے بال سنوارے، پیشانی پر ہاتھ رکھا اور ہندستانی میں نرمی سے پوچھا، ”سر میں درد تو نہیں۔“

نھل نے ممنونیت کے انداز میں سر ہلا کے انکار کیا۔ ”کچھ چاہیے آپ کو؟“ سیورین نے شکستگی سے پوچھا۔

نھل نے اپنا ہاتھ چادر سے باہر نکالا۔ سیورین بہت ہوش مند اور مستعد لڑکی تھی۔ دوسری جانب جا کے اس نے نھل کا اٹھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ ادھر

ٹھٹھل کا دوسرا ہاتھ میں نے پٹے میں جکڑ لیا۔ نیچے پر اس کی گرفت سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کا ارادہ بغیر آدمی کیا ہے؟ ہے بھی، نہیں بھی۔ اس کی آنکھوں میں چمک بھی تیز تھی۔ سیورین آدمی انگریزی، آدمی ہندستانی میں اسے لفظی دلا سے دینے لگی۔ ٹھٹھل کے ہونٹوں پر اطمینان کی مسکراہٹ چھائی رہی۔ گھڑی دیکھ کے سیورین کے بدن میں جیسے بجلی سی بھڑکی۔ اس نے ٹھٹھل کا ہنر سرھانے سے کچھ اونچا کیا اور کے بعد دیگرے دوائیاں پلانے لگی۔ کچھ دیر بعد ٹھٹھل کے پونے بھاری ہونے لگے اور وہ جلد ہی خود سے بیگانہ ہو گیا۔ سیورین نے مجھے اس کے پاس سے ہٹ جانے کا اشارہ کیا۔ نیچے میں دبا ہوا ٹھٹھل کا ہاتھ آہستہ آہستہ میں نے جدا کیا۔ اس کی گرفت پہلے ہی کم زور پڑ چکی تھی۔ دواؤں میں یقیناً خواب آور دوا میں شامل ہوں گی یا اسے بھی اتنے ہی حوصلے کی توفیق ہو سکتی تھی مگر یہ بھی غنیمت تھا۔ گزشتہ محل کی نسبت سے تو بہت غنیمت تھا۔

سونے پر آ کے میں نے اپنے آپ سے غافل ہونے کی کوشش کی، لیکن آدمی کا اختیار اس کے پاس کس قدر ہے۔ کتنا ہی کوئی ارادے کا پختہ ہو، اس کے دل و دماغ کتنے ہی متوازن ہوں، اسے اپنے در پیچے دروازے بند کرنے کی قدرت نہیں ہے۔ میں نے نہیں پڑھا تھا، یا سنا تھا کہ آدمی کا سب سے بڑا دوست اس کا ہوش ہے اور سب بڑا دشمن بھی یہی ہوش ہے۔

دروازے پر کسی رفیق کار کی جھلک دکھائی دی تھی کہ اسے کمرے میں بلانے کے بجائے سیورین خود باہر چلی گئی۔ ٹھٹھل کمرے میں موجود تھا، لیکن بے خبر آدمی کی موجودگی ایک گمان ہے۔ میں تیار ہ گیا، اور آدمی تنہا کہاں ہوتا ہے۔ تنہائی تو ایک عددی امتیاز ہے کسی کے ساتھ دوسرا کوئی نہیں ہے، مگر آدمی ہمدردت، ہمدردی اپنے ساتھ جو ہوتا ہے۔ تنہا

آدمی اپنی ذات کے ہجوم میں گھر جاتا ہے، ایک در پیچے بند نہیں ہوتا، دوسرا کھل جاتا ہے، تیسرا، چوتھا..... اور کیسے کیسے بھولے بسرے، دور افتادہ، کیسے مٹی لوگ آ کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میرا سر دکھ رہا تھا۔ سر کیا، سارا جسم ہی کسی زخم کے مانند تھا۔ آدمی کو اپنا آیا بھی کیسا حقیر، کوڑے کا ڈھیر لگنے لگتا ہے۔ میں بہت نظریں جراتا تھا، لیکن بار بار اکبر علی خاں سامنے آ جاتے تھے، مجھ سے جیسے کوئی سوال کرتے ہوں، ان کی بیوی، ان کے بچے، ان کی بیار ماں، جنہیں میں نے نہیں دیکھا تھا، لیکن ایک ضعیف و ناتواں عورت..... ان سب کی نظریں کانٹوں کی طرح، میرے جسم میں پیوست ہوتی تھیں اور ہڑک سی سینے میں اٹھتی تھی کہ میں یہاں بیٹھا کیا کر رہا ہوں۔ کیا صرف پشیمانی، ملال اور بے بسی کا احساس اکبر علی خاں جیسے بے بہا، بے پناہ آدمی کا مول ہے۔ دست و بازو اٹھنے لگتے تھے کہ یہ کسی مصلحت کوٹی، مال اندیشی ہے کہ میں یہاں ہاتھ پیر توڑے بیٹھا ہوں۔ اکبر علی خاں یوں چلے جائیں اور مجھے معلوم ہو کہ ان کے قاتل کس سمت سے آئے تھے، وہ کون ہو سکتے ہیں۔

مجھ سے بیٹھنا نہ جا سکا تو اٹھ کے کمرے میں چکر کاٹنے لگا، اس کو نہ سے اس کو نہ تک۔ دروازہ کھلا ہوا تھا، کھڑکیاں بھی کھلی ہوئی تھیں۔ دن کی روشنی کمرے میں چھٹکی ہوئی تھی، لیکن روشنی، ہوا، کھلی کھڑکیاں، کھلے دروازے، سب کچھ آدمی کے اخذ و استنباط کی آمادگی سے مشروط ہے۔ آدمی کے اندر ہی اندر جیسا چاہا اور آدمی کا جسم ہی جس جس بنا ہو اور آدمی کو اپنا آیا ہی زہر لگ رہا ہو۔

شکر ہے سیورین جلد واپس آئی۔ اس کا چہرہ بچھا ہوا تھا۔ آ کے اس نے وہی شائستگی اختیار کی جو اس لڑکی کے حسن و جمال اور نرم اور نازکی پر مستزاد تھی۔ مجھے بتائے بغیر باہر جانے کی معذرت کی اور کہنے لگی، اس کی ریش کار دوست اسے بتانے آئی

تھی کہ انتھونی کی بیوی شیری کا بچہ اس کے پیٹ میں مر گیا ہے۔ آپریشن کر کے شیری کو بچا لیا گیا ہے، لیکن اس کی حالت نازک ہے۔ سیورین بہت اداس تھی۔ مجھ میں مزید یاسیت کی تاب نہیں تھی۔ میں خاموش رہا اور دوبارہ سونے پر آؤا۔ اکبر علی خاں کے سامنے سے انتھونی اوجھل سا ہو گیا تھا۔ وہ بھی تو اپنے گھر والوں کو بہت عزیز تھا۔ اس کی بھی بیوی تھی اور متعلقین تھے۔ مرنے والوں کے پس ماندگان اذیتیں جھیلنے کے لیے کیوں زندہ رہ جاتے ہیں۔ ایک آدمی مر جاتا ہے تو کتنے آدمی ویران ہو جاتے ہیں۔ وہ بھی مر جایا کریں تو کسی کی جدائی کسی کے لیے عذاب نہ رہے۔ کسی آدمی کے مرنے سے ایک گھر اجڑ جاتا ہے تو گھر ہی کیوں باقی رہے۔

سیورین میرے پاس آ کے بیٹھ گئی اور در تک کھولی کھولی رہی۔ مجھے وقت کا احساس نہیں تھا۔ کسی لمحے اس کی نظر گھڑی پر گئی ہوگی، یا اسے ویسے ہی خیال آیا کہ چونک کے بولی، "تم نے صبح سے کچھ کھا یا پیا نہیں ہے۔"

میں نے اپنے آپ کو سمیٹ کے کہا، "بھوک ہی نہیں ہے۔"

"تھوڑا بہت تو کچھ کھا لو۔"

میں نے بیزارگی سے انکار کر دیا۔

کل اسی وقت اکبر علی خاں کھانا لائے تھے۔ سیورین بھی شریک ہوئی تھی۔ وہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ یقیناً اسے اکبر علی خاں یاد آ رہے ہوں گے۔ آدمی کتنی جلدی محض یاد ہو جاتا ہے۔ میں سمجھ رہا تھا، میری وجہ سے وہ ان کا ذکر نہیں کر رہی ہے۔

"چائے..... کافی، یا تھوڑا سا رس..... کچھ تو لے لو....." وہ التجائی لہجے میں بولی۔

"نہیں، اس وقت کچھ نہیں۔ بس تم یہاں بیٹھی رہو۔"

"میں یہیں ہوں۔" اس نے اپنا ہاتھ میرے

ہاتھ پر رکھتے ہوئے ڈوبی آواز میں کہا، "مجھے معلوم ہے، تم پر کیا گزر رہی ہے۔ کہتے ہیں بس..... مگر کوئی کسی کا دکھ کیا بنا سکتا ہے۔"

وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی لیکن یہ بھی تو ایک بچ تھا کہ اس کی موجودگی سے مٹنے کچھ کم محسوس ہوتی تھی۔ "ایک بات پوچھوں؟" وہ آہستہ سے بولی۔

"میں نے پتلیں جھپکا کے اس کی طرف دیکھا۔"

"یہ پولیس افسروں سے تمہاری کیا بات ہوئی۔ مجھے کچھ بتاؤ۔"

"کیا بتاؤں، کچھ خاص نہیں۔"

"سنا ہے، بڑے پاگل لوگ ہوتے ہیں۔ وہ ایسے آسانی سے کسی کو نہیں چھوڑتے۔"

"میں نے جو تھا، انہیں بتا دیا تھا، لیکن وہ میری بات تسلیم نہیں کر رہے تھے۔"

"پھر تم کسے.....؟" وہ ہونٹ چبانے لگی۔

"پھر ڈاکٹر رائے نے ان سے بات کی۔"

"ڈاکٹر رائے! کیا وہ بھی وہاں موجود تھے؟"

"بعد کو آ گئے تھے اور پھر انہوں نے..... انہوں نے تو....." میری آواز رندھنے لگی۔ "کسے مشفق اور بچے آدمی ہیں وہ۔ اس وقت میں یہاں تمہارے پاس انہی کی وجہ سے بیٹھا ہوں۔"

"وہ تو ایک مکمل آدمی ہیں۔ سبھی ان کی عزت بے وجہ تو نہیں کرتے اور سبھی ان سے بے وجہ خوف نہیں کھاتے۔ وہ تو ایک مثال ہیں۔"

"کون ہوتا تھا میں ان کا؟ ایک اجنبی، ایک بیمار آدمی کا نگہبدار..... اور کیا رشتہ ہے میرا ان سے؟"

"صبح جوان سے تمہاری بات ہوئی ہے۔ تم نے ضرور نہیں سب کچھ بتا دیا ہوگا۔"

"میرے پاس چھپانے کے لیے کچھ نہیں تھا..... اور انہوں نے اسی طرح یقین کیا، جس طرح میں نے کہا تھا۔"

"وہ جہاں دیدہ آدمی ہیں۔ صرف ڈاکٹر ہی

نہیں، وہ بہت بڑے مردم شناس اور انسان دوست آدمی ہیں۔“

”وہ تو وہاں میری وکالت کرتے رہے اور میں انہیں دیکھتا رہا۔ میرے ساتھ ہر جگہ کچھ نہ کچھ ایسا ہی اندھیر ہوتا رہتا ہے، اور ایسے ہی لوگ مل جاتے ہیں۔ کس کس کا نام لوں، یہاں اکبر علی خاں مل گئے تھے اور اب..... خدا ڈاکٹر صاحب کو لہی عمر دے۔ میری عمر بھی انہیں لگ جائے۔“

”اچھے لوگوں کو اچھے لوگ مل جاتے ہیں۔“ اور اچھے لوگوں کے ساتھ اتنا برا بھی تو ہوتا رہتا ہے..... میں تمہیں کیا بتاؤں..... کیا کیا بتاؤں۔“

سیورین کے پاس کوئی جواز نہیں تھا، افسردگی سے بولی، ”کہتے ہیں، خداوند کی کوئی مصلحت ہوتی ہے۔“

”انٹونی اور اکبر علی خاں نے کسی کا کیا بگاڑا تھا۔ یہ کیسی مصلحت ہے خدا کی؟“

یہی ایک جواب ہر عاجز اور ناتواں کی سپر ہوتا ہے کہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ سیورین نے بھی ہی کہا۔

”انٹونی ان کے راستے کی رکاوٹ بن گیا تھا، لیکن اکبر علی خاں.....! صرف اتنی سی بات پر کہ تین چار دن سے وہ میرے بہت قریب ہو گئے تھے اور میں ان کتوں کے ہاتھ نہیں آ رہا تھا، انہوں نے ایک بے گناہ کو ختم کر دیا..... اور کس بات پر.....! کہ میں کسی طور پر ان کے سادھی دھنوا کی موت کا سبب بن گیا تھا لیکن وہ جانتے ہیں، میں نے اسے نہیں مارا تھا۔ اور سبب بھی میں کہاں تھا، انہوں نے ہی زیادتی کی تھی۔“

”وہ آدمی نہیں درندے معلوم ہوتے ہیں۔“

سیورین کی سے بولی۔

”ان کا انجام بھی پھر ہولناک ہونا چاہیے۔“

مجھے اپنی آواز پر قابو نہیں رہا۔ ”انہیں ایسے نہیں پھوڑنا چاہیے۔ ظالم کو اس کے انجام سے دوچار

کردینے میں تامل و تاخر بڑی اذیت، بہت بڑا اجر ہے۔“

سیورین مجھے صبر و ضبط کی تلقین کرنے لگی۔ وہ یہی کچھ کر سکتی تھی۔

وہ کیا جانتی تھی، میرا سینہ بہت جلتا ہے۔ مجھے تو ایک پل بھی کاٹنا دو بھر ہو رہا ہے۔ ”اتنا وقت نہیں ملنا چاہیے انہیں۔“ میں نے سچی ہوئی آواز میں کہا۔

”مگر تم..... تم سردست کیا کر سکتے ہو۔ شاید کچھ بھی نہیں۔“ وہ ٹھیکے لہجے میں بولی۔

اس کے غیر متوقع ترشی آمیز لہجے پر مجھے حیرانی ہوئی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ پتلیں پٹ پٹا پٹا لہجے میں اور جیسے اس نے کچھ سوا کہہ دیا ہو۔ وہ نکل سی ہو گئی..... مگر اس نے کیا غلط کہا تھا۔ مجھے تو انتظار کرنا ہے جب تک ان لاٹ صاحب کی طبیعت سازگار نہیں ہو جاتی۔ میرے پیروں میں تو

انہوں نے زنجیر ڈال رکھی ہے..... اور یہ سب کچھ ہوا بھی انہی کی وجہ سے ہے۔ نہ وہ اپنی یہ حالت بناتے نہ ہمیں اس شہر میں آنا پڑتا اور نہ یہ وقت دیکھنا پڑتا۔

”تم ٹھیک ہی کہتی ہو۔“ میں نے مایوسی سے کہا، ”لیکن میں کیا کروں اس طرح منہ چھپائے بیٹھا نہیں جا رہا۔ اکبر علی خاں کے گھر والوں کا خیال آتا ہے۔ وہ کیا سوچتے ہوں گے میں کیسا ہے جس، بے غیرت ہوں، اپنے محسن کے پڑ سے کے لیے نہیں آیا اور دوسرے لوگ..... اکبر علی خاں کے گھر پر ان کے اعزاء، احباب، پاس پڑوس والوں کا ایک انجم ہوگا۔ وہ لوگ کسی تپسی چھنگوئیاں کر رہے ہوں گے۔ انہیں بتایا گیا ہوگا کہ تین چار دن سے ایک اجنبی سے ان کی رسم و راہ بہت بڑھ گئی تھی۔ صبح و شام اسپتال جانا ان کا معمول ہو گیا تھا۔ بہت باتیں ہو رہی ہوں گی وہاں۔“

”وہاں تمہارے جانے کے بعد بھی یہی کچھ ہوگا۔“ سیورین دہلی دہلی آواز میں بولی۔

”لیکن میرا جی تو مطمئن ہو جاتا۔ اب خیال آتا ہے۔ شاید یہی بہتر تھا کہ پولیس مجھے ساتھ لے جاتی۔ پھر میرے وہاں نہ جانے کا ایک عذر تو منظور ہوتا۔“

”اوہ، نہیں نہیں۔“ سیورین بے قرار ہو گئی۔

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“

”میں خود کو بے بس، بہت حقیر محسوس کر رہا ہوں۔“

”کیوں؟“ وہ حیرانی سے بولی، پھر اس کے شانوں کی طرح اس کی آواز بھی ڈھلک گئی۔ کہنے لگی، ”برانہ مانو تو کچھ کہوں۔“

”اس سے برا کیا ہوگا جو ہو رہا ہے۔“ میں نے پشیمردگی سے کہا۔

”معاف کرنا، لگتا ہے تم اسے حواس میں نہیں ہو اور ذہنی انتشار میں بڑی اتنی سیدھی باتیں کر رہے ہو۔ تم سمجھتے ہو، تم کیا کہہ رہے ہو؟ تم اپنے بھائی کو یہاں چھوڑ کے پولیس کے ساتھ چلے جاتے تو تمہارے پاس اکبر علی خاں صاحب کی تجویز و تلقین میں شریک نہ ہونے کا ایک عذر ہو جاتا۔ یہی نا؟ تم چلے جاتے ان کے ساتھ۔ تم نے ڈاکٹر رائے کو روک دیا ہوتا کہ وہ اپنا وقت کیوں ضائع کر رہے ہیں۔ یہ تو تم اب بھی کر سکتے ہو۔ یہاں اسپتال میں بہت سے پولیس والے چوکے کر رہے ہیں۔ تم اب بھی ان کے سامنے جا کے خود کو پیش کر سکتے ہو۔“

سیورین ایک مختلف لڑکی نظر آ رہی تھی۔ اس کا چہرہ دیکر رہا تھا۔ میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

”ہم یہاں تمہارے بھائی کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ وہ پوچھے گا تو تمہاری یہاں ناموجودی کا کوئی نہ کوئی بہانہ کر دیا جائے گا۔ وہ مان لے گا تو ٹھیک ہے، نہیں تو.....“

مجھے حیرت ہوئی، اسے اس طرح کی تکلیفی زبان باتیں کرنا بھی آتی ہیں۔ میں نے زبان بند رکھی، اس لیے کہ میرے پاس تردید کے لیے کچھ

نہیں تھا۔

”ڈاکٹر رائے ایک دانش مند آدمی ہیں۔ انہوں نے ہر طرف دیکھ کے ہی پولیس سے بات کرنے، ایک اجنبی کے معاملے میں دخل اندازی کا فیصلہ کیا ہوگا۔“ سیورین کی آواز ماند پڑ گئی۔

”انہوں نے تمہارے باہر جانے پر پابندی مانگ کر دی ہے۔ ایسا پابندی جو تم کسی لمحے بھی توڑ سکتے ہو۔ یہ پابندی نہیں۔ ایک بزرگ، ایک مہربان شخص کی تاکید ہے۔ ڈاکٹر رائے کو معلوم ہے کہ شہر کی کیا حالت ہے۔ تین چار دن میں تین قتل ہو چکے ہیں اور تم کسی نہ کسی طور سے ان میں ملوث ہو۔ باہر تمہارے ذہن تمہاری تلاش میں ہیں۔ انہیں یقین ہوگا کہ تم اکبر علی خاں کے پڑ سے کے لیے ان کے گھر کا رخ ضرور کرو گے۔ ان یا گلوں کے سر پر خون سوار ہے۔ وہ تاک لگائے بیٹھے ہوں گے اور تم ان سے بچ کر اکبر علی خاں کے گھر پہنچنے کے تو وہاں موجود بے شمار تعزیرات دار تم سے کوئی باز پرس نہیں کریں گے کیا؟ وہ طرح طرح کے سوالوں سے تمہارا سینہ پھلنی کر سکتے ہیں۔ ایک دور دراز امکان یہ بھی ہے کہ اکبر علی خاں کا کوئی ذراٹی تمہیں وہاں دیکھ کے اپنے ہوش و حواس میں نہ رہے اور..... اور تم پر کوئی شبہ ہے تو جلد ہی پولیس اور دوسرے ذریعوں سے ہر کسی کو باور ہو جائے گا کہ اکبر علی خاں کی ہلاکت کے وقت تم اپنے بھائی کے پاس اسپتال میں تھے..... تم نے سوچا، ان بے در پے محسن واقعات کے بعد شہر کے لوگ تمہاری صورت دیکھنے کے لیے کتنے.....“

مخمل کو کچھ تکلیف ہوئی تھی کہ یکا یک کمرے میں کراہ جیسی اس کی آواز گونجی۔ سیورین سونے سے اٹھ کے اس کے بستر کی جانب گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے گیا۔ مخمل نے کر دت بدلنے کی کوشش کی تھی۔ سیورین نے اس کی مدد کی، سر اٹھا کے کمرے درست کیا اور جسم تھپ تھپاتے ہوئے دیر تک

بازن 199

بازن 198

گنبداری کرتی رہی۔ مٹھل غفلت میں تھا۔ اس طرف سے مطمئن ہو کہ وہ دوبارہ سونے پر آ بیٹھی اور معذرت کرنے لگی کہ اس نے اپنی حیثیت سے تجاوز کیا۔ وہ نہ جانے کیا اول نول بکتی رہی۔

”تم نے کیا..... کیا غلط کہا۔“ میں نے بیچانی لہجے میں کہا، ”مجھے تو تعجب ہے، تمہیں اتنی باتیں..... اتنی مدلل اور موثر باتیں بھی کرنی آتی ہیں۔“

میں کہہ نہ سکا اور کہنا چاہتا تھا کہ اس کے تخمینے میں مجھ سے کوتاہی ہوئی۔ اس کا کچھ کی بنی، پھولوں کی طرح نازک، ریشم کی طرح نرم لڑکی کی دانائی اور جزوبنی کا مجھے ایسا اندازہ نہیں تھا۔ وہ مجھے زیریں کی مثل لگ رہی تھی۔ کوئی کسی کے کھینٹے، کسی کے دکھ میں اس قدر سنجیدہ، اتنا شامل کہاں ہوتا ہے۔

”ایک بات بتاؤ، تمہیں اکبر علی خاں کے گھر جانے کی بے غلی ہے۔ یا ان کے قاتلوں کی سرکوبی کی؟“

مجھے جواب دینے میں الجھکا ہٹ ہوئی۔

میرے جواب کے انتظار میں اس نے چند لمحے تامل کیا اور متانت سے بولی۔ ”شاید دونوں کی..... ہوئی بھی چاہیے، لیکن یہ وجوہ نہ اس وقت اکبر علی خاں کے گھر جانا مناسب ہے نہ کسی دوسرے کام سے باہر جانا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ بس تمہارے باہر نکلنے کی دہر ہے، تم ان کے سروں پر پہنچ جاؤ گے جنہوں نے اتھوئی اور اکبر علی خاں سے ان کی زندگیاں چھین لی ہیں۔ تمہارے انتظار میں وہ سر جھکائے کھڑے ہوں گے کہ ہمیں ہمارے انجام تک پہنچاؤ.....؟ اور کیا تم اس گمان میں ہو کہ کسی اور طرف جانے کے بجائے تم سیدھے اس بد معاش کے ٹھکانے کا رخ کرو گے جس کا چاقو تمہاری جیب میں ہے اور جو شہر کے تمام شورہ پشتوں کا سرغیر ہے۔ تم اسے تخت سے اتار کے اس کی قلم رو کے حاکم بن جاؤ گے، پھر سب کچھ تمہارے زیر نگیں ہوگا اور اس کا

ہر آدمی تمہاری دست رس میں..... تمہارے پاس ایسی کوئی ضمانت ہونی چاہیے کہ وہاں پہنچنے کے بعد تم سے بہادروں اور بادشاہوں کا سلوک کیا جائے گا۔“

”لیکن میں..... میں تو یہاں موجود ہوں۔“ میں نے کئی بچی آواز میں کہا، ”ڈاکٹر رائے کی تنبیہ کے باوجود میں یہاں سے نکل سکتا تھا۔ بے شک میرے ذہن میں یہ خدشات اور اندیشے اتنے واضح نہیں تھے، لیکن تھے ضرور..... اس لیے میں نہ جا سکا میں تو اپنے دل و دماغ کی حالت، اپنی کیفیت بیان کر رہا تھا۔ مجھ پر یہ وقت بہت بھاری گزر رہا ہے۔ یہ کمراب مجھے قید خانہ سا محسوس ہوتا ہے۔“

”یہ کرب و اضطراب بڑا فطری ہے لیکن اس نظر بندی کے سوا تمہارے پاس کیا راستہ ہے۔“

سیورین دل سوزی سے بولی، ”بہادری کو دانائی سے عاری نہیں ہونا چاہیے۔ باہر جا کے تم اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو جاؤ تو اکبر علی خاں اور اتھوئی کو واپس نہیں لاسکتے۔ اس کام پائی کے بعد اور پیچیدگیاں بھی تو پیدا ہو سکتی ہیں۔ پولیس دوبارہ تمہیں ساتھ لے جا سکتی ہے اور تمہیں اندازہ ہوگا کہ اپنی جگہ پر وہ تم سے کس طرح پیش آ سکتے ہیں، پھر ڈاکٹر رائے بھی شاید کچھ نہ کر پائیں۔ اب اس قدر اپنا ذہن مغلوب نہ رکھو تو اچھا ہے۔ اس وقت تمہارے متعلق شہر میں بہت انواہیں گردش کر رہی ہوں گی۔ تم کس کس کی زبان پر تالا لگاؤ گے۔ چند دن میں بہر حال، سب کچھ آئینہ ہو جائے گا۔ پولیس بھی یوں پاؤں پیارے بیٹھی تو نہ رہے گی۔ وہیل، عدالت، قانون، انصاف سب ختم ہو گئے کیا۔ کچھ خداوند پر بھی چھوڑ دو۔ تمہارے کسی غلط قدم سے بہت کچھ غلط بھی تو ہو سکتا ہے۔ سب سے زیادہ تمہارا بھائی متاثر ہو سکتا ہے۔ وہ صحت یاب ہو رہا ہے۔ اسی پر تمہاری توجہ مرکوز رہنی چاہیے کہ تم اسی لیے یہاں، اس شہر میں آئے تھے۔ بعد کو تمہاری جو مرضی

ہو کر نینا۔ وہ چپ ہو گئی۔

سیورین کے لہجے میں بیگانگی کی رمت نے مجھے بہت آزر دہ کیا۔ "میں..... میں کہیں نہیں جا رہا۔" اسے مطمئن کرنے کے لیے میں نے پر غزم لہجے میں کہا۔

میری طرف دیکھ کے اس نے مسکرانے کی کوشش کی اور میرا ہاتھ چھینکنے لگی۔ میری آنکھوں میں پھر آنسو بھر آئے۔ سونے سے اٹھ کے وہ حاکمانہ انداز میں بولی، "میں تمہارے لیے کچھ لاتی ہوں۔ انکار مت کرنا۔ تمہی نے کہا تھا، تم کی توانائی کے لیے غذا کی ضرورت پڑتی ہے۔ کچھ ایسا ہی کہا تھا نا.....؟" یہ کہتے ہوئے وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

معمول کے خلاف دوپہر نھل کو دیکھنے کے لیے ڈاکٹر رائے کے بجائے دو اور ڈاکٹر آئے، لیکن شام کے دورے پر ڈوبتے اجالے کے کے وقت ڈاکٹر رائے ایک نوجوان ڈاکٹر اور ایک عمر رسیدہ نرس کے ساتھ کمرے میں وارد ہوا۔ وہ کچھ جگت میں معلوم ہوتا تھا، بدحواس سا۔ آتے ہی وہ سیدھا نھل کے پاس گیا اور مجھے باہر چلے جانے کی ہدایت کی۔ نھل کے معائنے کے دوران اس نے دوسری بار مجھے باہر چلے جانے کا حکم دیا تھا۔ راہ داری میں میں زیادہ دور تک نہیں گیا تھا کہ کچھ فاصلے پر دو بندوق بردار سپاہی گشت کرتے نظر آئے۔ مجھے دیکھ کے وہ چونکنے سے ہو گئے۔ میں نے سوچا کہ آزما کٹھا کچھ اور آگے جاؤں، لیکن بے کار منہ لگنے والی بات نہ ہو جائے۔ ادھر کسی وقت ڈاکٹر رائے کی طلسمی کا خیال بھی مانع رہا۔ میں نے اپنے قدم روک لیے اور فوراً ہی واپس آ گیا اور کمرے کے آس پاس راہ داری میں ٹھہرا رہا۔ یہی ہوا، کچھ دیر بعد سیورین تقریباً بھاگتی ہوئی باہر آئی اور اس نے ہاتھ ہلا کے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ کسی لمحے کی تاخیر کے بغیر میں کمرے میں داخل ہو گیا۔ سامنے کا منظر میرے لیے کسی خواب کے

مانند تھا۔ نھل بستر پر بیٹھا ہوا تھا اور ڈاکٹر رائے اس کے بہت قریب کھڑا سرگوشیاں ہی کر رہا تھا۔ نھل کبھی زیر لب، کبھی سر ہلا کے اس کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا۔ اس کی آواز پر قہقہہ طاری تھی۔ ڈاکٹر رائے نے مجھے پاس بلا لیا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے چمکنی آواز میں نھل کو مخاطب کیا، "یہ بہت ٹھیک کرتا ہے، ہم کو..... اس کے لیے تم کو جلدی ٹھیک ہو جانا ہے، سمجھا۔ نہیں تو یہ بتا رہا جائے گا۔"

نھل نے پلکیں جھپکیں، میری طرف دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں کوئی حسرت ہی انداز آئی۔ اس نے سر ہلا کے ڈاکٹر رائے کو جیسے یقین دلایا کہ وہ اپنی ہمت جمع کرنے کے لیے خود فکر مند ہے۔ "سر میں اب تکلیف تو نہیں؟" میں نے بے تابانہ پوچھا۔

نھل نے گہری سانس لے کے اور آنکھیں بند کر کے بددلتے ہوئے نئی کی۔ "بس اب تم ٹھیک ہو جاؤ گے جلد ہی۔"

ڈاکٹر رائے میرا بازو تھامے مجھے اس کے پاس سے سونے پر لے آیا۔ اس کے ساتھ آنے والے ڈاکٹر اور نرس نے سیورین کی اعانت سے نھل کا بستر بچھنے کر دیا۔

"اکبر علی خاں کی تدفین آج نہ ہو سکی۔ ڈاکٹر نے پاس بھرے لہجے میں مجھے بتایا، "اس کا بڑا بھائی حیدر آباد دکن سے آ رہا ہے۔ سنا ہے، تدفین کل کسی وقت اس کے آنے پر ہوگی۔"

میں چپ بیٹھا رہا۔ "شہر کے حالات نہایت کشیدہ ہیں۔ سارے میں سناٹا چھایا ہوا ہے۔ بد قماش لوگ اسے دوسرا رنگ دے رہے ہیں، کیوں کہ ایک عیسائی، دوسرا مسلمان قتل ہوا ہے۔ فرقہ وارانہ فساد کے اندیشے میں پولیس بڑی تعداد میں شہر میں گھوم رہی ہے۔ تم کہیں باہر نہ جانا۔ اسپتال میں بھی پولیس کی بڑی

نفری موجود ہے اور تمہارے ارد گرد وہ بہ طور خاص نگرانی کر رہے ہیں۔ آج دن بھر کچھ عجب مصروفیت رہی۔ اتفاق سے آج اسپتال میں کچھ سنگین قسم کے مریض آ گئے۔ دوپہر گھر بھی جانا نہ ہو سکا۔ نھن کی محسوس ہو رہی ہے۔ رات کو شاید آنا نہ ہو سکے۔ بھائی کے لیے ساری ہدایات میں نے ڈاکٹروں کو دے دی ہیں..... تم بھی اب آرام کرو اور اپنے ذہن پر اتنا زور مت دو۔ ہمیں بہتری کی امید رکھنی چاہیے۔" مجھے چند نصائح کرتے ہوئے اس نے کسمکسا کے کہا، "تمہارے آدمی ابھی تک نہیں پہنچے۔"

"جی!؟" میں نے واجبی احرام میں اختصار گوئی پر اکتفا کیا۔ "معلوم نہیں کیوں، اکبر علی خاں صاحب نے تار دیے تھے اور کہہ رہے تھے کہ ارجنٹ تار دیے ہیں، اور احتیاطاً ایک کے بعد دوسرا تار....."

"تم نے انہیں کیوں بلایا تھا؟" اس کی آواز روکھی تھی۔

"نہیں..... یہاں کی..... اور اپنی صورت حال دیکھ کے اکبر علی خاں صاحب نے بھی مشورہ دیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ پولیس کا کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ مجھ پر کوئی برا وقت آ سکتا ہے، سو پیش بندی کے طور پر....." میرا لہجہ غیر ارادی طور پر معذرت خواہانہ ہو گیا۔ وہ بیکاری بھر کر رہ گیا۔

"آجائیں گے پھر۔ تم نے بتایا تھا ان کا تعلق بھی..... وہ کیا کہتے ہیں....." وہ الجھ کے بولا، "اڈوں وغیرہ سے ہے۔ انہیں بھی پابند کرنا ہے نہیں..... اور ہاں، وہ دن بھر اسپتال میں رہ سکتے ہیں، رات کو انہیں کوئی اور بندوبست کرنا ہے۔"

"جی!" میں نے اسی طرح سنا جس طرح اس نے کہا تھا۔

"اور سنو! انہیں روک کے رکھنا ہے۔ وہ یہاں کوئی تماشہ نہ کریں۔ تمہاری خوش نوودی میں ان کا

ایسا خیال ہو تو اس اسپتال کا رٹھی نہ کریں۔" اس نے جھکی لہجے میں کہا۔

"جی، میں سمجھتا ہوں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

یہ ادا کام صادر کر کے وہ سونے سے اٹھ گیا اور اس نے میرے کمال پر ہلکی کی چپت رسید کر کے مسکراتے ہوئے بولا، "ہوش مبرا بنا، کوئی کارنامہ نہیں۔"

"آپ نے ہاتھ پیر بھی بانڈ دیے ہیں۔" میرے منہ سے نکل گیا۔

"ورنہ..... ورنہ تم کیا کرتے؟" وہ اچک کے بولا۔

مجھ سے کوئی جواب بن نہ ہوا۔ میں نے کلفت سے کہا، "شاید کچھ بھی نہیں۔ میں نے آپ سے وعدہ کیا ہے۔"

"ابھی لڑ کے!" وہ شایاش کے انداز میں بولا، "اور سنو! تمہیں رات کو شاید نیند نہ آئے۔"

سیورین نے مجھے بتایا ہے کہ تم نے بہت برا وقت گزارا ہے۔ کبوتو نیند کا انجشن لگاؤ..... گولیوں سے بھی کام چل جائے گا۔"

میں سر جھکا کے کھڑا رہا۔ میرے سینے پر مکا مار کے وہ کمرے سے چلا گیا۔

نرس ایلی آچکی تھی۔ آتے ہی مجھے کوئی بلا نہیں لیتا ہے، مجھے پہلو سے لگا یا اور کہنے لگی کہ صبح وہ چلی تو گئی تھی، لیکن دن بھر اسے چھین نہیں آیا۔ میری طرف دھیان لگا رہا۔ اس لیے اس نے شام کی ڈیوٹی پر آنے میں بھی جلدی کی۔

سیورین کو اب گھر جانا تھا، لیکن نرسوں کے لیے مخصوص پیوستہ کمرے میں لباس تبدیل کر کے وہ واپس آ گئی اور میرے پاس بیٹھ گئی۔ وہ گھر کا لباس پہنے ہوئے تھی اور گھر کی کوئی لڑکی لگ رہی تھی، اچلی اجلی، صاف شفاف، ہر میلی شرمیلی اور اداس اداس۔ لباس کی تبدیلی سے بھی آدمی کیا سے کیا

ہو جاتا ہے۔ اس لباس میں اسے دکھ کے کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کسی اسپتال میں ایک تربیت یافتہ ماہر نرس کا کام کرتی ہے۔ ہلکی نیلی رنگت کی ساڑھی میں اس کا ترشا ہوا سراپا نمایاں ہو گیا تھا۔ سر سے گردن تک لٹھے ہوئے اسی رنگت کے اسکارف میں چہرہ کچھ اور کھل اٹھا تھا۔ اسے تو اس اسپتال کے بجائے کہیں اور ہونا چاہیے تھا، کسی محل دو محلے میں..... ایسی کسی کام سے باہر گئی تھی کہ وہ سرسرائی آواز میں بولی، ”میں رات کو رگ بھی سکتی ہوں۔“

میں نے بے دلی سے کہا، ”مگر تمہیں..... تمہیں گھر جانا چاہیے۔“

”گھر کھلوایا جاسکتا ہے، کبھی کبھی ایسا ہوتا رہتا ہے۔“

”مگر ایسی تو یہاں موجود ہے، تم بے آرام ہوگی۔“

”گھر میں آرام کہاں ہوگا۔“ وہ آہ بھر کے بولی۔

”کیوں؟“ مجھے تردد ہوا۔ ”کوئی الجھن؟“

”نہیں نہیں آئے گی۔“

”ہاں!“ میں نے مایوسی سے کہا۔ ”ان حالات میں نیند کیسے آسکتی ہے مگر تم..... تم تو خود مجھے ہدایات دے رہی تھیں۔“

”لیکن اب لگتا ہے، میرے حالات تم سے مختلف نہیں۔“

”تم یہاں رکنا چاہتی ہو؟“ میں نے سادگی سے پوچھا۔

”مجھیں اگر ضرورت محسوس ہوتی ہو۔“ وہ جھجک کے بولی۔

”میں تو کسی نہ کسی طرح وقت کاٹ ہی لوں گا، کاٹنا ہی ہے۔ چونکہ آدی کو زندہ تو رہنا ہی ہوتا ہے، اپنے لیے نہیں تو دوسروں کے لیے۔“

”اور شاید دوسروں کے لیے زندہ رہنا ہی

زندگی ہے۔“ اس نے جلتی بجھتی نگاہ سے مجھ دیکھا اور اٹھ گئی۔

”جاری ہو۔“ میں نے اسے ٹوکا۔ ”کہیں تم میری نگرانی کے لیے تو.....؟ یہ ایسی بھی بڑی چوکی دار ہے، اور میں کہاں جاؤں گا۔“

”تمہارا ہی خیال تھا۔“ اس نے ہنستی آواز میں کہا۔

”میں ٹھیک رہوں گا۔ تم اپنا خیال رکھنا۔“ وہ دروازے سے نکلا چاہتی تھی، میں نے کہا کہ میرے کپڑے شکستہ ہو گئے ہیں اور ہونٹ میں سارا سامان ہے۔

وہ رک گئی اور سوچ میں ڈوب گئی۔ ”اور سننے کپڑے اتنی جلد تیار نہیں ہو سکتے۔ ہونٹ میں کسی آدی کو تمہارا خط، تمہارا اجازت نامہ دے کے بھیجا جائے تو.....“

”ہونٹ والے انکار کر دیں گے۔“

”پھر تو ایک ہی صورت ہے۔“ وہ رک رک کر بولی، ”کچھ دیر کے لیے تمہیں برابر کے زسوں والے کمرے میں بیٹھنا ہوگا۔ وہ کمرہ اچھا، صاف ستھرا ہے۔ اسپتال میں کئی دھوئی ہیں، جتنی جلد ممکن ہو سکے گا، وہ کپڑے دھو دیں گے۔ بس یہی ہے کہ بارش نہ ہو اور کپڑے سوکنے میں وقت نہ لگے۔“

”جو تم مناسب سمجھو، کپڑے تو تبدیل ہونے چاہئیں۔ مجھے الجھن ہونے لگی ہے ان کپڑوں سے.....“

اس نے سر سے پیریک ایک طائرانہ نگاہ مجھ پر ڈالی۔ ”اسے ملے تو نہیں ہوئے ہیں ابھی۔ پھر ایک طریقہ اور بھی ہے۔ میں ابھی تمہیں بتاؤں۔“

ڈاکٹروں کے دورے کے بعد تم مریضوں والے کپڑے پہن لو، پھر یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ میں یہ کپڑے گھر جا کے دھو دوں گی۔ رات بھر میں سوکھ ہی جائیں گے۔ استری کر کے صبح جلد سے جلد یہاں آ جاؤں گی۔“

”ارے نہیں۔“ مجھے ہنسی آ گئی۔ ”تم کپڑے دھوؤ گی؟“

”مجھے کبھی اپنے بھی دھوتی ہوں۔“

”نہیں نہیں۔“

”میں سنجیدہ ہوں۔ مجھے خوشی ہوگی۔“

”اور مجھے اچھا نہیں لگے گا۔“

”کیوں اچھا نہیں لگے گا؟“

”بس نہیں۔“ میں نے سر جھٹک کے کہا۔

”اس میں کیا برائی ہے؟“ وہ ناراض سی نظر آنے لگی۔ ”تمہارا کام کر کے مجھے خوشی ہوگی۔“

”میں سمجھتا ہوں۔ لیکن.....“ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ انکار کے لیے کیا اندر پیش کروں۔

”ٹھیک ہے، تم اچھا نہیں سمجھتے تو ٹھیک ہے۔ پھر کوئی آدی بھیج کے ہونٹ کے کسی کارندے کو یہاں بلا لو۔ وہ تم سے مل کے تسلی کر لے گا تو آسانی ہو جائیگی۔ بہ ہر حال، اب تو رات ہو چکی ہے، صبح ہی کچھ ممکن ہے۔ کل دیکھیں گے پھر، مگر کل کوئی انتظام نہ ہو سکا تو تمہیں وہی کرنا ہے جو میں اب کہہ رہی ہوں۔“

پہلے برابر والے کمرے تک جا کے اس نے دروازے پر ٹھوکا دیا۔ اندر سے ایسی کی آواز آئی۔ چند ثانیوں بعد وہ باہر آ گئی۔ اس نے جھٹلاتے ہوئے سیورین کو بتایا کہ شائے پر اسپتال کی وردی کی سیون نکلی گئی تھی۔ کمرے میں دوسرا لباس موجود نہیں تھا۔ اسپتال کے لباس خانے سے منگوانے میں دیر لگتی۔ اسے خود ہی سینا پڑا۔ ڈاکٹر رائے کی کہیں نظر پڑ جاتی تو قیامت آ جاتی۔ ایسی کو شائبہ بخیز کہہ کے سیورین بوجھل قدموں سے میرے ساتھ چلتی رہی، پھر کچھ دور جا کے اس نے مجھے واپس ہو جانے کا اشارہ کیا اور دو جا قدم آگے جا کے لوٹ آئی۔

”صبح تمہارے..... لیے کچھ بنا کے لاؤں؟“ وہ اشتیاق سے بولی، ”زیادہ تو نہیں، ایک دو چیزیں جیسی تمہیں بنانی آتی ہیں مجھے بھی۔“

”جو تم بہتر سمجھو، آنا۔“ میں نے اس کی دل بستگی کے لیے کہا۔ ”مجھے یقین ہے، تم نہیں چیزیں ہی بناتی ہوگی کیوں کہ تم خود بہت نصیب بہت اچھی ہو۔“

اس کے رخسار کچھ اور گلزار ہو گئے اور وہ ہاتھ بلاتی ہوئی ربا داری سے دور ہو گئی۔

رات کے دورے پر ڈاکٹر رائے کے بجائے دو ڈاکٹر ہنسل کے معائنے کے لیے آئے اور اطمینان کا اظہار کر کے جلد ہی چلے گئے۔ ایسی کے کہنے پر ایک بار پھر مجھے کمرے سے باہر جانا پڑا۔ اب یہ معمول ہو چکا تھا۔ اس دوران یقیناً ایسی نے ہنسل کے لیے نرس کی ذمے داریاں نبھائی ہوں گی۔ میں کرسی ڈال کے دروازے کے باہر بیٹھا رہا۔

آسمان پر بادل بکھرے ہوئے تھے، بلکہ اور گاڑھے بادلوں کی ٹکڑیاں۔ ہوا نم تھی اور کسی قدر سردی سے آلودہ۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ خاموشی میں انتظار کا اضطراب شدید ہو جاتا ہے اور میرے پاس انتظار کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔

انتظار شاید سب سے بڑی مصروفیت اور بے بڑی اذیت ہے..... اور میں کیا..... ہر شخص ہر وقت کسی نہ کسی انتظار سے دوچار رہتا ہے۔ چھوٹے بڑے انتظار، کسی کے آنے، کسی کی بازیابی، کسی کے صحت مند ہو جانے کا انتظار، کل کا، برسوں، ہفتوں، مہینوں اور برسوں کا انتظار..... یہ ایک دلت کی کئی انتظار زندگی کا بیش تر حصہ اسی انتظار کی نذر ہو جاتا ہے۔ زندگی مختصر ہوا کرتی تو انتظار کے مراحل بھی کم ہو جاتے۔

کچھ ایسی بے سرو پائی باتیں میرے دماغ میں گردش کر رہی تھیں کہ ایسی نے مجھے اندر بلا لیا۔ وہ ہنسل کو ہلکی پھلکی غذا میں اور کڑوی کیسیلی دو بائس کھلا اور بلا پھلکی تھی۔ ایسی کو باتیں کرنی خوب آتی تھیں۔ کہنے لگی ”اک مریض بھٹک چکی ہوں، دوسرے سے

اب نمٹنا ہے اور یہ دوسرا بہت نٹ کھٹ ہے۔" ایسی سرابا شفقت، سرتاپا تپاک تھی۔ چہرے مہرے سے تند خو، اندر رس گھلا، ہوم بھر ہوا تھا۔

کمرے کے دروازے، کھڑکیوں کی چٹنیاں اس نے چڑھا دی تھیں۔ پردے بھی گرا دیے تھے، صرف چھت سے ملتی روشن دانوں سے تازہ ہوا کی آمد ممکن رہی تھی۔ اسے خدشہ ہوگا کہ اس رات آنے والے حملہ آور دوبارہ کمرے میں نقب لگانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ حالاں کہ اسے معلوم تھا کہ اب کسی مشکوک آدمی کا اسپتال میں داخلہ ناممکن ہے۔ اسپتال پولیس نے گھیر رکھا ہے۔ رات گئے تک وہ مجھ سے باتیں کرتی رہی، شہر کے حالات اور طرح طرح کی افواہوں کے بارے میں بتاتی رہی۔ مجھے سلمانے کے لیے گزشتہ رات کی طرح وہ میرے سرھانے بیٹھنے کے میرے بالوں میں اپنی موسی انگلیوں سے جیسے کھی پھیرتی رہی اور مجھے اکی یا بدلاتی رہی۔ کئی بھی سرسہلانے اور دبانے میں بڑی ماہر تھی، اور نیساں! نیساں تو کمال کرتی ہے۔

ایک مجھے ہمت اور حوصلے کی تعلیم دے رہی تھی اور خود باہر ذرا سی آہٹ پر چونک جاتی تھی۔ میں نے اسے سو جانے کا تاثر دیا، کچھ اس خیال سے بھی کہ وہ کمر ٹیک لے۔ جانے کس وقت وہ دبے قدموں میرے پاس سے اٹھی کہ مجھے احساس ہی نہ ہو سکا۔ شاید کسی وقت میری آنکھ لگ گئی تھی۔ صبح سویرے اسپتال میں خاصی چہل پہل ہو جاتی تھی۔ سبزے کی کثرت کی وجہ سے پرندوں کی بہتات تھی۔ منہ اندھیرے وہ صبح کی آمد کی نوید سنادیتے تھے۔ منہ ہاتھ دھو کے میں باہر آیا تو آٹھ بج رہے تھے۔ ایسی نے چائے منگوائی تھی۔ ہم دونوں چائے پی رہے تھے کہ کھلے دروازے پر دستک ہوئی۔ چائے ادھوری چھوڑ کے ایسی فوراً آٹھ گئی۔ باوردی سپاہی کی جھلک پر میں بھی بیٹھنا نہ رہ سکا اور اندر دروازے کے پاس جا کے ٹھہر گیا۔

"کا..... کا بات ہے؟" ایسی نے کڑکتی آواز میں پوچھا۔

"کچھ نہیں مام۔" سپاہی نے کترائے لہجے میں میرے بارے میں تصدیق چاہی کہ رات کو میں کمرے ہی میں رہا ہوں۔

"ادھری اور کاں۔" ایسی نے ترخ کے جواب دیا، "تم، تم کیوں پوچھتا ہے؟"

"بس مام، ہم کو اتنا ہی پتا کرنا تھا؟"

"پر کیوں؟ ایسا کا بات ہے؟"

سپاہی نے سرگوشی میں ایسی کو کچھ بتایا۔ ایسی کی سکاڑی نکل گئی۔ "نہیں نہیں، کا بولتا ہے تم؟"

سپاہی زیادہ دیر نہیں ٹھہرا۔ اس نے بھی اپنی آنکھوں سے نیچے کمرے میں دو کچھ کے اطمینان کر لیا تھا۔ ایسی بڑبڑاتی ہوئی میرے پاس آئی اور ہوتی

آواز میں بتانے لگی کہ صبح جس وقت لوگ نماز کے لیے گھر سے نکلے، انہوں نے اس باغیچے میں، اس جگہ جہاں کل اکبر علی خاں کی لاش دیکھی تھی، تین لاشیں پڑی ہوئی دیکھی ہیں۔ سپاہی کو پولیس کے

صدر دفتر کے حکم پر رات اسپتال میں میری موجودی کی تصدیق کے لیے بھیجا گیا تھا۔

میرا ہنسنے کے لیے سن ہو گیا۔

"یہ کیا ہوا میرے بچے؟" ایسی کی آواز سننا رہی تھی۔

میں کیا جواب دیتا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے یہاں؟" وہ سرا سبگی سے بولی۔

"کیا کہا جا سکتا ہے۔" میں نے یہ مشکل کہا، "سپاہی اور کیا بتا رہا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"اور کچھ نہیں، بس یہی کچھ....."

ایسی کا چہرہ اتر گیا تھا۔ میرا حال بھی کچھ اسی جیسا تھا۔ ایسی سوال پر سوال کیے جا رہی تھی جیسے میں وہاں موجود رہا تھا۔ "میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" میں نے اسے جھڑک دیا اور دوسرے ہی لمحے نیچے

غدا مت ہوئی۔ میں نے اپنے لہجے پر معذرت چاہی۔

"نانا، ایسی کوئی بات نہیں۔ تمہیں کیا معلوم۔

میں ہی پاگل ہو رہی ہوں۔" وہ مہربان عورت فرخ دلی سے بولی۔ "میں باہر جا کے سن کن لینے کی کوشش کرتی ہوں۔ ہو سکتا ہے، خبر ہی غلط ہو۔" ایسی بہت

ہراساں نظر آتی تھی۔

جتنی دیر وہ باہر رہی، میں تانے بانے ملانے کی ننگ دو کرتا رہا۔ ایسی چند منٹ بعد مایوس واپس آ گئی۔ وہ بار بار دہائیاں دینے کے انداز میں ہاتھ پھیلاتی اور سینے پر صلیب کا نشان بناتی رہی۔ میں نے بھی کئی مرتبہ باہر نکلنے کے دیکھا۔ اسپتال کے

عام ملازموں کے سوا مجھے کوئی ایسا آدمی دکھائی نہیں دیا جس سے کچھ معلوم کیا جا سکتا۔

ٹھیک ساڑھے نو بجے ڈاکٹر رائے کمرے میں داخل ہوا۔ میری توقع کے مطابق وہ بہت مشتعل رہا تھا۔ اپنے ساتھی ڈاکٹر کوٹھل کے بستر کی طرف

جانے کا اشارہ کر کے وہ سیدھا میرے پاس آیا۔

"تم نے کچھ سنا؟" اس نے سٹہنی آواز میں پوچھا۔

"ہاں، کچھ سنا ہے ایسی کی زبان سے۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ اس دوران میں نے اپنے

اعصاب پر قابو پایا تھا۔

"کیا..... کیا سنا ہے؟"

میں نے اسے صبح آٹھ بجے کے قریب آنے والے سپاہی کے بارے میں بتایا۔

"ٹھیک ہے، تم سے بات ہوتی ہے ابھی۔" یہ کہہ کے وہ کوٹھل کے پاس چلا گیا۔ کشمکش کی اس

حالت میں بھی اسے اپنے کام سے علاقتہ تھا۔ لوگ صبح کھتے ہیں، عہدہ و منصب، علم و فضل اور مال و زر اپنی جگہ، آدمی کی عزت و مرتبت تو اس کی انسان

دوستی اور فرض شناس سے ملے ہوتی ہے۔ ڈاکٹر رائے کی ہدایت سے پہلے میں خود ہی باہر چلا گیا۔ مجھے جاتا دیکھ کے اس نے بلند آواز میں مخاطب

کیا، "دور کہیں مت جانا۔"

میں دور کہاں جاتا، وہیں دروازے کے پاس دربان بنا بیٹھا رہا۔ اچھا ہوا جو مجھے اس کے ٹمکڑے

سوالوں کی جواب دہی کے لیے فزولوا استوار کرنے کا موقع مل گیا۔ اس نے کوٹھل کے معائنے میں اپنا

وقت لیا۔ وہ باہر آیا تو معاون ڈاکٹر ساتھ نہیں تھا۔ اس کی بے روی میں راہ داری سے گزر کے مرکزی

عمارت تک چلا آیا۔ تیز قدموں سے وہ ایک بڑے آراستہ و پیراستہ کمرے میں داخل ہو گیا۔

دروازے پر اس کے نام کی تختی آڑھاں تھی۔ جب تک وہ کرسی پر بیٹھ نہیں گیا اور مجھے اس نے بیٹھ جانے کی اجازت نہیں دی، میں کھڑا رہا۔ جگ سے

گلاس بھر پانی بھر کے اور ایک گھونٹ لے کے اس نے معتدل لہجے میں پوچھا، "تم کیا سمجھتے ہو؟"

"آپ کیا سمجھتے ہیں؟" میرے لیے شاید یہی مناسب تھا کہ اپنی رائے کے اظہار میں محتاط رہوں۔

"میں..... میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پایا ہوں، لیکن ایک بات سمجھ میں آئی ہے۔ ٹھیک اسکی تمام پر

لاشیں چھٹکانے والے یہ باور کرنا چاہتے ہیں کہ انہوں نے اکبر علی خاں کے قاتل ختم کر دیے ہیں۔"

"جی، یہی کچھ سمجھ میں آتا ہے۔" میں نے دھیمی آواز میں تائید کی۔

"تم بھی اسی نتیجے پر پہنچے ہو؟" وہ بے تاب سے بولا۔

"لیکن کیا اکبر علی خاں کے قاتل وہی تھے؟"

"یہ دوسری بات ہے۔" وہ دکھائی سے بولا، "میں نے صرف یہ کہا کہ کوئی کچھ باور کرنا چاہتا ہے۔"

"یعنی اکبر علی خاں کے قاتل دوسرے تھے اور ان قاتلوں کو انجام تک پہنچانے والے دوسرے وہ

جانتے تھے کہ قاتل کون لوگ ہیں۔ جس معاملے کی تفتیش میں پولیس بری طرح سرکھپاری ہے۔ باور

کرانے والے لوگ اس کی حقیقت سے آشنا تھے۔“
 ”تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“ اس نے تجسس سے
 پوچھا۔

میں نے تمام لحاظ دمروت سے کہا۔ ”دونوں
 کے درمیان کوئی تعلق ضرور تھا۔“
 ”یعنی دونوں ایک ہیں؟“ ڈاکٹر نے حیرانی
 ظاہر کی۔

”دونوں ایک دوسرے سے واقف ہیں۔“
 میں نے کہا۔
 ڈاکٹر کے ہونٹ باہر نکل آئے۔ ”تمہارا قیاس
 درست معلوم ہوتا ہے۔“ وہ سر ہلا کے بولا۔
 ”اور آپ نے غور کیا، وہ کسے یہ باور کرانا
 چاہتے ہیں؟“

”ہاں۔“ اس نے تذبذب سے دہرایا۔ ”وہ
 کسے یہ باور کرانا چاہتے ہیں، اکبر علی خاں کے گھر
 والوں کو کہ وہ بری طرح متاثر ہوئے ہیں، شہر والوں
 کو کہ وہ شدید خوف دہراس میں مبتلا ہیں۔ ویلیوں
 کی انجمن کو، جو کل سے داویلا کر رہی ہے، انہوں
 نے کل عدالت میں کام بھی بند کر دیا تھا۔ لا کالج کے
 ان طلبہ کو، جو اپنے بہترین استاد سے محروم ہو گئے
 ہیں۔ کل دن بھر وہ مظاہرے کرتے رہے۔ ان کا
 مطالبہ ہے جب تک قاتل پکڑے نہیں جا میں گے،
 وہ کلاسوں میں واپس نہیں آئیں گے۔ اور پولیس کو
 کہ وہ سخت بوکھلائی ہوئی ہے، جگہ جگہ چھاپے مار رہی
 ہے اور کوئی سراغ نہیں مل رہا ہے؟“

”اور کیا اب ان تین آدمیوں کے خون سے
 اکبر علی خاں کے دکھ کا ازالہ ہو جائے گا؟ شہری،
 وکیل، طلبہ سکون کا سانس لیں گے اور پولیس کو کوئی
 سرا مل جائے گا؟“

ڈاکٹر رائے کچھ سوچتا رہا، پھر مضطرب ہو کے
 بولا، ”گلتا ہے، تم کچھ جانتے ہو؟“
 ”ہاں شاید۔“ میں نے تامل سے اقرار کیا۔
 ”میں سمجھنے سے قاصر ہوں۔“

”آپ نے توجہ نہیں دی، حالاں کہ آپ
 ڈاکٹری کے علاوہ زندگی کے دیگر معاملات میں بھی
 اتنے ہی شامل ہیں۔ دیدہ ریزی، نکتہ بینی میں
 طاق۔ مجھے اس کا تجربہ ہو چکا ہے۔“ میرا مقصد
 مطلق اس کی خوشامد نہیں تھا۔ یہ تو اظہار واقعہ تھا،
 لیکن میرے اعتراف میں سلسلے کا پہلو بہر حال نکلتا
 تھا۔

شکر ہے اس نے میری نیت پہ شبہ نہیں کیا اور
 وہی ہوا۔ اس جہاں شناس، دور اندیش نے مجھے
 مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔ ”نصیرو!“ وہ ہاتھ اٹھا
 کے بولا، ”تم ٹھیک سمجھ رہے ہو۔ وہ صرف تمہیں
 باور کرانا چاہتے ہیں۔ یہی تا؟“

پھر مجھے نامتقنی کی تشریح کی ضرورت نہ رہی۔
 اسے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں دیر نہیں لگی کہ میدا اور اس
 کے خاص مقرب ہی اتنا خوشی، اتنا منظم اور بڑا قدم
 اٹھا سکتے تھے۔ انہوں نے ان تین آدمیوں کو بھیٹ
 چڑھا دیا جو اصل میں انہی کے اڈے سے وابستہ
 تھے اور دھنسا سے زیادہ قرب رکھتے تھے۔

اس رات جب مسلح حملہ آور میری جستجو
 میں اسپتال آئے تھے تو میں نے صبح اکبر علی خاں سے
 کہا تھا کہ وہ میدا کی حمایت یافتہ آدمی نہیں ہونے
 چاہئیں، وہ میدا سے برگشتہ دھنسا کے ہم نفس، ہم
 جاں ہی ہو سکتے ہیں۔ انہیں بہت قلق ہو گا کہ اڈے
 پر آ جانے کے باوجود میدا نے اتنی آسانی سے مجھے
 جانے کیوں دیا۔ گو میدا نے اڈے کے استاد کی
 حیثیت سے دھنسا کے زخمی ہو جانے کی اطلاع پر اپنی
 ذمے داری اچھی طرح نبھائی تھی۔ اس نے میرے
 لیے سارے راستے بند کر دیے تھے۔ وہ تو خود میں
 نے اس کے اڈے پہنچنے کے، دانستہ اس کے بے شمار
 آدمیوں کے زخمی میں جا کے توفیق کے خلاف
 اڈے کی چوکی کا دعوا کر دیا۔ پھر تو بات ہی دوسری
 ہو گئی تھی۔ میدا کو اپنی عمل داری سے دست بردار
 ہو جانے کا اندیشہ لاحق ہو گیا۔

میدیا کے پختہ کار ساتھی میں نے دیکھے تھے۔ میرا قصہ پاک کر دینے کے لیے وہ مسلح آدمی اسپتال بھیجے گا تا مقبول مشورہ نہیں دے سکتے تھے۔ اگرچہ میڈیا کی عین خواہش یہی ہوگی، میڈیا کا عندیہ لیے بغیر اسپتال آنے والے حملہ آور کام یاب ہو جاتے تو میڈیا انہیں پگلوں پر بٹھاتا لیکن وہ ناکام ہو گئے تھے اور ان کے ہاتھوں اسپتال کے ایک ملازم کا خون ہو جانے سے معاملہ اور سنگین ہو گیا تھا۔ میڈیا کے اڈے پر میرے جانے کی ساری روداد پولیس کے علم میں ہوئی۔ پولیس کے مخبر بھی اڈوں پر موجود ہوتے ہیں۔

پہلی بار شہر کے سب سے بڑے اسپتال میں ڈاکوؤں کی طرح کچھ لوگ گھس آئے تھے۔ اسپتال ڈاکا ڈالنے کی جگہ نہیں ہوتی۔ ایک ڈرا سی عرق ریزی سے پولیس کو اسپتال میں موجود اس شخص تک پہنچ جانا چاہیے تھا جو میڈیا سے مبارزت کے لیے اس کے اڈے گیا تھا اور مبارزت ملتوی ہو گئی تھی۔ سو مراسم کی مروت اپنی جگہ، پولیس نے سب سے پہلے میڈیا کے اڈے کی راہ لی ہوگی اور میڈیا نے صاف انکار کر دیا ہوگا۔ میڈیا کو گرفت میں لینے کے لیے پولیس کے پاس کوئی واضح ثبوت نہیں تھا اور میڈیا ان سے دور ہی کتنا تھا، ارادے کی دوری پر۔ کسی وقت بھی اس کے سر پہ آدھک سکتے تھے۔

امکان یہی ہے کہ پولیس کے تیور دیکھنے کے بعد میڈیا نے دھنوا کے ماتم گساروں کو سرزنش کی ہوگی۔ ہو سکتا ہے انہیں اڈے سے خارج کر دیا ہو یا کسی بڑے عتاب کی دھمکی دی ہو۔ پہلی ناکامی سے دھنوا کے دل برداشتہ ساتھی ادھر میڈیا کی سرد مہری، اس کے غیظ و غضب، ادھر دھنوا کی جدائی کے صدمے سے ایسے بے حال، ایسے اندھے ہوئے کہ انہوں نے سارا تہرا اکبر علی خاں، ایک بے قصور پر اتار کے دھنوا کے قرض کا بوجھ کسی طور کچھ کم کیا اور مجھے موت سے بڑی سزا سے دو چار کیا۔ وہ اپنے

مقصد میں کسی حد تک ضرور کامیاب ہوئے۔ ڈاکوؤں نے وقفے وقفے سے ٹھونٹ بھر پانی پیتا رہا اور چپ رہا۔ کل صبح اکبر علی خاں کی خبر سننے کے بعد جب وہ مجھے کسی ساتھی ڈاکو کے کمرے میں لے گیا تھا، میں نے بدوجہ اس سے کچھ ڈھکا چھپا نہیں رکھا تھا۔ وہ سارا کچھ اس کے ذہن میں تازہ ہوگا جو اسے مزید کسی صراحت کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ ”مگر یہ خود میڈیا کے لیے کوئی بہت محفوظ اور مفید فیصلہ نہیں لگتا۔“ ڈاکو نے بھن بھنائی آواز میں کہا۔

”میڈیا کو مختلف ذریعوں سے معلوم ہوتا رہا ہوگا کہ میں اپنا جا تو واپس لینے کے لیے اس کے اڈے پر آنے کا مقصد ارادہ کیے ہوئے ہوں۔ آپ کو یاد ہوگا، اسی شام دو پولیس افسر یہاں اسپتال میں میرے پاس آئے تھے۔“

”ہاں، ہاں یاد ہے۔“ ڈاکو نے ڈکا جی لہجے میں کہا ”اور میرے استفسار پر تم نے کچھ بات بنا دی تھی یا یوں کہو کہ شہلادیا تھا۔“

”مجھے یہی کرنا چاہیے تھا، اس لیے کہ آپ اس وقت اس سلسلے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔“ میرا عذر اس نے تسلیم کیا کیوں کہ وہ ایک متوازن آدمی تھا۔ ”تم کیا کہہ رہے تھے!“ اس نے بے صبری سے مجھے ٹوکا۔

”اس شام آنے والے پولیس افسروں نے میری جرات کی بڑی داد دی تھی۔ انہوں نے میڈیا کے لیے اپنی نفرت کا اظہار کیا اور مغفلات سنائیں۔ کہہ رہے تھے کہ پہلی مرتبہ کوئی رستم سہراب میڈیا کے سامنے آیا ہے۔ انہوں نے در پردہ مجھے ہر طرح کے تعاون کا یقین دلایا۔ اس تعاون کے بدل میں رشوت طلبی کا ایک اشارہ واضح تھا۔ وہ مایوس نہیں لوٹے میں نے انہیں.....“

”تم نے انہیں رشوت دی؟“ میری بات پوری ہونے سے پہلے اس کا لہجہ اکھڑ گیا۔

”میں نے کنایا اپنی آسودگی اور کشادہ دلی کا گداز دیا۔“

”تم نے انہیں کوئی نقدی وغیرہ تو نہیں دی؟“ ”نقدی دینے سے مراد ہونی کہ میڈیا کے اڈے پر جا کے میں نے بے اساس دعوے کیے ہیں، لیکن پہلے اگر کوئی شہتہ تو اب کچھ یقین ہونے لگا ہے، وہ پولیس والے میڈیا ہی کے فرستادہ نہ ہوں۔ میڈیا نے انہیں میرے ارادے کی چھینکی کے لیے بھیجا ہو۔

مبارزت ملتوی کرنے کی تجویز میری نہیں تھی، میڈیا کے ایک عمر رسیدہ ساتھی کی تجویز تھی یہ..... اور میڈیا نے بے ظاہر بہا کر اسے قبول کیا تھا۔ یہ حقیقت میڈیا کے دل پر فاش ہوگی کہ وہ میری تجویز نہیں تھی۔ جو شخص اسی وقت جا تو آزمائی کرنے اور ادھر یا ادھر فیصلہ ہو جانے پر تمل گیا ہو، اس کا محرور اثر میڈیا اور اس کے ساتھیوں کے حواس و اعصاب پر بری طرح طاری ہونا چاہیے۔ مبارزت ٹل جانے اور اڈے سے میرے جانے کے بعد میری حرکات اور عزائم کا بھی منسلک جائزہ لیتے رہنا ان کے لیے ضروری ہو گیا تھا۔ میڈیا مجھ سے مبارزت کے لیے قطعاً آمادہ نہیں تھا کہ اسے اپنا نوشتہ صاف نظر آ رہا ہوگا۔

مبارزت کے التوا کی اس مدت میں اسے میرے لیے تپاک اور فراخ دلی کی ارزانی کرنی چاہیے تھی۔

کچھ اسی طرح مبارزت کے لیے میرے عزائم میں نرمی آسکتی تھی، مگر دھنوا کے جفا کار اندازوں نے سب کچھ دہر دہر پر ہم کر دیا۔ اب ان سے کچھ بعید نہیں تھا کہ آگے وہ بیسی بیسی دھنواؤں اور شوروشوں کے مرتکب ہوں۔ ابھی پہلے سامنے کی گفتیش شروع ہوئی تھی کہ ایک اور سانحہ ہو گیا۔ انتھونی کی موت اتفاق تھی کہ وہ ناکام لوٹ جانے والوں کے آڑے آ گیا تھا۔ پولیس کے لیے یہ اتنا گھبر معاملہ نہیں تھا لیکن اکبر علی خاں..... وہ کئی عیشیتوں سے ایک ممتاز آدمی تھے۔ ان کے خون کے بعد تو میڈیا کے اڈے سے پرانی رسم درواہ کی پاس داری اب پولیس کے بس

میں نہیں رہی تھی۔“

ڈاکوؤں نے خاموشی شکاری۔ مجھے گمان ہوا، کہیں میرے قیاس اور اتنا تازے ہڈیاں کی شکل تو اختیار نہیں کر رہے۔ مخاطب کی خاموشی بھی بہت ہلکان کرنی ہے۔ خصوصاً ایسے وقت جب کوئی اپنی عرض گزار میں اس قدر شامل ہو۔ میں نے بے کلی سے ڈاکو کو دیکھا۔

اسے بھی احساس ہوا اور اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا، ”تم چپ کیوں ہو گئے؟“ ”مجھے گمان ہوا، آپ تمہیں اور ہیں۔“ میں نے صاف گوئی اختیار کی۔

”نہیں نہیں، میں توجہ سے کن رہا ہوں۔ تم کیسی منطقی باتیں کر رہے ہو، سب کچھ آئینہ کر دیا ہے تم نے۔“

مجھے اپنی بات جاری رکھنے میں مشکل پیش آئی۔ میں نے جھجک کے کہا، ”میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ اڈے کی چونکی وراثت میں نہیں ملتی۔ استاد اپنی طاقت کے بل پر چونکی کے منصب کا سزاوار ہوتا ہے اور اس وقت تک اس منصب پر قائم رہتا ہے جب تک اس میں کس بل ہے اور وہ اپنے آدمیوں کی حفاظت کرنے کے قابل ہے۔ وہ مطلق العنان نہیں ہوتا، اڈے کی روایتوں پر عمل پیرا رہتا ہے۔ دھنوا کے سرکش ساتھیوں نے میڈیا کو کھین کا نہ چھوڑا تھا، بڑی آزمائش میں ڈال دیا تھا انہوں نے اڈے کے استاد کو۔ استاد کی ساکھ پر ضرب پڑ رہی تھی۔ اس طرف پولیس نے اس کا تامل بند کر رکھا ہوگا، دوسری طرف، اکبر علی خاں کی ہلاکت پر میرے اشتعال، غم اور غصے کا شدت سے احساس ہوگا اسے۔ اس نازک موقع پر اس کے بی خواہ ناخین نے ایک ہی مشورہ دیا ہوگا کہ بعد کو کئی بد صورت حال کا سامنا کرنے سے بڑے بے کوش بندی کر لی جائے۔ سردست تو مجھے یہ باور کرانا لازم ہے کہ اکبر علی خاں کے خون میں میڈیا کا کوئی ہاتھ نہیں ہے،

جن کا ہاتھ تھا، ان کی سرکونی کر دی گئی ہے۔ اس طرح میدا نے میری خوش نوڈی کے علاوہ پولیس کو منتشر کرنے، معاملات پیچیدہ کرنے کی بھی کوشش کی اور دھنوا کے ساتھیوں کی بے دردی و بے داد گری پر بھی بند باندھ دیا۔

ڈاکٹر تادیر گم بیٹھا رہا اور یکا یک اس کے جسم میں لہری اٹھی۔ ”پھر اب..... اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“

”ہم کیا کر سکتے ہیں؟“ میں نے پھینکی آواز میں کہا۔

”ہمیں پولیس سے بات کرنی چاہیے۔“

”میری طرف سے پولیس نے بے شک اطمینان کر لیا ہے کہ میں مستقل اسپتال میں ہوں۔ پولیس کی نظریں ایک ہی سمت جانی ہوں گی، لیکن کیا آپ سمجھتے ہیں، میدا کو اس کا اندازہ نہیں ہوگا کہ پولیس اس کے ٹھکانے کا راستہ پکڑے گی اور اسے اس دشوار گزار مرحلے سے نمٹنا ہوگا۔ میدا نے سارا کام نہایت سلیقے سے کیا ہوگا۔ ایسے کام خود نہیں کیے جاتے ڈاکٹر صاحب! ارد گرد اور دور دور کے دوستوں سے اعانت کی درخواست کی جانی ہے، مال و ذرا تھا کے، کچھ نایدہ لوگوں سے بھی۔ میدا نے گزشتہ رات، ممکن ہے بھرے کی کسی محفل میں گزاری ہو یا اپنے ہی اڈے پر تمام ساتھیوں کے ساتھ کوئی محفل برپا کی ہو۔ قمار بازی کی بزم آرائی کا ڈھونگ رچا یا ہو۔ چشم دید گواہان پولیس کو یہ یقین دلانے کے لیے موجود ہوں گے کہ میدا بہ تمام و کمال ان کے درمیان جان محفل تھا۔“

”تو ہم تماشا دیکھتے رہیں؟“ ڈاکٹر درشتی سے بولا۔

”ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔“

”گویا ہم.....“ وہ زنج ساہو کے رہ گیا۔

”ابھی یہیں بات کہاں ختم ہوئی ہے۔“

”کیا..... اب کیا؟“ اس نے جھلا کے پوچھا۔

”میرا خیال ہے، آج یا کل میدا یا اس کے قریب ترین معتمد کو یہاں آنا چاہیے۔“

ڈاکٹر رائے ایک نکلے کے لیے بدحواس ہوا۔

”کیا..... کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”میں صرف امکان کی بات کر رہا ہوں۔“

”مگر میدا یہاں کیوں آئے گا؟“ ڈاکٹر نے میرا قیاس مبالغے پر معمول کیا۔ اس کے چہرے کی شکنیں گہری ہو گئیں۔

”پہلے ایک راستہ صاف کرنا چاہیے۔ بعد کو اور راستے اور منزلیں اتنی کھن نہیں ہوں گی۔“

”تمہارے لہجے کے تین تین پر مجھے حیرت ہے۔ اگر تم جیسا کہہ رہے ہو تو میں..... میں اس منظر پر موجود رہنا چاہوں گا۔“

”آپ کے لیے مناسب نہیں ہوگا، گو میری خواہش بھی یہی ہے۔“

”نہیں، تم مجھے مطلع کرو گے۔“ اس نے حتی اور حکم لہجے میں کہا، ”میں جہاں کہیں بھی ہوں۔“

”آپ کو تیار رہنا ہوگا، کسی دقت کے لیے بھی آپ ہی نے یہ ساری صورت حال بدلی ہے۔“

”میں نے؟“ ڈاکٹر کی آواز پھڑ پھڑا کر رہ گئی۔

”ڈاکٹر صاحب! کل پولیس کی آمد پر آپ دخل اندازی نہ کرتے اور پولیس مجھے ساتھ لے جاتی تو ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ میدا کو پھر اتنی غلت پیش نہیں آتی۔ ان تین آدمیوں کو شاید کچھ دن اور زندگی مل جاتی۔ بہت کچھ اس پر منحصر تھا کہ پولیس کتنے دن مجھے روکے رکھتی ہے اور مجھ سے کس طرح کا سلوک کرتی ہے۔“

ڈاکٹر رائے نے گہری سانس بھری۔ اس کی نظریں میرے چہرے پر منڈلاتی رہیں۔ چند لمحوں وہ بعد کرسی سے اٹھ گیا۔

سیورین آچکی تھی لیکن ابھی موجود تھی۔ میں تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ سب ٹھیک تو ہے میرے

”بچے؟“ ابھی ہاتھ پھیلا کے میری جانب لپکی اور مجھے سینے سے لگا لیا۔

”سب ٹھیک ہی ہے۔“ میں نے اداسی سے کہا۔

”ڈاکٹر رائے تمہیں ساتھ لے گئے تھے؟“

”انہی کی حاضری میں تھا۔“

”پولیس تو نہیں آئی تھی؟“ وہ پریشانی سے بولی، ”کوئی نئی خبر.....؟“

”ابھی تو دن پڑا ہے۔“ میں نے زہر خند سے کہا۔

”خداوند سب ٹھیک کرے۔“ ابھی ہلکتے لہجے میں بولی، ”سیورین آچکی تھی مگر مجھے تمہاری فکر لگی ہوئی تھی اس لیے رکی رہی..... اچھا چھوڑو، دیکھو ایہ سیورین تمہارے لیے کیسا خوب صورت ناشتا لے کے آئی ہے۔“

سیورین پاس ہی کھڑی تھی۔ اس نے ڈیوٹی والا لباس پہن لیا تھا۔ کچھ بھی کھانے پینے کوئی نہیں چاہ رہا تھا، لیکن انکار کا عمل نہیں تھا۔ سیورین نے انگریزی طرز کا ناشتا بنایا تھا۔ شنگ سیوے کے ریڑوں سے ڈھکا ہوا اٹھے کا حلو، انڈوں کی آمیزش سے بنے ہوئے ٹکیوں ٹوسٹ۔ چپاتی جیسے نلے نلے پرائے۔ آلو، منڈ اور گاجر کی سبزی، ان کی اصل رنگت پکانے سے تبدیل نہیں ہوئی تھی اور تازہ مکی سبزیوں سے بھری سٹری اور پھلوں کا رس۔

”یہ ناشتا ہے؟“ میں نے کہا، ”اور یہ سارا تم نے بنایا ہے؟“

”نہیں، آئی بھی ساتھ تھی۔“ سیورین کے لہجے میں حسرت نمایاں تھی کہ میں اس کی تعریف کروں۔ ناشتا واقعی بہت لطیف اور خوش ذائقہ تھا۔

کچھ سیورین کی دل دہی عزیز تھی، کچھ ناشتے کی اپنی خوبی، انہیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ ابھی نے اپنے ہاتھ سے چچا پھر حلو ایڑی شفقت سے میری جانب بڑھایا۔ میں نے اسی اشتیاق اور احترام سے

منہ میں رکھا جس کی اسے توقع تھی۔ یہ عورتیں کیسی دل نواز تھیں۔ میرا دل بھر آیا۔ میری ان کی شناسائی کو وقت ہی کتنا ہوا تھا۔ لطف و عنایت کی اس فراوانی پر آدمی خود کو کیسا بے بس محسوس کرتا ہے کہ وہ نہ تو اس کا مستوجب ہے، نہ اسے بے زری باری اتارنے کی استطاعت ہے، اور جو مسافر ہو، جسے اس جگہ ٹھیکرنا ہی نہ ہو۔ میں ان کے لیے کیسا عارضی رفیق تھا۔ آج نہیں تو کل مجھے چلے جانا ہے اور شاید لوٹ کے بھی آنا بھی نہ ہو۔

میری پیشانی چوم کے ابھی رخصت ہو گئی۔ سیورین کو تین آدمیوں کے قتل کی خبر مل چکی تھی۔ وہ مجھ سے ڈاکٹر رائے کے انداز میں باز پرس کرتی رہی اور میں اس کی ہیبت، اس کا غبار دور کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ ڈاکٹر رائے کی اطلاع کے مطابق آج اکبر علی خاں کی تدفین ہو جانی تھی۔ حیدرآباد سے پٹنہ کا فاصلہ کم نہیں ہے۔ شام تک کہیں ان کا بڑا بھائی پہنچ پائے گا۔ کیا طرکی تھی کہ میں آخری مرتبہ اپنے محسن، اپنے مہی کا چہرہ بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں ان کے جنازے کو کندھا دینے کی توفیق نہیں رکھتا تھا۔ اکبر علی خاں کا خیال آتے ہی ان کا سارا گھر سامنے آ جاتا تھا اور جیسے میرا وجود زمین میں دھسنے لگتا تھا۔

دوپہر کے دورے پر ڈاکٹر رائے تین چار ڈاکٹروں اور نرسوں کے ساتھ ٹھکل کو دیکھنے آ گیا تھا۔ اس وقت ٹھکل کی حالت خاصی بہتر نظر آ رہی تھی۔ انہوں نے اسے بٹھا دیا اور اتنے دنوں بعد بستر سے اٹھا کے کمرے کے فرش پر قدم رکھوانے چاہے۔ وہ بہت احتیاط سے کام لے رہے تھے۔ ٹھکل کا جسم ایک لمبے کے لیے ڈمگایا مگر پھر اس نے مضبوطی سے قدم زمین پر جمالے۔ دونو جوان ڈاکٹر اسے کاندھوں سے پکڑے ہوئے تھے۔ چند قدم چلانے کے بعد ڈاکٹر رائے نے پوچھا کہ اس کا سر بھاری تو نہیں ہو رہا یا اس کے سر میں دھک تو

نہیں ہو رہی۔ ہٹھل کے انکار پر اس نے چٹکی بجا کے خوشی کا اظہار کیا۔ سونے تک ڈاکٹر، ہٹھل کو لے آئے اور وہاں چلا کے انہوں نے دوبارہ اسے بستر پر بٹھا دیا۔ انہوں نے ہٹھل سے بہت کم بات کی اور لگتا تھا ہٹھل خود بھی زیادہ بات کرنے سے گریزاں ہے۔ وہ کچھ مدبوش سا لگ رہا تھا۔ میں تو ایک کونے میں گنگ کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ یقین ہی نہیں آ رہا تھا، ڈاکٹر رائے نے ہٹھل سے نمٹ کے میرے کانہ سے پر ہاتھ رکھا تو میں اچھل پڑا۔ وہ مسکرانے لگا۔ میں نے بے اختیار اس کے ہاتھ تمام کے آنکھوں سے لگا لیے۔ میرے آنسوؤں سے اس کے ہاتھ بھگ گئے۔ وہ مجھے ہچکاتا رہا، پھر اس نے مجھے پہلو میں سمجھ لیا۔ میں اس سے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ لفظ ہی کھو گئے تھے۔ مجھے چھوڑ کے وہ اپنے ساتھی ڈاکٹروں اور نرسوں کے ہم راہ باہر نکل گیا۔

چار بج چکے تھے۔ میں پاؤں پھیلائے سونے پر نیم جان سا، بے حس و حرکت بیٹھا ہوا تھا۔ سیورین کہیں باہر گئی، گھبرائی ہوئی میرے پاس آئی اور اس نے بتایا کہ اسپتال کی مرکزی عمارت سے آنے والا ایک کارندہ چند مہمانوں کی اطلاع دینے آیا ہے اور میری اجازت کے لیے باہر کھڑا ہے۔

میں خود ہی اٹھ کے دروازے پر چلا گیا۔ اسپتال کی وردی میں وہ ایک پختہ عمر آدمی تھا۔ اسی لمحے خیال آیا، کھلتے سے کوئی نہ آ گیا ہو۔ جمرو، جامو، زور کا نام لینے پر اس نے انکار میں گردن ہلا دی اور کہنے لگا: "آئے والے مہمان لوگ میں سے ایک ہی تھیں نے اپنا نام بتایا ہے اور ان کا نام میدا صاحب ہے۔"

"میدا.....؟" میرے منہ میں جیسے ریت بھر گئی۔

"اسی نام بولت ہیں صاب۔ ساتھ میں دو اور لوگ بھی ہیں۔" کارندے نے مؤذبانہ کہا۔

مجھے اس سے کچھ کہنے میں دیر لگی۔ میدا کے نام پر سیورین کی آنکھیں پھٹ گئی تھیں اور اس نے میرا بازو زور سے دبوچ لیا تھا۔ کارندہ جو اب کے انتظار میں تھا۔ میں نے خود کو سمجھایا اور گھٹی ہوئی آواز میں اسے ہدایت کی کہ ڈاکٹر رائے جہاں کہیں بھی ہوں، انہیں یہاں آنے کے لیے کہا جائے اور میدا کو اس وقت تک مرکزی عمارت میں روکے رکھا جائے جب تک ڈاکٹر رائے میرے پاس نہ پہنچ جائیں۔ میں نے سیورین کو کمرے کے آگے کے سبزہ زار میں کرسیاں لگوانے کی تاکید کی۔

"وہ..... وہ کیوں آیا ہے؟" کارندہ ابھی قریب ہی تھا کہ سیورین ہلبلائی آواز میں بولی۔ "اسے آنا تھا۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"اسے آنا تھا، مگر کیوں؟" "یہی ایک راستہ رہ گیا تھا اس کے پاس۔" "کیا مطلب؟"

"سارے سوال اس وقت نہ کرو تو پتر ہے۔" "تمہیں اس سے نہیں ملنا چاہیے۔" "وہ ملے بغیر نہیں جائے گا۔"

"مگر وہ..... وہ کیوں آیا ہے۔ اب کیا رہ گیا ہے کچھ کہنے سننے کو۔"

"دیکھتے ہیں۔" اس کے سکون کے لیے میں نے بہ ظاہر بے پروائی سے کہا، "یہ تو اس سے ملنے کے بعد ہی معلوم ہوگا، لیکن تمہیں..... تمہیں یہ کیا ہو گیا ہے؟ تم ایک موصولہ مند لڑکی ہو، تم پر اس قدر دہشت کیوں چھائی ہے؟"

"معلوم نہیں، مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔" میں نے اسے مصروف رکھنے کے لیے کسی آدمی کو بلا کے سبزہ زار پر کرسیاں لگوانے کا کام یاد دلادیا۔ وہ بولائی ہوئی یہ بگلت راہ داری میں ایک طرف مڑ گئی۔ کمرے میں جا کے میں نے ایک نظر ہٹھل کو دیکھا پھر اپنے آپ کو۔ ناشتے کے دوران سیورین نے کپڑوں کی طرف اشارہ کیا تھا کہ کیا

میں دو تین گھنٹے کے لیے مریضوں کا لباس پہننے کے حق کمرے میں بند ہو جانے کو تیار ہوں۔ میں نے منع کر دیا تھا۔ کپڑے شکستہ ہو گئے تھے، لیکن ایسے میلے نہیں ہوئے تھے اور میدا کے سامنے تو کسی بھی لباس میں جایا جاسکتا تھا۔

دس پندرہ منٹ سے زیادہ وقت نہیں گزرا ہوگا کہ ڈاکٹر رائے آ گیا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت بھری ہوئی تھی اور وہ نو جوانوں کی طرح سرگرم لگ رہا تھا۔ "وہ آگے ہیں؟" اس کی آواز گھٹتی رہی تھی۔ "تم ان سے میرا تعارف نہ کرانا۔" "وہ آپ کو جانتے نہیں ہوں گے کیا۔ شہر میں آپ کو کون نہیں جانتا۔"

"ضروری نہیں۔ جاننا اور چیز ہے، پہچاننا اور۔"

ادھر سیورین نے آ کے سبزہ زار میں کرسیاں لگ جانے کی اطلاع دی، ادھر اسپتال کا ملازم میدا کے پہنچ جانے کی خبر دینے آیا۔ ڈاکٹر اور میں نے ایک دوسرے کو فکر مندانہ نگاہوں سے دیکھا، دوسرے لمحے ہم باہر آ گئے۔

وہ تین تھے، ایک وہی عمر آدمی، جس کا نام شاید بر جو تھا، درمیان میں دوسرا میدا، اور تیسرا ابھی عمر میں خاصا پختہ تھا۔ میں نے اسے اڈے کی چوکی پر میدا کے قریب دیکھا تھا۔ وہ کرسیوں پر بیٹھ چکے تھے، ہمیں آنا دیکھ کے کھڑے ہو گئے۔ تینوں کے چہروں پر سنجیدگی کا غلبہ تھا۔ راہ داری سے چند قدم چل کے ایک فاصلے پر ہم ان کے سامنے رک گئے۔

انہوں نے سلام کے لیے سرسری انداز میں ہاتھ اٹھا کے چھوڑ دیے۔ ہم نے بیٹھ جانے کو نہیں کہا۔ انہوں نے ہماری اجازت ضروری نہیں سمجھی۔ ہمیں بیٹھنا دیکھ کے کرسیاں سنھال لیں۔ چند لمحے سنسنائی خاموشی رہی۔ شاید ڈاکٹر رائے کی موجودگی انہیں کلک رہی تھی۔ ان کی آسانی کے لیے میں نے ہی پھل کی۔ "کیا بات ہے؟" میں نے سپاٹ لہجہ

میں کہا۔ "میدا نے عمر رسیدہ بر جو پر نظر کی۔ بر جو کی آنکھیں زمین میں گڑی ہوئی تھیں۔ کبلا تے ہوئے اس نے زبان کھولی، "ہم کو تمہارے سے جروردی بات کرنی ہے۔"

"اب کیا بات کرنی ہے؟" میں نے تلخی سے کہا۔

"ہم کو پتا ہے، ہمارے یوں کے واسطے کچھ نہیں ہے۔ ہم کو زیادہ بات بھی تا ہیں کرنی۔"

"میرے ہٹھلے پھول گئے۔" "یو لو پڑا!" "ہم تمہارا کولوٹو لے کو آئے ہیں۔" میدا سٹھی ہوئی آواز میں بولا۔

یہ کہتے ہی اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کے چاقو نکال لیا۔ مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ دوسرے لمحے وہ میری جانب اچھال دے گا۔ اپنے ذہنی ظہان میں اس کا ہاتھ او اچھا گھٹ گیا تھا۔ جیسے ہی اس نے ہاتھ بلند کیا، مجھے اس کی کوتاہی کا احساس ہوا۔ میں کرسی پر ہٹھا رہتا ہوا چاقو ڈاکٹر رائے کے دائیں جانب فرش پر گرنا اور کوئی ایسی عداوت کی بات نہ ہوتی۔ کرسی پر نیم ایستادہ ہو کے اور ہاتھ بڑھا کے چاقو اچکنے کا عمل مجھ سے غیر ارادی طور پر رز ہوا۔ میرا چاقو اب بہ ہر حال میری گرفت میں تھا۔ "یہ کیا ہے؟" میں نے ناگواری سے کہا۔

"اڈا اب تمہا ہے استاد! تمہارے ہی کو دیکھنا ہوگا۔"

"پر ایسا کیسے۔" "تم ہی ادھر اڈے پر بولے تھے، اڈے کی ریت ہے، چوکی پر بیٹھا استاد آئی نیچے کو آ جاوے تو....." بر جو اٹھی زبان سے بولا "استاد میدا کو اب تم سے نیچہ تا ہیں لڑانا۔"

"کیوں نہیں لڑانا۔" میرا منہ بن گیا۔ "جو ہوا، اس کے بعد باگل تا ہیں۔" تیسرے آدمی نے تپتی ہوئی آواز میں کہا، "اوحرام چا دے

”ہمارا چاکو ترے پاس ہے۔ اسی سے ہماری گدن اتار دیو۔“ میدا بھڑک کے بولا، ”کوئی اور سجاترے من میں ہوتو بولو۔“

”ایسا کر سکتے تو ذرا در نہیں لگتی استاد! پر اس سے بھی تسلی نہیں ہوگی اپنی۔“ میری آواز گرجنے لگی تھی۔ اسے سامنے دیکھ کے ہی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ کہنے کو بہت سی باتیں سینہ جلا رہی تھیں۔ اب وہ میرا چاقو واپس کرنے آ گیا تھا اور اپنا چاقو طلب نہ کرنے کا مطلب واضح تھا کہ اب اس کے پاس نجات کی ایک ہی صورت رہ گئی ہے۔ پہلی مرتبہ چاقو بدلنے کے حیلے سے مبارزت مکمل ہوئی تھی اور بعد کو درمیان کی کوئی راہ نکل آنے کی امید کی جاسکتی تھی، لیکن اب اکبر علی خاں کی ہلاکت کے نتیجے میں اڈے پر میری واپسی یعنی ہوئی تھی اور پھر یہی ایک تدبیر عقل و ہوش کے قریں تھی، چاقو سے میدا کی دست برداری۔

وہ اس حقیقت سے آشا ہو چکا تھا کہ اڈے پر میرے احوال کے بیان میں کوئی کھوٹ نہیں تھی۔ میرا بھائی واقعی اسپتال میں ہے۔ جو شخص اپنے بھائی کے لیے خود کو داد پر لگانے آجائے، وہ اپنے بھئی اکبر علی خاں کا خون ہو جانے پر کیا کچھ کر گزر سکتا ہے۔ مجھے اس کے اڈے پر توکل صحیح ہی اکبر علی خاں کے سامنے کی خبر مل جانے پر پہنچ جانا چاہیے تھا۔ میرے نہ پہنچ پانے کی وجہ بھی اسے معلوم ہوگی۔ سو میرے پاس آنے کے لیے یہی وقت مناسب تھا کہ اسپتال میں بیمار بھائی کی زنجیر میرے پیروں میں پڑی تھی۔ تین آدمیوں کو ختم کر کے اس نے اپنی دانست میں زمی کا ایک گوشہ ڈھونڈ لیا تھا۔ یہی کچھ صبح میں ڈاکٹر رائے سے کہا تھا کہ آج بالکل کسی وقت میدا کو یہاں آنا چاہیے۔

میں خاموش رہا۔ میں نے میدا سے نہیں کہا کہ جب ان تین آدمیوں نے اسپتال میں گھس جانے کا

بہت اندھیار کیے۔ کتے کے پلے اسپتال کا جوان آدمی مار دیے، پھر وکیل صاحب کو۔ وکیل صاحب بے چارے کا کا دوش تھا۔ ادھر ایسا کبھی ناہیں ہوا۔ ڈاکٹر صاحب یہاں بیٹھتے ہیں۔ انہی سے پوچھ لیو، ایسا کبھی ہوا ادھر کا؟ کیوں ڈاکٹر صاحب، مانی باپ!“ اس نے ڈاکٹر رائے سے ہاتھ جوڑ کے پوچھا۔

ڈاکٹر رائے کا چہرہ سرخ ہو گیا۔
ڈاکٹر کی خاموشی اس نے تائید جانی، چلچلاتی آواز میں کہنے لگا، ”اداپنے اڈے کے ادمن تھے۔ ہمرے ہی سے بندھے تھے رنڈی کے جنے، ہمرے پر سچے داری آوت ہے انھاں کی۔ میدا استاد نے اسی کارن اڈا چھوڑن کا بھیسلا کیا ہے۔ اب ترے ہی کو اڈا دیکھنا ہے۔ میدا استاد اب اسی سہری سے چلا جاوے گا، پر ادھر تھوڑی پولیس سے منہ ماری کرن کے باد۔“

”ہم کو ما بھی دیو استاد!“ برجونے ندامت زدہ لہجے میں لہم دیا، ”ہم اور کا بولیں۔“

”میں جانتا ہوں۔ اکبر علی خاں کو تم نے نہیں ختم کیا ہے۔ ان تینوں ہی نے کیا ہوگا۔ ان کی یہی سزا ہوئی چاہیے تھی جو انہیں مل چکی ہے، لیکن یہ تو بہت کم ہے۔“

”کم ہے، جانت ہیں، بہت کتی ہے۔“ برجونے بولا، ”اسی کارن میدا استاد ترے پاس۔“

”اسی کارن میدا استاد اپنی سزا سنانے کے لیے ہمارے پاس آیا ہے ہاں! میں نے برجونے بات کاٹ کے دھتکارنی آواز میں کہا، ”ٹھیک ہے، میدا کو اب اڈے پر نہیں رہنا چاہیے۔ اڈے کا جو استاد اپنے کتوں کے گلے میں پٹا ڈال کے نہیں رکھ سکتا، اڈے کے آخری آدمی تک جس کی نظر نہیں جاتی، اسے چوکی سے اتر ہی جانا چاہیے، لیکن میدا نے اپنی سزا آپ ہی کیسے طے کرنی۔ اس شہر سے راج پاٹ چلا جائے گا تو دوسرے شہر میں جا کے میدا ہنسی بجائے

حوصلہ کیا تھا اور انھونی مارا گیا تھا، میدا گلے دن صبح ان پر بچندا ڈال دیتا تو نڈا کیر علی خاں جانتے ندوہ تینوں۔ میدا کو میرے جواب کی آگہی ہوگی اور میرے پاس اس کے سوا جواب بھی کیا تھا کہ اس کا چاقو واپس کر کے اسے اپنے دل و دماغ سے حرف غلطی کی طرح مٹا دوں۔ ٹھٹھل کی صحت یابی تک مجھے خود کو روک رکھنا تھا، چاہے درون خانہ کیسا ہی تلاطم برپا ہو اور کیسا ہی خون گھولتا ہو۔ میرے پاس اسے ٹھوٹھو کریں مارنے، اس کا گریبان پکڑ کے لہو لہان کر دینے، اس کا خون پینے کی گنجائش کہاں تھی۔ اس سے حاصل بھی کیا ہوتا۔ وہ دونوں، انھونی اور اکبر علی خاں تو چاچکے تھے۔ انہیں واپس لانا میرے اختیار میں تھا نہ میدا کے۔ ادھر بھل بستر یہ تھا۔ کہتے ہیں، گل اور برداشت سب سے بڑا انسانی وصف ہے۔ ہر گل جبری ہوتا ہے اور ہر برداشت ہوش مند ہی ہوتی ہے۔ مجھے اسی وظیفے پر تکیہ کرنا چاہیے تھا۔

میدا کو اپنا وزن کرنا آتا ہوگا۔ وہ اپنے بدن پر چڑھتی چربی سے خوب واقف ہوگا، لیکن یہ بھی ایک اتفاق ہے۔ اتنے بڑے اڈے پر اس جیسے زور کا کوئی اور آدمی موجود نہیں تھا۔ ہوتا تو میدا ہی کیوں راجا بنا بیٹھا ہوتا۔ میدا کے چوکی سے اتر جانے کے بعد اڈے کی ریت کے مطابق بھی کو اڈے کی ذمہ داری سنبھالنی چاہیے تھی، کیوں کہ میں ہی ایک دعوے دار بہت عرصے بعد سامنے آیا تھا۔ دوسرا کوئی دعوے دار نظر نہیں آتا تھا۔ ہو بھی جاتا ہے تو چاقو آزمائی میرے اس کے درمیان ہی ہو سکتی ہے اور اس کے لیے میرا اڈے پر موجود ہونا ضروری ہے۔ میدا نے دست بردار ہو کے اڈے کی ریم بھادی ہے۔ مجھے آج میدا کی آمد کی توقع تھی اور آمد کے منتظر کی بھی..... تو اپنا رد عمل میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اپنا جواب تیار رکھنے کے لیے مجھے خاصا وقت مل گیا تھا۔

اس دوران ڈاکٹر رائے کی نظر میں مسلسل مجھے اپنے چہرے پر چھٹی محسوس ہوتی رہی تھیں۔

”ٹھیک ہے۔“ میں نے بے مہری سے کہا، ”مگر میں اس وقت اڈا نہیں سنبھال سکتا۔ وجہ تمہیں معلوم ہے۔ اس وقت اڈے پر تم سے یہی بات ہوتی تھی کہ بھائی کے ٹھیک ہو جانے پر جب مجھے سہولت ہوگی، میں اپنا چاقو لینے آ جاؤں گا۔“

”ہاں استاد، یاد ہے ہمارے کو پورا۔“ معمر برجو نے سینے پر ہاتھ رکھ کے جلدی سے اقرار کیا۔ ”پر..... پر.....“

میں نے اسے روک دیا۔ ”یاد ہے تو اچھا ہے۔ جس مجبوری سے اس شہر اور تمہارے اڈے پر آنا پڑا تھا، وہ ابھی تک ہے۔ بھائی اسپتال میں ہے۔“

”تم مانو، یا مانو استاد۔“ تیسرا آدمی گل کے بولا، ”ایک کارن یہ بھی تھا چاکو بدلی کا.....“

”ہند۔“ میں نے اسے جھڑک دیا، ”اس بات کو جانے دو۔ کارن اچھی طرح تمہیں معلوم ہے، مجھے بھی..... اور اتنا بھی کہ تمہیں ہمارے بھائی سے کتنی دل چسپی ہو سکتی ہے۔“

تینوں یہ یک وقت کچھ بولنا چاہتے تھے لیکن تینوں نے ایک ساتھ خاموش رہنے کا فیصلہ کیا۔

”اب سنو!“ میں نے اونچی آواز میں کہا، ”اڈے کی ایک اور ریت بھی ہے۔ اڈے کا استاد کسی وجہ سے چوکی پر نہ بیٹھ سکے تو اپنی جگہ کوئی بھی آدمی چوکی کے لیے چن سکتا ہے۔ تم لوگ یہ ریت جانتے ہو یا اسے بھی جتانے کی ضرورت ہے؟“

”جانت ہیں استاد۔“ برجو کے لہجے میں کساد آ گیا۔ ”تھوڑی بہت جان کاری ہے اپنے کو بھی..... تم بولو۔“

”پھر کچھ مدت کے لیے میدا استاد یا برجو دادا اڈا سنبھالیں یا کوئی اور جسے تم لوگ یہ تر تھکتے ہو۔ بھائی کی طبیعت ٹھیک ہونے پر مجھے اسے گھر لے جانا

ہے۔ اسے گھر چھوڑ کے بھی لوٹنا ہو سکتا ہے اپنا۔“ وہ بہت سے ہو گئے اور برجو جیسے پہلے ہوش آیا۔ عاجزی سے بولا، ”اب تم چانو استاد، اڈا اپنا ہیں تمہارے۔“

”مجھے نہیں لگتا، میدا جیسا کوئی اور آدمی اڈا سنبھال سکتا ہے۔ میرے لوٹ آنے تک میدا کو چوکی پر بیٹھے رہنا ہے۔“

حالاں کہ میری جانب سے اسی ایک جواب کی توقع انہیں بھی ہونی چاہیے تھی مگر شاید وہ کچھ اور قیاس کر رہے ہوں۔ ان کے چہروں کا رنگ بدل گیا تھا۔

”اب ہماری تاہیں لگائے گا ہوں۔“ میدا نے غلٹکی سے کہا۔

ادھر برجو بھجک کے بولا، ”اور میدا استاد اڈے کے سارے اذمن سے بدائی لے کے آیا ہے۔ او سب نئے استاد کے سوا گت کے واسطے اسپتال کے بہری کھڑے ہیں۔“

”ادھر اسپتال کے باہر؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”اب جو بولنا ہے، ایک بار ادھری جا کے انھال کے سامنے بول دیو استاد! وہ سارے اسپتال کے بھیترا ہیں آسکت تھے۔ ہم لوگن کو بھی بھیترا آنے میں بہت جو ٹھم ہوا۔“

”مجھے ان کے پاس جانا ہے؟ نہیں نہیں۔“

”اب وہ ترے اڈے کے اذمن ہیں۔“

”لیکن میں ابھی اڈا نہیں سنبھال رہا ہوں۔“

”اسی بات کو جرا انھال کے سامنے بول دیو۔“ برجو نے لجاجت سے کہا، ”جروری ہے استاد!“

مفرکی کوئی صورت نہیں تھی۔ میں نے متوش نظر دوں سے ڈاکٹر رائے کی طرف دیکھا۔ اسے یہ سارا کچھ بہت نیا اور انوکھا لگ رہا ہوگا اور وہ آگے کا تماشہ دیکھنے کا بھی مشتاق ہوگا۔ میں نے مزید پیش نہیں مناسب نہیں سمجھا اور ڈاکٹر رائے کو اشارہ

کر کے کرسی سے اٹھ پڑا۔ خاص کمروں کے اس حصے سے صدر دروازے کا فاصلہ خاصا تھا۔ ڈاکٹر رائے سے میں نے رک جانے کی درخواست کی تھی۔ وہ نہیں مانا تو میں نے اصرار بھی نہیں کیا۔ بہ ہر حال، ایک نہایت متبرگواہ بھی ہم راہ تھا۔ جہاں جہاں سے ہم گزرتے رہے، ڈاکٹر رائے کو ہمارے ساتھ دیکھ کے راستے میں ملنے والے ڈاکٹروں، نرسوں، اسپتال کے دیگر ملازموں اور سپاہیوں کے جسم تن جاتے تھے اور آنکھیں پھیل جاتی تھیں۔ ہم دونوں آگے، پیچھے وہ تینوں تھے۔ ہماری رفتار تیز تھی۔ سلاخوں والے اونٹنے.... صدر دروازے ہی سے بہت لوگ معظرب کھڑے دکھائی دیے۔ سپاہیوں کا ایک دستہ بھی وہاں موجود تھا۔

دربان نے صدر دروازہ کھول دیا۔ اڈے کے آدمیوں کے ہجوم میں شور اٹھا۔ اس لمحے بے اختیار میں نے ڈاکٹر رائے کا ہاتھ تھام لیا۔ مجھے نہیں معلوم اس کی ضرورت مجھے کیوں محسوس ہوئی۔ ہمارے تین اطراف اڈے کے آدمی کھڑے تھے۔

جانے کس کی ہدایت پر کوئی آدمی دربان کی کرسی لے آیا، پھر کوئی اور سپاہیوں کی بیچ۔ سپاہیوں کی کیا مجال تھی کہ اڈے کے آدمیوں کی پذیرائی میں تامل و تردد کریں۔ انہوں نے مجھے کرسی پر کھڑا کرنا چاہا، لیکن یہ کیسے ممکن تھا کہ ڈاکٹر رائے کچھ کھڑا رہے۔

میں نے اسے کرسی کی پیش کش کی۔ اس کے چہرے سے نظر آ رہا تھا کہ وہ کتنے استغاب اور کشاکش کے عالم میں ہے۔ کسی قدر درد و کد.... کے بعد وہ کرسی پر کھڑے ہو جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ میدا، برجو، ان کا تیسرا ساتھی اور میں بیچ پر کھڑے ہو گئے۔ وہ تینوں سڑے سینے ہوئے تھے۔ ہمارے کھڑے ہوتے ہی شور اٹھنے لگا۔ عمر رسیدہ برجو کو ٹوکنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ اتنی عمر میں چہرہ شناسی آئی جانی چاہیے۔ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کے انہیں

خاموش رہنے کی تاکید کی۔

ہر طرف خاموشی چھا گئی تو میں نے بلند آواز میں کہا، ”ہمیں زیادہ لمبی چوڑی بات نہیں کرنی، اس کا وقت بعد کو آئے گا۔ اس وقت جو تم سے کہنا ہے، اسے دھیان سے سنو! میدا استاد نے اڈا چھوڑ دیا ہے۔ اب ہمیں اڈے کی چوکی پر بیٹھنا ہے، لیکن ابھی ہم اڈا نہیں سنہال سکتے۔ میدا استاد فیصلہ کر چکا تھا۔ ہمارے کہنے پر مشکل سے ہماری جگہ چوکی پر بیٹھنے کو تیار ہوا ہے۔ جب تک ہم واپس نہ آ جائیں، میدا استاد ہی اڈے کا مالک رہے گا۔ سچ میں کوئی ہماری طرح چوکی کا دعو کرنے والا آجائے تو اسے میدا استاد سے نہیں، ہم سے بل کرنا ہوگا۔ ہمارے ٹھکانے کا پتا میدا استاد کے پاس ہوگا، ہم جہاں کہیں بھی ہوں گے، اس کے بلانے پر یہاں آ جائیں گے، پر جب تک ہم آنہ جائیں، نئے دعوے دار کو انتظار کرنا ہوگا۔“

میرے چپ ہو جانے پر رجوم میں بھن بھناہٹ ہونے لگی اور مجھے خیال آیا احتیاطاً ایک بات ان سے اور کہہ دینی چاہیے۔ میں نے کہا، ”کسی کو کچھ پوچھنا ہے، یا کوئی انکا وہی کسی کے دماغ میں، تو ہم ابھی سامنے کھڑے ہیں۔“

کسی طرف سے کوئی آواز نہیں اٹھی۔

”ہاں ایک بات اور۔“ جیسے ہی میری آواز بلند ہوئی، دوبارہ سناٹا چھا گیا۔ ”کوئی اور دعوے دار ہوتا ابھی ہم شہر میں گھیرے ہوئے ہیں، وہ سامنے آجائے، یہاں ابھی، اس وقت بھی۔ اب نہیں تو دو چار دن بعد، ہفتے بھر میں۔ ہمارے جانے کے بعد پھر، جیسا ہم نے بول دیا ہے، اسے ہمارے لوٹ کے آنے کا انتظار کرنا ہوگا۔“

اپنی بات ختم کر کے میں نے سوالیہ نظروں سے بر جو کو دیکھا۔ وہ تینوں ہی جیسے بت بنے ہوئے تھے۔ میں بیٹھ سے اتر آیا۔ ڈاکٹر رائے نے بھی فوراً میری تقلید کی۔ صدر دروازے پر واپس آ کے میں

نے مڑ کے ایک نظر پیچھے کی طرف دیکھا۔ میدا، بر جو اور وہی تیسرا آدمی لپکتے ہوئے ہماری طرف بڑھ رہے تھے۔ میں اور ڈاکٹر رک گئے۔ ان تینوں کے ہاتھ جڑے ہوئے تھے، آنکھیں جھلملا رہی تھیں، جیسے بس انداز ہی چاہتی ہوں۔

جب میں ہاتھ ڈال کے میں نے میدا کا چاقو نکال کے اس کے آگے کر دیا۔ ”اب تمہیں اس کی ضرورت پڑے گی۔“ میں نے آہستگی سے کہا۔ اس کے چہرے کی کھال پھڑکنے لگی تھی۔ میرے ہاتھ سے چاقو لے کے اس نے آنکھوں سے لگا لیا۔ پھر ہم وہاں نہیں ٹھیرے، صدر دروازہ عبور کر کے اسپتال میں داخل ہو گئے۔

مرکزی عمارت اور اپنے کمرے تک آنے کے دوران ڈاکٹر رائے نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ مجھے اس سے اجازت لے لینی چاہی تھی، لیکن میں اس کے ساتھ چلتا رہا تھا۔ کمرے میں آ کے وہ مجھے ہونے انداز میں میز کے قریب رکھی ہوئی آرام کرسی پر نیم دراز ہو گیا اور اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ لگتا تھا جیسے بہت دور کے سفر سے آ رہا ہو۔ چند لمبے بعد اس نے پلکیں جھپکا میں اور مجھے سامنے کھڑے ہوئے دیکھا تو گز بڑا کے بولا۔ ”تم..... تم کھڑے کیوں ہو؟“

”میں اب چلتا ہوں۔“ میں نے خفیدہ آواز میں کہا، ”مجھے اجازت دیجیے۔“

”کیوں، کیوں جانا چاہتے ہو؟“ اس نے کھوئے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”یوں ہی..... کچھ دیر آپ آرام کر لیں۔“ وہ پھر نہیں تم ہو گیا اور مجھے پھر بعد چوٹیک کے بولا، ”مجھے واقعی آرام کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ ٹھیک ہے، جاؤ تم۔ کچھ دیر میں شام کے معائنے پر میں اس طرف آتا ہوں۔“

سلام کے لیے ہاتھ اٹھا کے میں دروازے کی طرف بڑھ گیا تھا کہ اس کی بھاری آواز نے میرا

تغائب کیا۔ رات کو تم گھر آ سکتے ہو؟“

میں نے پلٹ کے حیرانی سے اسے دیکھا۔

”رات کا کھانا ساتھ کھا لیں گے۔“ اس نے سرسری سے انداز میں کہا۔

میں سوچتا رہا، مجھے کیا کہنا چاہیے۔ اس نے کرسی کے سرہانے سے سرنگ کے پھر آنکھیں موندنی نہیں۔ میں دے قدموں کا باہر آ گیا۔

راستے پھر گزرتے ہوئے لوگوں اور جگہ جگہ تعینات سپاہیوں کی نگاہیں مجھ پر بھٹکتی رہیں۔ بری خبر ہوا رفتار ہوتی ہے۔ شاید کبھی کو معلوم ہو گیا تھا کہ شہر کے اڈے کے سب سے بڑے استاد، میدا استاد اور اس کے قریب ترین ساتھی مجھ سے ملنے کے لیے اسپتال آئے ہوئے تھے اور یہ حیرت انگیز واقعہ بھی ان کے لیے ناقابل فہم ہوگا کہ ڈاکٹر رائے بھی میرے ساتھ تھا۔ کچھ دیر میں جزئیات سے بھی انہیں آگاہی ہو جاتی تھی۔ پھر ہر کوئی اپنے اپنے طور پر اپنی اپنی زبان میں انہیں بیان کرے گا۔ میں دائیں بائیں ان کی موجودگی سے بے نیاز سان کے سامنے سے گزرتا رہا۔ اتنی نگاہوں کی زد پر آدمی کیسا چور سا بن جاتا ہے۔ بہ حال، کسی طرح میں اپنے کمرے تک پہنچ گیا۔ سیورین مجھے باہر ہی مل گئی۔ اسے عجیب لہجے میں ہوگا۔ بار بار کمرے سے راہ داری میں آتی ہوگی۔ اس نے دور سے مجھے آتا دیکھ لیا تھا۔ مجھے اعزازہ تھا کہ ابھی اس کے سوالوں کی جواب دہی کا ایک مرحلہ باقی ہے۔

”کیا ہوا؟“ اس نے پھٹے ہوئے دیدوں سے پوچھا۔

”جملے گئے وہ۔“ میں نے اس کے اطمینان کے لیے مسکرا کے کہا اور اس کا بازو تھام کے سونے بسے آیا۔ ”تم اتنا کیوں گھبرا رہی تھیں؟“

”بات ہی ایسی تھی۔“ وہ ہراساں آواز میں لگا۔

”تم نے غور نہیں کیا۔ اسپتال میں وہ کسی

خطرناک ارادے سے کیسے آ سکتے تھے۔ وہ باقاعدہ اجازت لے کے یہاں تک پہنچ پاتے تھے۔“

”لیکن ان کا کیا بھروسہ۔“

”وہ بھی آدمی ہی ہوتے ہیں، اور آدمی زیادہ تر آدمی ہی رہتا ہے۔“

”لیکن یہ ہوا کیا؟“

”ہوتا کیا۔“ میں نے اسے مختصر آساری روداد سنانے کی کوشش کی۔ ”اب سب ٹھیک ہو گیا۔“ میں نے رسائی سے کہا۔

”کیا ٹھیک ہو گیا؟“ اس کا منظر اور کم نہ ہوا۔

”میں نے تمہیں بتایا نا، میرا چاقو اب میرے پاس ہے، میدا کا چاقو اس کے پاس۔ میدا استاد اپنی پرانی جگہ جانیٹھ گئے۔ انھونی کو جانا تھا، چلا گیا۔ کہتے ہیں، وقت کو کون نال سکتا ہے۔ اکیبر علی خاں صاحب کا بھی وقت آ گیا تھا۔ ان کے قاتل بھی ملے گئے۔“

پولیس ایک دوسرے کے قاتل تلاش کر رہی ہے۔ کوئی ان کے ہاتھ نہیں آئے گا تو وہ کیا کر سکتی ہے،

چپ ہو کے بیٹھ جائے گی اور کسی معاملے میں مصروف ہو جائے گی۔ شیر کی کو انھونی کے بغیر

رہنا ہوگا۔ اکیبر علی خاں صاحب کے گھر والوں کو ان کے بغیر زندگی بسر کرنے کی عادت ڈالنی ہوگی اور

عادت پڑنی جائے گی۔ آدمی کو ب سے لڑ اپنی زندگی ہوتی ہے۔“

”تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟“ وہ آزرگی سے اور روہا نسی ہو گئی۔

”کیا غلط ہے اس میں؟“ میں نے بھی ہوئی آواز میں کہا۔ وہ سر جھکا کے چپ ہو گئی اور ناخن

کریڈن لگی۔ میں بھی خاموش بیٹھا اپنے کو تنکے چھوٹا رہا۔ خود آزادی سے کبھی تسلی تھی ہوتی ہے۔

رفتہ رفتہ مجھے احساس ہو رہا تھا، دل جوئی کے بجائے

میں نے اس سے کسی شکست یا تم شروا کر دی تھیں۔ وہ تو چھوٹی موٹی کی مانتہ ہے۔ میری سنگ

بیانی سے کسی کھلا گئی ہے۔ شیشہ ایسی گرانی کی

تاب نہیں رکھتا۔ اصل میں شاید میں یہ سب کچھ خود سے کہنا چاہتا تھا کہ میں نے اس پر بار کر دیا۔ کچھ دیر بعد میں نے چپکے سے اسے ٹوکا، ”اب کیا سوچ رہی ہو؟“

”کچھ نہیں۔“ اس کی آواز جیسے پاتال سے ابھری۔

”مجھے افسوس ہے۔“ میرا لہجہ بھی معذرتی تھا۔ اس کے گلگلی ہونٹوں میں ارتعاش ہوا۔

”ویسے تم تھوڑی سی پاگل بھی ہو۔“ میں نے ہلکی آواز میں کہا۔

اس کی لب ریز آنکھیں مجھ پر منڈلائیں اور اس کے ابرو آلودہ رخسار چمک اٹھے۔ ”ہاں۔“ وہ بے ساختہ بولی۔ ”اور تم نے کیا ہے مجھے پاگل۔“

”میں نے؟“

”معلوم نہیں، تم کیسے آدی ہو۔“

”بہت برا ہوں تا۔“

”ہاں آں، بہت برے۔“ وہ ہنس پڑی ”یہی تو تمہاری خوبی ہے۔“

میری تدبیر کارگر ہوئی، آخر کہیں اس پر چھائے یاس و حرماں کا غبار چھنا۔ ”چائے نہیں پلاؤ گی۔“

میں نے اشتیاق آمیز لہجے میں فرمائش کی۔

وہ زریں کی طرح بے تاب ہوئی، نیساں کی طرح اس کے بدن میں بجلی بھرنی، جھٹ باہر نکل گئی۔

نہل پر ایک نظر ڈال کے میں بھی باہر آ گیا۔ سیورین وہاں نہیں تھی۔ خدمت گار کو طلب کرنے کے بجائے وہ خود احکام صادر کرنے باورچی خانے چلی گئی ہوگی۔ سبزہ زار میں، اسپتال کے آداب کی وجہ سے وہ میرے ساتھ چائے میں شریک نہیں ہو سکتی تھی، اس خیال سے میں دوبارہ کمرے میں آ گیا۔

تھوڑی دیر میں وہ نمودار ہوئی۔ اس کے پیچھے بڑا سا تشت اٹھائے ایک مؤدب خدمت گار تھی

تھا۔ چائے تمہا نہیں تھی۔ جانے کیا کیا لوازم ساتھ

تھے۔ چائے کا تو بہانہ تھا، میں تو سیورین کو متحرک، تازہ دم دیکھنے کا آرزو مند تھا۔ حسین چہرہ پر حزن و دلال زربا نہیں ہوتا۔ پھول کھلے ہوئے ہی اچھے لگتے ہیں، ڈھلکے ہوئے ہوں، تیز دھوپ کی زد پر اور تیز ہواؤں کے نرنے میں ہوں تو جی حیرانے لگتا ہے۔ چائے کے دوران وہ خاصی چاق چو بند تھی۔ میں نے اسے یاد دلایا کہ یہ وقت مناسب ہے۔ وہ کوئی کارندہ ہوئی سمجھے کا بندوبست کر دے۔ میں پرچی لکھے دیتا ہوں تاکہ ہوٹل کا کوئی ذمہ دار شخص یہاں آکے تصدیق کرے کہ میں ہی اپنا سامان ہوٹل سے منگوانا چاہتا ہوں۔

وہ دنیا جہاں سے باخبر تھی، کہنے لگی کہ سنا ہے شہر میں سنا ہے، بہت کم لوگ آج گھروں سے نکلے ہیں۔ بیش تر دکا نہیں اور بازار بند ہیں۔

میں نے کہا، ”شہر تو بند نہیں اور ہوٹل تو کھلا ہوگا۔ کیوں نہ ایک کوشش کر لی جائے۔ اب تو میں خود بھی جا سکتا تھا، لیکن ڈاکٹر رائے سے بات کرنا بھول گیا۔“

”کیا؟“ وہ برحسب سے بولی۔ ”تم جاؤ گے شہر میں۔ ڈاکٹر رائے کیا، میں بھی سمجھیں جانے نہیں دوں گی۔“ اپنے تھکمانہ لہجے کا اسے فوراً احساس ہوا اور وہ ٹھٹک سی گئی۔ ”تمہیں معلوم ہے، تم کیسے بوجہ بنے ہو شہر میں۔“

”میں اسی لیے تو نہیں گیا۔“ میں نے ملامت سے کہا۔ ”معلوم تھا، ان حالات میں کوئی بھی جانے نہیں دے گا۔ ان پتروں میں ایک دن اور گزارا جا سکتا تھا، لیکن آج رات ڈاکٹر رائے کے گھر جانا ہے۔“

”کیا؟“ اس کا سراپا میل کھا گیا۔ وہ بدحواسی کا ہو کے بولی۔ ”ڈاکٹر رائے نے تمہیں بلایا ہے؟“

”ہاں، انہوں نے حکم دیا ہے، رات کا کھانا میں انہی کے ساتھ کھاؤں۔“ میں نے کہا۔

”کیا واقعی؟ یقین نہیں آتا۔“

”کیوں نہیں آتا، اور تم اتنی حیران پریشان کیوں ہو رہی ہو، کوئی نئی بات ہے کیا؟ ڈاکٹر صاحب ایک مہربان اور مشفق بزرگ ہیں۔“

”بے شک، وہ ہر اعتبار سے ایک بڑے اور منفرد آدمی ہیں، وہ اپنے اسپتال کے مریضوں میں بہت شامل رہتے ہیں لیکن صرف یہیں تک۔ مجھے یاد نہیں، آج تک انہوں نے.....“

”مگر میں ان کا مریض نہیں، مریض کا گمراہ ہوں۔“

”ایسا کبھی نہیں ہوا۔ گھر جا کے تو وہ بالکل گھر کے ہو جاتے ہیں، مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ بہت لوگوں سے انکا ملنا جلنا ہوتا ہے۔ انہیں اپنے کام سے غرض ہے۔ کام ان کے لیے عبارت ہے۔“

”بچ پوچھو تو مجھے بھی حیرت ہوئی تھی، لیکن جیسا تم کہتی ہو اور جیسی لوگ ان کے بارے میں رائے رکھتے ہیں، شاید ایسا کچھ نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب زندگی میں بھی بہت شامل ہیں۔ لوگوں نے طرح طرح کے افسانے یوں ہی ان کے بارے میں زائش رکھے ہیں۔“

”یہ ہر حال، یہ بڑی ان ہونی کی بات ہے۔“

”میں کیا کہہ سکتا ہوں، انکار بھی تو نہیں کر سکتا تھا۔“

”یہ تو ایک اعزاز ہے۔“ جانے کیوں سیورین کچھ متزدد، کسی فکر میں ڈوبی نظر آئے گی۔

اسی اثنا میں دروازے پر آئیں ابھریں۔ ڈاکٹر رائے حسب معمول شام کے معائنے کے لیے آ گیا تھا۔ نہل کو آنکھیں کھولنے لگی کچھ دیر نہیں لگی۔ انہوں نے اسے بٹھا دیا۔ ڈاکٹر رائے اور اس کا شریک کار ڈاکٹر آہستہ آہستہ اس سے باتیں بھی کرتے رہے۔ بیش تر نہل، ہوں ہاں، میں جواب دیتا رہا۔ میرا خیال تھا ڈاکٹر شام کو بھی اسے چھل دینی کرائیں گے لیکن روزانہ کا طبی احوال نامہ پڑھ کے انہوں نے فشارخون کا معائنہ کیا اور نہل کو بستر

سے نہیں اٹھایا۔ میری تشریح پر ڈاکٹر رائے نے بے پروائی ظاہر کی۔ ”وہ زندگی ہی کی طرف بڑھ رہا ہے۔“ میں نے کچھ اور پوچھنا چاہا تو اس نے مجھے باہر چلے جانے کا حکم جاری کر دیا۔ میرا دل مطمئن نہیں تھا۔ شاید نہل کو چند قدم چلانے کا فیصلہ نل از وقت تھا جو انہوں نے شام کو نہیں دہرایا۔ ڈاکٹر کے واپس آنے میں دیر ہو گئی تو مجھے اور پریشانی ہوئی۔ میں نے دروازے سے تھمک کے دیکھا تھا، مگر دروازہ بھی بند کر دیا گیا تھا۔

سورج کب کا افاق بار چا چکا تھا۔ شام تیزی سے اندھیرے میں اتر رہی تھی۔ اسپتال کی روشنیاں جل چکی تھیں جب کہ دروازہ کھلا اور ڈاکٹر رائے اپنے ساھی ڈاکٹر کے ساتھ باہر نکلا۔ ہم دونوں جیسے ایک دوسرے کی جانب جھٹے جھٹے دھڑکا لگا ہوا تھا، وہ نہل کے بارے میں زردی کوئی بات نہ کہہ دے، لیکن میرا شانہ بڑکے اس نے اپنی بات کی۔ ”ساڑھے آٹھ بجے تیار رہنا ہے۔ ملازم گھر لے جانے کے لیے آجائے گا۔“ یہ کہتے ہی وہ نہل پڑا اور میں اسے دیکھتا رہ گیا۔

کمرے میں جا کے جب تک میں نے کریڈ کریڈ کے سیورین سے تصدیق نہیں کر لی، مجھے سکون نہیں آیا۔ اس نے بتا ہنض احتیاط کی وجہ سے کہ نہل پر کوئی دباؤ نہ پڑے، انہوں نے اسے نرش پر چلانے کی زحمت نہیں دی۔

ایسی آچکی تھی اور سیورین کے چلے جانے کا وقت آ گیا تھا مگر وہ ٹھہری رہی اور درہرنگ ایسی سے سرگوشیاں کرتی رہی۔ یقیناً وہ اپنی حیرتیں ایسی نہل کر رہی ہوگی۔ حیرتوں کے اظہار کی آدمی کو بڑی بے چینی ہوتی ہے۔ ایسی کونانے کے لیے سیورین کے پاس بہت کچھ تھا، استامبدا کی اسپتال میں آمد اور ڈاکٹر رائے کے گھر میری طبی۔ ان دونوں میں بڑی یگانگت تھی۔ کبھی تو ایسا لگتا جیسے ماں بیٹیاں ہوں۔ معلوم نہیں، یہ کتنی حقیقت ہے، دو عورتیں کتنی

قریب ہو جاتی ہیں، دو مرد اتنے قریب نہیں ہو پاتے۔ دو عورتوں کی ایسی یک جائی دیکھ کے مردوں کو اپنی الگ جنس کا احساس کچھ سوا ہونے لگتا ہے، مفاہرت کا سا کوئی احساس۔ گندشتہ شام کی طرح کترائی ہوئی آواز میں سیورین مجھ سے پوچھنے لگی کہ کل صبح وہ میرے لیے کچھ لائے۔ میں منع کرنا چاہتا تھا، لیکن وہی صورت درپیش تھی۔ بہت کچھ دعوت کار برنصر ہوتا ہے کہ وہ کون ہے، کتنا دل کش اور نازک، کتنا عزیز و محترم ہے اور اس کی نیت، اس کی طلب میں شوق کیسا فراوان ہے۔ کل کی طرح مجھ سے انکار نہ کیا جاسکا۔ میرے اقرار پر اس کی آنکھوں کی تابانی فرزدں ہو گئی اور وہ سبک خرامی سے چلی گئی۔ رفتار بھی آدمی کی قلبی کیفیت کا مظہر ہوتی ہے۔

گھڑی نے ساڑھے آٹھ بجائے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ ڈاکٹر رائے کے ملازم کو پابندی وقت کی غیر معمولی تربیت دی گئی تھی۔ ضرور وہ کمرے کے باہر گھڑا رہا ہوگا کہ ٹھیک وقت پر دستک دے۔ آدمی کو اتنا گھڑی نہیں ہونا چاہیے، آدمی تو پھر آدمی نہ رہا۔

ہول میں کسی کو بھیجے اور سامان منگوانے کا وقت نہیں تھا۔ صبح تان کے میں نے انہی بوسیدہ کپڑوں کی شلینیں درست کیں۔ نہاد جو پہلے ہی لیا تھا۔ نہانے کے بعد باسی کپڑے پہنے رہنا بھی ایک ستم ہے۔ پیشانی پر ایچی کے بوسے کی نذر لے کے میں باہر آ گیا۔

ڈاکٹر کا گھر دور نہیں تھا۔ پیدل کے فاصلے پر، اسپتال کی چار دیواری سے ملحق ہم گویا کسی جنگل میں داخل ہوئے، ترشا ہوا جنگل۔ ہر طرف سبزے کی خوش بو تھی، کچی کچی سی خوش بو۔ ایک طرف کوٹھیوں کی قطار، سچ میں سینٹ کی پختہ سڑک، سڑک کے اس طرف درخت ہی درخت، باغ ہی باغ، چمن زار، فاصلے فاصلے پر والی بال، مینس اور

باسکٹ بال وغیرہ کے قطععات۔ سڑک کے کنارے ایسا تادہ ہمبوں پر لٹتے روشن تھے اور پروانے ان پر یخار کیے ہوئے تھے۔ کچھ دور سڑک پر چند گورے اور کالے بچوں کی ٹولی سائیکلیں دوڑا رہی تھی۔ بچوں کی ہادہوں میں مینڈکوں کی ٹرٹر اور چھتنگروں کی جھنگر بھی شامل تھی۔ ہر کوئی گز بھرا اونچی لکڑی کی باز کی چار دیواری میں قائم تھی اور عمارت کے چہا اطراف وسیع رتبے پر اونچے نیچے سبزہ زار پھیلے ہوئے تھے۔

ہمیں زیادہ آگے نہیں جانا پڑا۔ تیسری کوٹھی میں لکڑی کے چوڑے دروازے پر دربان موجود تھا۔ یہ پرانی طرز کی دمنزلہ کوٹھی تھی۔ نہ اتنی بڑی، نہ ایسی چھوٹی۔ جدید کم، قدیم زیادہ، صاف ستھری، رنگ روغن بھی نیا نیا تھا۔ دروازے میں داخل ہوتے ہی رات کی رانی سے واسطہ پڑا۔ رات کی رانی کی بھی کیا مہک ہوتی ہے۔ ادھر زریں نے حویلی میں رات کی رانی کے پودے بے تماشا لگائے ہیں۔ ساری حویلی معطر رہتی ہے۔ کچھ یہی احوال ڈاکٹر کی کوٹھی کا بھی تھا۔ خوش بو آدمیوں کی طرح ہوتی ہے۔ نرم و نازک، اجڑ اور وحشی، لہڑ، شوخ، شرارتی، سنجیدہ، رنجیدہ۔ رات کی رانی کی مہک میں جتنی نفاست اور شائستگی ہے، اتنی ہی شوخی اور چپکاری بھی۔

ڈاکٹر رائے سبزہ زار میں ٹہل رہا تھا۔ میرے سلام کا اس نے سر کی جنبش سے جواب دیا۔ "فاصلہ زیادہ تو نہیں ہے۔" وہ ٹیلی آواز میں بولا۔

"بالکل نہیں۔" میں نے مستعدی سے کہا۔ "کیا مجھے دیر ہوگئی؟"

"آدمی کے پاس سب سے کم کیا چیز ہوتی ہے؟"

دماغ کچھ حاضر تھا۔ ایک لفظ میں اس کا تھما رسا ہو گیا۔ میں نے کہا۔ "جی ہاں! وافر بھی ہوتو کم ہے۔"

”آؤ“ میری کمر پر ہاتھ رکھے وہ بید کی کرسیوں کی طرف بڑھ گیا۔ کرسی پر بیٹھ کے اس نے تذبذب سے پوچھا، ”یہاں بیٹھو گے، یا اندر چلیں؟ یہاں کچھ نکلی ہے۔“

”جیسا آپ بہتر سمجھیں۔“ میں نے موڈ بانہ کہا۔

”میلے کھانا کھاؤ گے یا.....؟“

”آپ کا وقت ہو گیا ہے تو ٹھیک ہے۔“

”میرا خیال ہے، کچھ دیر بعد لگوا میں،“ اس نے ہنسی بھرتے ہوئے فیصلہ کیا اور کرسی سے اٹھ گیا، پھر ایک دو قدم بعد رگ کے بولا، ”تم یہاں بیٹھنا تو نہیں چاہتے؟“

”یہ بہت خوب صورت اور پرسکون جگہ ہے۔“ میں نے کہا، ”لیکن یہاں واقعی نکلی ہے۔“

مجھے ساتھ لیے ہوئے وہ عمارت میں داخل ہو گیا۔ دروازے کے سامنے کا وسیع حصہ کسی بڑے ہال کے مانند تھا، سادگی و پرکاری کی مثال، کونے کونے میں لہراتے، بل کھاتے ایک دوسرے میں بیوست اور کم، عورت اور مرد کے عریاں، نیم عریاں قد آدم جسمے، دیواروں پر بڑی بڑی روغنی تصویریں، ساز و سامان گم اور منتخب تھا۔ ہال میں غنودہ سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

ڈاکٹر رائے بائیں طرف کے روشن کمرے میں آ گیا۔ یہ نشست گاہ تھی۔ چالی پوش کھڑکیاں کھلی ہونے کی وجہ سے یہاں بھی باہر جیسا موسم تھا۔ اس کمرے کے ساز و سامان میں بھی بڑی سادگی تھی، آرائش تھوپی ہوئی نہیں تھی اور کینوں کی دولت و حشمت سے زیادہ ان کی نفاست طبع کی غنائی تھی۔ ہم دیواری کونے میں جڑے ہوئے سونوں پر کچھ اس طرح بیٹھ گئے کہ ایک دوسرے کے سامنے تھے، ترچھے تھے۔

”ابھی کوئی دس منٹ پہلے ایک پولیس افسر یہاں سے گیا ہے۔ اصل میں میں نے ہی اسے بلایا

تھا۔ اس دوران میں نے پولیس سے تھوڑا بہت رابطہ رکھا ہوا تھا۔“ ڈاکٹر رائے نے کسی تمہید کے بغیر کہا، ”پولیس افسر بتا رہا تھا، کچھ دیر پہلے، غروب آفتاب کی نماز کے بعد اکبر علی خاں کی تدفین ہو گئی ہے۔ ان کا بڑا بھائی شام کو حیدر آباد دکن سے آ گیا تھا۔ سنا ہے، جنازے میں بہت بڑا جھوم تھا۔ شہر کے پیش تر مسلمان عدالت میں اکبر علی خاں کے ساتھی اور لاہور کالج کے طلبہ کثرت سے شریک تھے۔ آئی جی سے میں نے درخواست کی تھی کہ جنازے میں تمہاری عدم شرکت محسوس کی جائے گی اور خواہ مخواہ کے وہم و گمان کو ہوا دے گی۔ یہ تر ہوگا، اکبر علی خاں کے بھائی اور گھر والوں کو آگاہ کر دیا جائے کہ کہیں بدوجہ شرکت سے روکا گیا ہے۔ پولیس افسر کا کہنا ہے، اکبر علی خاں کا بھائی طویل سفر سے آیا ہے اور چھوٹے بھائی کی ناگہانی پر بہت دل گرفتہ ہے۔ اسے ابھی کسی اور طرف دیکھنے اور سونپنے کا وقت کہاں ملا ہوگا، لیکن پولیس اس کے اثر و رسوخ سے واقف ہے، اس لیے خائف ہے۔ میں سمجھتا ہوں، اکبر علی خاں کا بھائی تم سے ملاقات کرنا چاہے گا۔“

میں جب رہا۔ میرے پاس کیا جواب تھا۔

”اکبر علی خاں کے قتل کے مقام پر پہنچنے لگی تین لاشوں نے خاصی پیچیدگی پیدا کر دی ہے۔ حالاں کہ میرے، تمہارے اور کسی حد تک پولیس کے بھی علم میں ہے کہ یہ کوئی ایسی پیچیدہ بات نہیں ہے۔ مسئلہ یہ ہے، جیسا کہ تم کہتے ہو، قاتل اتنی آسانی سے گرفت میں نہیں آ پائیں گے۔ بہ ہر حال، میں نے پولیس کو یقین دلادیا ہے کہ اس دوران تم ہر وقت اسپتال میں رہے ہو اور پولیس..... بھی تو تمہاری نقل و حرکت کی نگرانی کرتی رہی ہے۔ ادھر میں احتیاطاً پیرسٹر بھارگو سے بھی مشورے لیتا رہا ہوں۔ ان کا بھی یہی کہنا ہے کہ تم فی الحال اپنے آپ کو اسپتال اور بیمار بھائی کے کمرے تک محدود رکھو۔“

ملازم کی مداخلت پر ڈاکٹر رائے کو رکنا پڑا۔ ملازم باوردی تھا اور کسی پھل کے رس سے بھرے گلاس بہت اہتمام سے لایا تھا۔ یہ اناس کا رس تھا۔ ملازم کے جانے کے بعد ڈاکٹر رائے کو موقع ہو گیا کہ میں زبان کھولوں گا، لیکن ممنونیت کے اظہار کے سوا میرے پاس کچھ نیا نہیں تھا اور ڈاکٹر کا لحاظ بھی مانع تھا کہ منہ سے کوئی ایسی ویسی بات نہ نکل جائے۔

”آج شام کا واقعہ میری زندگی کا سب سے اونگھا تجربہ تھا، خاصاً سنسنی خیز۔ ہم قاتلوں کے ساتھ بیٹھے تھے اور وہ..... وہ کیسے مطمئن تھے۔“

”آپ اڈے کے لوگوں کے درمیان تھے۔“

میں نے صبح کی جرأت کی۔

”یعنی وہ قاتل نہیں تھے۔“ وہ بگڑ کے بولا، ”یہ ان کے لیے کیوں کہ معمول کی بات ہے۔“

”اڈے کے آدمی اس طرح ہر کسی کا خون نہیں کرتے۔“

”مگر وہ قاتل ہیں۔ انہوں نے تین آدمیوں کا خون کیا ہے۔ یہ اعتراف کسی طور ڈھکے چھپے انداز میں انہوں نے خود کیا ہے۔“ شدت بیان میں ڈاکٹر کی آواز طوق میں پھنس گئی۔

”مگر میرے اور آپ کے سامنے اس مجہول دہم اعتراف کی کیا حقیقت ہے۔“

”یہ ایک اور بات ہے۔“ وہ جھنجھلا کے بولا۔

”انہوں نے ان لوگوں کو راستے سے ہٹا دیا جو ان کے لیے مسلسل مصیبتیں کھڑی کر رہے تھے۔“

”تم ان کی حمایت کر رہے ہو؟“

”جن تین آدمیوں نے اتھوئی اور اکبر علی خاں کو قتل کیا تھا، آپ کے خیال میں ان کی کیا سزا ہونی چاہیے؟“ میں نے غصے سے پوچھا۔

”نوراً کچھ کہنے کے بجائے وہ پہلو بدلنے لگا۔

”نہیں..... نہیں..... مگر یہ عدالت کا کام ہے۔ عدالت بھی یہی فیصلہ کرتی..... یا نہیں

کرتی..... مگر فیصلہ تو یہی ہونا چاہیے تھا۔ عدالت کو کسی نتیجے پر پہنچنے میں ایک وقت صرف ہو چاہا، گواہیاں، شہادتیں، ویل، اور ایک عدالت کے بعد دوسری، تیسری اور ایک تارنما کے بعد دوسری..... ممکن ہے، وہ سچ بھی جانتے۔“

”مگر یہ بھی تو ممکن ہے، اکبر علی خاں کا قتل انہوں نے کیا ہی نہ ہو۔“

”اور اگر واقعی کیا ہو؟“

”مگر اڈے کے لوگوں کو کسی فیصلے کا اختیار نہیں ہوتا چاہیے۔ انہیں کیا، کسی کو بھی نہیں۔“

”سارے معاملات میں وہ کہاں داخل ہوتے ہیں۔ یہ تو ایک بالکل مختلف معاملہ تھا۔ یہ ان کے اڈے کا معاملہ تھا۔ اڈے کے لوگوں پر غریب آدمی تھی۔ اپنے ہی آدمیوں کی وجہ سے وہ برا ہو رہے تھے اور..... یوں سمجھیے، انہوں نے اچھی طرح خون تلاش کر لیے تھے۔“

”میں تم سے متفق نہیں ہوں۔“

”میں اصرار بھی نہیں کر رہا۔ میں تو حقیقت واقعہ بیان کر رہا ہوں۔ جو کچھ ہوا، اس کا پس منظر بتانے کی کوشش کر رہا ہوں اور انہوں نے قتل کہاں کیا ڈاکٹر صاحب! یہ تو انہوں نے میرے اور آپ کے سامنے جو ڈھکا چھپا سا ج بولا تھا، اس کی کیا وقعت ہے۔ انہیں کسی مضبوط شہادت کے بغیر کوئی عدالت سزا نہیں دے سکتی، ہاں، میں انہیں سزا دے سکتا ہوں، آپ دے سکتے ہیں۔ آپ نے وہ قول لازماً سنا ہوگا، قانون کی آنکھیں نہیں ہوتیں، صرف کان ہوتے ہیں، چلیے، کل صبح چل کے میں اور آپ عدالت میں اعلان حق کرتے ہیں، ہم سچ بولتے ہیں۔ انہوں نے کوئی کوتاہی نہیں کی ہوگی۔ اگر کی ہے تو اس کا خمیازہ ضرور بھٹیں گے۔ آدمی اپنی غلطیوں ہی سے اپنے لیے کاٹنے ہوتا ہے۔“

”تم مجھے زچ کر رہے ہو۔“

”مجھ میں یہ حوصلہ نہیں ہے۔“

”گو یا اب سب کچھ فیصلہ ہو چکا۔“

”باقی پولیس کی سنجیدگی اور دیدہ ریزی پر منحصر ہے۔ اس کے لیے یہ عزت و وقار کا مسئلہ ہونا چاہیے۔ پولیس بھی سمت پہنچاتی ہے۔ اسے سزا تلاش کرنے کی بے قراری ہونی چاہیے۔“

”ہم اس کی مدد تو کر سکتے ہیں۔“

”کس بنیاد پر؟“

ڈاکٹر کا جسم پھڑک کے رہ گیا، اور وہ مرجھائی ہوئی آواز میں بولا، ”تم ٹھیک کہتے ہو شاید۔“

انٹس کے رس میں کالی مرچ اور نمک کی آمیزش تھی۔ میں نے لمبا گھونٹ لے کے گلاس تمام کر دیا۔ ڈاکٹر نے بھی اپنے گلاس کا رس حلق میں اٹھلایا۔ ”یہ اس کم عمری میں ایسی جہاں دیدگی تم میں کہاں سے آگئی؟“ وہ کچھ پرسکون سا ہو گیا تھا۔

”شاید میں نے زندگی زیادہ ہی جھیلی ہے۔“

میں نے اٹھارے کہا۔

باہر سے آتی ٹھنکی نسوانی آواز نے نشست گاہ کا سکون متلاطم کر دیا۔ ”پاپا! کھانا لگوا آئیں۔“ ساتھ ہی بادامی رنگت کی سادگی سی ساری میں لپٹی ایک نوجوان لڑکی ہوا کے تیز جھونکے کی طرح کمرے میں در آئی۔ مجھے دکھ کے وہ کسی قدر جھکی اور چپکتی پلکوں سے بولی، ”آپ ہی باہر صاحب ہیں۔“

میں کھڑا ہو گیا۔

اس نے میری سامنے آ کے جھٹ مٹانے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور چپکتی آواز میں بولی، ”اچھا، تو آپ ہیں۔ پاپا لوگوں کی تعریف کرنے میں بیڑے بخیل ہیں، لیکن آپ کا ذکر مسلسل کرتے رہے ہیں۔ مجھے آپ کو دیکھنے کی بڑی آرزو تھی۔“

اس کے نرم ہاتھوں کی حدت اور لپک سے اس کے اشتیاق کی تصدیق ہو رہی تھی۔ اس کی ناگہاں آمد، تپاک اور اس بے ساختگی سے میرے حواس منتشر ہو گئے۔ ”یہ بیٹا ہے، میری بیٹی۔“ ڈاکٹر نے افتخار سے کہا۔ ”ادراب یہ میرا بیٹا بھی ہے۔“ اس

کے لہجے میں بے پناہ شگفتگی تھی۔

سو نے جیسی اس کی رنگت تھی، سونا جیسے تیار ہوا ہو، چہا جیسے کندن بن گئی ہو۔ بدن کا ایک ایک انگ ناپ تول کے بنایا گیا ہو، شانوں تک تراشیدہ بال، چہرے پر تانہنگی اور تروتازگی، انداز میں حکمت اور اعتماد۔ اسے حسن و جمال کا مرقع نہیں کہا جاسکتا تھا، لیکن جاذبیت اور دل کشی میں ایک تانہ، یگانہ۔ آدمی دیکھتا رہ جائے، آدمی کھینچتا چلا جائے۔ یہ خوبی ہر حسین لڑکی میں نہیں ہوتی۔ ”میں تو بھول ہی گیا۔“ ڈاکٹر خود کو سرزنش کرتے ہوئے لہجے میں بولا، ”تم کچھ پیو گے، اسکاچ، وائن، یا کوئیک؟ اسکاچ کا تو وقت نہیں رہا۔“

”جی، جی نہیں۔“ میں نے اکتی زبان سے کہا، ”میں کچھ نہیں پیتا۔“

”کوئی تکلف نہیں، میں برائیں سمجھتا اور گاہے گاہے تو.....“ وہ مسکرا کے بولا۔

میں نے شکر یہ ادا کیا۔ ”بس یوں ہی عادت نہیں پڑی۔“

”اچھا ہے یہ بھی..... مشکل یہ ہے کہ پھر آدمی شرابی ہو جاتا ہے اور شرابی ہو کے آدمی نہیں رہتا۔“

”پاپا! باقی باتیں اب کھانے کی میز پر۔“ بیٹا نے چلبلی آواز میں کہا، ”کھانا تیار ہے۔“

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، آتے ہیں سرکار۔“ ڈاکٹر کے قدویانہ لہجے پر مجھے تعجب ہوا۔ ایسا لگا کہ بیٹی کے سامنے وہ بے بس سا ہو گیا ہے۔ یوں بھی اولاد کے سامنے آدمی کو اپنی عمر کا احساس کچھ زیادہ ہی ہونے لگتا ہے، اور اولاد جوان ہوتی تو اس پاسا ہو جاتا ہے۔

بیٹا چھلاوے کی طرح کمرے سے چلی گئی۔ ڈاکٹر بھی اٹھ گیا۔ ہم دونوں آہستہ آہستہ نشست گاہ سے نکل کے ہال میں اور چند قدم کی دوری پر واضح کھانے کے کمرے میں آ گئے۔ میز پر چینی کی صاف شفاف تشریاں سجی ہوئی تھیں۔ گلاسوں میں سفید

رومال اڑ سے ہوئے تھے۔ کھانے کا یہ اہتمام میں نے کر شاجی کے ہاں دیکھا تھا۔ جو لیکن اس قسم کی لوک پلک میں بڑی مشاق ہے۔ بیٹا کی گمرانی میں وردی پوش خانساں نے خوان اس احتیاط سے میز پر رکھے کہ ایک ذرا سی بھی آواز بلند نہیں ہوئی۔ یہ آداب بھی زندگی کتنی سفید کرتے ہیں۔ درمیان میں ڈاکٹر اور اس کے دائیں بائیں میں اور بیٹا بیٹھ گئے۔ کھانوں کی اقسام زیادہ نہیں تھیں۔ ڈاکٹر کی دیکھا دیکھی میں نے بھی سبزیوں کی کتنی سے ابتدا کی۔ چھلی کا سالن، مٹر پلاؤ، پیپر پالک، مسالا مرغ، میٹھی کے ساگ ملی موٹیک کی دال اور اردی کے بیوں کے کباب۔ سب کچھ ہلکا ہلکا اور لذیذ، کچھ مختلف سا بھی، مرچیں برائے نام اور روغن کم سے کم۔ میں نے ازراہ وضع تعریف کی۔

”آج اس نے تجربے نہیں کیے، شاید تمہارا خیال رکھتے ہوئے۔“ ڈاکٹر رائے نے توصیفی نظروں سے بیٹی کی طرف دیکھا۔ ”ورنہ یہ تو روز ہی نت نئے تجربے.....“

”آپ کو دل چسپی ہے کھانا پکانے سے؟“ میں نے بیٹا سے پوچھا۔

بیٹا کچھ کہنا چاہتی تھی کہ ڈاکٹر نے لقمہ دیا۔ پکانے سے زیادہ تجربوں سے۔ خانساں کو بدایا میں ہاری کرتی اور سر پہ کھڑی رہتی ہے۔“

”اور تجربے کیا برے ہوتے ہیں پاپا! بیٹا نے ٹھنک کے پوچھا۔

”نہیں، بہت اچھے، مگر ہضم بھی تو کرنے پڑتے ہیں۔“

”ادوہ بابا۔“ وہ کھل کھلا پڑی۔ طعام گاہ میں کشتیاں ہی جج اٹھیں۔

”مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ کو کھانا پکانے کا شوق ہے۔“ میں نے دبی آواز میں کہا۔

”کیوں، اندازہ کیوں نہیں تھا؟“ بیٹا نے

چمک کے پوچھا۔

”عموماً جہاں ملازمین اور زندگی کی باہر سہولتیں میسر ہوں، وہاں کھانا پکانے وغیرہ کتنی چیزیں سمجھا جاتا ہے بلکہ فضولیات۔“

”اور وہاں طرح طرح کے کھانوں کے بھی دل دادہ ہوتے ہیں۔“ بیٹا شگفتگی سے بولی، ”کھانے کا تعلق تو زندگی سے بہت ہے، غالباً ب

سے زیادہ۔“

”اور یہ تم دیکھ رہے ہو۔“ ڈاکٹر رائے ہاتھ کے گھماتے ہوئے بولا، ”ان دیواروں پر یہ نقش و نگار، یہ جگہ جگہ، کوئے کوئے بے حرکت مرد اور عورتیں..... یہ بے جاں بھی ای کی شرارتیں ہیں۔“

”یہ مجھے، تصویریں آپ کی تخلیق ہیں۔ یہ سارا کچھ.....؟“ میں نے تعجب سے کہا۔

”ہاں۔ بس ایسے ہی کوشش کرتی رہتی ہوں۔“ بیٹا چلبلی آواز میں بولی، ”آپ کو مصوری، سگ تراشی سے کوئی نسبت ہے؟“

”درک نہیں، شوق ضرور ہے۔ آپ نے تو بہت اچھا کام کیا ہے۔ سارا گھر عجیب خانہ لگتا ہے۔ یہ مجھے اور تصویریں محفل صنایع اور مصوری نہیں، ان میں آپ کا خیال، آپ کے احساس، آپ کی فکر کا اضطراب جھلکتا ہے۔ لگتا ہے، درون خانہ کچھ سلگ رہا ہے، کوئی شورش سی پاپے۔ کچھ تلاش سی ہے۔ جو کون نظر آ رہا ہے، جو لکڑیوں وہ آپ کو قبول نہیں۔ اس سے کچھ نیا، بدلا ہوا اور سوا ہونا چاہیے۔ مصور اور مجسمہ ساز قدرت جیسا اختیار چاہتے ہیں۔ تجربیدی مصوری اس خواہش کی ایک مثال ہے۔ تجربیدی مصور طبع ہوئے بغیر قدرت کے بنائے ہوئے نمونوں سے انحراف کی جرأت کرتے ہیں۔ وہ جیسے کائنات کی ایک سانی سے اکتا گئے ہیں اور تغیر و تبدل کے شدت سے خواہش مند.....“

میں نے خود کو روک لیا اور معافی چاہی کہ اس موضوع پر کوئی دست رس نہ ہونے کے باوجود میں

کسی کلیاتی باتیں کر رہا ہوں اور ایک باقاعدہ مصور کے سامنے۔

پینا کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی۔ ”آپ رک کیوں گئے؟“ وہ چمن چھٹانی آواز میں بولی، ”بہت عمدہ تجزیہ کر رہے ہیں آپ۔“

”کہاں، بس یوں ہی۔“

”آپ تجریدی مصوری کے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے۔“ پینا نے مجھے ٹوکا اور اس کا سارا بدن چل سا گیا۔

”میں..... میں کہہ رہا تھا۔“ شاید اپنی بے باگی، یا تاجواز کے احساس سے میری آواز اینٹنے لگی، میں نے لہجے میں نرمی اختیار کی۔ ”اور ہوا کچھ بے، بعض مصوروں نے تجرید کے عنوان سے مادر پدر آزادی حاصل کر لی۔ پھر تو کوئی بھی مصوری کا دعوا کر سکتا ہے کہ اشیاء و اجسام، مظاہر و مناظر کی مسلمہ اور مستقل شکلیں متح کرنے کا کام نہایت آسان ہے۔“

تجریدی تخلیقات میں بھی ایک توازن و تناسب پر حال لازم ہے۔ مراد یہ ہے کہ تجرید کو بھی ایک نظم و ضبط چاہیے۔ تجرید مصوری کے نسب اور سلسل سے بالکل جدا نہیں ہو سکتی۔ بھی اثر انداز ہوتی ہے جب تخلیق کار کو مصوری کے آداب و قواعد سے آگہی ہو اور وہ اشیاء و مناظر کی جتنی تفصیل و تجسیم پر بھی قادر ہو، یعنی انحراف اسی مصور کو زیر دیتا ہے جو مصوری کی بنیاد، اس کے نئی رموز سے آشنا ہو..... اور ہاں رسائی بھی ایک شرط ہے، چاہے وہ محدود سے چند تک ہو۔ مشکل رسائی اور چیز ہے، رسائی سے عاری ہونا اور چیز۔ تخلیق رسائی سے عاری ہوگی، یا رسائی صرف تخلیق کار تک محدود رہتی ہے تو حجت محض ہے۔ ہر تخلیق یعنی اپنے لیے، اتنی دوسروں کے لیے ہوتی ہے۔ کوئی صرف اپنے لیے شعر نہیں کہتا اور کوئی صرف اپنے لیے تصویر نہیں بناتا، سورسائی لازم ہو جاتی ہے۔ تجرید بے دلیل نہیں ہوتی۔ وہ کسی فکر،

کسی خیالی کی طرف اشارہ کرتی ہو۔ کیسوں، رنگوں اور زاویوں میں فکر و خیال، معانی و مفہم نہیں پیچے ہوئے، آنکھ چٹوئی کرتے محسوس کرتے ہوں تو ان کا تعاقب ضرور کیا جاتا ہے اور تعاقب میں کچھ ہاتھ نہ آئے تو..... تو..... میں پھر بیٹھنے لگا تھا۔ اپنی رو میں جانے کیا کیا کہتا رہا۔ دونوں باپ بیٹی کی نظریں مجھے نشانہ بنائے ہوئے تھیں۔

پینا کا چہرہ آتے جاتے رنگوں سے ہمتا رہا تھا۔ باپ سے وہ شکایت کرنے لگی کہ اس نے میرے بارے میں اتنے کج سے کیوں بتایا تھا۔

”پھر میں نے اسے مدعو کیوں کیا ہے۔“ ڈاکٹر رائے بچوں کی کسی سرخوشی سے بولا، ”میں تمہارے لیے کچھ تجزیہ میں محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔“

پینا نے مصنوعی تاراشی کا اظہار کیا اور نکتے لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوئی، ”آپ نے تجریدی بات کی ہے۔“

پینا نے مصنوعی تاراشی کا اظہار کیا اور نکتے لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوئی، ”آپ نے تجریدی بات کی ہے۔“

حقیقت سے ایسا انحراف نہیں کیا جاتا، حقیقت ہی بنیاد رہتی ہے۔“

”مصوری کی یہ قسم اس لیے مرغوب بھی بہت ہے کہ حقیقت بنیاد رہتی ہے۔ یوں کہیں کہ بنیاد میں ذرا سا تصرف کیا جاتا ہے، ٹھوڑا لرزا اور جھن جھنایا جاتا ہے۔ یہ ایک معصومانہ انحراف ہے، سرکشانہ اجتہاد نہیں۔“

”آپ تو خاصا جانتے ہیں۔“ پینا کی آواز حیرت آمیز مسرت اور احترام سے مملوئی۔

”نہیں، بالکل نہیں، کسی خوش فہمی میں نہ رہیے۔ کچ پوچھیے تو مجھے آپ کے سامنے اس موضوع پر بات کرنے کا حوصلہ نہیں کرتا چاہیے تھا، لیکن کچھ تو سفر بہت کیا ہے، اور شہر شہر میں عجائبات و نو اور دیکھنے کا موقع ملا ہے، پھر اصل میں ہمیں میں میرے ایک مربی تھے، راج کرشنا، مدراہی تھے، پولیس کے بہت بڑے افسر، سفر کے دوران ریل کے ڈبے میں

ان پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ میں نے ان کی جان بچائی تھی۔ مجھ پر ایسے مہربان ہوئے کہ اپنے گھر لے گئے۔ مجھے چھوٹا بھائی سمجھنے لگے۔ پولیس سے وابستگی کے باوصف وہ بہت بڑھے لکھے آدمی تھے، عالم فاضل۔ انہیں فرصت کم ملتی تھی لیکن جب بھی ملتی، مجھ سے ادب، شاعری، فلسفے، مصوری، موسیقی کی باتیں کیا کرتے۔ ان کے پاس کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا۔ میری تربیت کرتے، مجھے اپنا علم منتقل کرتے رہتے تھے۔ دوسری بار ان پر حملہ ہوا تو میں انہیں نہ بچا سکا۔ بد معاشوں نے انہیں ختم کر دیا۔“

”پینا..... پینا کی آنکھیں پھیل گئیں اور اس نے شہری لڑکیوں کی طرح سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔“

”یہی کچھ ہوا۔“ میں نے اداسی سے کہا۔ ”اور آپ کو بتاؤں، وہ مجھے اتنا اپنا سمجھنے لگے تھے کہ ساری جائیداد میرے نام کر گئے۔ میرے سوا ان کا کوئی تھا ہی نہیں یا ایسا سمجھے کہ میرے سوا وہ کسی کو اپنا نہیں سمجھتے تھے۔ میں نے مصوری کے بارے میں جو کچھ الٹا سیدھا کہا ہے، وہ میرا دیکھا اور جانا ہوا کم، سنا ہوا زیادہ ہے، یہ تو آموختہ تھا۔“

”آدمی اپنا دیکھا اور دیکھا ہوا ہی دہراتا ہے اور دل چسپی نہ ہو تو کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔ کیوں بابا؟“

پینا نے باپ سے حمایت چاہی۔ ڈاکٹر رائے نے سر ہلا کے تائیدی۔

کھانا کب کا ختم ہو چکا تھا۔ خانساماں نے فوان بنا لیے تھے۔ ڈاکٹر رائے کے اٹھنے پر میں بھی اٹھ گیا، پینا بھی ساتھ ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ڈاکٹر نے خوشامدانہ سے لہجے میں پینا سے کہا کہ اسے مجھ سے کچھ بات کرنی ہے، پینا اس دوران کافی کا اہتمام کر دے تو کیا خوب ہو۔

”کوئی ذاتی قسم کی بات؟“ پینا نے شکایتی لہجے میں پوچھا۔

”نہیں، کچھ ایسی ذاتی نہیں۔“

”تو میں شریک نہیں ہو سکتی؟“

ڈاکٹر رائے نے انکار نہیں کیا، انکار کر نہ سکا۔ وہ بیٹی کی پشائی پر کسی شگن کا تحمل نہیں معلوم ہوتا تھا۔ کہتے لگے کہ ہماری باتوں میں پنا کے ذوق کی شاید کوئی چیز نہ ہو۔

”دیکھو میں اس منتظر اور شان دار مہمان کے ساتھ بیٹھنا اور بہت سی باتیں کرنی چاہتی ہوں۔“ پینا نے بے باکی سے کہا۔

”میں..... میں تو کچھ بھی نہیں۔“ میں نے ہکلا کے کہا۔

”آپ لوگ بیٹھے، میں کافی کا انتظام کرتی ہوں۔“ پینا نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔ تیز قدموں سے وہ ایک طرف چلی گئی۔

دو بارہ نشست گاہ میں جانے کے بجائے ڈاکٹر رائے ہال کے ایک گوشے میں رکے سونوں میں سے ایک پر جا بیٹھا۔ پینا ہال مزید روشن کر گئی تھی۔ ”تم کسی کافی پلنڈر کرتے ہو، بیک یا ساوہ دو دودھ کے ساتھ یا کریم کے؟“

”میں شربت کم پیتا ہوں۔“ میں نے متانت سے کہا۔ ”ویسے کافی کا لطف ہی اس کی چٹی میں ہے۔“

”اور تم سب سے زیادہ تلخ چیز نہیں پیتے۔“

”جی ہاں۔“

”برا سمجھ کے؟“

”کچھ اچھی چیز بھی نہیں ہے۔ میں نے آپ سے کہا تھا، بس عادت ہی نہیں پڑی۔“

”کیا اڈے کے لوگ نہیں پیتے؟“

”پیتے ہیں۔ شراب، انون، گانجا اور بھنگ بھی، لیکن عام آدمیوں کی طرح، عادی شریوں اور نشے بازوں کی طرح نہیں، اور کی خاص موٹی پر۔“

پینا فوراً ہمارے درمیان آگئی اور اپنے باپ کے ساتھ میرے مقابل سونے پر بیٹھ گیا۔ وہ پہلے سے کچھ زیادہ شاداب لگ رہی تھی۔ ”کیا باتیں کر رہے تھے آپ؟“ اس نے شائستگی سے پوچھا۔

”کچھ خاص نہیں۔“ ڈاکٹر رائے اچلتی ہوئی آواز میں بولا: ”میں نے تمہیں اڈے پاڑوں کے متعلق بتایا تھا، اسی کے بارے میں کچھ مزید معلومات.....“

”اڈے کے لوگوں کے سینک نہیں ہوتے، نہ چار آنکھیں، چار کان۔“ میں نے کہا۔

”ہاں۔ ہاں۔“ ڈاکٹر کے لہجے میں تڑسی آگئی۔ ”مگر وہ اڈے کے لوگ ہوتے ہیں، عام لوگوں سے مختلف۔“

”عام لوگوں میں بھی بہت مختلف لوگ ہوتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ ڈاکٹر رائے مفاہمانہ لہجے میں بولا۔

”معلوم ہے، تمہارے پاس ہر بات کا جواب ہے۔“

”اور بے جواز نہیں۔“

”ہاں ہاں صاحب۔“ اس نے الگسائے ہوئے اقرار کیا اور کچھ توقف کے بعد ہنک کے بولا: ”ایک بات ذہن میں لکھتی ہے۔ تمہارا کہنا ہے

کہ ڈاک خانے والی ٹی میں..... کیا نام تھا مرنے والے آدمی کا؟“

میں نے بتایا، ”دھنوا۔“

”ہاں دھنوا، دھنوا۔ تمہارے ہاتھوں دھنوا کو زچ ہوتا دیکھ کے اس کا دوسرا ساھی تمہاری طرف

چاٹو تانے بڑھا تھا اور تم اس کے نشانے سے ہنپنے میں کام یاب ہو گئے تھے، لیکن چاٹو بردار خود کو قابو

میں نہ رکھ سکا۔ اس کا چاٹو اپنے ہی ساھی کی پہلی میں جا کھبا۔“

”جی ہاں، کچھ ایسا ہی۔“ میں نے تعجب سے کہا: ”آپ کو خوب یاد ہے، جزئیات کے ساتھ۔“

ڈاکٹر نے میری مداحی پر توجہ نہیں دی اور تیزی سے بولا: ”مگر وہ آدمی جس کے چاٹو سے دھنوا زخمی ہو گیا تھا، اس حقیقت سے تو واقف تھا کہ غلطی اسی کی

تھی، پھر اس کے اور دھنوا کے لیے جان پر کھیلنے کو تیار اس کے دو اور ساتھیوں کے قہر و غضب کا کیا سبب تھا۔ ایسا جنون کہ وہ جنہیں ختم کرنے کے لیے اسپتال تک آگئے اور تم ہاتھ نہ آئے تو انہوں نے اکبر علی خاں کو ہلاک کر دیا؟“

”اس نے اپنے دو ساتھیوں کو اصل حقیقت نہیں بتائی۔“ میں نے تامل سے کہا۔

”لیکن راہ کیر..... ٹھکی کے بہت سے کلین بھی تو اس منظر کے گواہ تھے۔“

میری سمجھ میں ڈاکٹر کی الجھن ذرا دیر سے آئی۔ وہ ایک دانا و پینا، نہات منطقی بات کر رہا تھا۔ مجھے وہ

سارا واقعہ اختصار سے دہرانا پڑا۔ میں نے کہا، ”اس قسم کی صورت حال میں پلک بھینکنے کی مدت میں

منظر بدل جاتا ہے، کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔ بے شک راہ کیر گواہ ہیں، لیکن وہ ایک نمبر کن منظر تھا۔

دھنوا کا ساھی پاگلوں کی طرح اپنی جگہ سے اٹھا تھا، اور واضح رہے، فاصلہ میلوں کا نہیں، چند قدم کی

دوری کا تھا۔ میرے پاس اس وقت یہی ایک راستہ تھا کہ اپنے قبضے میں آئے دھنوا کو ڈھال بنائے

رکھوں کہ یہ صورت دیکھ کے چاٹو بردار کو شاید کچھ ہوش آجائے، وہ خود کو تھام سکے، لیکن وہ نوشقا تھا

اور ادھر دھنوا کو چھوڑ کے الگ ہو جانے کی مہلت میرے پاس نہیں تھی۔ ایک لمحہ، دوسرا لمحہ..... لٹخوں کا

معاملہ ہوتا ہے ڈاکٹر صاحب!“

”میں کچھ اور کہہ رہا ہوں۔“ ڈاکٹر تندہی سے بولا۔ ”جب دھنوا کا ساھی اس حقیقت سے.....“

میں نے اس کی بات کاٹ دی، ”وہی بتا رہا ہوں آپ کو۔ دھنوا کی پہلی میں چاٹو کی رعایت تھی

اس سبب سے ممکن ہوئی تھی کہ میں کسی حد تک اسے نشانے سے بچانے میں کام یاب رہا تھا، ورنہ چاٹو

تو اس کا پیٹ چیر دیتا، یا سینہ کھود ڈالتا۔ چاٹو بردار نے خود کو یقین دلایا، اس نے یہی جانا کہ میں دھنوا

کو چھوڑ دیتا تو دھنوا اس کے نشانے پر نہ آ پاتا، یعنی

س نے دھنوا کو سپر بنائے کیوں رکھا، یعنی مجھے اس
 خواہش کی تکمیل کرنی چاہیے گی۔ مجھی کو نشانے پر
 جانا یا رہنا چاہیے تھا یعنی میں نے دھنوا کو دانستہ
 گئے کر دیا۔ لازماً اس نے اپنے دوستوں کو بھی
 ہی کچھ باور کرایا ہوگا۔ اپنی کئی دناہلی کا تم وغصہ
 سے بہت ہونا چاہیے تھا۔ کلی کے بوکھلائے ہوئے
 ماشائیوں میں کچھ دور تھے۔ کچھ قریب۔ کچھ نہیں کہا۔
 اسکتا کس کس نے دیکھا، کتنا دیکھا، اور کیا جانا، کیا
 سمجھا اور ایک نے دوسرے کو کیا تلقین کی۔ بھوم میں
 ایک اپنی اپنی شہادت الٹا ہے۔ یہ بات ذہن
 میں رکھیے، میں ان کے لیے اجنبی اور اڈے کے
 دیوں سے ان کا روز کا واسطہ تھا، لیکن ان میں کچھ
 اس موقع پر میری حالت دیکھنے، میری مجبوری سمجھنے
 اور سچ بیانی کا حوصلہ رکھنے والے لوگ بھی ضرور
 ہوں گے۔ کسی سے گواہی طلب کی جاتی تھی کچھ
 ماننے آتا۔ گلی سے میرے نکلنے ہی ماہا کا رنج گئی۔
 ڈے کے کچھ آدمی شامل ہو گئے اور بروٹی اس سمت
 اشارے کرنے لگا، جدھر میرا تانگا بڑھ رہا تھا۔
 انہوں نے پولیس کو بھی ساتھ کر لیا۔ میرا چاقو، میری
 سیب میں تھا۔ یہی ایک دلیل کافی ہے، لیکن دلیلیں
 سنے کی نوبت ہی کہاں آئی۔ میدانے شاید واقف
 کی نوعیت سمجھنے کی کوشش کی گئی۔ اسے چاقو بردار کی
 چٹائی کا بھی علم ہوگا۔ جیسا کہ میں نے آپ سے
 پہلے کہا تھا، ایک اجنبی کے بجائے اڈے کے کبیدہ
 خاطر آدمیوں کو مطمئن رکھنا میدانے کے لیے ضروری
 تھا۔ اسے اس وقت کوئی اندازہ نہیں ہوگا کہ بات
 اتنی دور جا سکتی ہے۔ یہی کچھ تو وہ آپ کی موجودی
 میں کہہ رہا تھا۔

ڈاکٹر چپ رہا۔ جینا کا بے قرار سراپا ساکت
 ہو گیا تھا۔ اس دوران خاناماں نے کافی لاکھ میز
 پر رکھ دی تھی۔ چند لمبے گزر گئے تو جینا نے کہتی
 آواز میں خاموشی جاک کی۔ ”اب تو کوئی کھٹک
 نہیں رہی پاپا؟ آپ نہیں تو کافی بناؤں۔ آپ لوگ

بڑی عجیب قسم کی باتیں کر رہے تھے۔ میں نے منتشر
 کرنا مناسب نہیں سمجھا۔“

ڈاکٹر نے رنجی انداز میں بیٹی سے معذرت کی۔
 بیانی میں کافی لوٹتے ہوئے بیٹا کہنے لگی، ”پاپا
 کی زبانی میں یہ خوف ناک واقعہ تھوڑا بہت سن چکی
 ہوں، لیکن اب تو لگ رہا تھا جیسے میں وہاں موجود
 ہوں، چاقو کھلے ہوئے ہیں، لوگوں کی بھیڑ ہے اور
 ان میں بھی ایک گواہ ہوں۔“

”آپ تو ویسے بھی ایک خیال کار ہیں، پہلے
 تصور، پھر حقیقت۔ مصور تو تصور کی فراوانی ہی سے ذہن
 ہے۔“

”لیکن تصور کی کثرت بھی بہت تنگ کرتی
 ہے۔ آدی ستوں میں بھٹک جاتا ہے، یک سو نہیں
 رہ پتا اور کہیں مطمئن نہیں ہوتا۔“ وہ خواب ناک
 لہجے میں بولی۔

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ قرار تو استقرار میں ہے۔
 زندگی تو یوں منزلیں سر کرنے ہی میں گزر جاتی
 ہے۔

کافی ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ اس نے خاناماں کو
 آواز دے کے دوسری گرم کافی لانے کی ہدایت کی
 اور تحس آواز میں گویا ہوئی ”پاپا کہہ رہے تھے،
 آپ کو چاقو بازی خوب آتی ہے۔“

”یہ کوئی ایسی فضیلت نہیں جس کا ذکر سرائی کے
 یاد دہی آواز میں کیا جائے۔“

”بیرا تو نہیں مانا آپ نے۔“ وہ گھبرا کے
 بولی۔ اس کی گھبراہٹ میں بھی کیا دل کشی تھی۔ اس
 نے جلدی سے وضاحت کی، ”اصل میں آپ کو کچھ
 کے بہت سے سوال ذہن میں کھلبلتا ہے۔“

”مجھے اندازہ ہے، لیکن یقین کیجیے، کوئی تہ در
 تہ کوئی سر نہیں نہیں ہے۔“

”پھر بھی کچھ تو ہے، کچھ بتائیے نا۔“

”اگر سامنے کا منظر اتنا ناگوار خاطر محسوس نہیں
 ہو رہا تو پیچھے کی جانب کیوں نظر کی جائے۔ ماضی کی

راکھ میں چنگاریاں بھی چھپی ہوتی ہیں۔“

”وہ تو لگ رہا ہے۔“ وہ مسکرا کے بولی۔

”کیا لگ رہا ہے؟“

”چنگاریاں، کھٹائیں، داستانیں، بہت کچھ۔“

”آپ کو مصوری کے ساتھ قلم کاری بھی کرنی
 چاہیے۔“

”محض قیاس ہے میرا، غلط بھی ہو سکتا ہے۔“

”اور میں کہنا چاہتا ہوں، ماضی سے حال کا کتنا
 تعلق ہے۔ صرف حال ہی پیش نظر ہونا چاہیے۔
 آدی کا حال ماضی سے بہت مختلف ہو سکتا ہے تو پھر
 آنے والے وقت میں بھی کیا کچھ بدل سکتا ہے۔
 آدی تو بدلتا رہتا ہے، اور جو سامنے ہے، وہی معتبر
 ہے۔“

وہ دیکتی نگاہوں سے مجھے دیکھتی رہی۔ ”آپ کو
 انگریزی میں اپنا مدعا بیان کرنے کی کیسی قدرت
 ہے۔“

”انگریزی تو آپ بولتی ہیں، رواں، سبکل،
 شستہ، صحیح برطانوی طرز کلام، بالکل گوروں کی
 طرح، بل کہ ان کی اشرافیہ کی طرح۔“

وہ ہنسنے لگی، ہال میں چھنا کا سا ہوا۔ ”میں
 انگلستان میں بہت دن رہی ہوں۔“

”وہی تو.....! میں تو ہندستانی لہجے میں
 انگریزی بولتا ہوں۔ کبھی تو خود مجھے اپنا لہجہ بہت
 چہیتا ہے۔“

”نہیں، ایسا کچھ نہیں۔“ اس نے میری کسر نفسی
 ایک سر مستر د کر دی۔

”ان چار پانچ دنوں میں، جب سے اسپتال
 آنا ہوا ہے، میں تر انگریزی سے واسطہ پڑتا رہا
 ہے۔ نرسیں، ڈاکٹر، سبھی انگریزی کے عادی ہیں۔
 حالانکہ اسپتال میں نوے فی صد سے زیادہ مریش
 ہندستانی ہوں گے۔ وہ جو کہتے ہیں، گٹ پٹ
 کرتے کرتے جڑے دکھنے لگے ہیں، کچھ یہی حال
 ہو چکا ہے میرا۔“

”بہشت!“ ڈاکٹر رائے نے بہت دیر بعد چھیٹے
 لہجے میں مداخلت کی۔ ”تم خاص کمروں کی بات
 کر رہے ہو، یہ گٹ پٹ تو انہی کمروں سے مخصوص
 ہے۔“

خاناماں نے تازہ کافی لاکے رکھ دی تھی۔ جینا
 نے غلٹ کی، اس مرتبہ کافی کو ٹھنڈا ہو جانے کا ذرا
 سا وقت نہیں دیا۔ مجھ سے متدار پوچھ کے اس نے
 شکر تحمیل کی۔ پہلے اپنے باپ کے سامنے بیانی
 رکھی۔ پھر میرے آگے۔ شکر نے سیاہ کافی کی تھی
 خاصی کم کر دی تھی۔ کافی کا گھونٹ بھر کے جینا نے
 گلابی ہونٹوں سے رومال مس کیا اور چپک کے
 بولی، ”پاپا سے معلوم کیجیے، ہم جو لوگ میری کیسی کم
 زوری ہیں۔“

”پھر آپ اپنی تصحیح کر لیجیے، میں مہم جو قطعاً
 نہیں۔ ہمیں تو مجھ پر وارد ہوتی رہتی ہیں اور جبراً
 مجھے ان سے نبر آنا ہونا پڑتا ہے۔ کہیں خود میری
 زندگی کا معاملہ ہوتا ہے، کہیں کسی دوسرے کی۔ میں
 ایک بات صاف کر دوں، اڈے پاڑوں سے میرا
 تعلق بالواسطہ رہا ہے۔ میں اڈے پاڑوں کا آدی
 نہیں ہوں۔“

”سمجھتے ہیں ہم۔“ جینا کے بجائے ڈاکٹر رائے
 سرزنش کے انداز میں بولا۔ اس کے لہجے میں بڑا اپنا
 پن تھا۔ وہ بیٹی سے کہنے لگا، ”تم محتاط رہو تو اچھا
 ہے۔ اندیشہ ہے، تمہارے سوالوں کے جواب میں
 اس نے سچ بولنا شروع کر دیا تو تم سے برداشت
 نہیں ہو جائے گا۔ یہ سب سے مجھے مسلسل حرجان کر رہا
 ہے۔ سچ اس نے یقین سے کہا تھا کہ آج کبھی وقت
 میدانے کو اسپتال آنا چاہیے۔ شام کو وہ موجود تھا۔
 یہ میرے لیے ایک نیا آدی ہے، ایک تجربہ، بل کہ
 ایک مہم۔ پھر اس نے میدانے شہر کے سب
 سے بڑے ہسپتال سے جس انداز کا سلوک کیا، وہ
 دیدنی تھا۔“

”ڈاکٹر صاحب!“ میں نے التجا کی، ”اتنا

مت کیے۔ میری جگہ آپ ہوتے، میری طرح اس ساری صورت حال میں شامل، اور میری طرح آپ پر گزر رہی ہوتی تو آپ بھی یہی کرتے، اسی نتیجے پر پہنچتے۔

”شاید نہیں۔ جڑی طور پر تم درست کہتے ہو۔“ ڈاکٹر نے فرخ دلی سے اعتراف کیا، ”میں تمہاری جگہ ہوتا تو اتنی استقامت نہ دکھاتا۔“

”میری استقامت کی ایک وجہ آپ بھی تھے۔ آپ نے میری بات محل سے سنی اور میری پاس بانی کی۔“

”تم اپنے بزرگ کو عزت و تکریم سے نواز رہے ہو۔ یہ اچھی بات ہے۔ لیکن میں نے تو بہت بعد میں یہ سارا کچھ جانا تھا۔ اس سے پہلے تو تم بہت کچھ خود ہی سمجھتے رہے تھے۔ ڈاک خانے والی جی کا واقعہ، اکبر علی خاں کے گھر میں تمہارا داخلہ اور میڈا کے اڈے پر جانے کا حوصلہ..... ان سارے مراحل سے تم گزر چکے تھے۔ میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں، میں نے تو جج کی اعانت کی ہے۔ چوں کہ تم جج بولتے رہے تھے، لیکن.....“ اس کی آواز بھاری ہو گئی۔ ”تم نے ایک جج نہیں بولا.....“

”وہ کیا؟“ میں نے حیرانی سے کہا۔

”..... کہ مریض تمہارا اصل بھائی نہیں ہے۔“

مجھے جھکا سا لگا۔ کئی بار دل میں آیا تھا کہ میں ڈاکٹر پر یہ حقیقت آشکارا کر دوں، لیکن کچھ تو جج میں اس جج یابی کا موقع نہیں آیا، یا پھر کوئی دور پرے کی احتیاط مانع رہی کہ ڈاکٹر کے ذہن میں پھر کیسے کیسے سوال اٹھے لگیں، یا پھر مجھے اس وضاحت کی ایسی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ پشیمانی کے چند لمحوں بعد میں نے اس سے یہی کہنا چاہا کہ بھائی کیا، میرے تو بھل سے بہت سے رشتے ہیں۔ وہ میرا باپ ہے، دوست، بزرگ، مربی و مکن ہے۔ وہ تو میرا آقا ہے، میرا سایہ، میرا ستون ہے۔ ڈاکٹر کی آسانی کے لیے میں نے ”بھائی“ کی نسبت معین

کر دی تھی۔ کیا ضروری ہے کہ بھائی ہی کا رشتہ مستحکم ہو۔ بھائی تو صرف بھائی ہوتا ہے۔ کیا ڈاکٹر نے بھل کے لیے میری نگہداری، میری تشویش، میرے اضطراب میں کوئی کوتاہی دیکھی ہے۔

میرے زبان کھولنے سے پہلے ڈاکٹر نے مجھے روک دیا۔ ”جانتا ہوں، تم کیا کہو گے۔ واقعی میں نے اصل رشتوں میں بھی ایسی قربت نہیں دیکھی۔“

ڈاکٹر کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ ایک ملازم نے آکے کی اسپیکٹر کی آمد کی اطلاع دی۔

”سکینا؟ ابھی تو وہ یہاں سے گیا ہے۔“ ڈاکٹر رائے الجھ کے بولا، ”اب کیا بات ہے؟“

میرا ہاتھ ٹھکا۔ اسپیکٹر کا دوبارہ آنا اور اس وقت آنا بے علت نہیں ہو سکتا تھا۔

میرا نے باپ کو مشورہ دیا کہ گھر میں مہمان موجود ہے، اسپیکٹر کو منع کر دیا جائے۔

ڈاکٹر نے اس کی بات نہیں مانی۔ ملازم منتظر کھڑا تھا۔ ڈاکٹر نے اسپیکٹر کو سبزہ زار میں بٹھانے اور کافی پیش کرنے کی تاکید کی۔

میرے لیے اب رخصت کی اجازت لے لینا ہی مناسب تھا لیکن میرا نے کچھ دیر اور ٹھہر جانے کی منت کی، ادھر ڈاکٹر کا بھی یہی حکم تھا۔

جلد آنے کا کہہ کے ڈاکٹر ہمارے پاس سے چلا گیا۔ میں اور بیٹا تمہارہ گئے۔ گو میرا دامخ اسپیکٹر کی ناوقت آمد کی ادھیڑ بین میں لگا ہوا تھا، لیکن سامنے بیٹا بھی، ماہ جمال، خوش مقال، خوش خیال بیٹا۔ میں نے اپنا دھیان بنانے اور میزبان کی خوش نویدی کے لیے اس کی تصویریں اور مجھے دیکھنے کی فرمائش کی۔ میرے اشتیاق پر اس نے خوشی کا اظہار کیا اور دن میں کسی وقت گھر آنے کی دعوت دی کہ اس کی تخلیقات کی نظارگی کے لیے دن کا وقت ہی موزوں ہوتا۔

”مجھے احساس ہو رہا ہے، میں آپ دونوں کے معمولات میں حارج ہو رہا ہوں۔“

”بالکل نہیں۔“ اس نے خوش وضعی سے تردید کی۔ ”پاپا تو رات گئے تک مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ پاپا یا ان ڈاکٹروں میں نہیں جو ایک بار ڈگری لے کے سمجھ لیتے ہیں کہ بس سب کچھ جان لیا، میدان مار لیا۔ پاپا طب کی جدید کتابوں، دواؤں اور امراض کی تازہ ترین تحقیقات سے متعلق کتب و رسائل کا مطالعہ کرتے ہیں۔ وہ جتنے پرانے ڈاکٹر ہیں، اتنے ہی نئے بھی۔“

”لوگوں کا ان پر بڑا عقیدہ ہے۔ کہتے ہیں، کسی کسی کے ہاتھ میں شفا ہوتی ہے۔ یہاں اسپتال میں ڈاکٹر صاحب کی یہ کرامت بہت مشہور ہے۔“

”شفا تو ڈاکٹر کے علم، اس کی سنجیدگی، صحیح تشخیص، مریض سے ہم دردی، غرض اپنے کام میں دیانت کی وجہ سے ہوتی ہے۔ پاپا کے لیے ہر مریض ایک سا اہمیت رکھتا ہے، اور وہ اس پر پوری توجہ دیتے ہیں۔ کسی پیچیدہ مرض پر وہ دوسرے ڈاکٹروں سے مشورہ کرنے میں ڈرا تکلف نہیں کرتے۔“

”مجھے اس کا تجربہ ہوا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ایک بے مثال ڈاکٹر ہیں اور آدمی بھی بہت نادر۔“

میرے اعتراف کی صداقت اس نے محسوس کی کہ اس کی آنکھوں میں شرارے نمودار ہوئے۔

”اور آپ..... آپ کیا کرتی ہیں ان اوقات میں؟“ میں نے تمام تر شائستگی سے پوچھا۔

”کوئی ایک کام نہیں۔“ وہ خواہیدہ سی آواز میں بولی۔ ”کبھی ادھوری تصویریں مکمل کرتی ہوں، کبھی گراموفون سنتی رہتی ہوں، کبھی ریڈیو، کبھی ستار بجانے لگتی ہوں، زیادہ تر کتابیں پڑھتی ہوں۔ کتاب بھی کھڑکی کی طرح ہوتی ہے، جھانک تو کچھ نہ کچھ ضرور نظر آتا ہے، ہر بار نیا منظر۔“

”لیکن بعض کھڑکیوں کے آگے دیوار بھی پڑ جاتی ہے۔“

میرے بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ وہ کھل کھلا پڑی۔ ”بعض کتابیں بھی ایسی کھڑکیوں کے مانند

ہوتی ہیں، یہی کہنا چاہتے ہیں نا آپ۔“

اس نے میری بات سے لطف لیا۔ میرا مقصد بھی یہی تھا۔

”اور ایک مصروفیت تو میں بتانا ہی بھول گئی۔“ اپنے مخاطب سے اس کے کلم کا کلف اب کچھ ٹوٹ رہا تھا۔ کہنے لگی، ”کبھی کسی چیز میں جی نہیں لگتا تو پاپا کے کمرے میں چلی جاتی ہوں۔ انہیں دیکھتی رہتی ہوں۔ ان سے زندگی سیکھنے کی کوشش کرتی ہوں۔ وہ بھی کتاب چھوڑ کے مجھ سے باتیں کرنے لگتے ہیں۔ طب کی کتابوں کے علاوہ پاپا کو ادب کا بھی اچھا ذوق ہے۔ دنیا کے مشہور ناول، کہانیاں پڑھنے کے لیے جانے کیسے وقت نکال لیتے ہیں۔“

”آپ اپنے پاپا سے بہت محبت کرتی ہیں۔“

”وہ میرے دیوتا ہیں، میرے باپ اور ماں بھی۔“

”اور آپ کی والدہ.....؟“

”وہ اب تک ہیں ہمارے درمیان۔“ وہ اداس ہو گئی۔ میں نے افسوس کا اظہار کیا تو بولی، ”تعلیم مکمل ہو گئی تھی، لیکن آرٹ پر کچھ اور پڑھنے کا ارادہ تھا۔ پاپا کی تنہائی کا سونچ کے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے یہاں چلی آئی۔“

”اب آپ کا یہاں دل لگتا ہے؟“

”یہ میرا وطن ہے۔ یہاں میرے پاپا رہتے ہیں۔“

اس سے پہلے کہ وہ میرے بارے میں سوال کرنے لگتی، میں نے انگلستان کی زندگی کا ذکر چھیڑ دیا۔ میں نے دیکھا تھا، لوگ کتنے ہی گوروں سے ناراض، ان کے ذہن ہوں، انگلستان کے نظم و ضبط کی مدح و ثنا کرتے نہیں تھکتے۔ پھر تو جیسے بیٹا کو موضوع مل گیا۔ ایک دربار واں ہو گیا۔ وہ پٹر پٹر باتیں کرنے لگی۔ میرے کان ڈاکٹر کی وابستگی کی آہٹ کے منتظر تھے۔ میں نے کوشش کی کہ بیٹا کو میری بے چینی کا احساس نہ ہو پائے۔ یوں اس کی

قربت ہی کچھ کم سحر ناک نہیں تھی۔ کاش، انیسٹر کی آمد سے یہ رختہ انداز کی نہ ہوتی۔ بعض لوگ بھی رنگا رنگ منظر کی طرح ہوتے ہیں۔ وہ انگلستان میں ایک عرصہ گزار کے آئی تھی اور گوروں کی علوم و فنون سے دل چسپی، کام کی لگن، وقت کی پابندی، نفاست اور سلیقے سے بہت متاثر تھی، لیکن کبہ رہی تھی، یہاں اپنے وطن کی بے اطواری، بے سلیقگی میں بھی ایک رنگ ہے۔ میں نے اس سے بحث نہیں کی کہ اس نے یہاں کیا دیکھا ہوگا۔ یہاں تو بہت اندھیرے ہیں۔ اس نے یہاں کی غربت اور اس کے عذاب کہاں دیکھے ہیں، اور جہالت تو سب سے بڑی غربت ہے۔ ہندستان تو اب اپنی جہالت کا خمیازہ بھگت رہا ہے۔ میں نے کچھ نہیں کہا۔ میں تو سنتا رہا، اور میری خوش سچی سے وہ میسر ہوئی رہی۔

”آپ آئیں گے نا پھر؟“ اس نے حسرتی لہجے میں کہا۔

”جب تک یہاں ہوں، آتا رہوں گا۔ آپ بلائیں گی اور ڈاکٹر صاحب کا حکم ہوگا تو کیوں نہ آؤں گا۔“

”آپ سے مل کے عجیب سا احساس ہوا۔ بہت دنوں بعد کوئی۔۔۔۔۔“

ڈاکٹر کی آمد پر جیسے کسی خواب سے آکھ کھل گئی۔ ڈاکٹر کا چہرہ دیکھ کے اندازہ ہو گیا کہ انیسٹر سکسینا نے اس سے کچھ خوش گوار باتیں نہیں کی ہیں۔ ڈاکٹر کو گے دیر بھی خاصی ہو گئی تھی۔ میں نے اسے سانس لینے کا وقت دیا، پھر پوچھا۔ ”خیریت تو ہے؟“

”ہاں، ہاں۔“ اس کے تیور کسی حد تک مفازانہ تھے، معاندانہ نہیں۔ ”یہ تھا کہ بستی کا کیا قصہ ہے؟“ اس نے ناگواری سے پوچھا۔

میں نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔

میری خاموشی پر وہ ڈپٹ کے بولا، ”چپ رہو؟“

”سوچ رہا ہوں، کیا بتاؤں آپ کو۔ اس کا مطلب ہے، فیض آباد پولیس سے ان کا رابطہ ہو چکا ہے۔“

”سکسینا یہی بتانے آیا تھا۔“

”اور اس نے خواہ مخواہ آپ کو تنگ کیا۔ اس کے پاس کہنے کے لیے یہی کچھ ہوگا کہ فیض آباد پولیس تھا کہ بستی میں ہونے والے قتل و خون کا کوئی سراغ نہیں لگا سکی۔“

”ایسا ہی کچھ کہا اس نے۔“

”تو آپ اتنے فکر مند کیوں ہو رہے ہیں۔ اڈے پاڑوں سے متعلق لوگوں پر سنگین الزامات عائد ہوتے رہتے ہیں۔ کیا میں اور بھائی تھا کہ بستی کے حادثے میں فیض آباد پولیس کو مطلوب ہو گئے ہیں؟“

”اس نے یہ کچھ نہیں کہا۔“

”تو پھر کیا مسئلہ ہے؟ میں آپ کو بتاتا ہوں، اگر آپ سننا چاہتے ہیں۔“

”میں۔۔۔۔۔ میں جانتا چاہتا ہوں۔“

میں نے اسے بتایا کہ فیض آباد میں قیام کے دوران ایک روز بازار میں اڈے سے وابستہ ہریاتی آدی پر زیادتی ہوئی دیکھ کے مجھ سے رہا نہیں گیا، مجھے قتل دینا پڑا۔ یہی ایک واقعہ ام پر پولیس کے شک کی بنیاد بنا۔

فیض آباد کے قریب واقع تھا کہ بستی میں ایک خاندانی جاگیر دار تھا کہ ہر دیو کی علاقے بھر میں دہشت، اس کے بدکار بیٹے تھا کہ بل دیو کی فیض آباد میں مقیم ایک نوجوان، حسین و جمیل، تعلیم یافتہ اور آسودہ حال لڑکی برکھا پر فریفتگی اور شادی کے لیے پیام۔ برکھا کے باپ کے انکار پر تھا کہ بل دیو کا غتاب، برکھا کا اغوا اور اڈے کے آدی کے آڑے آجانے پر ناکامی، انتقاماً اڈے کے دو آدمیوں کا قتل، دوسری کوشش میں برکھا کے گھر پر حملہ، دو ملازموں کی ہلاکت اور برکھا کا اغوا، اور

دوسرے تیسرے روز گھر کے قریب برہنہ اور شکستہ لاش کی صورت میں برکھا کی بازیابی، صدمے سے باپ کے حواس معطل، چند دنوں بعد ایک رات تھا کہ بستی کی بابائی، شاگردوں کی ساری حوصلی، کھیت کھلیان نذر آتش، شاگرد، خاندان کے دیگر افراد، ملازمین اور مصاحبین پر مشتمل بیالیس آدمیوں کی موت، اڈے کے دو آدمیوں کی ہلاکت سے ہم پر پولیس کے شک کی پختگی، حادثے کی تفتیش کے لیے پولیس کے بڑے بڑے افسروں کی تعیناتی، کو توالی میں میری، قتل اور اڈے کے سارے آدمیوں کی طلبی، سوال جواب اور کوئی ثبوت نہ ملنے پر کو توالی سے ہماری یہ عافیت واپسی کا سارا واقعہ ڈاکٹر کی شرح صدر کے لیے مجھے سنانا پڑا۔

دونوں باپ بیٹی سن سے ہو گئے۔ بیٹا کے چہرے کی چہا زرد پڑ گئی تھی۔ ڈاکٹر بھی گنگ بیٹھا رہا۔ ان کے عالم حیرت کی ایک وجہ مجھ پر ان کا اعتبار تھا۔ نہ میں کسی غلط بیانی کا مرتکب ہوں گا نہ کسی مبالغے کا۔

میں نے ڈاکٹر کو بتایا، پولیس کے اطمینان کی خاطر ہم نے فیض آباد میں قیام کی مدت بڑھا دی۔ سترہ اٹھارہ روز بعد ہم نے از خود کو توالی حاضری دے کے پولیس افسروں کو فیض آباد سے اپنی روانگی سے مطلع کیا۔ انہوں نے ہمیں نہیں روکا۔ تاہم ہم نے اپنی جانب سے انہیں یقین دلایا کہ اس خوں ریزی میں ہمارے عمل دخل کا کوئی اشارہ نہیں ملے گا، تو ہم کہیں ان سے دور نہیں ہوں گے۔ پولیس، فیض آباد میں ہمارے گھر، یا کھلتے کے اڈے پر طلبی کا پیغام بھیج دے۔ ہم جہاں ہیں ہوں گے، فیض آباد پہنچ جائیں گے۔

”مگر تھا کروں کی بستی میں کس نے آگ لگائی؟“ ڈاکٹر کی آواز دھڑک رہی تھی۔

”کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ تھا کروں نے گرد و نواح میں جانے کب سے بہت تباہی مچائی ہوئی تھی۔ کسی

کی عزت آبرو محفوظ نہیں تھی۔ ظاہر ہے، انہوں نے بہت سے دشمن پیدا کر لیے ہوں گے۔“

”تم کیا سمجھتے ہو؟“

”میں نے اس پر بہت غور کیا تھا، ہر پہلو سے اور میں آپ کو بتاؤں، مجھے قتل بھائی پر بھی شبہ ہوا تھا۔ شبہ کا وجہ وہی تھی جو پولیس کی تھی۔ ایک اور وجہ بھی سمجھ میں آئی تھی۔ تھا کہ بل دیو فیض آباد میں ہماری موجودگی اور شہر کے اڈے کی پشت پناہی کا علم یقیناً ہو گا۔ اڈے کے بعض آدمیوں کو ہمارے گھر آنے کی اجازت ملی ہوئی ہے۔ یہ خدشہ رد نہیں کیا جاسکتا تھا کہ کسی دن تھا کہ بل دیو اپنے زور و اثر کے فتنے میں ہمارے گھر کو نشانہ نہ بنائے، لیکن پولیس کی طرح میرے پاس بھی کوئی گواہی نہیں تھی۔ جس رات یہ واقعہ ہوا، ہم سب فیض آباد میں تھے۔ میں مسلسل قتل بھائی کے ساتھ تھا۔ پولیس کو شہر میں ہماری موجودگی کی ساری شہادتیں مل گئی تھیں۔“

”بیالیس آدمیوں کی موت، اتنا سنگین واقعہ! کوئی نقش، نشان، کوئی علامت نہیں۔“ ڈاکٹر کی حیرت بے جواز نہیں تھی۔

”تفتیش کے لیے گورے افسر بھی آئے تھے۔ انہوں نے تو حادثے کی جگہ کا سناٹہ بھی کیا تھا، مگر سنا ہے، سب کچھ خاکستر، کھنڈر ہو چکا تھا۔“

”صبح سویرے اکر علی خاں کے قتل کی جگہ پر تین لاشیں پائی گئیں۔ گان ہے، انہی تین آدمیوں نے اکر علی خاں کا خون کیا تھا۔ کسی نے انہیں ان کے انجام تک پہنچا دیا۔ پولیس کو کوئی ثبوت نہیں ملا۔ میرا اپنے اڈے پر آرام سے بیٹھا ہوا ہے، اس کے سامنے کبھی۔ شاگرد بستی اور یہاں، بٹے کے واقعے میں ہمیں کوئی مطابقت نظر نہیں آتی؟“ ڈاکٹر رائے بگڑے تیوروں سے بولا، ”یاد ہے، جنہی نے کہا تھا کہ ان تین آدمیوں کے قاتلوں کی گرفت آسان نہیں ہے۔ کیوں کہ اگر یہ میرا اور اس کے ساتھیوں کا کام ہے تو انہوں نے اپنی گردنیں محفوظ کر لینے کی

ہر تہہ پیر کر لی ہوگی، یعنی میدانے یہ کام کسی اور کو سونپا ہوگا۔“

”جی ہاں۔“ میں نے اقرار کیا۔ ”یہی کہا تھا میں نے اور کچھ ایسا ہی نظر آتا ہے۔“

”پھر..... پھر یہ بھی تو ممکن ہے کہ ٹھا کر بستی میں تمہارے۔“ ڈاکٹر نے اپنی بات خود ہی ادھوری چھوڑ دی، کیوں کہ اسے میرا جواب معلوم ہوگا۔ وہ خاموش ہو گیا۔

میں نے اس کی دل جوئی کے لیے کہا، ”اسپیکٹر سکسینا کو اس وقت یہاں آنے کی ایسی ضرورت نہیں تھی۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں کہ آپ کو ابھی اس سے باخبر کرنا لازم ہو۔“

”وہ نہیں آیا تھا۔“ ڈاکٹر نے ترشی سے کہا، ”اسے ڈی آئی جی نے بھیجا تھا۔ وہ تمہاری نعل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ انہیں معلوم تھا کہ تم اس وقت میرے گھر یہ ہو۔ اسپیکٹر سکسینا ڈی آئی جی کی طرف سے مجھے متنبہ کرنے آیا تھا کہ تم پر اور تمہارے بھائی پر اتنی شدید نوعیت کے الزامات ہیں۔“

”محض الزامات نا!“ میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

”کاش، الزامات ہی رہیں۔“
”آپ کا دعایہ لہجہ شک سے آلودہ ہے۔“
”نہیں نہیں۔“ ڈاکٹر کا لہجہ بدافغانہ ہو گیا۔
”پولیس کے پاس فضول قسم کے کام بہت ہوتے ہیں۔“

”ہاں پاپا، کیا غلط ہے، دیکھیے نا پولیس افسر نے ہماری ایک خوب صورت شام بل کہ رات منتشر کر دی۔“ بیٹا نے دے لہجے میں پاپ سے شکایت کی ”میں اسی لیے آپ کو منع کر رہی تھی۔“

”پھر تم ٹھا کر بستی کے اس عبرت ناک واقعے سے محروم رہ جاتیں۔“ ڈاکٹر کی آنکھوں میں خاصی دیر بعد آسودگی نمودار ہوئی۔

”یہ بہت سنسنی خیز تھا۔“ بیٹا نے جھرمھری لے کے کہا، ”نا قابل یقین۔“

”مجھے شبہ ہے، اس قسم کے کتنے واقعات اس کے سینے میں دفن ہوں گے۔“

ڈاکٹر کی قیاس آرائی میں طنز کی رتق دانستہ نہیں تھی۔ دانستہ بھی ہوتی تو میں کیا کر سکتا تھا۔ ”ان پر مٹی ہی پڑی رہنے دیجیے۔“ میں نے پڑمردگی سے کہا۔

”دیکھا!“ ڈاکٹر نے اچھل کے بیٹی کو مخاطب کیا، ”یہ کیسا مختلف نوجوان ہے، اور بھی..... اور بھی ایسے واقعات سے اس کا سابقہ پڑا ہے۔“

”میرے لیے تو یہ دریافت کی حیثیت رکھتے ہیں۔“ بیٹا بے اختیار سی ہو کے بولی۔

”میرا خیال ہے، اب مجھے چلنا چاہیے۔“ میں نے مسکرا کے کہا، ”رات بھی بہت ہوئی ہے۔“
”بیٹھے نا، کچھ دیر اور۔“ وہ اٹھلائی آواز میں بولی اور باپ کی طرف حمایت طلب نظروں سے دیکھا۔ ”کیوں پاپا! ایک کافی اور نہ ہو جائے۔“ کافی یا چٹھا اور.....“

کھانا کھائے وقت ہو چکا تھا۔ بیٹا اٹھ کے ہال سے باہر چلی گئی۔ خانسا ماں شاید کہیں قریب ہی تھا کہ وہ نور او ابس آگئی اور تیز سانسوں سے بولی، ”کیا آپ نے ابھی ٹھا کر بستی..... جس جگہ کا یہ واقعہ بتایا ہے، دوسری جگہوں پر بھی ایسا ہی ہوتا ہے؟“

”یہ کیا، اس سے بڑی حقیقتیں ہیں۔ یہاں صرف گورور کی حکومت نہیں، بے شمار ظم مراں ہیں یہاں، دولت مند، زمین دار، جاگیر دار، نوابین۔ بانی خلقت تو ان کے پالتو جانوروں کی طرح ہے، ان کے گھوڑوں، ان کے کتوں کی طرح۔ بانی سارے ان کی رعیت ہیں، ان کے غلام۔ یہاں کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔“ میں نے خود کو تھما ماورا پنچے لہجے کی جی پر معافی مانگی۔

”میں..... میں پاپا، آپ سے کیا کہتی ہوں۔“

بیٹا جو شیلے انداز میں بولی، ”یہ وہی بات کر رہے ہیں۔ یہاں تو دو قسم کے آدمی رہتے ہیں، ایک حاکم، ایک مظلوم، آقا اور غلام۔ نواب راجا لوگ وہاں بھی بہت ہیں، لیکن ایسا کچھ، یہاں جیسا کچھ نہیں۔“

”وہ ایک اور دنیا ہے۔“ ڈاکٹر کے لہجے میں بے چارگی سی تھی۔ ”وہ تین صدیوں سے جاگ رہے ہیں۔“

”اور ہم.....؟ ہم سوتے رہے ہیں۔“ بیٹا تڑپا سے بولی۔

”نہ سوتے ہیں، نہ جاگ رہے ہیں۔“ ڈاکٹر نے اداسی سے کہا، ”ہم کچھ تھک سے گئے ہیں۔ قوموں پر تلکان، اعصاب شکنی اور غنودگی کے یہ دور آتے رہتے ہیں۔“

خانساہاں نے بہت غلٹ کی۔ کافی کے ساتھ انگریزی بکٹ، خشک میوہ اور دال موٹھ وغیرہ کے لوازم بھی تھے۔ کافی ختم کر کے میں اٹھ گیا۔ پھر انہوں نے مجھے نہیں روکا۔

ہم ہال سے باہر آ گئے۔ بالکی سی ٹھنڈی ہوا پر رات کی رانی کا راج تھا۔ دونوں میرے ساتھ دروازے تک بڑھتے اور مجھے شرمندہ کرتے رہے۔ دروازے پر آ کے بیٹا نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ ایک کھٹے کے لیے جی میں آیا کہ اس کے ہاتھ کو بوسہ دوں، دوسرا لمحہ بہ ہر حال میرے اختیار میں آ گیا۔ مصافحہ کرتے ہوئے اس کی سخر دہلی انگلیوں کی گرفت سے اس کی سرخوشی جھٹک رہی تھی۔ مجھ سے دوبارہ آنے کا وعدہ لے کے وہ دروازے سے لوٹ گئی، لیکن ڈاکٹر رائے میرے ساتھ باہر آ گیا۔ میں نے اس سے واپس چلے جانے کی عاجزی کی۔

”کچھ چہل قدمی ہو جائے گی۔“ وہ بے نیازی سے بولا۔

کہا، ”بیٹا، آپ کی صاحبزادی تو بہت لائق ہیں۔ ان کا کام بہت متاثر کرتا ہے۔“

”اس میں بہت سے گن ہیں۔“

”وہ تو کوئی شہزادی ہیں۔“

”حالاں کہ باپ بادشاہ نہیں۔“ وہ ہنس کے بولا۔

”باپ کا درجہ بادشاہوں سے بلند ہے، باپ تو ایک مسیحا ہے، باپ تو ایک فرشتہ ہے۔“

”اوہ، تمہیں نہیں، اتنا مت کہو۔“ وہ ناراض ہونے لگا۔

”میں جو سمجھتا ہوں، جو میں نے دیکھا ہے، وہی کہہ رہا ہوں۔“ میں نے اصرار کیا۔

”ہم کیا بات کر رہے تھے؟“ اس نے اپنے ذکر سے بھٹکانے کے لیے موضوع بدلا دیا۔

”آپ شہزادی کی بات کر رہے تھے۔“ میں نے اسے یاد دلایا۔

”ہاں، میں کہہ رہا تھا، میرے لیے وہ یہاں آگئی ہے، لیکن کبھی کبھی مجھے لگتا ہے، اس نے اپنے آپ سے زیادتی کی ہے۔ اسے یہاں بہت محسن بھی ہوتی ہوگی۔“

”وہ تو بہت خوش دکھائی دیتی تھیں۔“

”گھر میں کم لوگ آتے ہیں اور بہت کم لوگوں میں اس کا جی لگتا ہے۔ پیش تر ایلی ہی رہتی ہے۔ تمہارے آنے سے خاصی مٹھی کھلی لگ رہی تھی کیوں کہ تم اس کے لیے دوسروں جیسے نہیں تھے، ایک بہت نئے آدمی، ہر اعتبار سے۔“

”میں کیا.....“ میرے شانے سزگے گئے۔

”آپ جب آپسکے سے ملنے باہر چلے گئے تھے تو میری ان سے خوب باتیں ہوئیں ان کے لیے تو سب سے بڑی خوشی یہی ہے کہ وہ اپنے پاپا کے پاس ہیں۔“

”وہ بڑی پگھی ہے۔ سوچو، کب تک میں اس کے ساتھ رہوں گا اور کب تک وہ میرے ساتھ رہے گی۔“

کے گی۔ اسے اپنا گھر تو بسانا ہوگا، بسانا چاہیے۔“

”جی ہاں۔“ میں نے پتکچا کے کہا۔ ”لڑکیوں کے ساتھ یہ کچھ عجیب ہے، ان کا گھر بدل جاتا ہے۔“

”پہلے تو شادی ہی سے انکاری تھی۔ کہتی تھی، میں تو آپ کے ساتھ رہوں گی۔ کیا ضروری ہے کہ ہر لڑکی کی شادی ہو کرے۔ بعد کو میرے سمجھانے بھانے پر آمادہ ہوگئی۔ پھر یہ شرط عائد کی کہ میں بھی اس کے ساتھ رہوں گا۔ میں نے ہائی بھری کہ پہلے وہ اپنے گھر کی تو ہو جائے بعد کو دیکھا جائے گا۔“

”پھر کیا ہے۔ اب تو وہ راضی ہوگئی ہے۔ کوئی ایسا خوش قسمت تلاش کر لیجیے جو آپ کے ساتھ رہ سکے۔“

”لیکن کوئی اسے پسند تو آئے۔ تم نے تو اسے دیکھا ہے، ایسی نفیس طبع، نادرہ کار اور ندرت پسند لڑکی ہے۔ اسے چیدہ چیدہ چیزوں کی عادت ہے۔ کلکتے میں کچھ عزیز رہتے ہیں۔ ان کے نہایت لائق بیٹوں سے ملوایا تھا میں نے اسے۔ اس نے انکار کر دیا۔ میں نے اسے آزادی دی تھی کہ پھر اپنے لیے خود کوئی لڑکا منتخب کرے۔ لندن میں ایک عرصے رہی، وہاں بھی اسے کوئی نہ بھاسا..... تمہیں ایک دل چسپ بات بتاؤ کیا۔“

”جی.....“ میں نے ہنس سے پوچھا۔

”جب مسلسل کئی لڑکے مسترد کر چکی تو مجھ کے سارا بار مجھ پر ڈال دیا کہ جو مجھے پسند آئے، وہ اسے قبول کر لے گی۔“

”تو سب کچھ اب آپ پر منحصر ہے۔“

”اور ظاہر ہے، مجھے کبھی اس کے مزاج، رجحان، طبیعت کا خیال رکھنا ہوگا۔“

”جی ہاں، پھر تو بات وہی کچھ رہی۔“

”وہ بڑی تیز ہے، اسے معلوم ہے، اس کا باپ بھی پسندنا پسند میں کچھ کم حجت نہیں کرتا۔ تم بھی کچھ میری مدد کرو۔“

”جی..... جی ہاں۔“ میں نے تذبذب سے کہا۔

کونٹیوں کے علاقے کی چار دیواری قریب آگئی تھی۔ سامنے دروازہ تھا۔ ڈاکٹر رائے ٹھہر گیا۔ میں بھی رگ گیا۔

”تم سزگرتے رہتے ہو کوئی ایسا نوجوان جو ایسا ہی پر خیال، عزم و حوصلے میں ایک تار پڑھا لکھا، ہوش مند، کچھ تمہارے جیسا۔“ اس نے سراٹھا کے آسمان کی طرف دیکھا اور گمر کی طرف واپس ہو پڑا، اور ابھی قدم دو قدم کا فاصلے کا ہونگا کہ پلٹ کے بولا، ”اور وہ..... وہ تم بھی ہو سکتے ہو۔“

میں اسے دیکھتا رہ گیا۔

ڈاکٹر آہستہ قدموں سے اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ مجھے اپنے حواس کی رکنی پر شبہ ہوا اور جی میں آیا، اس کا تعاقب کروں یا اسے آواز دوں کہ کیا اس نے یہی کہا ہے جو میں نے سنا ہے۔

مجھے یہاں لانے والا ڈاکٹر کا ملازم کچھ فاصلے پر ہمارے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ ڈاکٹر کے لوٹ جانے کے بعد وہ میرے قریب آ کے ٹھہر گیا اور منتظر رہا کہ کب میں اس کے ساتھ چلتا ہوں مگر میرے قدم تو زمین سے جکڑ لیے تھے۔

جانے کیوں مجھے گمان تھا کہ ڈاکٹر مڑ کر مجھے دیکھے گا لیکن وہ دور ہوتا گیا اور بولا سا نظر آنے لگا۔

”چلیں صاحب!“ مجھے بے حس و حرکت دیکھ کے ملازم نے دنی آواز میں رُکا۔

میں نے اضطراب سے سر ہلایا اور پٹناتے ہوئے پلٹ کے دروازے کی طرف چل پڑا ہر طرف سنانا چھایا ہوا تھا اور میرے جسم و جاں میں شور مچا ہوا تھا۔ چند قدم بعد اسپتال کی چار دیواری آ جاتی تھی۔ اسپتال کے اس حصے پر تعینات مستعد دربان نے چند لمحوں کے داخل کے بعد بھانک بھانک دیا۔ سپاہیوں کے انداز میں اس نے مجھے سلام کیا

تھا۔ مجھ سے کوئی جواب دیا جاسکا نہ ہاتھ ہلایا جا سکا۔ سامنے اسپتال کی عمارتیں سکوت میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ راہ داریوں اور مختلف وارڈوں کے درمیان پھیلی ہوئی سڑکوں اور سبزہ زاروں پر نصب روشنیاں ہلکی ہلکی کمرہیں شمار ہی تھیں۔

ڈاکٹر رائے کا خدمت گار میرے ساتھ ساتھ چلا رہا۔ کمرہ نزدیک ہی تھا۔ مجھے اسے لوٹا دینا چاہیے تھا لیکن اس کی ہر اہی میں کوئی سہارا سا محسوس ہو رہا تھا۔ کمرے میں داخل ہونے سے پہلے دروازے پر پتھر کے پیر نے غیر ارادی طور پر مصائب کے لیے ہاتھ بڑھایا تو وہ بوکھلا گیا۔ مجھے خیال نہیں رہا تھا کہ خدام اس عزت افزائی کے عادی نہیں ہوتے۔ وہ سر تا پا لہرا گیا اور جسم خم کر کے اس نے مجھے تعظیم دی تو اتنی مجھے ہشیمانی ہوئی۔

نرس ایک جاگ رہی تھی۔ میری آہٹ سن کر چلتی ہوئی باہر آ گئی۔ ایک لمبی سانس پھینکنے کے بعد وہ چلیں جھکتے گی۔ ”بہت دیر کر دی تم نے۔“ وہ شکایتی لہجے میں بولی۔

”بس“ میں نے سر جھکا کر ناتوانی سے کہا۔

”وقت کا کچھ احساس ہی نہیں رہا۔“

”کیسا رہا؟“ وہ اشتیاق سے بولی۔

”بہت اچھا میں نے بلے لڑی سے کہا۔“

”اوہ شکر ہے۔“ وہ جھرجھری لے کر بولی،

”مجھے تو طرح طرح کے وہم آ رہے تھے۔“

”کیوں..... کیسے وہم؟“ میں نے تندہی سے پوچھا۔

”کوئی ایسی لمبی بات نہ ہو کہیں۔ میں نے تمہیں بتایا تھا، ڈاکٹر رائے بہت کم کسی کو اپنے گھر بلا تے ہیں۔ یہ تو بڑی ان ہونی قسم کی بات تھی، خصوصاً تمہارے لیے۔“ ایسی جھجکتے ہوئے بولی۔ ”ان حالات میں جو تین چار دن سے پیش آرہے ہیں، تمہاری حیثیت کسی سوائیلہ نشان کی سی ہو گئی ہے۔ ویسے بھی ڈاکٹر اور تمہاری شناسائی کو وقت ہی کتنا

گزر رہے۔“

میں نے کچھ نہیں کہا۔ ہم دونوں کمرے میں آ گئے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میری نظریں بے اختیار کھل کے بستر پر پڑیں اور جیسے کسی خواب سے آکھ کھل جائے میں نے اضطرابی آواز میں پوچھا۔ ”کیا حال ہے ان کا؟“

”بالکل ٹھیک۔“ ایسی فراخ دلی سے بولی۔

”درمیان میں دو ایک بار آکھ کھلی تھی، تمہیں پوچھ رہے تھے۔“

”تم نے کیا کہا پھر؟“

”میں نے بتا دیا کہ تمہیں ڈاکٹر رائے نے گھر پر بلایا ہے۔ کچھ تو کہنا تھا مجھے۔ میں نے بتا دیا کہ ڈاکٹر نے تمہیں کھانے پر بلایا ہے۔ یہ واضح کرنا ضروری تھا، کہیں کوئی اندیشہ، وسوسہ مریض کے دماغ میں نمودن پالے۔ بیماری بہت حساس کر دیتی ہے۔“ ایسی سرگوشیاں انداز میں بولی۔ ”خاصی دیر تک جاگتے رہے پھر میں نے سیب کی چند قاشیں کھلائیں، دو امیں دیں، سو گئے۔ خون کا دباؤ، حرارت وغیرہ دیکھی گئی میں نے۔ سب کچھ معمول پر ہے۔ یہ ظاہر فکر کی کوئی بات نہیں۔“

سو نے پر بیٹھ کے میں نے اپنا بکھرا ہوا جسم سینے کی کوشش کی۔ ایسی بھی میرے برابر بیٹھ گئی۔

”لوگوں تک خاموش رہی پھر اسے گرم ہاتھ سے میری گدی سہلاتے ہوئے وہ بولی۔“ کچھ کھوئے کھوئے سے لگتے ہو۔“

”نہیں تو.....“ میں نے تہی ہوئی آواز میں کہا۔

”نیند آ رہی ہے؟“

”نہیں۔ بالکل نہیں۔“ میں نے اپنا جسم سیدھا کر لیا۔ وہ نیند کو پوچھ رہی تھی۔ نیند تو بڑی مشروط ہوتی ہے۔

”ٹھیک ہوا وہاں؟“ وہ پچھل کے بولی۔

”کیا ہوتا؟“ میں نے کسمسا کہا۔

”کیا کیا باتیں ہوئیں؟“

”دنیا بھر کی، ادھر ادھر کی۔ بہت سی باتیں۔“

میں نے سرسری لہجے میں کہا۔ میں ایسی کو کیا بتاتا۔

”کیسا لگا ڈاکٹر کا گھر؟“

”وہ تو کوئی نگار خانہ ہے۔“

”ہاں، بے شک۔“ عمر رسیدہ ایسی بچوں کی مانند کہنے لگی۔ ”کوئی نگار خانہ یا عجائب خانہ..... مگر تمہیں سارا گھر دیکھنے کا موقع کہاں ملا ہوگا۔“

”تھوڑا بہت جتنا دیکھا وہی بہت مختلف اور منفرد تھا بہت۔“ میری آواز کھوسی گئی۔

”تم نے غور کیا، کیسا تناسب و توازن ہے اس گھر میں۔ ہر چیز جہاں رکھی ہے، جیسے اسی جگہ کے لیے بنی ہو۔ اس طرح کے اکثر گھروں میں بڑی نادر چیزیں ہوتی ہیں لیکن ایک سلیقہ بھی تو چاہیے۔ بعض جگہوں پر تو چیزیں ٹھوپٹی ہوئی، اٹلی ہوئی لگتی ہیں۔ جتنے نفیس ڈاکٹر رائے ہیں۔ اتنا ہی اعلیٰ ان کا ذوق ہے..... اور جب سے بیٹا انگلستان سے آئی ہے، گھر کا نقشہ ہی بدل گیا ہے۔ بیٹا تمہارے سامنے آئی تھی؟“

”ہاں آئی۔“ میں نے ہچکچاہٹ سے اقرار کیا۔

”دیکھا تم نے اسے۔ کیسی ترشی ہوئی، سامنے میں ڈھلی ہوئی لڑکی ہے، شگفتہ، شائستہ..... ہزاروں، بلکہ میں تو کہوں گی، لاکھوں میں ایک.....“

میں نے آنکھیں میچ لیں۔

”کیسی لگی وہ تمہیں؟“

”بہت اچھی، تم ٹھیک کہتی ہو، وہ بڑی نادر لڑکی ہے۔“ میں نے آہستگی سے کہا۔ ”ڈاکٹر رائے کی بیٹی شاید کچھ ایسی ہی ہونی چاہیے۔“

”ارے مت پوچھو۔“ ایسی بے تاب سی ہو گئی۔

”میں تو اس کی عاشق ہوں۔ ذرا سا بھی تکبر نہیں اس میں۔ جب بھی جاتی ہوں، بہت خوش ہوتی ہے اور میں..... میں تو اسے بس دیکھتی رہتی ہوں۔ جی کرتا ہے آنکھوں میں بسا لوں۔ بھی لمبا وقفہ ہو

جائے تو شکایت کرتی ہے۔ باپ سے کہلو کر ملائی ہے۔ جس گھر میں جائے گی بہاںیں بکھیر دے گی۔ وہ تو ایک گھستان ہے۔ سوچتی ہوں، کون خوش نصیب ہوگا جس کے گھر اور دل کی زینت بنے گی۔ کوئی شہزادہ ہی ہونا چاہیے اس کے لیے۔“

”ہاں ہاں۔ وہ خود کسی شہزادی سے کیا کم ہے۔“

”تم بتاؤ تم نوجوان آدمی، کچھ کہنا، تم اس کے سحر کے امیر نہیں ہوئے؟ ہیں نا؟“ ایسی مجھے ٹھوکا دیتے ہوئے بولی، لگتا ہے، کچھ ایسا ہی ہے جیسا چپ چپ ہو۔“

”کیسی باتیں کر رہی ہو تم۔“ میں نے زبرد بر آواز میں کہا اور پہلو بدلا۔

”کچھ بتاؤ، تم نے نہیں چاہا کہ تم اس کے پاس بیٹھے رہو۔ تم سونے کی اس مورٹی کو دیکھتے رہو، اس کے پہلو میں، اس کی روشنی اور گلاز میں زندگی بسر کر دو..... کچھ بتانا۔“

”میں نے ایسا کچھ خیال نہیں کیا۔“ میں نے تجنی سی کہا، ”حسین لوگ بھی حسین مناظر کی طرح ہوتے ہیں۔ ان کی نظارگی اور دید و بازدید کے لیے کس کا جی نہیں چاہتا..... مگر تم کچھ زیادہ ہی اس سے متاثر ہو۔“

”وہ ہے ہی ایسی..... اور یہ تم کیسے نوجوان ہو۔“

”کیوں، مجھے کیسا ہونا چاہیے۔“

”تمہیں تو آہیں بھرتے ہوئی واپس آتا چاہیے تھا۔“ وہ شوخی سے بولی۔

”آدمی کو اپنے آپ کو پھینچنا پڑا ہے۔“

”تم..... تم کیا کسی سے کم ہو۔ میں تو زندگی بھر بیٹے کی آرزو کرتی رہی۔ دو بیٹیاں ہوئیں، ایک زندہ نہ رہ سکی، دوسری اپنے گھر کی ہوئی اور دوسری گئی، لیکن اگر میری کسی بیٹے کی خواہش تھی جو خداوند نے پوری نہیں کی تو وہ کوئی نہیں جیسا تھا۔“ وہ افسردہ ہو گئی۔

رات نئی رات، ہر دن نیا دن ہوتا ہے۔ آدمی وہی پرانا ہوتا ہے۔ ان پہروں اور موسموں کے طلوع و غروب ہی سے وقت کے پیمانے یا گھڑی کی ایجاد ممکن۔۔۔ ہوئی ہوگی۔ ایک ہی پھر رہتا، یا ایک ہی موسم تو آدمی ماہ و سال کے اعداد و شمار کے فریب سے دوچار نہ رہتا۔ کسی لمحے ایسی کی نظر گھڑی پر گئی ہوگی کہ وہ چونک پڑی اور اس نے معذرت چاہی کہ اپنی رو میں جانے کیا کیا دکھڑے، داستا میں لے کے بیٹھ گئی، اس کی یاد گھوٹی مجھے ناگوار خاطر ہوئی چاہیے۔ میں نے شدت سے تردید کی کہ میں تو کسی رنڈ اندازی کے خیال سے خاموش رہا ہوں، ایک ہمہ صفت شخص کا احوال دروں جاننے کی جست جو میں۔ ڈاکٹر رائے کا ذکر ایسی کا جتنا پسندیدہ موضوع ہے، میرے لیے بھی سردست اشتیاق و اضطراب کا باعث ہے۔ مجھے تو خلش ہے کہ یہ سارا کچھ میں پہلے کیوں نہ جان سکا۔ ڈاکٹر میرے محسن ہیں اور محبوب بھی۔ انہوں نے جس انتہاک سے شعل کا علاج کیا ہے اور اس شہر میں میرے آنے کے بعد پیش آنے والے پے در پے سنگین واقعات پر، جس میں میرا نام بہر حال ملوث ہے، بل کہ بنائے فساد ہے، ان کا شعل، ان کی بردباری میرے لیے پہلے ہی ایک ناقابل یقین واقعہ ہے، لیکن جتنا کچھ میں نے یہاں، اسپتال میں اور ان کے گھر جاکے دیکھا اور سمجھا ہے اور اب جتنا کچھ میں نے ایسی سے سنا اور جانا ہے، مجھے احساس ہو رہا ہے، ڈاکٹر کے لیے واجب مرتبت اور منزلت کے اظہار میں مجھ سے کوتاہی ہوئی ہے۔

ایسی چپ ہو گئی تھی۔ اس نے مجھے بستر پر لیٹ جانے اور آرام کرنے کی ہدایت کی۔ میں اس کے پاس سونے پر بیٹھا رہا، پھر ایسی کی وجہ سے کہ اس عمر گزیدہ کو بھی آرام کا کچھ وقت مل جائے، بستر پر آکے دراز ہو گیا۔ ڈاکٹر رائے کا وہ آخری کلمہ میرے کانوں میں پیوست ہو گیا تھا۔ مجھے ہر جانب

اسی کی گونج سنائی دیتی تھی اور اپنی سماعت پر بار بار شبہ ہوتا تھا۔ ایک بار اپنے خلط حواس میں مجھے یہ بے جواز بدگمانی بھی ہوئی کہ ایسی ڈاکٹر رائے کی وکالت تو نہیں کر رہی، جیسے وہ مجھے کچھ جتنا چاہتی ہو اور اسے معلوم ہو کہ ڈاکٹر رائے نے اپنے گھر سے وداع کرتے وقت مجھ سے کیا کہا ہے۔ دوسرے لمحے اپنی بے لگامی اور بدحواسی پر مجھے شرم ساری بھی بہت ہوئی۔ ایسی تو ایک سادہ و معصوم اور مشفق خاتون ہے۔ ڈاکٹر کی روداد بیان کرتے ہوئے اس کے لہجے میں کرب و موز شامل تھا، جو کسی شامل شخص ہی میں ہوتا ہے۔ بے شک ڈاکٹر رائے اس کے لیے کسی دیوتا کی حیثیت رکھتے ہیں، اور ایسے ہی کوئی کسی کا دیوتا نہیں بن جاتا، بہت شہادتوں اور دلیلوں کے بعد پرستش کا یہ مقام آتا ہے۔

بستر پر آکے میرے جسم و جاں میں تلاطم سا برپا ہو گیا۔ بستر آدمی کو آرام پہنچاتا ہے تو ہلکان بھی کم نہیں کرتا کہ پھر تو بہت سے روزن کھل جاتے ہیں اور روزنوں سے طرح طرح کے حشرات اُٹھ آتے ہیں۔ آنکھیں بند نہیں ہو پاتی تھیں۔ آنکھیں بند کرتے ہوئے آدمی کو کبھی بہت ڈر لگتا ہے۔ کھلی آنکھوں سے نظر آنے والے اشیاء و موجودات کوئی رکاوٹ بنے رہتے ہیں۔ بند آنکھوں سے آدمی خود اپنے سامنے آ جاتا، اپنے آپ سے تیرا آزما ہو جاتا ہے۔ میں نے اپنی باگیں کھینچے رکھنے کی بڑی کوشش کی، لیکن چھوٹ چھوٹ جانی تھیں۔ ایسی بھی جاگ رہی تھی۔ در تک مجھے کروٹیں بدلتے دیکھ کر میرے سرھانے آگئی۔ "نیند نہیں آرہی میرے بچے؟"

اس نے سرگوشی میں پوچھا۔

میں نے بے جارگی سے سر ہلادیا۔
 "اسی کے متعلق سوچ رہے ہو؟"
 "کس کے؟"
 "میں کھسا سا گیا۔"
 "اسی کے۔" وہ مسکراتے ہوئے۔ "یا آ رہی ہے

تا؟"

میرے جی میں آئی، اسے پرے دکھیل دوں۔
 "میں جانتی ہوں۔" وہ آنکھیں میچ کے
 بولی۔ "لیکن نہیں۔" کیا ایک اس کی آواز ہماری
 ہوگی۔ "وہ بہت دور کھڑی ہے۔ نہیں پہنچ سکتے تم اس
 کے پاس۔ بہت فاصلہ ہے درمیان میں، بہتر ہے،
 کوئی دیا نہ جلاؤ۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ وہ میرے سر پہ ہاتھ
 پھیرنے لگی۔ "بہتر ہے، اچھے بچوں کی طرح
 سو جاؤ۔"

"کیا کہہ رہی ہو تم؟" میں نے ناتوانی سے
 کہا۔ میں کہنا چاہتا تھا کہ وہ کیا کچھ رہی ہے۔؟
 "میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔۔۔۔۔ میں سمجھتی
 ہوں۔" اس نے میرے گال پر ہلکا سا طمانچہ
 مارا۔ "مجھ پر بھی تو تمہارے جیسے دن آئے ہوں گے
 نا۔۔۔۔۔"

ایسی مجھے اور منتشر کر رہی تھی۔ اس کی کسی بات
 کا جواب دینے اور ٹھکرار کرنے کے بجائے خاموشی
 ہی مناسب تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ پہلے
 کی طرح وہ میرے بالوں میں انگلیاں الجھاتی رہی
 اور میری پیشانی کا بوسہ دے کے چپکے سے اٹھ گئی۔
 آدی کے سرے پکھر جائیں تو بہت ہاتھ پاؤں
 مارتا ہے۔ ہجوم میں جیسے کوئی پھنجر جائے، بھی آدی
 اپنے آپ سے بھی پھنجر جاتا ہے اور خود کو تلاش کرتا
 رہتا ہے اور ڈھونڈ بھی لیتا ہے تو اپنا سامنا نہیں
 کر پاتا۔ میری حالت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ بہت
 سے سوال و جواب تو مجھے خود سے کرنے اور خود کو
 دینے تھے۔ میں ایسی کو کیا مطمئن کر پاتا۔

مجھے دروازے کھلنے اور بند ہوجانے کی آواز
 آئی۔ میں نے نہیں دیکھا، مگر شاید ایسی پہلو میں،
 نرسوں کے لیے مخصوص کمرے میں چلی گئی تھی۔ اس
 کی ناموجودی سے جانے کیوں کچھ سکون سا ہوا۔
 ہر چند رنگوں میں چوہنیاں ہی رینگ رہی تھیں اور
 آنکھوں میں آگ سی لگی ہوئی تھی۔ اندھیرے میں
 ٹوٹتے ہوئے جیسے کوئی سرا ہاتھ آجائے، کسی سوال کا

جواب مل جائے، رات کے آخری پہر میں کہیں مجھے
 لگا، میں گم گشتہ خود کو نظر آ گیا ہوں۔
 یقیناً ڈاکٹر رائے نے وہی کہا تھا جو میں نے سنا
 تھا۔ ڈاکٹر پوری طرح اپنے حواس میں تھا۔ کچھ دیر
 پہلے اس نے گھر آنے والے پولیس افسر سے گفت
 گو کی تھی اور میرے بارے میں کچھ اچھی باتیں نہیں
 سنی تھیں، پھر اس نے مجھ سے تہہ پیدی و شیشی لب
 و لہجے میں بحث کی تھی اور میری صراحتیں محل سے سنی
 تھیں، وہ نہایت متوازن باتیں کرتا رہا تھا۔ کوئی
 اہتمام نہیں تھا اس کے کلام میں۔ اپنا مدعا عیاں کرنے
 سے پہلے اس نے تمام تر سابق و سابق کا خیال رکھا
 تھا اور اس نے مجھے کوئی حکم نہیں دیا تھا، محض ایک
 امکان ظاہر کیا تھا۔ اس نے پوری ناز کی برتی تھی۔
 یہی ایک شخصیت، اشارتی سا فرہنگ ہوتا ہے ایسے
 موضوع پر لب کشائی کا۔ ایک دانش مند، ہر اعتبار
 سے مکمل، ایک جہاں شناس شخص کی جانب سے ایسی
 کسی خواہش کا اظہار اچھی طرح عواقب و نتائج پر
 غور کر کے ہی کیا جاسکتا ہے۔ یہ اس کی عزیز از جاں
 بیٹی کا معاملہ تھا۔ اس بیٹی کا جو اس کی زندگی کا حاصل
 ہے۔ سب کچھ کھنجر جانے اور لٹ جانے کے بعد اس
 کے لیے بچی بچی کا نجات کے مانند ہے۔ نہ وہ رندی
 و سرستی کی کسی کیفیت سے دوچار تھا، نہ میرے اس
 کے درمیان بے تحاشی و بذلہ سچی کوئی رسم و رواج تھی
 اور ایسی باتوں کا تعلق تو زندگیوں سے ہے۔ زندگی
 کے اتنے اہم فیصلوں میں یہ شوشیاں نہیں کی
 جاتیں۔

میرے اس کے مراسم کو دن ہی کتنے ہوتے
 تھے، ٹھیک سے ہفتہ بھر بھی نہیں۔ اس مختصر دورانیے
 میں جس بے سروپائی، بے دردی، بے دادگری میں
 روز و شب گزرے تھے، بے شک مجھے قریب سے
 جاننے بوجھنے کا اسے موقع مل گیا تھا۔ ادھر اس کے
 سامنے اپنے مزاج، اپنی روش کی بیٹی تھی، عام
 لڑکیوں سے یک سر مختلف، پھر شاید کچھ یوں ہوا کہ

جنت بسیار کے بعد ڈاکٹر کو اپنی بیٹی اور مجھ ایک
 خاک بسر، آشفتم سر کے درمیان کسی تار پود کی کوئی
 صورت دکھائی دے گی۔

وہ ایک سراپا حملت، سر تا با رعنائی، چہرہ ماہ
 تاب، بدن کندن، نقش و نگار تراشیدہ، کوئی حسین
 و جمیل لڑکی کچھ ایسی ہی ہو سکتی ہے اور حسن و جمال کی
 خوبیوں تو خلقی ہیں۔ خیال کی افراط، ذہانت
 و فطانت کے اوصاف خداوندی عطیہ ہیں، مگر آدی
 ان پر کس قدر ادا طلب ہو، ناز تو ان اوصاف پر ہونا
 چاہیے جو اپنی جست جو، مسامی اور رباخت کا ثمر
 ہوں۔ ڈاکٹر رائے کی صاحب کمال بیٹی بیبا کو اپنی
 بیش از بیش خلقی صفات کا احساس کچھ زیادہ ہی تھا
 کہ اس نے اس کی پالیدگی اور افزائش کا ہر چہن کیا
 تھا۔ وہ بری زاد آسمانی حسن سے آراستہ نہ ہوتی تو
 بھی علم و فکر، ہنر و فن، نفاست و شائستگی کی اکتسابی
 اور ارادی خوبیوں میں یک تار بیگانگی۔

تو پھر استرداد کا کیا عمل، تردید کا کیا جواز ہے۔
 سامنے کون ہیں، دانائے دہر، دانش سرشت، فکر
 پیشہ، مسیحا نفس، عالی مقام ڈاکٹر رائے اور ان کی
 نادرہ کار، نادر روزگار بیٹی بیبا! کس میں استقامت
 سے جو ڈاکٹر رائے کی عزت مآب گھرانے سے
 وابستگی میں سرتابی کا ارتکاب کرے۔ لازم ہے کہ
 بیٹی کے اشارہ و عنایت کے بغیر باپ کو اس قلندری کی
 جرأت نہیں ہوتی چاہیے، تو پھر یہ تصور ہی کیسا جاں
 گداز ہے کہ ایسا کوئی ریشم و شیشہ و شعلہ و گل
 اندام، ایسا کوئی گلستاں مثال، آمادہ لطف و نشاط
 ہے۔ ڈاکٹر رائے اور اس کی بیٹی کا کسی نا آشنا، بے
 نشان پر یہ خسروانہ القات ایک عز و شرت ہے۔ پھر
 وہ خوش کام و خوش انجام کسی اور کو بچے کا رخ کیوں
 کرے، خود کو بچوں اور رنگوں کی نذر کیوں نہ
 کر دے۔ آدی وہیں تمام کیوں نہ ہوجائے۔

رات کے آخری پہر کسی لمحے مجھے نیند آگئی۔ سنا
 ہے، کسی ارادے کی توانائی نصیب ہوجائے تو نیند

آجاتی ہے۔ ارادے کی نوعیت چاہے کسی کیوں نہ
 ہو، ارادہ بڑی راحت ہے۔ بجان واضطراب کے
 ایک گرداب کے بعد مجھے جیسے کوئی کنارہ نظر آ گیا۔
 میرا ارادہ استوار ہو گیا تھا۔ کمرے میں ایسی کس
 وقت واپس آئی، مجھے خیر نہ ہو سکی۔

صبح اچھی اندھیرا لٹ رہا تھا کہ راہ داری میں
 خاک رو بہوں کی چہل پہل سے آنکھ کھل گئی۔ پہلے
 میری نگاہ نعل کے بستر پر گئی، وہاں خاموشی تھی، پھر
 دروازے کے قریب آرام کرسی پر نیم دراز بیگانہ
 ہوش ایسی نظر آگئی۔ میں نے بھی پھر آنکھیں
 موند لیں، لیکن آدھ گھٹنا نہیں گزرا ہوگا کہ کمرے
 میں در آنے والا اجالا پھیل گیا۔ پھر نیند نہیں آئی۔
 ایسی بھی جاگ گئی تھی۔ اس نے دروازہ کھول دیا اور
 کھڑکیوں کے پردے ایک طرف سمیٹ دیے۔
 ملحق غسل خانے میں منہ ہاتھ دھو کے میں کمرے
 سے باہر آ گیا۔ دن رات کا کوئی پہر صبح سے بہتر نہیں
 ہوتا۔ دنیا بدل ہوتی محسوس ہوتی ہے۔ تازہ تازہ،
 جیسے آج بھی وجود میں آئی ہو۔ آدی کیا، پرندوں کو
 بھی صبح بہت مرغوب ہے، کیسے ناپنے، گانے،
 اترانے لگتے ہیں۔ کاش ایک پہر ہی ہوا کرتا، مگر صبح
 کی لطافت در سے پہروں سے میز کس طرح
 ہو پائی، اندھیرے ہی سے روشنی کا مرتبہ ہے۔

ایسی نے کسی خدمت گار سے جائے سنگولی
 تھی۔ راہ داروں میں کرسی اور میز ڈلووا کے اس نے
 اپنے ہاتھ سے میرے لیے چائے بنائی اور خود چند
 گھونٹ پی کے واپس کمرے میں چلی گئی اور دروازہ
 بند کر لیا۔ اس کا مطلب تھا کہ اب مجھے اندر جانے
 کی اجازت نہیں ہے۔ صبح سویرے وہ زیادہ فعال
 ہوجاتی تھی۔ زائٹر کے آنے سے پہلے اسے بہت
 سے کام کرنے ہوتے تھے۔ حرارت، خون کے دباؤ
 اور جنس کی رفتار کی جانچ پڑتال اور مریض کے
 کیفیت نامے میں خانہ پری، مریض کے لباس کی
 تبدیلی، ناشتا کرانا، دواؤں کی خوراک دینا وغیرہ۔

اتنے دنوں میں میں بھی اسپتال ہی کا کوئی آدمی بن گیا تھا۔ اسپتال کے بھی اپنے صبح وشام ہوتے ہیں، باقی دنیا سے الگ تھلگ۔ اسپتال اور قید خانے میں بڑی مماثلت ہے، وہاں جیلر ہوتا ہے، یہاں ڈاکٹر، وہی نظم و ضبط، وہی ان کا گشت، وہی پابندیاں۔ یہاں مریض بھی کسی زندانی کی طرح ہوتا ہے۔ میں نے سات سال کاٹے تھے، پھیلنے بھی جاتے تھے، زندگی قید خانوں میں گزار دی تھی۔ اسے اپنی مرضی و مشا ترک کر دینے کی عادت تھی، حالاں کہ زندانی ہونے کے باوجود جیل میں ایک طرح اس کی عمل داری ہوتی تھی۔ یہاں تو وہ کسی محتاج کے مانند ہو گیا تھا۔ قید خانے سے اسپتال کی سزا زیادہ اذیت ناک ہوتی ہے۔ آدمی آزاد ہے بھی نہیں بھی۔

ٹھیک آٹھ بجے سیورین آگئی۔ اودی رنگت کے کڑھے ہوئے کرتے، تنک مہری کے سفید پاچھے اور سفید دوپٹے میں ملبوس۔ نوگنڈتہ، کھلی کھلی سی، مسکراتی، لہراتی ہوئی اور کسی قدر گھبرائی گھبرائی سی۔ عقب میں اسپتال کا نو عمر ملازم، توشیدان اٹھائے ہوئے تھا۔ آج وہ کچھ پہلے ہی چلے آئی تھی۔ لگتا تھا، بس صبح ہونے کی منتظر تھی۔ اسے دیکھ کے مجھے اپنے ہی گھر کی کسی لڑکی کا گمان ہوا، شاید اس لیے کہ وہ زریں، فرخ، فریال، سلمیٰ اور نیساں ایسا لباس پہنے ہوئی تھی۔ ڈاکٹر رائے کسی وقت بھی معمول کی گشت پر آسکتا تھا۔ ادھر سیورین ناشتا ٹھنڈا ہو جانے کے اندیشے میں یگان نظر آئی تھی۔ اس وحشت کی ایک وجہ یہ بھی ہوگی کہ ہر تخلیق کار کو اپنی تخلیق کی داغ بیل لگانے کی ہوتی ہے۔ ہنرمندی نے اس کا عمل یہ ڈھونڈا کہ وارڈ بوائے کو بیچ کر ڈاکٹر کی نقل و حرکت کا سراغ لگایا، پھر اس اطمینان کے بعد کے ڈاکٹر کے آنے میں کچھ وقت لگنا چاہیے۔ میز پر ناشتا سجا دیا گیا، مجھے اندازہ تھا کہ سیورین نے کیا کیا اہتمام کیا ہوگا۔ رات کو سو بھی سکی، یا نہیں۔ بالشت بھر کی چھوٹی چھوٹی پوریاں،

سبھی ایک پھانسی کی، ہلکی ہلکی تلی ہوئی، پنے، آلو، پالک اور پیپرز کاریاں مختلف ہلکی سبز یوں کی قاشیں، ٹوسٹ، مکھن اور شہد، ولاتی قسم کا سیبوں کا میٹھا اور جانے کیا..... وارڈ بوائے چائے لے آیا۔ میرے انکار کے باوجود سیورین کے اشارے پر ایسی بار بار میری تشریح بھرتی رہی۔ میں نے کچھ شکم سیری کی، کچھ وضع نبھائی۔ کچھ مجھے اس تکلف پر سختی بہت ہو رہی تھی۔ میری پسندیدگی کے اظہار پر سیورین کے رخساروں کی چمک دیدنی تھی۔ لوگ ایک دوسرے سے شدید نفرت کرتے ہیں تو انہیں ایک دوسرے سے محبت کرنی بھی کم نہیں آتی، اور اس میں عرصہ، وقت اور کسی ایثار و احسان کی بھی شرط نہیں، بس آدمی کو آدمی اچھا لگتا چاہیے، آدمی کو آدمی کی قدر ہونی چاہیے۔ اس کی مجبوری، محرومی اور ضرورت کا احساس، اور آدمی کا دل کشادہ ہونا چاہیے۔ کہتے ہیں، نفرت بجل ہے، محبت سخاوت اور آدمی کا شرف۔

اچھا ہوا جو وارڈ بوائے نے لپکتے جھپکتے آکے ڈاکٹر رائے کے آنے کی اطلاع دی اور سیورین اور ایکی کی خاطر دار یوں پر بندش لگی۔ میں نے بھی ان کا ہاتھ بٹانا چاہا تھا۔ انہوں نے گوارا نہیں کیا اور خود ہی انہوں میں میز صاف کر دی اور ناشتے کی کوئی نشانی میز پر باقی نہ رہنے دی۔

روزی طرح تر و تازہ ڈاکٹر رائے دو ڈاکٹروں اور ایک نرس کے ہمراہ تیز قدموں سے کمرے میں داخل ہوا۔ شاید پہلی نظر بھی پرگنی اور اس کے ہونٹوں پر شائستہ مسکراہٹ کو نہ گئی۔ اس ایک لمحے میں میرا سارا وجود دھڑک اٹھا۔ دوسرے لمحے وہ قدم بڑھا چکا تھا، لیکن یکا یک درمیان میں ٹھہر گیا اور سر گھماتے ہوئے چونکی آواز میں یولا۔ 'دیکھی تم کا ناشتا! یہاں اسپتال میں تو نہیں بنتا۔'

سیورین ابھی تک گھر کے لباس میں تھی، وہ تو چہرہ لگی۔ ایکی نے سامنے آکے جھجکتے ہوئے پردہ

پوشی کی کہ سیورین اس کے لیے کچھ گھر سے بنا کے لائی تھی۔

ڈاکٹر نے آنکھیں چڑھا کے سر ہلایا۔ ایک ناگواری چہرے پر ہوا پیدا ہوئی اور وہ آگے چلا گیا۔ پھل کے پاس جا کے وہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ میں نے اس کے قریب جانے سے دانستہ گریز کیا اور اپنی جگہ کھڑا رہا۔ ڈاکٹر نے پھل کی کیفیت نامے پر ایک نظر ڈالی اور اپنے سامنے ڈاکٹروں سے سرگوشیوں میں مشورے کرتا رہا۔ پھل جاگ گیا تھا یا پہلے سے جاگا ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے اس کے شانے پر مکا مارتے ہوئے مہیا نا اور مشفقانہ انداز میں حال پوچھا۔ پھل نے ہلکی آواز میں کیا جواب دیا تھا کہ بے ساختہ ڈاکٹر کا قبضہ بلند ہوا۔ دوسرے ڈاکٹر بھی مسکرا اٹھے۔ اس سے پہلے کہ گذشتہ مرتبہ کی طرح ڈاکٹر رائے مجھے کمرے سے نکل جانے کا حکم صادر کرے، میں نے خود ہی کمرے سے نکل جانا مناسب سمجھا۔ باہر آکے مجھے عداوت و ملامت کے احساس نے آھیڑا۔ اس طرح میرے چلے آنے کا کیا جواز ہے، صرف اتنا نہیں کہ میں نے خود کو وہاں غیر ضروری جانا، یا جلد، یا بدیر ڈاکٹر کو میری موجودی ناپسند ہوئی، اس کے حکم کے بغیر میرے باہر آجانے کی یہی ایک وجہ ہو سکتی ہے کہ ڈاکٹر سے نظریں ملانے کی مجھے تاب نہیں ہے، اس کا سامنا کرتے ہوئے کوئی ہچکچاہٹ ہو رہی ہے مجھے، لیکن یہ گریز و اجتناب تو میرے استوار کیے ہوئے ارادے کے منافی ہے۔ اس اعتراض و تلقین کے باوجود کمرے میں واپس جانے کی ہمت نہ ہو سکی۔ راہ داری میں کمرے کے پہلو ٹک رہی ہوئی کرسی پر میں کسی دربان کی مانند بیٹھ گیا اور در پر ہو گئی۔

آج کمرے کا دروازہ بند نہیں کیا گیا تھا۔ اندر سے آنے والی تیز آوازوں پر یک بارگی مجھے اٹھنا پڑا اور میری آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ ایک طرف نرس

ایکی، دوسری طرف ڈاکٹر کے ساتھ آنے والی نرس کا ہاتھ تھا جسے پھل اپنے پیروں سے پلٹا ہوا باہر کی جانب آرہا تھا۔ تینوں ڈاکٹر اس کے پیچھے تھے اور حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ پھل نے کمرے کا دروازہ بھی عبور کر لیا اور باہر آکے اس نے دونوں نرسوں سے اپنے ہاتھ پھڑا لیے اور خود اپنے سہارے دائیں طرف بڑھنا شروع کیا۔ ڈاکٹر تالیاں بجانے لگے۔ پھل کے پیروں میں ہلکی سی لڑکھڑاہٹ تھی اور جسم بھی ڈمکھا گیا تھا، لیکن دو گرا نہیں۔ دونوں نرسیں اس کے جسم سے تقریباً چپکلی ہوئی ساتھ تھیں۔ ڈاکٹروں کی آنکھوں سے خوشی جھلک رہی تھی۔ چند قدموں کا فاصلہ پھل نے خود طے کر لیا تھا۔ وہ اور آگے جانا چاہتا تھا کہ ایک ڈاکٹر نے آگے جا کے اسے روک دیا۔ پھل واپس بھی اپنے بل پر آیا اور کمرے کے دروازے پر رکھی جس کرسی پر کچھ دیر پہلے میں بیٹھا ہوا تھا، وہیں ٹھہر کے اس نے بیٹھ جانے کی خواہش کی۔ نرس ایکی نے اس کا بازو تھاما، مگر وہ اسے اب ہی کرسی پر بیٹھا تھا۔ پھل کی ایسی بات نہیں ہوئی، اتنے دنوں تک کمرے کے در و دیوار سے دور ہو کے کھلی جگہ اسے اچھی لگ رہی ہوگی۔ راہ داری کے آگے سبزہ زار تھا، کیاریوں میں رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے۔ سبزہ زار کے اس پار درخت تھے اور پرندے پھدک رہے، چچہارے تھے۔ کچھ فاصلے پر میں بھی وہاں موجود تھا۔ مجھے دیکھ کے اس نے ایک گہری سانس لی۔ سارے لوگ، ڈاکٹر، نرسیں، سبھی اس کے گرد گھبرا ڈالے ہوئے تھے۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ کس طرح ڈاکٹر رائے سے احسان مندی کا اظہار کروں، ایکی اور سیورین سے کیا کہوں اور پھل کو کیا سلی دوں۔ میں تو سب کچھ بھول ہی گیا تھا۔ میرا جسم بے وزن ہو گیا تھا۔

ڈاکٹر رائے، سامنے ڈاکٹروں کے پاس سے ہٹ کے میرے پاس آگیا۔ میں سو چٹا رہ گیا۔ اس

”کیسا ہے رے؟“ اس نے بد بداتی آواز میں پوچھا۔

”میں..... میں ٹھیک ہوں بالکل۔“ میرا جسم اکڑ گیا اور زبان لڑکھڑانے لگی۔ ”تم..... تم بتاؤ کیسے ہو اب؟“

اس نے جواب دینے میں تامل کیا، پھر بولا،

”کتنے دن ہو گئے؟“

”زیادہ نہیں۔“ میں نے بہ عجلت کہا، ”یہی کوئی چار پانچ بل کہ سمجھو، چھ دن۔“

اس کے ہونٹ پھیل گئے اور وہ سر ہلا کے رہ گیا۔

”اب کوئی بات نہیں۔ سب ٹھیک ہی ہے۔ اچھا ہوا جو ہم یہاں آ گئے۔“ اپنی آواز قابو میں رکھنا مجھے مشکل ہو رہا تھا۔ وہ مجھ سے مخاطب تھا، میری بات کا جواب دے سکتا تھا۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔

”خط، تار تو نہیں دیا کہیں کو؟“ اس نے پوچھنا شروع کیا۔

”نہیں۔“ اس کے استفسار پر پہلا خیال مجھے زریں کا آیا تھا، اس لیے میں نے انکار کر دیا تھا، پھر میں نے تردید کی۔ ”کلتے تار دیا تھا جامو بھائی اور جرو کو بلانے کے لیے۔ انہیں آ جانا چاہیے تھا اب تک۔“

”کیدوں دیارے۔“ وہ ادا سی سے بولا۔

میں اسے کیا بتاتا کہ اس کی بیماری کے ان چند دنوں میں کیا کچھ ہوتا رہا ہے..... پانچ آدمیوں کا خون ہو چکا ہے۔ سارا شہر ہی متاثر ہوا ہے، میں بھی بس اتفاق سے اس کے پاس موجود ہوں۔ ڈاکٹر رائے پولیس کے آڑے نہ آ جاتا تو میں پولیس کی تحویل میں ہوتا، اور جانے پھر کیا ہوتا۔ میں نے کہا، ”اکیلا لگ رہا تھا میں خود کو۔“

اس نے ہنکاری بھری اور کچھ نہیں بولا۔

کے ہاتھ پوموں، سینے سے لگا لوں، پاس کے پیر پکڑ لوں۔ ڈاکٹر نے میری بھری ہوئی آنکھوں میں ضرور کچھ دیکھ لیا تھا کہ میرے سامنے آ کے کھڑا ہو گیا اور مضطرب نظروں سے مجھے گھورنے لگا۔ ”ٹھیک ہے استاد؟“ چند ثانیوں کے توقف کے بعد اس نے ہندستانی میں کہا۔ اس کی آواز میں رعب، انخار اور مسرت کا آمیزہ تھا۔

میں نے جھک کے اس کے پیر چھونے چاہے کہ اس نے مستعدی سے میرے شانے پکڑ لیے اور اپنے ساتھی ڈاکٹروں کو اشارہ کیا۔ میرا خیال تھا، ابھی وہ میرے گا، مجھ سے کوئی بات کرے گا، لیکن جیسے میں تو بس ایک مریض کا نگہدار تھا، گذشتہ رات میں اس کے گھر گیا ہی نہیں تھا اور اس نے مجھ سے کچھ کہا سنا ہی نہ تھا۔ میرے آگے سے ہٹ کے اس نے ایچی اور سیورین کو کچھ ہدایات دیں اور ہنسل کا بازو تھپ تھپا کے واپس جانے کا ارادہ کیا۔ ہنسل اٹھنا چاہتا تھا کہ ڈاکٹر نے اس کے گھٹنوں پر زور دے کے اسے بیٹھا رہنے دیا اور چل پڑا۔ جاتے جاتے مڑ کے بولا، ”وقت ملے تو ادھر آنا میرے پاس۔“ اس بار اس نے مجھے انگریزی میں مخاطب کیا اور تذبذب سے بولا، ”یا پھر میں خود ہی بلا لوں گا، اگر فرصت ملی۔“ پلک جھپکنے کی مہلت میں وہ دور ہو گیا۔

سیورین اور ایچی ہنسل کے پاس کھڑی رہیں۔ انہوں نے اسے کمرے میں واپس لے جانا چاہا، لیکن ہنسل کے منع کرنے پر انہوں نے اصرار بھی نہیں کیا۔ ڈاکٹر نے انہیں ایسی کوئی تاکید نہیں کی ہوگی کہ وہ زیادہ تشویش کرتیں۔ ایچی نے خدمت گار سے کہہ کے وہیں ایک اور کرسی رکھوادی اور کمرے میں جا کے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئی۔ سیورین بھی لباس کی تبدیلی کے لیے ہنسل کے پاس چلی گئی۔ ہنسل اور میں وہاں اسی لیے رہ گئے اور میں دزدیدہ نظروں سے اس کی صورت

”مغفوم نہیں، کیوں نہیں آسکے وہ۔ یہ تو ممکن نہیں کہ تار نہ پہنچا ہو۔ جانے کیا بات ہے؟“ میں نے اسے نہیں بتایا کہ ایک کے بجائے دو تار دیے گئے تھے، اور وہ بھی ار جٹ۔

اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا اور بڑھدگی سے بولا، ”ابھی اور کتنے دن کا بولتے ہیں ڈاکٹر لوگ؟“

”کوئی بات نہیں ہوئی ابھی، لیکن یہ اسپتال اچھا ہے، ڈاکٹر، نرس، سبھی لوگ بہت ذمے دار ہیں۔ اور کچھ دن لگ جائیں تو کیا فرق پڑے گا۔“

میں نے عمداً سرسری طور پر کہا۔

”جگہ تو بڑی ہریالی ہے۔“ ادھر ادھر نظریں گھماتے ہوئے اس نے میری تائید کی۔

”یہ اسپتال کا سب سے خوب صورت حصہ ہے، الگ تھلگ بھی اور اسپتال میں شامل بھی۔ بہت بڑے بڑے لوگوں کو کمرے ملتے ہیں ایسے، گورے، بڑے افسروں اور پیسے والوں کو۔ وہ تو ڈاکٹر نے مہربانی کی۔ کسی جان پہچان، صاحب سلامت کے بغیر ہمیں ادھر جگہ دے دی اور پھر کیسا خیال رکھا، جیسے ہم ان کے کوئی عزیز ہوں۔ کیا کیا تاؤں نہیں، اپنے ڈاکٹر صاحب، ڈاکٹر رائے کے بارے میں.....“

وہ سر اٹھائے ستارہ ہا اور جانے کیا بڑا بڑا لگا۔ میں کچھ سمجھ نہیں پایا۔

اسی لمحے ایچی آ کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اس کے ہاتھ میں سفید کپڑے سے ڈھکی ایک مختصر ٹرے تھی۔ ٹرے میں فنان اور گلاس دیکھ کر ہنسل نے منہ پھیر لیا، مگر ایچی کا انداز نہایت معذرت خواہانہ تھا۔

”میرا مادرانہ شفقت چھائی ہوئی تھی۔ شفقت سے کسی کیسے گراں گزرتی ہے۔ ہنسل نے فنان ٹرے سے اچک کے حلق میں انٹرٹل لیا۔ ایچی پانی بھرا گلاس بڑھایا تو ایک ہی سانس میں اس گلاس بھی خالی کر دیا۔ ایچی ہنکر یہ ادا کر کے چلی گئی۔ ہنسل نے منہ بنا کے میرے گھٹنے پر آہستہ سے

”ہاں رے، سارا ٹھیک ہی لگتا ہے۔ چل پھر سکتا ہوں اب ایک دم۔“

”چل کے تو تم اپنے پیروں ہی سے یہاں آئے تھے۔ کوئی اٹھا کے نہیں لایا تھا، لیکن ہوا کیا پھر۔“ میرے لہجے میں تیزی آ گئی۔ ”ڈاکٹر صاحب کی اجازت کے بغیر کہیں نہیں جائیں گے ہم۔“

”ہاں رے بیڑی، بیڑی مل جاوے گی ادھر ہی؟“

”بیڑی؟“ میں چونک پڑا۔

”ہاں رے بیڑی، کبھی دیکھی نہیں؟“ وہ سچی سے بولا۔

”دیکھی ہے، بہت دیکھی ہے۔“ میں نے زنج ہو کے کہا، ”پر نہ بیٹو تو اچھا ہے۔ مجھے نرس ایچی سے پوچھنا پڑے گا۔“ میں نے کمرے میں موجود ایچی کے پاس جانے کے لیے اٹھنا چاہا۔ میں نے سوچا تھا، ایچی سے کہہ کے منع کرادوں گا۔ بیڑی سے کھانسی ہو سکتی ہے۔

”رہنے دے۔“ اس نے جھشڑکی آواز میں مجھے روک دیا۔

بیڑی کی طلب سے مراد تھی کہ واقعی اس کی طبیعت ٹھیک ہو رہی ہے۔ حالاں کہ وہ بیڑی کئی کا ایسا عادی نہیں تھا۔ دن میں چند بیڑیاں اور حد سامنے ہوتی تو قطعاً نہیں۔ یہاں حقے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

اس نے پھر چپ سادھ لی تھی۔ بڑہ زار پڑا۔ اچھلتی، کودتی اور ٹھوٹھیں مارتی بیڑیاں دیکھتا رہا۔ اور دیر بعد تاسف آمیز درد تھی سے بولا، ”الہا ہو گیا رے بیڑی۔“

”کیا اللہ ہو گیا۔“ یہ تو ہوتا رہتا ہے۔ میرے ساتھ نہیں ہوا تھا؟ آسن سول میں اس بدعاش سید محمود علی کے گھر کتنے دن ٹھہرنا پڑا تھا۔ مجھے تو بخار تھا..... اور تمہیں.....“ مجھے اپنی زبان تھامی بیڑی اور میں نے ملامت سے کہا، ”تمہارا تو سر کا معاملہ تھا، اور اب، اب تو تم ٹھیک ہو۔“

”ہاں رے، سارا ٹھیک ہی لگتا ہے۔ چل پھر سکتا ہوں اب ایک دم۔“

”چل کے تو تم اپنے پیروں ہی سے یہاں آئے تھے۔ کوئی اٹھا کے نہیں لایا تھا، لیکن ہوا کیا پھر۔“ میرے لہجے میں تیزی آ گئی۔ ”ڈاکٹر صاحب کی اجازت کے بغیر کہیں نہیں جائیں گے ہم۔“

”بیڑی؟“ میں چونک پڑا۔

”ہاں رے بیڑی، کبھی دیکھی نہیں؟“ وہ سچی سے بولا۔

”دیکھی ہے، بہت دیکھی ہے۔“ میں نے زنج ہو کے کہا، ”پر نہ بیٹو تو اچھا ہے۔ مجھے نرس ایچی سے پوچھنا پڑے گا۔“ میں نے کمرے میں موجود ایچی کے پاس جانے کے لیے اٹھنا چاہا۔ میں نے سوچا تھا، ایچی سے کہہ کے منع کرادوں گا۔ بیڑی سے کھانسی ہو سکتی ہے۔

سیورین نے وقفے واری معمول کے مختلف معائنوں کے بعد بستر کے نزدیک الماری میں رکھے ہوئے شیشے کے جگ سے کسی پھل کا مشروب گلاس میں بھر کے پھل کو پیش کیا۔ اس وقت پھل کے نتھنے پھولے ہوئے تھے، پیشانی پر شکنوں کا جال بچھا تھا، سانس بھی مجھے کچھ تیز لگ رہی تھی۔ مجھے خدشہ ہوا کہ سیورین کی پیشہ ورانہ تن دہی سے چڑ نہ جائے اور کچھ الٹ سلت نہ کر دے، اس لیے میں قریب ہی کھڑا رہا۔ اس نے خاموشی سے مشروب پی لیا۔ سیورین نے پھر چند گولیاں اسے کھلائیں اور اس نے پھل کے بالوں کی ایک بھری ہوئی لت درست کرنی چاہی کہ پھل نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا، وہ بری طرح گھبرا گئی۔

”پہنہ جاری ادھری۔“ پھل نے ہنسی آواز میں فرمائش کی۔

سیورین نے ڈیوٹی والا لباس پہن لیا تھا اور ابھی اپنے گھریلو لباس میں گھر جانے کے لیے تیار ہوئی تھی۔ پھل کو وہاں بیٹھے قریب آدھ گھنٹا گزارا ہوگا کہ ابھی کسی ناگہانی بلا کی طرح سر پہ آدھمکی۔ اس بار اس کے تیور ہی بدلے ہوئے تھے۔ اس نے پھل کو اٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ بیمار آدمی سب سے بڑا محکوم ہوتا ہے اور ابھی اچھی طرح جانتی تھی کہ اپنے محکوموں سے کب اور کیسا برتاؤ کرنا چاہیے۔ پھل کے پاس خشونت بھری نگاہوں سے اسے دیکھنے اور تعمیل کرنے کے سوا کیا چارہ تھا۔ وہ اٹھ گیا۔ سیورین اور ابھی نے اس کے بازو پکڑ لیے تھے۔ اس نے بازو جھٹک کے دونوں کو ہٹا دیا اور تین قدم کی دوری طے کر کے اپنے کمرے، اپنے زنداں میں داخل ہو گیا۔

ابھی پھر نہیں ٹھہری۔ شام کو جلد ڈیوٹی پر واپس آنے کا کہہ کے اور پھل کی صحت یابی کے لیے رسمی دعائیہ کلمات ادا کرتی ہوئی رخصت ہو گئی۔